ھزار داستان

ایڈیٹر (حکیم احمد شجاع بی اے علیگ)

اشاعت ماہ جولائی سنہ ۱۹۲۳ء — نمبر ۱

فہرست مضامین

مضمون	اثر خامہ	نمبر صفحہ	نمبر شمار	مضمون	اثر خامہ	نمبر صفحہ
…ت	ایڈیٹر	۲	۸	فریبِ تقدیر	جنابِ حامد علی خاں حامد	۲۵
…باری	ایڈیٹر	۳	۹	وجدانیاتِ سُہا	مولانا سہا (علیگ)	۴۳
…ں	جناب سیّد عابد علی عابد بی اے	۵	۱۰	بقائے اشکال	جناب سیّد عابد علی عابد بی اے	۴۴
…	مترجمہ جناب عبدالستار صاحب	۶	۱۱	جذباتِ عزیز	جناب یوسف عزیز	۴۰
…با	جناب محمد ہادی حسین	۱۱	۱۲	بچپن	جناب مرزا مظفر حسین علیگ	۴۱
…ئے محبت	جناب عندلیب شادانی	۲۳	۱۳	نوائے ہوش	جناب حبیب الحق ہوش دہلوی	۶۹

صفحۂ ادارت

خدا کے فضل سے ہزار داستان کی [illegible] جلدیں ختم ہو گئیں۔ اور آج تیسری جلد کی پہلی اشاعت ناظرین کی خدمت میں حاضر ہو رہی ہے۔

اس ایک سال کے دوران میں جو خدمات ادب ہزار داستان نے انجام دیں یا جو خدمات وہ آئندہ انجام دینا چاہتا ہے ان کی طرف میں پچھلی اشاعت میں اشارہ [illegible] وہ اشاعت غالباً ناظرین پر اس حقیقت کو آشکار کر دیگی۔ بہر حال اب میں نے اشاعت ماسبق میں مستقبل ہزار داستان کے متعلق ظاہر کئے ہیں وہ تکمیل کے کسقدر قریب ہیں۔ جن حضرات نے سال بھر کی سرپرستی کے بعد آئندہ کے لئے بھی ہزار داستان کو شرف قبولیت بخشا ہے ان کی مروت اور کرمفرمائی کے شکریہ سے میرا قلب و دماغ عہدہ برآ نہیں ہو سکتا مگر جن حضرات نے اس سال بھر کے ادبی رفیق سے بیوفائی کی ہے۔ ان کا احسان بھی میری گردن پر ہے۔ مجھ پر ظاہر ہو گیا ہے کہ ابھی ہزار داستان ہمذاق کے شائقین ادب کی ضیافت طبع کا سامان نہیں رکھتا۔ لیکن اگر وہ حضرات از رہ کرم مجھے ان وجوہ سے آگاہ کر دیتے' جو ہزار داستان کی سرپرستی اور ان کی قدر افزائی کے درمیان حائل ہو گئی ہیں۔ تو میں اس کو ایک بیاز حسن سلوک تصور کرتا۔

دنیا میں دوست دوستوں کے لئے سب کچھ کر گذرتے ہیں۔ اور ادبی مذاق رکھنے والے حضرات تو اپنی بے غرض قربانیوں کی بدولت مشہور ہیں۔ اگر ہزار داستان یہ امید رکھے کہ اس کا ہر ایک سرپرست اس کے لئے کم از کم ایک خریدار سال بھر کے لئے بہم پہنچائیگا۔ تو شاید یہ توقع نہ تو آپ کے فیضانِ کرم سے بعید ہوگی اور نہ ہزار داستان کے استحقاق سے بالاتر۔

میں ہر چند چاہتا ہوں کہ ہزار داستان کے ناظرین کو اس مالی خسارہ کا صرف اندازہ ہی کرنے دوں جو کمی اشاعت اور زیادتی مصارف کی وجہ سے پچھلے سال اٹھانا پڑا ہے۔ اور اپنی زبان سے کچھ نہ کہوں۔ مگر بعض احباب کا تغافل مجبور کرتا ہے۔ کہ میں آپ سے استدعا کروں کہ آپ اس خادم ادب کو کم از کم آئندہ تو مالی نقصانات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کریں۔

میں نے روپے۔ وقت اور ہمت کی قربانیاں کی ہیں۔ اور کرتا رہونگا۔ کہ ہزار داستان کے اجرا کا مقصد کوئی تجارتی مفاد نہیں بلکہ محض تقاضائے ذوق ہے۔ تاہم اگر یہ قربانیاں صرف میری ذاتی خدمات تک ہی محدود رہیں تو میرے لئے ایک گونہ اطمینان کا باعث ہوگا۔

میں ہر موقع سے فایدہ اٹھا کر ہزار داستان کو بہتر بنانے کے لئے ماہرین ادب سے مشورہ کرتا رہتا ہوں لیکن اگر اس رسالے کے معزز سرپرست بھی مجھے ایسی تجاویز سے آگاہ کرتے رہیں جو اس کو زیادہ مقبول اور مفید بنانے میں مدد دے سکیں۔ تو میں بخوشی تمام ان پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرونگا۔

جن ناظرین کرام کے پاس پچھلے سال کی تمام اشاعتوں کا فائیل موجود ہے وہ براہِ کرم اس مجموعہ کو ایک نظر دیکھ لیں۔ اور فیصلہ کریں کہ آیا واقعی ہزار داستان نے ادبیات ملک میں کوئی قابلقدر اضافہ بھی کیا ہے یا نہیں اور ادب لطیف کی سی عام طور پر مستقل صنف ادب کا پایہ بلند کرنے میں کوئی خدمت انجام دی ہے یا نہیں۔ اگر اس کا جواب اثبات میں ہو تو کیا آپ کا فرض نہیں کہ آپ ہر ممکن طریق سے اس کی بقا کے لئے کوشش کریں۔

موجودہ اشاعت میں جسقدر افسانے اور مضامین مندرج ہیں وہ میرے تعارف کے محتاج نہیں۔ ہاں تصویر کے متعلق صرف یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ یہ عہد مغلیہ کی صناعی کی ایک قیمتی یادگار ہے۔ اور میرے خاندانی ورثہ میں سے ایک عجوبہ شے۔ اس کے بلاک کی تیاری میں میں نے اصلی رنگ و روغن کو قائم رکھنے کی ممکن کوشش کی ہے۔ اور میری نظر میں نتیجہ اس کوشش کی کامیابی کی دلیل روشن ہے۔

ایڈیٹر

محبت کی بازی

وہ زرتار ریشم کے ایک نرم اور پُر تکلف بستر پر دو خوبصورت تکیوں کے سہارے بیٹھی تھی۔ اسکے اردگرد حسین اور نوعمر خواصوں کا جھرمٹ تھا جن میں سے ہر ایک اپنا فرض ادا کرنے کے لئے محض اسکی جنبش ابرو کا انتظار کر رہی تھی۔ پلنگ کے قریب چاندی کے ایک نازک فوارہ سے معطر پانی کی ایک مسلسل پھوار جاری تھی۔ ساون کی شام کی اودی گھٹائیں چھا رہی تھیں۔ اور آبی بخارات سے معمور ہوا باغ کی شاخوں کو ایک پیہم رقص میں لرزاں کر رہی تھی۔ اسکے ہاتھ میں بادہ خوشگوار سے لبریز ایک سونے کا کشمیری پیالہ تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب میں ریشمی اور کارچوب سراپردوں سے گذر کر اس کے حضور میں باریاب ہُوا۔ وہ ہچکچا کر اُٹھی۔ اور میری حیرت کو دیکھ کر مسکرائی پھر اسی طرح ریشمیں تکیوں کے سہارے لیٹ گئی۔ - - - ایک اندھا شاعر جو حسن کو نہ دیکھ سکنے کے باوجود عشق کی سوزشِ ناتمام سے آتش بجاں تھا۔ اپنے رباب کے تاروں کو ایک بے پھڑا اور مضطرب نغمے کی لے سے بیتاب کر رہا تھا۔ وہ میری آمد سے بے خبر تھا۔ اور ایک عجیب کیف سے مدہوش۔ وہ شعر کہتا تھا اور اپنے شعر کو موسیقی کی لرزش سے زندہ کرنا چاہتا تھا۔ اس کی آواز کرّہ ہوا میں گونج رہی تھی۔ اور اپنی عارضی یا مستقل اقامت کے لئے اعماق دل میں جگہ تلاش کر رہی تھی۔ - - - -

مَیں نے حیرت سے پُوچھا "کیا تم وہی ہو۔ جسے مَیں جانتا ہوں"؟ اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "وہی حسن کی ملکہ، تم اسی نام سے مجھے پکارا کرتے تھے۔ اب اپنے خواب کی تعبیر دیکھ کر تمہیں حیرت کیوں ہے"؟

مَیں نے بچپن کی سی حیرانی اور جہالت کی سی معصومیت سے جواب دیا۔ "مگر یہ سب کچھ کیسے ہُوا"؟

اندھے شاعر کی آواز اب زیادہ بلند ہو گئی۔ اور اس کے نغمہ نے میرے سوال کے جواب کو خاموشی میں تبدیل ہو جانے پر مجبور کیا۔

"کشمیر کی نازنین، بنفشہ اور سوسن کی زُلفیں
اس سے اپنے رنگین خم اُدھار مانگ کر سرمست نازنینیں
جوانی کی رات کی نیند لے کر اُٹھی . . . .

تن تن تنا تنا تن تنن تنن تنن

اس کی خواصوں نے کنول کے پتّوں پر شبنم کے

موتی اس کے حضور میں پیش کئے۔ اور کہا کہ نسیم سحر کشمیر کی شہزادی کے لئے تحفہ لائی ہے۔ اور چاہتی ہے کہ وہ ان موتیوں کو اپنے آنسوؤں سے آب دے دے، بالوں کو بکھیر کر اس آوارہ نسیم کو معطر کر دے . . .

تن تن تنا تنا تن تنن تن تن

وہ اپنے کاکل پیچاں کو اپنے بلوریں شانوں پر بکھیر کر بارہ دری کی طرف چلی۔ اس بارہ دری کی طرف جو ڈل کے عمیق اور وسیع آئینے میں اپنی صورت دیکھ دیکھ کر حیران ہوتی ہے تاکہ وہ اس غارتگر سے جو اسے ایک شطرنج کی بازی پر جیتنے کے لئے آیا تھا۔ دوچار ہو . . . .

تن تن تنا تنا تن تنن تن تن

دہلی کا شہزادہ آیا۔ وہ شہزادہ تھا۔ صورت سیرت میں شہزادہ۔ وہ شہزادوں کی طرح اپنی قسمت کو شطرنج کی ایک بازی پر لگانے آیا۔ قسمت ہنستی تھی، وہ روتا تھا کیونکہ اس کے دل پر عشق کے دیوتا کا کاری تیر لگ چکا تھا۔ وہ ہنستا تھا قسمت روتی تھی۔ کیونکہ اسکی آنکھیں کشمیر کی شہزادی کے حسن کو دیکھ چکی تھیں۔ دھلی کا شہزادہ آیا . . . . . .

تن تن تنا تنا تن تنن تن تن

پانی کی گہرائیوں سے گردن نکالنے والے کنولوں نے وہ شطرنج کی بازی دیکھی کنول کھلا کھلا کر ہنس پڑے شبنم کے نایاب موتی ایک ایک کر کے گر پڑے اور ڈل کے عمیق پانی میں گم ہو گئے۔ بارہ دری کی مرمریں جبین پر ایک غیر معلوم چین ظاہر ہوئی۔ آنکھیں اسے نہ دیکھ سکیں۔ اور وہ پھر اس مرمریں جسم کی شفاف گہرائی میں پنہاں ہو گئی۔ وہ شطرنج کی بازی کھیلے . . . .

تن تن تنا تنا تن تنن تن تن

کشمیر کی شہزادی جس نے سات شہزادوں کو اسی شطرنج کی بازی پر مات دی تھی۔ تقدیر کی بساط پر ہار گئی، وہ ہار گئی ہاں وہ ہار گئی۔ نقش و نگار کے مہروں نے اسے ہرا دیا۔ عشق کے روح سوز شعلوں کی آگ نے اسے جلا دیا۔ اور وہ شطرنج کی بازی ہار گئی۔ ہار گئی ہاں ہار گئی۔

تن تن تنا تنا تن تنن تن تن

جب اس کی شکست ہوئی اور دہلی کے شہزادے کی فتح جب اس کے یاسمن کے سے ہاتھ شطرنج کے مہروں کو نہ اٹھا سکے۔ تو وہ جیتی۔ جیتی ہاں وہ جیتی، تقدیر کی بساط پر جیتی۔ اور وہ فاتح شہزادہ جو نیزوں کی جھنکار اور تلواروں کی باڑ میں نہ ہارا تھا۔ ہارا۔ ہارا ہاں وہ ہارا۔ ان دونوں کے گیسو ملے۔ ساون کی بکھری ہوئی گھٹاؤں کی طرح۔ ان دونوں کے لب ملے۔ موتیا کے کھلے ہوئے پھولوں کی طرح سے ملے۔ خوشی کا ایک شور

ہوا۔ شادمانی کا ہنگامہ دہلی کا شاہزادہ کشمیر کی شاہزادی کو جیت کرلے چلا۔ شطرنج کی بساط سے یا تقدیر کی بساط سے ؟

کنول پانی کی گہرائیوں سے نکلے۔ اور جھانکنے لگے۔ جھانکنے لگے۔ ہاں جھانکنے لگے۔ دہلی کا شاہزادہ کشمیر کی شہزادی کو جیت کرلے چلا . . . .

تن تن تنا تنا تن تنن تن تن

اب اندھے شاعر کی آواز رباب کے تاروں کی جھنکار میں گم ہوگئی . . . .

وہ جواب تک ایک کیفیت مدہوشی میں تھی چلا اُٹھی۔ "میں نے بھی ایک بازی کھیلی، شطرنج کی بازی نہیں محبت کی بازی۔ تم نے پوچھا تھا یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ تو سنو یہ ایک لمبی داستان ہے۔ مگر میں تمہیں سناؤں گی۔ اس محبت کی بازی کا گیت میں تمہیں سناؤنگی" اور پھر وہ اپنی کوئل کی سی آواز کے مے فروش ساز پر اس محبت کی بازی کا گیت سنانے لگی۔ . . . .

ایڈیٹر

کیفیت

نگاہ آشنا ہے، اور میں ہوں
بلا کا سامنا ہے اور میں ہوں

تصور کا مزا ہے اور میں ہوں
خیالِ دلربا ہے اور میں ہوں

حیاے ناروا ہے اور میں ہوں
بیانِ مُدّعا ہے اور میں ہوں

نہ پوچھو کاہش ناکامیِ عشق
غمِ راحت فزا ہے اور میں ہوں

زباں پر ہے محبت کا فسانہ
یہی اِک ماجرا ہے اور میں ہوں

انہیں منظور ہے طرزِ تغافل
ستم کی التجا ہے اور میں ہوں

تماشائے وفا ہے اور وہ ہیں
تقاضائے جفا ہے اور میں ہوں

ستایا اس قدر عابدؔ بتوں نے
کہ اب یادِ خدا ہے اور میں ہوں

عابد

گورا

مصنفہ رابندرا ناتھ ٹیگور ------------ مترجمہ عبدالستار خاں

باب (۱) اوّل

بارش کا موسم تھا صبح کے وقت بادل چھنٹ گئے تھے مطلع بالکل صاف تھا۔ آفتاب کی طلاعی شعاعوں سے آسمان بقعہ نور ہو رہا تھا۔

کلکتہ میں بی نئے بھوشن اپنے بالاخانہ پر کھڑا ہوا اطمینان سے سڑک پر گذرنے والوں کا تماشہ دیکھ رہا تھا بی نئے کو فارغ التحصیل ہو کر کالج چھوڑے ہوئے تھوڑے ہی دن ہوئے تھے، لیکن اُس نے اپنی آیندہ زندگی کی راہِ عمل ابتک تجویز نہ کی تھی، ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کے چند مضامین اخباروں میں شائع ہو چکے، اور اُس نے کئی جلسوں کا اہتمام بھی کیا تھا۔ تاہم اُسے اطمینان حاصل نہ ہوا تھا۔ خصوصاً آج صبح کچھ کام نہ ہونے کی وجہ سے اُسے کچھ بے چینی سی تھی۔

سامنے ایک دوکان کے قریب ایک فقیر پھٹے پُرانے کپڑے پہنے ہوئے کھڑا تھا۔ اس فقیر کی ہیئت بالکل اُن بھکاریوں کی سی تھی جو سڑکوں پر گاکر بھیک مانگا کرتے ہیں فقیر کھڑا اپنی صدا لگا رہا تھا۔

فقیر کی صدا سُنکر بی نئے کو یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اُسے اوپر بُلاکر اُس کی صداؤں کو قلمبند کرلے لیکن شب کو سردی میں فقیر کے لئے کمل تلاش کرنے کا خیال اس کے اُوپر بُلانے میں مانع ہوا۔ بی نئے نے اپنا ارادہ فسخ کر دیا اور فقیر کی صدا قلمبند نہ ہوسکی۔ مگر اس صدا کا دھندلا سا نقش بی نئے کے دل پر باقی رہ گیا۔

اتنے میں سامنے ہی سڑک پر ایک حادثہ ہوگیا۔ دو بگھیاں آپس میں ٹکرا گئیں۔ اُن میں سے ایک بگھی کے گھوڑے بے قابو ہو گئے اور بدک کر بھاگے۔ بگھی الٹ گئی۔ بی نئے اپنے بالاخانہ سے اُتر کر جائے وقوع پر پہنچا۔ اُس نے ایک نوجوان لڑکی اور ایک سن رسیدہ شخص کو بگھی سے گرتے دیکھا۔ اور اُن کی مدد کو آگے بڑھا۔

اُس نے دیکھا کہ اس سن رسیدہ شخص کا چہرہ بالکل زرد پڑ گیا ہے۔ بی نئے نے آگے بڑھ کر پوچھا "کہیں آپ کو چوٹ تو نہیں آئی"۔ بوڑھے نے ہنسکر بات ٹالنے

کی غرض سے جواب دیا۔ "جی نہیں کچھ نہیں ہُوا" لیکن فوراً اُس کے چہرے سے تبسّم کے آثار زائل ہو گئے۔ اور اس پر بیہوشی طاری ہونے لگی۔ بی ننھے نے بڈھے کا بازو تھام لیا۔ اور لڑکی سے جو بہت متفکر تھی کہا "آپ کچھ تردد نہ کیجیے۔ آئیے میرا مکان یہی تو ہے"۔

ان دونوں نے بُوڑھے کو بستر پر لٹا دیا۔ لڑکی نے ایک برتن میں پانی لیکر بُوڑھے کے چہرہ پر چھڑکا اور پنکھا جھلنے لگی۔ اور بی ننھے سے کہا "کیا آپ مہربانی فرماکر کسی ڈاکٹر کو بُلوا سکتے ہیں"؟

ڈاکٹر قریب ہی رہتا تھا۔ بی ننھے نے اپنا نوکر اُسے بُلانے کو بھیجا۔

اُس کمرہ میں ایک آئینہ رکھا ہُوا تھا۔ بی ننھے لڑکی کے پیچھے کھڑا ہُوا آئینہ میں اُس کی شکل غور سے دیکھ رہا تھا۔

بی ننھے بچپن سے کلکتہ میں اپنی تعلیم کی غرض سے رہا کرتا تھا۔ اُسے اس زمانہ میں کبھی اپنے خاندان کے علاوہ کسی عورت کے دیکھنے کا اتّفاق نہ ہُوا تھا لیکن اس وقت اُس شکل نے جو آئینے میں منعکس تھی اُس کے دل پر عجیب اثرات مترتب کردیے اور اس کے حسیات میں ایک تلاطم برپا ہوگیا۔

بی ننھے کو اپنی تعلیمی مصروفیتوں کی وجہ سے اب تک صنف نازک کے حُسن و قبح اور ناز و انداز کی کرشمہ سازیوں پر رائے زنی کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔ تاہم اُس نوجوان بھولے بھالے چہرے نے جو محبّت آمیز تفکّر سے جُھکا ہُوا تھا بی ننھے کے سامنے دُنیائے حسن کا دروازہ کھول دیا۔

تھوڑی دیر میں بُوڑھے نے آنکھیں کھول دیں اور ایک گہری سانس لی۔ لڑکی نے جُھک کر نرم و دلسوز لہجہ میں پُوچھا۔ "ابّا جان! کہیں آپ کو چوٹ تو نہیں آئی ہے" بُوڑھے نے اُٹھنے کی کوشش کرتے ہُوئے پُوچھا "میں کہاں ہوں؟" بی ننھے نے سامنے آکر کہا "ڈاکٹر صاحب کے آنے تک آپ لیٹے ہی رہئے" یہ باتیں ختم بھی نہ ہونے پائی تھیں، کہ ڈاکٹر صاحب کے پیروں کی آہٹ معلوم ہُوئی اور وہ کمرے میں داخل ہُوئے۔ انہوں نے مریض کو دیکھا اور کہا "کوئی تشویش انگیز بات نہیں ہے۔ انہیں دُودھ اور برانڈی پلاؤ" یہ نسخہ تجویز کر کے ڈاکٹر صاحب چلے گئے۔

اُن کے چلے جانے کے بعد لڑکی کے والد کے بشرے سے کچھ تفکر کے آثار نمایاں ہونے لگے لیکن لڑکی نے یہ کہہ کر اُسے مطمئن کردیا۔ کہ میں مکان پہنچکر ڈاکٹر کی فیس اور دوا کی قیمت بھجوا دونگی۔

اب وہ بی ننھے سے مخاطب ہُوئی۔ غضب کی آنکھیں تھیں، صانع نے ان میں اخلاص اور محبّت کوٹ کوٹ کر بھردی تھی۔ تزلزل اور جھجک کے بجائے اُن سے

استقلال، استقامت اور اطمینان ٹپک رہا تھا۔ گویا وہ قوت ارادی اور محبت کا مخزن تھیں۔

بنئے ان آنکھوں کے مقابل ہوتے ہی کچھ ایسا محو حیرت ہوا کہ اس کا اندازہ ہی نہ کر سکا۔ کہ آیا وہ آنکھیں سیاہ تھیں یا کنجی، یا وہ ذرا ذرا سی اندر گھسی ہوئی تھیں، یا بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں تھیں۔

بنئے نے رکتی ہوئی زبان سے کہا۔ "ڈاکٹر کی فیس ۔۔۔۔ آپ تکلیف نہ کیجئے ۔۔۔ نہیں ۔۔۔۔ میں ۔۔۔۔" لیکن لڑکی کی آنکھوں نے جو اُسکے مقابل تھیں۔ اُسے کچھ ایسا مسحور اور محو حیرت کیا۔ کہ وہ صرف اپنا جملہ ہی پورا کرنے سے قاصر نہ رہا بلکہ ڈاکٹر کی فیس لینا بھی اُس نے منظور کر لیا۔

بُوڑھے نے برانڈی منگانے سے روکا۔ لڑکی نے اصرار سے کہا۔ "ابّا جان! یہ نسخہ تو ڈاکٹر صاحب کا تجویز کیا ہوا ہے۔" بُوڑھے نے جواب دیا۔ "ڈاکٹروں کی یہ عادت ہوگئی ہے۔ کہ ذرا سا بھی کہیں کچھ ہوا اور انہوں نے نسخہ میں برانڈی تجویز کر دی۔ میرا ضعف تو صرف دودھ سے رفع ہو جائیگا۔"

دودھ پینے کے بعد بُوڑھے نے بنئے سے رخصت ہونے کے لئے اجازت چاہی اور کہا۔ "ہم لوگوں کی وجہ سے آپ کو بہت تکلیف ہوئی۔ آپ معاف فرمائیے گا۔"

لڑکی نے تانگہ منگوانے کے لئے بنئے سے التجا کی لیکن بوڑھے نے اپنی لڑکی سے ذرا سخت لہجہ میں کہا۔ "نہیں بار بار کیوں اتنی تکلیف دیتی ہو۔ اپنا مکان بالکل قریب ہے میں وہاں تک آسانی سے چل سکتا ہوں۔" لیکن لڑکی نے نہ مانا اور بنئے خود تانگہ لینے چلا گیا۔

چلتے وقت بوڑھے نے اپنے میزبان کا نام دریافت کیا۔ بنئے نے کہا۔ "مجھے بنئے بھوشن چیٹرجی کہتے ہیں۔" بوڑھے نے اپنا نام پریش چندر بھٹاچاریہ بتلایا۔ اور کہا۔ "میرا مکان اسی سڑک پر نمبر ۹ میں ہے۔ اگر اپنے فرصت کے وقت آپ تشریف لائیں تو ہمیں بہت خوشی ہوگی۔" لڑکی کی نگاہ خاموش نے بھی دعوت دی۔ بنئے اُسی وقت اُن کے ہمراہ جانا چاہتا تھا۔ لیکن اُسے یہ خیال پیدا ہوا۔ کہ کہیں ہمراہ چلنا بداخلاقی نہ سمجھا جائے چنانچہ وہ اسی خیال میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

گاڑی کے روانہ ہوتے وقت لڑکی نے سر کے اشارہ سے بنئے کو سلام کیا۔ جو بالکل ایک غیر متوقع بات تھی اور جس کا بنئے کو سان گمان بھی نہ تھا۔ اسی لئے بنئے اس عجلت میں جواب نہ دے سکا۔

ان کے رخصت ہونے کے بعد بنئے اپنے کمرے میں واپس آیا اور اُسے اپنی اس فروگذاشت پر ایک ندامت سی ہوئی۔ وہ اپنے دل ہی دل میں بیٹھا ہوا اپنے تمام افعال و

حرکات پر جو اس سے اُن لوگوں کے سامنے سرزد ہوئی تھیں۔ ایک تنقیدی نظر ڈالتا رہا۔ یہانتک کہ وہ اِس نتیجہ پر پہنچا کہ میرا برتاؤ ان لوگوں سے وحشیانہ رہا۔ وہ اسی فکر میں بتلا تھا کہ مجھے کس موقع پر کونسی بات کہنی مناسب تھی اور کونسی غیر مناسب کہ احیاناً اُس کی نظر اس رسال پر پڑی۔ جو لڑکی کے ہاتھ میں تھا۔ اور جسے وہ چلتے وقت پلنگ پر بھول گئی تھی۔ اس نے اس کو دوڑ کر اُٹھا لیا اور اُسکے کانوں میں صبح والے فقیر کی صدا کی آواز بازگشت گونجنے لگی۔

گھنٹوں پر گھنٹے گذر گئے۔ دھوپ میں تیزی آگئی۔ دفتروں کی طرف گاڑیوں کا تانتا بندھ گیا۔ لیکن اس دن بی نئے کی طبیعت کسی کام میں نہ لگی۔ اور وہ ایک عجیب اودھیڑبن میں لگا رہا۔

ماہ جولائی کے آفتاب کی تیز ضیا نے بی نئے پر عکس فگن ہو کر شیراتن کے جال کے ذریعہ اُس کے دل و دماغ پر ایسے اثرات قائم کر دئے۔ جس سے اس کے ہر روز کے معمولی کارنامے اُسے ایک دلفریب اور مسلسل شکل میں دکھلائی دینے لگے۔ اور اُس کا کمرہ مع اس بدنما حصہ شہر کے جہاں کہ وہ رہتا تھا۔ عالم خیال میں ایک مافوق العادات مظاہر کا مسکن و ملجا معلوم ہونے لگا۔

وہ انہی خیالات میں غلطاں و پیچاں تھا کہ اس کی نظر ایک ۸۔ ۹ سال کے لڑکے پر پڑی۔ جو باہر دروازہ پر کھڑا ہوا مکان کا نمبر دیکھ رہا تھا۔ بی نئے کو خدا جانے کیسے یقین ہو گیا۔ کہ لڑکا اسی کا مکان تلاش کر رہا ہے۔ وہیں سے اُس نے آواز دی کہ مکان یہی ہے۔ اور خود بھی دوڑ کر نیچے آیا۔ اور لڑکے کو اپنے ہمراہ اندر لیتا آیا۔ اس نے لڑکے کے چہرے کو اسی وقت غور سے دیکھ لیا۔ جبکہ وہ اُسے خط دے رہا تھا۔ لڑکے نے بی نئے کو ایک لفافہ دیا۔ جس پر انگریزی میں اُس کا نام و پتہ نسوانی خط میں لکھا ہوا تھا۔ اور کہا۔ "لیجئے میری بہن نے مجھے یہ دیکر بھیجا ہے۔" لفافہ میں بجز چند نوٹوں کے کوئی خط نہ تھا۔

لڑکے نے خط دیکر واپس ہونا چاہا۔ لیکن بی نئے نے اُس سے اُوپر چلنے کے لئے اصرار کیا۔ یہ لڑکا اپنی ہمشیرہ سے کچھ کالا ضرور تھا۔ لیکن دونوں بہن بھائی میں بہت زیادہ مشابہت تھی۔ اور بی نئے کو اس سے قدرتاً دلی کشش پیدا ہو گئی۔ یہ لڑکا تھا بھی بڑا بے تکلف کمرے میں آتے ہی اُس نے ایک تصویر کی طرف اشارہ کر کے پوچھا "یہ کس کی تصویر ہے؟"

بی نئے "یہ میرے ایک دوست کی تصویر ہے"

لڑکا "کیا یہ آپ کے دوست کی تصویر ہے یہ ہیں کون؟"

بی نئے نے ہنسکر کہا "آپ اُن کو نہ پہچان سکینگے۔ اُن کا نام گورموہن ہے لیکن میں اُنہیں گورا کہتا ہوں۔ ہم دونوں بچپن میں ساتھ پڑھتے تھے۔"

لڑکا۔ کیا آپ اب بھی اسکول جایا کرتے ہیں۔

بی نتے۔ "جی نہیں ابتّیں اب اسکول نہیں جاتا۔ میں اپنی تعلیم ختم کر چکا ہوں۔"

لڑکا (تحسین آمیز حیرت سے) "واقعی آپ اپنی تعلیم ختم کر چکے ہیں!"

لڑکے کی دلکش تحسین سے متاثر ہو کر اُسے ایک مسرت ہُوئی۔ جسے وہ نہ چھپا سکا۔ اور کہا "جی ہاں مَیں اپنی تعلیم مکمل کر چکا ہوں۔"

لڑکا آنکھیں پھاڑ کر بی نتے کو دیکھنے لگا۔ اور گہری سانس لی۔ یقیناً وہ یہ سوچتا ہوگا۔ کہ مَیں بھی ایک دن ایسا ہی قابل ہو جاؤنگا۔

بی نتے۔ "آپ کا اسم مبارک؟"

لڑکا۔ "مجھے ستیش چندر مکرجی کہتے ہیں۔"

بی نتے۔ تعجب سے "مکرجی"

تھوڑی دیر میں دونوں میں بے تکلفی ہوگئی اور بی نتے کو معلوم ہوگیا۔ کہ پریش بابو ان کے والد نہیں ہیں بلکہ اُنہوں نے ان کو بچپن سے پالا ہے۔ لڑکے کی بہن کا اصلی نام رادھا رانی تھا۔ کہ پریش بابو کی بیوی نے بدلکر سوچیترا رکھا ہے۔"

اب ستیش نے رخصت ہونا چاہا تو بی نتے نے پوچھا "کیا آپ اکیلے چلے جائینگے؟"

ستیش کو کسی قدر بُرا معلوم ہُوا اور کہا۔ "جی ہاں مَیں ہمیشہ اکیلا جایا کرتا ہوں۔"

بی نتے۔ "اگر آپ ذرا ٹھیر جائیں تو مَیں آپ کو مکان تک پہنچا دوں۔"

ستیش نے غالباً اُس جملہ سے یہ سمجھا۔ کہ مجھے کم ہمّت سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے کہا۔ "آپ میرے ساتھ کیوں چلتے ہیں۔ مَیں آسانی سے تنہا چلا جاؤں گا۔ ہمیشہ مَیں تنہا جایا کرتا ہوں۔ یہ ایک معمولی بات ہے۔"

بی نتے کا بار بار اس کے ساتھ چلنے پر اصرار کرنے سے کیا مقصد تھا۔ اس کا سمجھنا لڑکے کی فہم سے بالاتر تھا۔ چلتے وقت ستیش نے پوچھا۔ "کیا آپ بھی چلتے ہیں؟" لیکن بی نتے نے عمداً یہ کہکر انکار کر دیا۔ "ابھی تو نہیں پھر کسی وقت حاضر ہونگا۔"

بی نتے اپنے کمرے میں واپس آیا اور لفافہ کو اٹھا کر بار بار نہایت غور سے اُس کا پتہ پڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ ہر حرف کی کشش اُس کے ذہن نشین ہوگئی۔ تب اُس نے لفافہ کو اس حفاظت سے صندوق میں رکھ دیا کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ سخت احتیاج کے وقت بھی وہ روپیہ صرف نہ کیا جائیگا۔

(باقی آئندہ)

غم نصیب

(گذشتہ سے پیوستہ)

۱۵- اگست

محبت رُوح کا اک جزوِ لاینفک ہے۔ وہ کون انسان ہے جس کا دل اس عالمگیر جذبے سے خالی ہو؟ میں دیکھتا ہوں کہ میرا جذبِ اُلفت آخر رنگ لایا ہے۔ اور چارلوٹی کے دل پر اثر کرتے رہا ہے۔ اب وہ مجھے کھو کر اپنی فضائے زندگی میں ضرور ایک خلا محسوس کریگی۔ اور تو اور اُس کے چھوٹے چھوٹے بھائی بہن بھی مجھ سے اس قدر گھل مل گئے ہیں کہ میں دو ایک دن اُنسے ملنے نہ جاؤں۔ تو وہ ضرور اداس ہو جاتے ہیں۔ آج سہ پہر کے وقت میں چارلوٹی کے ہاں گیا۔ ارادہ تھا۔ کہ اُس کے پیانو سے رفع الوقتی کرونگا۔ مگر وہ شریر کہاں دم لینے دیتے تھے۔ میرے سر ہو گئے کہ "صاحب! آج کوئی کہانی سنائیے" طرفہ تر یہ کہ اُنھوں نے چارلوٹی کو بھی اپنے مطالبات میں شریک کر لیا۔ آخر میں نے ہار مان لی۔ اور آمادہ ہو گیا میں نے اُن کے سامنے جاتے ہی۔ اور اُنہیں ایک ملکہ اور اُسکے ٹھنگنے پیش خدمتوں کی من گھڑت کہانی سنائی۔ یہ میری تمام کہانیوں میں کی بہترین کہانی ہے۔ وہ اسے سن کر بہت محظوظ ہوتے اور اب وہ مجھے پہلے سے بھی زیادہ چاہتے ہیں۔

کہانیوں کا سننا سنانا میرے نزدیک بڑے کام کی بات ہے۔ میں اس سے بہت فائدہ اُٹھاتا ہوں اور اپنے تخیل کو حیرت انگیز کامیابی سے فروغ دے رہا ہوں۔ اگر میں کوئی طبعزاد کہانی اُنہیں سناتا ہوں اور کسی دوسرے موقعہ پر بھولے سے اُس کے کچھ جزئیات بدل دیتا ہوں۔ تو ان کا حافظہ کچھ ایسا بلا کا ہے۔ کہ مجھے وہیں ٹوک دیتے ہیں۔ اس لئے اب میں احتیاط برتتا ہوں۔ کہ کوئی بات مکرر بیان کروں تو وہ بال برابر بھی بدلنے نہ پائے۔ وہی واقعات ہوں وہی اندازِ بیان وہی کل وہی جزو تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے سامعین مجھ پر دروغگوئی کا الزام دھر دیں اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ایک مصنف ترمیم و تبدیل سے اپنی تصانیف کی قدر بادی النظر میں کتنی گھٹا دیتا ہے اگرچہ فی الحقیقت فن کے زاویۂ نگاہ سے نقشِ ثانی نقشِ اول کے کتنے ہی عیب دھو دے۔ ہماری فطرت کا خاصہ ہے کہ پہلی نظر میں جو اثر ہم پر مترتب ہو جاتا ہے۔ وہ نقش کالحجر سے زیادہ

پایدار ہوتا ہے۔ اور اثرات مابعد کا اس کے سامنے رنگ نہیں جم سکتا۔ ہم جیسی سریع الاعتقادی کے باعث عجیب عجیب خلافِ قیاس اور دور از کار باتوں پر یقین کر لیتے ہیں۔ اور جب وہ باتیں جزوِ ایمان ہو جاتی ہیں، تو اُن کا دور ہونا معلوم!

۱۔ الست

کیا ہمیشہ یوں ہی ہوتا رہیگا۔ کہ ہماری خوشیوں کا سرچشمہ ہی ہمارے حق میں سیلِ بلا ہو جائے؟ وہ وجدانی جذبہ جس نے مجھے حُسنِ فطرت کی بہار پیرائیوں سے وابستہ کر کے میرے سامنے جنّت کے در کھول دیتے تھے، اب میری جان کا عذاب ہو گیا ہے۔ یادش بخیر! ایک وقت تھا جب مَیں فطرت کے ہمیشہ بہار باغ سے پھول چُن چُن کر باغ باغ ہوتا تھا۔ مَیں ان چٹانوں پر سے دریا پار کی ان سربفلک پہاڑیوں کو دیکھتا، اپنے سامنے کی اُن گل بکف وادیوں کو دیکھتا، اور مسرور ہوتا مَیں دیکھتا کہ جدھر نظر اُٹھ جاتی ہے، فطرت کا جوبن اُبھار پر ہے! اور اس کا شباب پھوٹا پڑتا ہے۔ وہ اونچی اونچی پہاڑیاں جو سر سے پاؤں تک ہریاول کے زیور سے لدی پھندی نوعروس بنی کھڑی ہوتیں! وہ سرسبز و شاداب وادیاں، اُن کی بیچ در بیچ پگڈنڈیاں، درختوں کے وہ پُر بہار جُھنڈ، وہ نرم رو ندی، جو ایک نقرئی سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی، نیچے سُروں میں گنگناتی ہوئی، سرسرانے والی گھاس کے پاؤں پر لوٹتی ہوئی بہتی تھی! وہ پانی کے آئینہ میں پرتو ڈالنے والے بکھرے بکھرے بادل جنہیں شام کی سُبک خرام ہوائیں فضائے بسیط میں اُڑائے لئے پھرتیں! کیا دلفروز منظر تھے! کنارِ راہ کے وہ گنجان درخت جنہیں پرندوں کے خوشگوار چہچہے ایک بزمِ سرود بنائے رکھتے تھے۔ کیڑوں مکوڑوں کا وہ ٹڈی دل جو آفتاب کی آخری زرنگار شعاعوں میں ناچ ناچ کر جنگل کو راجہ اندر کا اکھاڑا بنا دیتا تھا۔ اور رات کے وہ اَن تھک گویئے جو شام کے جھٹپٹے وقت میں، ڈوبتے ہوئے سورج کے ساتھ اپنے مخملی بچھونوں سے اُٹھ کر اپنی راگنیاں چھیڑ دیتے تھے اور سارے جنگل کو سر پر اُٹھا لیتے تھے۔ مَیں یہ سب دیکھتا اور میری خوشی کی کوئی حد نہ رہتی۔ پھر میری نظر زمین پر جا پڑتی تو مَیں سوچتا کہ خلقت کا ان داتا کس طرح اس سوکھی ہوئی کائی کو اس خُشک اور سنگلاخ چٹان میں سے روزی دیتا ہے۔ اور خود رو پودے کس طرح اس بنجر ریت پر پھلتے پھولتے ہیں۔ ان سب چیزوں میں مجھے وہ گرمیِ حیات ہنگامہ آرا نظر آتی تھی۔ جو فطرت کے تمام پیکر میں رُوح بنکر جاری و ساری ہے

اور حسن سے میرا بھی دل لبریز تھا۔ اس سرشار فراوانی میں مجھے خود صانع مطلق کا جلوہ نظر آتا تھا۔ اور اُسے دیکھ کر ایک بے نہایت کائنات کا نقشہ میری آنکھوں پر کھنچ جاتا تھا! میں دیکھتا کہ دیو پیکر پہاڑ چاروں طرف سے مجھے گھیرے کھڑے ہیں۔ اتھاہ گہرائیاں میرے پاؤں تلے مُنہ پھاڑے ہُوئے ہیں۔ آبشار زور و شور سے گر رہے ہیں۔ طوفانی دریا ایک خارا شگاف روانی سے میدان میں بہے چلے جاتے ہیں۔ اور دُور و نزدیک کے پہاڑ اُن کی گرج سے گونج رہے ہیں۔ زمین کے اعماق میں میں بیشمار طاقتوں کو بر روئے کار دیکھتا' اور روئے زمین کے چپّے چپّے پر جہاں جہاں بھی آسمان کا سائبان سر پر تنتا ہے۔ مجھے انواع و اقسام کے جاندار چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ اردگرد کی تمام چیزیں رنگ برنگ کی صورتوں میں رونما ہیں۔ اور ایک بے ابتدا و انتہا وسعت کو آباد کئے ہوتے ہیں۔ ایک انسان ہے کہ حفاظت کیلئے اپنے آپ کو اپنے مکان کی محدود چار دیواری میں بند رکھتا ہے اور اس کال کوٹھری میں بیٹھ کر اپنے زعم میں ہفت اقلیم پر حکومت کرتا ہے۔ اس کے کم سواد تصوّر میں ہر چیز ہیچ و پوچ ہے۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ دور دست پہاڑوں کی بلندیوں سے سمندر کے دُور افتادہ ساحل تک' اور صحرا کی لامحدود وسعتوں پر جنہیں کبھی کسی فانی کے قدم نے پامال نہیں کیا۔ خالق ازلی کی رُوح نگراں ہے۔ اور ہر ذرہ چھوٹے سے چھوٹا ذرّہ جسے اس نے پیدا کیا ہے۔ اس کی نگاہوں کے مس سے کسب نور کرتا ہے۔

ایسے وقت میں کتنی مرتبہ کسی پرندے کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ نے جو ہوا میں آزادانہ اُڑان بھرتا تھا میرے سر پر سے گذرا چلا جاتا تھا میرے دل میں یہ خواہش پیدا کر دی ہے کہ کاش میں ناپیدا کنار سمندر کے ساحل پر بیٹھا ہوتا۔ اور قدرت کے اس چھلکتے ہوئے جام سے دل کی لگی بجھا کر زندگی کی تمام عشرتیں حاصل کرتا۔ کاش میں اپنی تنگ ظرفی کے باوجود' خدا کی رحمت کے دریا سے جو کہ ہر چیز کا سرچشمہ وجود ہے' کوثر آشام ہو کر اپنی اس مصنوعی ہستی کے تمام افکار بھول جاتا۔

میرے دوست ان گئے گذرے لمحوں کی یاد ہی اب تک میرے لئے مایۂ تسلّی ہے۔ اِن ناقابل اظہار حسیات کو یاد کرنے اور معرض بیان میں لانے کی کوشش ہی میری رُوح کو آپے سے بلند کر دیتی ہے۔ مگر آہ وہ جہاں مجھے تسلّیاں دیتی ہے وہاں میری موجودہ مصیبت کی شدّت کو بھی دوبالا کر دیتی ہے۔

یوں سمجھ لو کہ گویا میری آنکھوں پر سے ایک پردہ ہٹ گیا ہے۔ اور حیات جاودانی کے خواب دیکھنے کی بجائے اب میں ایک ڈراؤنی اور بھیانک قبر کو اپنے سامنے مُنہ

پھاڑ سے دیکھتا ہوں۔ کیا ہم کسی چیز کے متعلق بھی کہہ سکتے ہیں۔ کہ یہ اس وقت بھی موجود ہوگی۔ جب تمام باقی چیزیں فنا ہو جائینگی۔ جب وقت ایک تند و تیز طوفان کی سرعت رفتار کے ساتھ ہر چیز کو بہائے لئے جائیگا۔ اور ہماری فانی ہستی طوفان کے نہ تھمنے والے ریلے کے ساتھ بہ کر یا موجوں کے مُنہ میں چلی جائیگی۔ یا چٹانوں سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیگی۔ کوئی لمحہ ایسا نہیں گذرتا جو ہماری اور ہمارے گرد و پیش کی تمام چیزوں کی عمر نہیں گھٹا دیتا۔ کوئی دقیقہ ایسا نہیں جاتا جس میں ہم کسی متنفس کی جان نہ لیتے ہوئے ہم چلتے ہیں۔ اور ہزاروں بے قصور حشرات الارض ہمارے پاؤں تلے کچلے جاتے ہیں۔ آہ کوئی قدم جفاکش چیونٹی کے لئے پیام موت بن جاتا ہے۔ اور ایک ننھی سی دُنیا کے نظام کو درہم و برہم کر دیتا ہے۔ اور کوئی قدم کسی بیکس خاک نشین کے نشیمن پر برق بلا بن کر گرتا ہے دُنیا کی وہ بڑی بڑی مصیبتیں جو کبھی کبھی بیشمار جانوں کو تلف کر دیتی ہیں۔ وہ سیلاب جو گاؤں کے گاؤں تہس نہس کر دیتے ہیں، وہ زلزلے جو شہر کے شہر نگل جاتے ہیں، مجھ پر اتنا اثر نہیں کرتے۔ جتنا یہ روزمرّہ کی نادانستہ تباہ کاریاں۔ میں ہلاک و فنا کی اُس ہمہ گیر طاقت کو دیکھ کر جو موجودات کے ذرّے ذرّے میں پنہاں ہے۔ دل ہی دل میں کڑھتا ہوں۔ فطرت نے کوئی چیز ایسی نہیں بنائی جو اپنے آپ کو اور اپنے آس پاس کی تمام چیزوں کو غارت نہیں کر دیتی۔ اور اس طرح زمین و آسمان کے کال اعکر اور دستبرد زمانہ کے نرغہ میں گرفتار ہیں اپنی راہ پہ ایک پُر درد دل لئے ہوئے چلا جاتا ہوں اور دُنیا میری نگاہوں میں ایک خوفناک راکشس ہے جو خود اپنے جگر کے ٹکڑوں کو ہڑپ کر جاتا ہے۔

۲۱۔ اگست

صبح کے وقت جب میں رات بھر بے چینی سے کروٹیں بدلنے کے بعد بستر سے اُٹھتا ہوں تو میں اپنا آغوش اس کے لئے وا کر دیتا ہوں۔ مگر آہ میرا آغوش کھُلے کا کھُلا رہ جاتا ہے۔ رات کو میٹھے میٹھے خواب مجھے دھوکہ دیتے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ ایک لہلہاتا ہوا سبزہ زار ہے۔ ہم دونوں قریب قریب کھڑے ہیں میں اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہوں اور اس پر بوسوں کا تار باندھ دیتا ہوں۔ مگر آہ آنکھ کھُل جاتی ہے۔ اور آرزوؤں کا خواب پریشان ہو جاتا ہے۔ اس نیم غشی کے عالم میں اپنے خوابوں کی یہ حسرتناک تعبیر دیکھ کر آنسو میری آنکھوں سے بے اختیار رواں ہو جاتے ہیں اور میں اپنے آئندہ آلام کے خیال سے زار و قطار روتا ہوں۔"

۲۴-اگست

ولیم، میری بدبختی کی بھی کوئی حد ہے؟ اس سے بڑھ کر بدقسمتی اور کیا ہوگی کہ میرے تمام قوائے عمل ایک زنگ آلودہ قناعت کی نذر ہو گئے ہیں۔ مجھ سے بیکار بھی نہیں رہا جاتا۔ اور مجھ سے کوئی کام بھی نہیں بن پڑتا۔ عجب مخمصے میں ہوں۔ حد تو یہ ہے۔ کہ مجھ سے سوچا بھی نہیں جاتا کہ کوئی راہ نجات ڈھونڈھ نکالوں وہ دل نہیں رہا۔ وہ بات نہیں رہی۔ اب فطرت کی دلفریبیاں مجھے کاٹنے دوڑتی ہیں، اور کتابیں مجھے بالکل نہیں بھاتیں۔ کتنی مرتبہ میں خواہش کرتا ہوں۔ کہ کاش میں ایک غریب مزدور ہوتا۔ کہ صبح سویرے جب میں اُٹھتا، تو مجھے ایک ہی فکر، ایک ہی دُھن، اور ایک ہی امید ہوتی، کہ دو پیسے کما کر پیٹ پال لونگا. اور اور کسی طرح کے افکار میرے لئے وبالِ جان نہوتے۔ مجھے اکثر البرٹ پر رشک آتا ہے۔ جب میں اُسے کاغذات کے پشتوں میں گھرا ہُوا اور اپنے حساب کتاب کی اُدھیڑ بن میں مصروف دیکھتا ہوں، اور سوچتا ہوں کہ میں اُس کی جگہ پر ہوتا تو کیسا خوش رہتا۔ اس تکلیف دہ احساس سے تنگ آکر میں نے بارہا ارادہ کیا ہے کہ وزیر صاحب کی خدمت میں سفیر کی ملازمت کے لئے درخواست لکھ بھیجوں، جس کے حصول کے متعلق تمہارا ہمّت افزا اصرار مجھے بہت کچھ اُمیدیں دلاتا ہے۔ وزیر صاحب میرے دیرینہ کرمفرما ہیں۔ اور کئی مرتبہ مجھے ملازمت کی ترغیب دے چکے ہیں۔ اگر میں پکّا ارادہ کر لوں تو صرف درخواست لکھنے کی دیر ہے نوکری کا ملنا کچھ مشکل نہیں۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر رک جاتا ہوں۔ مجھے رہ رہ کر گھوڑے کی تمثیل یاد آتی ہے۔ کُھلے بندوں پھر پھر کر اُس کی طبیعت جو اُکتائی تو اُس نے انسان کو اپنے اُوپر زین کسنے کی اجازت دیدی۔ جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ بیچارے کی جان پہ بن گئی۔ کچھ نہیں سُوجھتا کہ کیا کروں۔ کیا نہ کروں۔ میں جانتا ہوں کہ تبدیلِ احوال کی یہ خواہش رُوح کی اُس دائمی بے قراری کا نتیجہ ہے، جو کسی جگہ اور کسی حالت میں مجھے دم نہ لینے دیگی۔ اس لئے خاموش ہوں اور کچھ نہیں کرتا۔

۲۸-اگست

اگر میرے دُکھ درد کا کوئی علاج دُنیا میں ہے تو وہ اسی جگہ ہے۔ کُوئے جاناں کی خاک ہی میرے لئے اکسیر ہے اور کسی جگہ کا آب و دانہ مجھے موافق نہ آئے گا۔ پھر یہ ذرّہ نوازیاں جو یہاں میرے شاملِ حال ہیں۔ اور کہیں مجھے کاہے کو نصیب ہوں گی! آج میری

سالگرہ کا دن ہے۔ اور صبح ہوتے ہی مجھے البرٹ کا بھیجا ہوا ایک پیکٹ ملا۔ اُسے کھولا۔ تو اُس میں سے ایک گلابی رنگ کا ریشمی فیتہ برآمد ہوا۔ یہ وہ فیتہ ہے، جسے اوّل اوّل جب مَیں نے چارلوٹی سے ملاقات کی ہے۔ اُس کے لباس میں دیکھا تھا۔ اور جس کے لئے مَیں نے بارہا اُس سے التجائیں کی تھیں۔ اُس کے ساتھ کُلّیاتِ ہومر مرتبہ وٹسٹن کی دو جلدیں بھی تھیں۔ یہ کتاب چھوٹی تقطیع کی ہے۔ اور مَیں مدّت سے اس کی ضرورت محسوس کرتا تھا۔ کیونکہ ارنسٹ والے بڑے نسخے سے مجھے سیر و سفر کے موقعوں پر بہت تکلیف ہوتی تھی۔ تم نے دیکھا کہ البرٹ اور چارلوٹی میرے رجحاناتِ طبعی کی نبض کس خوبی سے پہچانتے ہیں۔ اور دوستانہ اُلفت کی اُن دلنوازیوں میں کیسا کمال رکھتے ہیں، جنہیں مَیں دریانوال امیروں کے گرانبہا عطیوں پر لاکھ لاکھ ترجیح دیتا ہوں۔ بھلا حکومت کو محبّت سے کیا نسبت؟

مَیں نے اُس فیتہ کو بار بار چُوما، اور آنکھوں سے لگایا۔ اُسے دیکھ کر میرے دل میں ان ایامِ ماضیہ کی یاد تازہ ہوگئی۔ جبکہ مَیں نے خود فراموشی کے چند لمحے بسر کئے اور ہوش آنے پر ایک ناخوشگوار خفیفت سے دوچار ہوگیا۔ ولیم، ہم سب کی قسمت میں یونہی لکھا ہے۔ مجھے کسی سے شکوہ شکایت نہیں۔ زندگی کی بہار دو روزہ بہار ہے۔ اُس سے بقا کی توقع ہی کیا؟ کتنی کلیاں بن کھلے مُرجھا گئیں، اور اپنی بقا کا نشان تک نہ چھوڑا۔ کتنے پھُول شگفتہ ہوئے۔ مگر پھل نہ بننے پاتے تھے کہ کمھلا کر رہ گئے۔ اور وہ پھل جو قضارا فنا کے ہاتھوں سے بچ نکلے۔ اُن میں سے بھی کتنوں کو پنپنا نصیب ہوا؟ تاہم اس تباہی و بربادی کے باوجود، زندگی کے گلزار میں پھُول کھلتے رہتے ہیں۔ اور، اے میرے دوست، کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ ہم اُن گنتی کے چند پھلوں کو جنہیں اس کشمکش کے بعد کہیں جاکر پکنا ملتا ہے۔ غنیمت نہ سمجھیں۔ اور اُن سے جی بھر کر لطف اُٹھائے بغیر انہیں گل سڑ جانے دیں؟ اچھا خُدا حافظ! اب کے بہار نرالی آن بان سے آئی ہے۔ چارلوٹی کے باغیچے میں درخت میووں سے لد گئے ہیں۔ مَیں اکثر ناشپاتی کے پیڑ پر چڑھ جاتا ہوں۔ اور شاخوں کو ہلا کر ناشپاتیاں گراتا ہوں۔ چارلوٹی نیچے کھڑی رہتی ہے، اور گرتی ہُوئی ناشپاتیوں کو جمع کرتی جاتی ہے۔

۳۰۔ اگست

مَیں بدبخت کیوں اپنی تباہی پر تُلا ہُوا ہوں؟ اس سودائے خام کا خدا جانے کیا انجام ہوگا؟ میری یہ وارفتگی نہیں معلوم مجھے کیا دکھائیگی؟ مجھے اُس کے سوا

کسی چیز کی سُدھ بُدھ نہیں رہی۔ وہی میری قبلۂ حاجات ہے۔ وہی میری دین و دُنیا۔ قرب ہو کہ بُعد، ہر حالت میں وہ میرے سامنے ہے۔ مَیں اُس کے خوابناک تصوّر میں گھنٹوں سرمست رہتا ہوں۔ تاآنکہ طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔ اور مَیں اُس سے جُدا ہو جانے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ آہ! ولیم اس دل کے ہاتھوں مجھ پر کیا کچھ نہیں گذرتا! اکثر اوقات جب کئی ساعتیں مجھے اُس کے پاس بیٹھے گذر جاتی ہیں۔ اور مَیں اس کی کامنی سی مورت، اُس کے پیارے پیارے چہرے، اُس کے ملکوتی خیالات اور اس کے پاکیزہ طرزِ تکلم میں ہمہ تن محو ہو جاتا ہوں۔ تو میرے دل کا اضطراب بڑھتے بڑھتے انتہائی درجہ پر پہنچ جاتا ہے۔ میری آنکھیں دُھندلا جاتی ہیں۔ میرے کانوں میں سائیں سائیں سی ہونے لگتی ہے۔ میری سانس رُک رُک کر چلنے لگتی ہے گویا کسی قاتل کا ہاتھ میرا گلا گھونٹ رہا ہے۔ اور میرا دل دھڑک دھڑک کر میرے دُکھتے ہوئے حواس کو آرام دینا چاہتا ہے۔ بعض اوقات مجھے اپنی ہستی پر شک سا ہونے لگتا ہے۔ مَیں حیران ہوتا ہوں کہ مَیں درحقیقت زندہ ہوں یا خواب میں جاگ رہا ہوں۔ اگر ایسے اوقات میں چارلوٹی میرے ساتھ ہمدردی نہ کرے۔ اور مجھے اس کی اجازت نہ دے کہ مَیں اُس کے ہاتھوں کو اپنے آنسوؤں سے تر کر کے ایک قسم کی افسردہ سی تسکین حاصل کر لوں، تو مَیں وحشت زدہ ہو کر اُس کے حضور سے بھاگ نکلنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ اور جدھر کو منہ اُٹھ جاتا ہے چل دیتا ہوں یا گاؤں گاؤں کی خاک چھانتا پھرتا ہوں۔ یا کسی اُونچے کرارے پر چڑھ جاتا ہوں یا خاردار جھاڑیوں میں گھس کر اُن سے اُلجھتا پھرتا ہوں۔ کانٹے میرے کپڑوں کی دھجیاں اُڑا دیتے ہیں۔ اور میرے بدن کو لہولہان کر دیتے ہیں۔ اور اس سے میرے قلب کی حرارت کچھ ٹھنڈی پڑ جاتی ہے۔ کبھی مَیں بھوک پیاس اور تکان سے نیم جان ہو کر زمین پر دراز ہو جاتا ہوں۔ اور کبھی آدھی رات گئے جب چاند بادلوں کی جھلملیوں سے جھانک جھانک کر مجھے دیکھتا ہوتا ہے، مَیں کسی جنگل کے عزلت کدہ میں کسی پرانے درخت سے تکیہ لگا کر بیٹھ جاتا ہوں۔ کہ اپنے تھکے ماندے اعضا کی کسل دُور کر لوں۔ اور درماندگی سے مغلوب ہو کر مَیں دن چڑھے تک وہیں پڑا سوتا ہوں۔ بن باسی سادھوؤں کا جھونپڑا، ٹاٹ کا اوڑھنا بچھونا، اور کانٹوں کا کمربند بھی میری بے سروسامانی کے مقابلہ میں عشرت کا سامان ہو گا۔ الوداع! مجھے قبر کے سوا اس زبوں حالی کا اور کوئی انجام نہیں نظر آتا!

۳۔ ستمبر

اب مجھے یہاں سے رخصت ہونا چاہئے۔

ولیم! میں تمہارا شکر گذار ہوں کہ تم نے میرے ڈانواں ڈول ارادوں میں استحکام پیدا کر دیا۔ پورے پندرہ دن سے میں تذبذب میں مبتلا تھا۔ آج میں نے قطعی فیصلہ کر لیا ہے کہ میرے لئے جانا ہی بہتر ہے۔ وہ چند روز سے شہر میں اپنی ایک سہیلی کے ہاں مقیم ہے۔ اور البرٹ —— لو اب مجھے جانا چاہئے۔

~~~~~~~~~~

۱۰ ستمبر

اُف، وہ بھی کیا رات تھی! ولیم، اب جو میرے سر پر آپڑیگی میں جھیل لونگا۔ لیکن یہ کبھی نہ ہوگا کہ میں پھر اُسے دیکھوں۔ کاش کہ تم میرے پاس ہوتے۔ میں تم سے لپٹ جاتا، اور اپنی آنکھوں سے آنسوؤں کی ندیاں بہا کر، تم سے اپنی حدیثِ درد کہہ سناتا! آؤ، اور اپنے دوست کی حالت پر خون کے آنسو روؤ۔ میں یہاں بیٹھا ہوں، فرطِ اضطراب سے میرا دم پھولا ہوا ہے، میرا دل دھک دھک کر رہا ہے۔ اور میں اپنا غم غلط کرنے کی بیفائدہ کوششیں کر رہا ہوں۔ میری آنکھیں بیچینی سے نمودِ صبح کے آثار ڈھونڈھتی ہیں، کیونکہ نور کے تڑکے ہی گاڑی مجھے لے جانے کے لئے دروازے پر آ پہنچے گی۔

اور وہ اپنی خوابگاہ میں خوابِ راحت کے مزے لے رہی ہے۔ اُسے اس کا سان گمان بھی نہیں، کہ کل رات ہماری بزم آخری تھی۔ اور کہ پھر یہ نقشے کبھی نہ جمینگے۔ اب مجھے کامل آزادی حاصل ہے کہ جدھر چاہوں چلا جاؤں۔ کیونکہ میں نے آخری مرتبہ اُسے جی بھر کر دیکھ لیا ہے۔ میرا ضبط قابلِ داد ہے کہ پورے دو گھنٹوں کی ملاقات میں، میں نے اپنا عزمِ سفر اُس پر کھلنے نہیں دیا۔ اور وہ دو گھنٹے، کچھ نہ پوچھو، ولیم کہ وہ کیونکر گذرے!

البرٹ نے شام کا کھانا کھانے کے بعد چارلوٹی سے باغ میں ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ اُس وقت میں چبوترے پر اخروٹ کے درختوں کی چھاؤں میں کھڑا غروبِ آفتاب کا منظر دیکھ رہا تھا —— آہ، میں نے آخری مرتبہ سورج کو اس دلکشا وادی اور اس سنسان ندی کی گہرائیوں میں ڈوبتے دیکھتا، اور مجھ پر ایک حسرت سی طاری ہوگئی۔ بارہا مجھے چارلوٹی کے ساتھ اس جگہ آنے کا موقعہ ہوا تھا۔ اور اب —— میں اس روش پر ٹہل رہا تھا۔ جو کسی زمانے میں میری مرغوب سیرگاہ تھی۔ ابھی چارلوٹی سے میری شناسائی بھی نہ ہوئی تھی، کہ ایک غیر معلوم سی کشش مجھے اکثر اس جگہ کھینچ بلایا کرتی۔ اور جب ہم اچھی طرح واقف ہوگئے
~~~~~~~~~~

ہیں۔ تو مَیں یہ معلوم کر کے خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا کہ ہم دونوں کو ایک ہی سیرگاہ پسند ہے۔ حقیقت میں یہ مقام اس تمام شعریت سے مالامال ہے، جو ایک حسن شناس مصوّر کی آنکھوں کو دعوت نظارہ دے سکتی ہے۔

چبوترے پر کھڑا ہونے سے آنکھوں کے سامنے ایک وسیع منظر کُھل جاتا ہے۔ مگر ہاں مجھے یاد آگیا، کہ مَیں اس سے پیشتر اس مقام کا خاکہ تمہارے ذہن نشین کر چکا ہوں، کہ لانبے لانبے درخت صف در صف کھڑے ہیں، اور ایک روش اُن کے درمیان میں سے بل پیچ کھاتی ہوئی جاتی ہے۔ اس روش پر جیسے جیسے بڑھتے چلے جاؤ، اندھیرا گہرا ہوتا جاتا ہے۔ تاآنکہ روش ایک تیرہ و تار خلوت گاہ میں جا کر، جس میں کہ ایک گوشۂ تنہائی کی تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں، ختم ہو جاتی ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب پہلی مرتبہ اس جگہ میرا جانا ہوا ہے، تو دوپہر کا وقت تھا مگر روز روشن میں بھی یہاں کچھ ایسی تاریکی مسلط تھی کہ مجھ پر ایک عجیب نامانوس سی افسردگی چھا گئی۔ میرے سینے کے اندر سے کسی ہاتف غیب نے میرے کان میں پھونک دیا۔ کہ یہ جگہ ضرور میرے لئے کسی خوشی یا غم کا موقعہ واردات ہوگی۔

مَیں یہ فیصلہ نہ کر سکتا تھا کہ اُنکے لطف صحبت میں خلل ڈالوں یا نہ ڈالوں۔ ان دو متضاد ارادوں کی کشمکش میں مبتلا مَیں کوئی آدھ پون گھنٹے تک ایک ہی جگہ بُت بنا کھڑا رہا۔ کہ اتنے میں مجھے اُن کے قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ مَیں دوڑ کر اُن کی جانب گیا۔ مَیں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں چارلوٹی کا ہاتھ لیکر تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں سے اُسے بوسہ دیا۔ ہمارے چبوترے پر چڑھنے تک چاند نے پہاڑیوں کی آڑ سے سر نکالا، اور چاروں طرف اُس کی روشنی پھیل گئی۔ ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ اور ہمارے قدم بلا ارادہ اُس تاریک خلوتگاہ کی طرف اُٹھتے گئے۔ وہ سب سے پہلے داخل ہوئی اور بیٹھ گئی۔ البرٹ بھی اس کے پاس بیٹھ گیا، اور مَیں بھی۔ لیکن میرے دل کی پریشانی مجھے دیر تک اس حالت میں رہنے کی اجازت کہاں دیتی تھی۔ اُٹھا، اُن کے قریب کھڑا ہو گیا۔ دوچار قدم اِدھر، دوچار قدم اُدھر گیا، پھر واپس آکر بیٹھ گیا۔ مجھے کسی پہلو قرار نہ تھا۔ میرے سینے میں ایک آگ سی لگی ہوئی تھی۔

چارلوٹی نے ہماری توجّہ چھٹکی ہوئی چاندنی پر منعطف کی، جو پتّوں میں سے چھن چھن کر چبوترے پر دُھوپ چھاؤں کی گنگا جمنی کیفیت پیدا کر رہی تھی۔ منظر کچھ تو

یوں ہی شاندار تھا، اور کچھ اُس تاریکی نے جو ہمارے چاروں طرف محیط تھی۔ اُس میں چار چاند لگا دیئے تھے ہم کچھ دیر تک خاموش بیٹھے اس منظر کو دیکھا کئے۔ پھر چارلوٹی نے یہ کہکر مہرِ سکوت توڑی۔ کہ "جب میں چاندنی رات میں سیر کرتی ہوں تو مجھے وہ پُرانے رفیق یاد آجاتے ہیں، جو آج قبر کے ظلمت کدے میں تن تنہا پڑے ہیں، اور میں موت اور عاقبت کی سوچ میں ڈوب جاتی ہوں" اور اس نے وفورِ احساس سے بھرّائی ہُوئی آواز میں مجھ سے پُوچھا۔ "کیوں، ویرٹر، جب ہم مرکر جی اُٹھینگے تو ایک دوسرے کو پہچان لیں گے؟ کیوں تمہارا کیا خیال ہے"؟

میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ جب میں نے کہا "ہاں چارلوٹی، ہم ایک دوسرے سے ملیں گے، یہ دُنیا ہو کہ کوئی دوسری دُنیا، ہمیں کوئی جُدا نہیں کرسکتا۔" مجھ سے اور کچھ نہ کہا جائیگا آہ، ولیم، اُس کو مجھی سے یہ سوال کرنا تھا، اور پھر ایسے وقت میں جب جُدائی کا جانگزا خیال میرے جگر پر چھُریاں چلا رہا ہو!

اُس نے اجرائے کلام کرتے ہُوئے کہا۔ "اور کیا اِن رفتگانِ عدم کو معلوم ہے کہ ہم دُنیا والے کیا کچھ کررہے ہیں۔ ہم کیا کیا رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ ہم میں کیا کیا چرچے ہو رہے ہیں۔ اور جب ہم محبت بھرے الفاظ میں اُن کا ذکرِ خیر کرتے ہیں تو کیا انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اُن کا کوئی نام لیوا اُنہیں یاد کر رہا ہے؟ شام کی خاموش ساعتوں میں، جب اپنے بھائی بہنوں کے جھُرمٹ میں بیٹھ کر میں اُنہیں اپنے اردگرد عین اُسی طرح جمع ہوتے دیکھتی ہوں۔ جس طرح وہ کبھی میری ماں کے گرد جمع ہوتے تھے۔ تو مجھے اُن مرحومہ کی رُوح اپنے گرد و پیش منڈلاتی نظر آتی ہے۔ اور اُس وقت میں اپنی آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھا دیتی ہوں۔ اور چاہتی ہوں کہ کاش وہ بہشت بریں سے ہمیں دیکھتیں اور اُن پر ظاہر ہو جاتا کہ وہ اقرار جو میں نے اُن کے مرتے دم اُن سے کیا تھا۔ یعنے میں اُن کے بچّوں کی بہن نہیں ماں بن کر رہونگی۔ وہ میں نے کہانتک پُورا کیا ہے۔ پھر کن رقّت خیز الفاظ میں، میں پکار اُٹھتی ہوں "پیاری امّاں، اگر میں اپنا فرض پوری طرح ادا نہیں کر رہی، تو مجھے معاف کرو۔ میں تو اپنے طور پر کوئی کوشش اُٹھا نہیں رکھتی۔ میں اُنہیں اچھا کھلاتی ہوں، اچھا پہناتی ہوں، اور اس سے زیادہ اُن سے محبّت کرتی ہوں۔ اور اُن کی تربیت کا خیال رکھتی ہوں۔ اگر تم دیکھتیں کہ ہم سب ایک دوسرے کی محبّت کا کس طرح دم بھرتے ہیں، اور ایک دوسرے پر کس طرح جان فدا کرتے ہیں

تو تم اُس خدائے پاک کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتیں، جس کی رحمت و برکت کے لئے تم نے نزع کے عالم میں دُعا مانگی تھی۔" اس نماز میں چارلوٹی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مگر او ولیم! اُس کی گلفشانیوں کو کس کا دامنِ تحریر سمیٹ سکتا ہے؟ مُردہ اور بے جان الفاظ میں رُوح کے اُس زندہ مظاہرے کا عکس کیونکر اُتر سکتا ہے۔ البرٹ نے اُس کا جوش حد سے فزوں ہوتے دیکھ کر ملائمت سے کہا۔" پیاری چارلوٹی۔ اس نے تم پر بہت گہرا اثر کیا ہے میں جانتا ہوں کہ پُرانی باتوں کو یاد کرنے سے تمہیں ایک روحانی سرور حاصل ہوتا ہے۔ مگر میں التجا کرتا ہوں ..."

اس نے اس قطعِ کلام کے باوجود سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔" آہ، البرٹ، مجھے یقین ہے کہ تم وہ راتیں نہیں بھولے۔ جب ابّا جان باہر گئے ہوتے تھے، بچے بستروں میں ہوتے تھے؛ اور ہم تینوں، اُس چھوٹی سی گول میز کے گرد بیٹھا کرتے تھے۔ تم اکثر کوئی نہ کوئی اچھی کتاب اپنے ساتھ لایا کرتے، مگر اُس کو پڑھنے کی نوبت شاذونادر ہی آتی تھی۔ کیونکہ اُس باکمال ہستی کی گفتگو میں جو بات تھی وہ کتابوں میں کہاں! خُدا جنّت نصیب کرے امّاں جان لاکھوں میں ایک عورت تھیں۔ حُسن، خوشی، دولت، اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ مگر اللہ رے شوق، کہ ہر وقت اپنے کام سے کام ہے۔

خدا جانتا ہے کہ میں کس طرح راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر روتی ہوں، اور اُس کی درگاہ میں دُعا کرتی ہوں۔ کہ الٰہی مجھے اپنی ماں جیسی بننے کی توفیق دینا۔"

اب مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے اُٹھ کر اپنے کو اُس کے پاؤں پر گرا دیا۔ اور اُنہیں آنسوؤں سے بھگو کر کہا۔"چارلوٹی خدا کا فضل اور بزرگوں کی دُعا تمہارے شاملِ حال ہے۔" اُس نے گرمجوشی سے میرا ہاتھ دبا کر جواب دیا۔" کاش! تم نے اُنہیں دیکھا ہوتا۔ وہ اس قابل تھیں کہ تم اُنہیں دیکھتے۔" قریب تھا کہ میں بیہوش ہو کر گر پڑوں۔ ایسا تعریفی کلمہ میں نے عمر بھر کسی سے نہ سُنا تھا۔ پھر اس نے ایک درد بھری آواز میں کہا۔" مگر آہ، ان تمام خوبیوں کے باوجود اُن کے نصیبوں میں جوانی کی موت لکھی تھی۔ جب کہ اُن کی گود میں ایک چھ مہینے کا دُودھ پیتا بچّہ تھا۔ وہ تھوڑے ہی دنوں بیمار رہیں، اور جس طرح اُنھوں نے جان دی ہے، خدا ہر ایک کی یہ کٹھن منزل آسان کرے۔ اُنہیں غم تھا، تو صرف اس بات کا کہ ان چھوٹی سی عمروں میں اُن کے بچّے بن ماں کے بچے ہو جائینگے۔ اور پھر اُس ننھّی مُنّی جان کا تو اللہ ہی بیلی تھا۔ جب اُن کا وقت قریب آ پہنچا، تو اُنھوں نے مجھے بچّوں کے بلانے کو کہا۔ چھوٹے بچّے تو بچارے بے سمجھ تھے۔ اُنہیں کیا معلوم کہ کیا ہونے والا ہے۔ مگر بڑے بچّوں کا غم سے بُرا حال تھا۔ میں نے

سب کو بلا کر بستر کے قریب کھڑا کر دیا۔ امّاجان نے اپنے نحیف ہاتھ اُٹھائے۔ اُن سب کے سروں پر دستِ برکت پھیرا، باری باری ہر ایک کو پیار کر کے رُخصت کیا، اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولیں۔ "بچّی! ان سب کی ماں بن کر رہنا۔" میں نے خدا کا نام لیکر حلف اُٹھایا۔ پھر امّاں نے کہا۔" بیٹا! تم بڑی ذمہ داری اپنے سر پر لے رہی ہو، ایک ماں کی مامتا، اور ایک ماں کے فرض۔ دیکھنا قیامت کے دن جھوٹی نہ ثابت ہونا۔ تم جانتی ہو کہ مادرانہ محبّت کس کا نام ہے؟ تو پھر اُسی محبّت کے ساتھ اپنے بھائیوں اور بہنوں سے پیش آنا۔ اور میری طرح اپنے باپ کی خدمت اور اطاعت کرنا . . . . ہاں وہ اس وقت کہاں ہیں؟"

" ابّا جان اپنے ناقابلِ برداشت غم کو چھپانے کے لئے تنہائی میں چلے گئے تھے ـــــ اُن کا دِل ٹوٹ گیا تھا۔

"البرٹ! تم بھی تو اُسی کمرے میں تھے۔ امّاں نے کسی کے چلنے کی آواز سُن کر پُوچھا۔" کون ہے؟" اور نہیں اشارے سے اپنی طرف بُلایا۔ پھر وہ دیر تک ہم دونوں کو سکون اور اطمینان سے دیکھتی رہیں۔ اُن کی نگاہوں سے اس بات کا پُورا پُورا یقین مترشح تھا۔ کہ ہم ایک دوسرے کے ہو کر خوش رہیں گے۔" البرٹ نے اُسے فرطِ محبّت سے گلے لگا لیا۔ اور پکار کر بولا۔" ہم خوش ہیں اور خوش رہیں گے۔" جب البرٹ کا سکونِ انجمادی بھی برقرار نہ رہ سکا۔ تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ میری کیا حالت ہُوئی ہوگی۔ چارلوٹی کی آواز بھی لڑکھڑا گئی، جب اس نے کہا "ویرٹر! ایسی ہستی کا فراق ہمیں دیکھنا تھا! میرے اللہ! کیا اس دُنیا میں جو چیز بھی ہمیں پیاری ہے، ہمیں اُس سے آخر کو یونہی جُدا ہونا پڑیگا؟ امّاں کی رحلت کا کسی اور کو اتنا صدمہ نہ ہُوا ہوگا۔ جتنا کہ بچّوں کو ہوا۔ وہ کئی دن تک روتے اور چیختے رہے۔ اور ہر کسی سے شکایت کرتے رہے کہ " ہوّا امّاں کو اُٹھا کے لے گیا ہے۔""

چارلوٹی یہ کہکر اُٹھی، مگر میں اُس کا ہاتھ پکڑے بیٹھا رہا۔ اُس نے کہا۔" آؤ! اب چلیں، دیکھو کتنی رات گئی ہے۔" اور اُس نے اپنا ہاتھ مجھ سے چھڑانا چاہا، مگر میں نے اُسے پکڑے رکھا۔ میں کچھ کہہ کر اپنے دِل کی بھڑاس نکالنا چاہتا تھا۔ میں نے پکار کر کہا۔" خُدا نے چاہا تو پھر ملینگے۔ اور زمانہ چاہے ہمیں کچھ کا کچھ بنا دے، ہم ایک دوسرے کو ضرور پہچان لیں گے۔ لو اب رُخصت، میں جاتا ہوں، اپنی خوشی سے جاتا ہوں، شاید ہمیشہ کے لئے، مگر نہیں، میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ شاید میں وعدہ پُورا نہ کر سکوں۔ اچھا چارلوٹی، اب رُخصت، اچھا البرٹ، رُخصت! انشاءاللہ ہم پھر ملینگے۔" چارلوٹی نے مسکرا کر کہا

"ہاں۔ کل ہی تو!" کل! ہائے اس لفظ نے مجھ پر قیامت ڈھا دی۔ کہ دیکھئے کل کا دن کس دیارِ غیر میں طلوع ہونا ہے! اور جب چاند لوٹی نے اپنا ہاتھ جھٹک کر میری گرفت سے چھین لیا۔ تو اس کو کل کے دن کی کیا خبر تھی؟ وہ دونوں رخصت ہو کر روش پر ہو لئے۔ اور میں تا دیر کھڑا انہیں چاندنی رات میں دُور جاتے دیکھتا رہا۔ پھر میں زمین پر گر پڑا۔ اور سسک سسک کر رونے لگا۔ ہوش آیا تو اُٹھا اُٹھ کر پھر ان کے پیچھے دوڑا۔ اور چبوترے پر چڑھ کر میں نے درختوں کے درمیان باغ کے دروازے کے قریب اُسکی براق پوشاک کی ایک آخری جھلک پالی۔ میں نے اپنا آغوش وا کر دیا۔ اور تاریکی نے اُسے میری نظروں سے چھپا لیا۔

(باقی دارد) محمد ہادی حسین

تقاضائے محبّت

شکوہ اک تم سے کروں آج اگر ہو نہ خفا — کہ حقیقت میں تقاضائے محبّت ہے گلا
کوہکن کے لئے شیریں نے دی جانِ شیریں — ذوقِ قیس ہیں جینے سے خفا تھی لیلےٰ
نالہ کش رعد کی صُورت نظر آتی تھی رباب — سعد کے ہجر میں تھی اشک بداماں اسما
چھٹ کر نل سے دمنتی کی بھی حالت تھی تباہ — جاں بلب خوں بجگر تھی پئے وامق عذرا
کس سے سلمیٰ کی ہے خونابہ فشانی پنہاں — کس سے پوشیدہ ہے افسانۂ قیس و لبنےٰ
پی لیا زہر مگر دخترِ سوداگر نے — چھوٹنا عاشقِ شیدا سے گوارا نہ کیا
ہے حسینوں کے لئے درسِ وفا و اُلفت — شوق و وارفتگیٔ ہیر برائے رانجھا
سوہنی ہو گئی کس طرح نثارِ مہی وال؟ — ڈوب کر۔ نام محبت کا اُچھالا کیسا؟
سسّی پنّوں کی کوئی دیکھے فداکاریٔ عشق — ہے غلط "نقشِ وفا وجہِ تسلّی نہ ہُوا"
مشتری جنسِ محبّت کے ہر اک عہد میں تھے — پایا یوسف سے زلیخا نے بھی اُلفت کا صلا
ناز بھی کرتے تھے عشاق سے خوبانِ جہاں — بے نیاز آپ سا لیکن کوئی دیکھا نہ سُنا

چاہتے ہو کہ نہ بھُولے سے بھی یاد آؤں کہیں
کیوں مری جاں! میں کوئی خوابِ پریشاں تو نہیں

عندلیب شادانی

نوائے آشفتگی

دردِ دروں نہیں ہے، جوشِ جنوں نہیں ہے
لیکن یہ جانتا ہوں دل کو سکوں نہیں ہے

مَیں ہوں مرا نفس ہے، آشفتہ خاطری ہے
دِل وقفِ یاس و حرماں کیونکر کہوں نہیں ہے

وحشت ہے یا محبّت، اپنی نظر سے پوچھو
مَیں تم کو کیا بتاؤں آرام کیوں نہیں ہے

صد شکر تم نے مجھ کو یہ خستگی عطا کی،
اب میرا دل حریفِ زخمِ دروں نہیں ہے

کیوں طعنۂ خموشی، بیمارِ ناتواں کو
آنکھوں میں تابِ گریہ اور دل میں خوں نہیں ہے

کیوں مسکرا رہے ہو، بالیں پہ بیٹھ کر تم
کیا شدتِ الم سے حالت زبوں نہیں ہے

صدقے مَیں اُن لبوں کے جن پر ہے کچھ تبسّم
قربان اس نظر کے جو سرنگوں نہیں ہے

بربادیِ نظامِ ہستی انہیں روا ہے
وہ ناسپاسِ اُلفت، جو یہ کہے جفا ہے

تم دشمنِ وفا ہو مجھ کو یقین نہیں ہے
میرے لئے مسرت لیکن کہیں نہیں ہے

مجھ کو عطا ہُوا ہے ذوقِ ادا شناسی
مَیں جانتا ہوں لب پر کیوں یہ نہیں نہیں ہے

اے شیوۂ تغافل، اے جانِ حسن و تمکیں
یہ شانِ بے نیازی کچھ دل نشیں نہیں ہے

مدّت سے اپنی ہستی نذرِ تپش کئے ہوں
قربانیِ محبّت یہ اوّلیں نہیں ہے

کیفِ سجودِ پیہم اب تک دماغ میں ہے
اس آستاں سے اُٹھے یہ وہ جبیں نہیں ہے

فطرت شناسِ غم ہوں شوریدۂ جنوں ہوں
کچھ میرے دل کو ذوقِ صد آفریں نہیں ہے

مَیں اپنی داستاں کو رنگیں بنا رہا ہوں
خونابۂ جگر سے تر آستیں نہیں ہے

اے حسنِ عالم آرا مَیں کیا بتاؤں کیا ہوں
وارفتۂ محبّت سرگشتۂ وفا ہوں،

محوی

فریبِ تقدیر

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

تمہاری طبیعت بھی ایک معمّا ہے جس کو میں آج تک نہیں سمجھ سکا۔ تم نے اب تک شادی نہیں کی دنیا کے عشق سے تمہیں صرف اسی قدر سروکار ہے۔ کہ دوسروں کا بنا بنایا کام بگاڑ دیا کرو۔ کئی سال گذرے جب میری شادی بالکل قریب تھی۔ تم بیچ میں آ دھمکے۔ اور میرا موقع مجھ سے چھین لیا۔ لیکن میرے رنگ میں بھنگ ڈال کر تم خود بھی پیچھے ہٹ گئے۔ اور اگر حقیقت کو بے نقاب کر دیا جائے تو یہ طرزِ عمل تم ایک دو دفعہ نہیں بیسیوں دفعہ اختیار کر چکے ہو۔

سنکلیئر پر سکوت طاری رہا۔ اس کے چہرہ سے ترشی ٹپک رہی تھی۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اور اس نے اپنی تھکی ہوئی اور بے رونق آنکھیں اُٹھا کر مجھ پر ایک نگاہ ڈالی۔ وہ یکسر پژمردگی بے دلی اور بے اطمینانی کا مرقع تھا۔

اُس کے وسیع اور آراستہ کمرہ میں ہلکی ہلکی روشنی پڑ رہی تھی۔ مشرقی ساخت کے بیش قیمت اور خوش وضع غالیچے بچھے تھے۔ دیواروں پر ہندوستانی فنِ نقاشی کے حیرت انگیز نمونے آویزاں تھے۔ اور آرائش کا دوسرا بیش بہا ساز و سامان اس فراوانی سے جمع تھا کہ اپنے سیدھے سادے مکان کے مقابلہ میں مجھے اس کی جائے قیام قصرِ شاہی سے کم نظر نہ آتی تھی۔ اس پرشکوہ منظر کا میرے دل پر ایک کیف آور اثر پڑ رہا تھا۔ لیکن اس کو ان چیزوں سے کوئی وابستگی معلوم نہ ہوتی تھی۔ اور میرا خیال تھا۔ کہ اسے دنیا کی کسی چیز سے بھی وابستگی نہیں۔ اُسے چین سے واپس ہوئے زیادہ دن نہ گذرے تھے۔ بڑے بڑے صندوق جن میں بلاشبہ چین سے فراہم کئے ہوئے صنعت کے حیرت انگیز نمونے، قالین۔ غالیچے۔ کامدار کپڑے اور چینی کا بیش بہا سامان بھرا پڑا تھا۔ ایک دوسرے پر رکھے تھے۔ لیکن معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس کی بے اعتنائی اس سامان کے کھولنے کی بھی روادار نہیں۔

آخر اس نے بے پروائی سے پوچھا "کیا درحقیقت میں تمہاری شادی کے راستہ میں حائل ہوا؟" اس وقت وہ ضعیف اور بڈھا معلوم ہو رہا تھا۔ اُس کا چہرہ بے رونق تھا۔ اور یقین نہ آتا تھا۔ کہ یہ وہی خوبصورت اور پُرشکوہ ہستی ہے جس نے دو سال پہلے ملڈریڈ کی نگاہِ التفات مجھ سے پھیر لی تھی۔

میں نے درشتی سے کہا "تم جان بوجھ کر اس حقیقت سے بے خبر بننا چاہتے ہو۔ اور حقیقت میں اُس کے طرزِ عمل نے اُس زمانہ میں نہایت معاندانہ صورت اختیار کر لی تھی۔ اور مجھے اپنی چپٹی ناک اور بھدی وضع و قطع کے صدقہ میں اُس کے لئے راستہ صاف کرتے ہی بنی تھی۔ میں ملڈریڈ کو موردِ الزام نہ ٹھیرا سکتا تھا۔ رعنائی اور دلبری کے اعتبار سے سنکلیئر اُن شہزادوں کی طرح تھا۔ جن کا ذکر ہم اکثر مشرقی افسانوں میں سنتے ہیں۔ میں نے ملڈریڈ کو کبھی قابلِ الزام نہیں سمجھا۔ اُسے یہ معلوم ہو گیا ہے۔ وہ ایک ایک بات جان گئی ہے۔

سنکلیئر نے جواب میں کہا "بھئی تم ناحق برہم ہوتے ہو۔ میں انجان نہیں بنتا۔ میرا خیال تھا بلکہ مجھے یقینِ واثق تھا۔ کہ . . . . بلاشبہ میں نے دھوکہ کھایا۔ . . لیکن میں سمجھا کہ . . . . . "

میں۔ کیا سمجھے؟

اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

اُس نے دھیمی آواز میں کہا "مجھے ملڈریڈ پر "اُس" کا گمان تھا۔ لیکن وہ "وہ" نہ تھی"

میں نے سنکلیئر کے چہرہ پر مستفسرانہ نگاہ ڈالی۔ میں اس کی بات بالکل نہ سمجھ سکا۔ وہ بار بار یہی فقرے دُہراتا رہا۔ گویا اپنے دل سے باتیں کر رہا ہے "مجھے اس پر "اُسی" کا گمان تھا۔ اُس کا چہرہ دلکش اور پیارا تھا۔ میں سمجھا کہ یہ ضرور "وہی" ہو گی۔ لیکن وہ "وہ" نہ تھی۔ میں نے دھوکہ کھایا"

ہم دونوں پر کچھ دیر تک سکوت طاری رہا۔

آخر میں نے کہا "شاید تمہیں یہ سُنکر خوشی ہو گی کہ میں نے ملڈریڈ سے پھر معاملات طے کر لئے ہیں"

سنکلیئر کی دھندلی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ اُس نے کہا کہ میں بہت خوش ہوں بشرطیکہ تمہیں یقین ہو کہ اصلی عورت یہی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ تمہیں پُورا پُورا یقین ہو۔

میں نے کہا "مجھے تو اس بات کا یقین ہوتے گیارہ سال گزر چکے ہیں۔ مشکل یہی تھی کہ یہ خیال اُس کے دل میں پیدا نہ ہوتا تھا۔ بہرحال اب میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ لیکن سنکلیئر تم شادی کیوں

نہیں کرتے ؛ اگرچہ تمہیں علم نہیں لیکن تم میں بھی کمی ہے ہر شخص کو ایک ایسی ہستی کی ضرورت ہے۔ جو اس سے کمزور ہو۔ جس پر وہ حکومت کر سکے۔ جسے وہ اپنے اشارہ پر چلا سکے۔ کاش کہ تم جانتے !"

سنکلیئر نے جواب دیا " کیا میں نہیں جانتا ؟ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ لیکن میں اُسے کہاں سے ڈھونڈوں "؟

مَیں نے کہا " لیڈی ویلنز سے شادی کر لو۔ میرا خیال ہے کہ وہاں بھی تم فساد برپا کر چکے ہو گے۔ اور خوب نام پیدا کیا ہو گا۔ اب وہ بڈھا ویلنز مر چکا ہے لیڈی ویلنز کا حسن پہلے سے بھی زیادہ دلکش ہے میں نے کل رات اسے تھیئٹر میں دیکھا تھا۔ اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتے "

سنکلیئر اپنے مقابل کی دیوار پر ٹکٹکی جمائے ہوئے تھا۔ اس کے لمبے لمبے ہاتھ اس کے گھٹنوں پر پڑے تھے۔ اس کے چہرہ پر سختی اور درشتی آگئی۔ اور کئی شکنیں پڑ گئیں جن سے تکان اور تیز مزاجی ٹپک رہی تھی آخر اُس نے جھلّا کر مجھے جواب دیا " میں لیڈی ویلنز کو کیا کروں ؟ مجھے اس کی کیا ضرورت ہے ؟ سوائے اصلی عورت کے دُنیا کی کسی عورت کی ضرورت نہیں ہو سکتی۔

مَیں نے کہا " یہ تم جانو۔ لیکن جب اُس کا بڈھا رشک کرنے والا خاوند زندہ تھا تمہاری حرکات سے یہی ظاہر ہوتا تھا۔ کہ تم اسی کو " اصلی عورت " سمجھتے ہو۔ اب جبکہ وہ مر چکا ہے اور لیڈی ویلنز آزاد ہے۔ تمہارا اسے اصلی عورت نہ سمجھنا تمہاری فطرت کا خاصہ ہے "

وہ پھر خاموش ہو گیا۔

میرے دل کو اس بات کی یاد سے اطمینان تھا کہ مَیں نے ملڈریڈ پر جس کی طبیعت کا سمجھنا نہایت دشوار ہے۔ اُس کی بیگانہ خوئی کے باوجود فتح پائی ہے اس لئے میں نے کہا " حقیقت یہ ہے کہ تم محبّت کے راز سے آشنا ہی نہیں۔ تم یہ بات پیدا ہی نہیں کر سکے۔ کہ سوائے اپنے کسی دوسرے کی ذرّہ بھر بھی پروا کرو۔ ورنہ برسوں پہلے تمہاری شادی ہو چکی ہوتی۔ اچھا یہ تو کہو آجکل تمہیں اپنے زعم میں کس عورت سے محبت ہے "

سنکلیئر (تھکی ہوئی آواز سے) " اسی عورت سے۔ ہمیشہ اُسی عورت سے "

مَیں پھر فوراً اس سے شادی کر لو۔ اور اس کمبخت عجائب خانہ کو ایک بستا گھر بناؤ۔

سنکلیئر " مَیں " اسے " ڈھونڈ نہیں سکتا " وہ "

مجھے کہیں نہیں ملتی۔"

میں۔ "اس کا نام کیا ہے؟"

سنکلیئر۔ "مجھے معلوم نہیں۔"

میں (درشتی سے) "ہاں کہیں کوئی گاڑی تیزی سے گذر رہی ہوگی۔ اور اس میں آپ کو اتفاقاً کسی مہ جبین کے رُخ انور کی ایک جھلک نظر آگئی ہوگی۔ بس آپ سمجھے ہونگے۔ کہ ہمیں تو اسی سے محبت ہے حقیقت میں تم کچھ بھی نہیں سمجھے۔"

میں نے اطمینان سے ایک لمبی سانس لی۔ دو ہی دن پہلے میں ملڈریڈ سے اپنا معاملہ طے کرچکا تھا۔ اور چونکہ میں نے بہت جدوجہد صرف کر کے اس پر فتح پائی تھی۔ اس لئے میں سمجھتا تھا کہ ان معاملات کے سلجھانے کا مجھ میں خاص ملکہ ہے۔

آخر سنکلیئر نے سلسلۂ کلام پھر یوں جاری کیا۔

"چیپس" (میرا نام چیپس نہیں ہے۔ لیکن مکتب کے دنوں سے میرا یہ نام مشہور ہے) "حقیقت یہ ہے۔ کہ ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔"

میرے پرانے زخم پھر ہرے ہوگئے۔

میں نے کہا۔ "نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے۔"

سنکلیئر۔ میرا خیال ہے۔ کہ ہم دونوں محبت کے زخم خوردہ ہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ ہم کو ایک ہی عورت سے محبت ہے۔

میں۔ "اب اگر ایسا ہو بھی تو مجھے کیا پرواہ ہوسکتی ہے ایک زمانہ تھا کہ میں اس فکر سے گھلتا تھا۔ لیکن اب وہ دن گئے۔ اب تم جو چاہتے ہو کر دیکھو۔"

سنکلیئر نے میری طرف ایک خاص انداز سے دیکھ کر کہا۔ "ہاں جیتی فاتح کو کس کا خوف ہوسکتا ہے"

اس وقت مجھے اس کی آنکھوں میں محبت اور ملاطفت کی جھلک نظر آنے لگی۔ اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ اور کہا۔ "خدا کرے یہ تعلق تمہارے لئے باعث برکت ثابت ہو۔"

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر غیر معمولی گرمجوشی سے دبایا۔ اور پھر اس سے کہا۔ "تم بھی کیوں شادی نہیں کر لیتے۔ اس سے تمہاری حالت بھی اسی طرح بدل جائیگی۔ جس طرح میں بدل گیا ہوں۔

اس وقت معلوم ہوتا تھا کہ ہم دونوں پہلے کی طرح پھر ایک دوسرے کے دل کے بہت قریب ہوگئے ہیں۔ اور حقیقت میں اس تکلیف دہ زمانہ کے بعد مجھ میں اور ملڈریڈ میں کھنڈت ڈلوا دی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہم دونوں نے یوں مل کر گفتگو کی ہو۔ اس نے رشک اور بےبسی کی ایک نگاہ مجھ پر ڈالی۔ اور کہا۔ "افسوس مجھے وہ نہیں ملتی۔"

ان الفاظ کے زیر و بم سے اس کے شاندار کمرہ میں صرف ایک ہلکی سی گونج پیدا ہو کر رہ گئی۔

ممکن ہے اس خیال سے کہ میں اور وہ مکتب میں ایک ساتھ رہ چکے تھے۔ یا شاید اس خیال سے کہ اب مجھے اُس سے کوئی وجہ شکایت باقی نہ تھی۔ یا شاید اس لئے کہ اسے میری رازداری کی عادت پر بھروسہ تھا۔ اور میں آج سے پہلے اس عادت پر نہایت پختگی سے قائم تھا۔ سنکلیر نے میری طبیعت بدلی ہوئی دیکھ کر اپنا قصہ یوں بیان کیا۔

"جب میں نوجوان تھا میں بار ہا دام محبت میں اسیر ہُوا۔ اور آزاد ہُوا۔ اور تم میرے اس طرز عمل سے خوب واقف ہو۔ لیکن میرے دل میں یہ خیال پتھر کے نقش کی طرح بیٹھ چکا تھا کہ یہ محض کھیل ہے۔ اور اصلی چیز ابھی باقی ہے۔ میں سمجھتا تھا۔ کہ ایک عورت کہیں نہ کہیں ضرور میرا انتظار کر رہی ہے۔ مجھے اس سے ملنے کی زیادہ جلدی نہ تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھ سے وقت پر آملیگی لیکن زمانہ گذرتا گیا۔ اور میں نے اپنی عمر کے تیسویں سال میں قدم رکھا۔ عمر کے بڑھنے کے ساتھ مجھ پر یاس اور ناامیدی کے شدید حملے شروع ہو گئے۔ دیر دیر تک میں اسی حسرتناک عالم میں رہنے لگا۔ ان حملوں کی شدت برابر بڑھتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ "اس کے بغیر میری زندگی محال ہے اور جبتک وہ نہ آجاتے میں محض اپنے دن پورے کر رہا ہوں۔" اور دس سال گذرے ہیں کہ گرمی کے موسم میں ایک رات جبکہ صبح ہونے کے قریب تھی۔ ایک واقعہ پیش آیا جسے تم میری بات کو صحیح سمجھو یا غلط تمہیں اختیار ہے۔ بہر حال تم مانو یا نہ مانو میں تمہیں اصل حقیقت سے آگاہ کر دینا چاہتا ہوں۔ میں ایک محفل رقص سے گھر کو لوٹا۔ اور اپنی ڈاک میں مجھے اپنی چھوٹی بہن کا لکھا ہُوا ایک خط ملا۔ کہ وہ بہت بیمار ہے۔ اور مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ وہ بیچاری اکثر بیمار رہا کرتی تھی۔ اور ہمیشہ مجھ سے ملنے کی خواہشمند رہتی تھی۔ اسے سل کا مرض تھا۔ اور اکثر گرمی کا موسم وہ اپنی نرس کے ساتھ یارکشائر کے ایک پہاڑی مقام پر گذارا کرتی تھی۔ راستہ کے دشوار گذار ٹیلوں اور گھاٹیوں کے باعث اُس مقام پر پہنچنا نہایت دقت طلب تھا لیکن اسے یہ مقام بہت پسند تھا۔ اور طبی مشورہ بھی اس کے حق میں تھا میں نے اس کے آرام کے لئے ہر ممکن انتظام کر رکھا تھا۔ اور فرصت کے وقت کبھی کبھی اس سے ملنے کے لئے بھی جایا کرتا تھا۔ لیکن یہ اتفاق بہت کم ہوتا تھا میں نے اُس کے خط کو ایک طرف رکھ دیا۔ اور سوچنے لگا۔ کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔ اس وقت لندن کو چھوڑنا

مجھے گوارا نہ تھا۔ میں تمام رات ماڈرریڈ سے مصروفِ رقص
رہا تھا۔ پھر اُسی خط میں چند اور الفاظ مجھ کو نظر پڑے
کہ مس سنکلیئر اپنے حال سے آگاہ نہیں۔ درحقیقت وہ
بہت زیادہ بیمار ہیں۔

"اب فیصلہ ہوگیا۔ میرا وہاں جانا ضروری تھا۔
اگرچہ اس سے پہلے بھی اس کی بیماری کے بڑھ جانے
کی اطلاع سُنکر میں ایک دفعہ اسے دیکھنے کے لئے گیا
تھا۔ اور اس کی حالت میں کوئی فرق نہ پایا تھا۔ تاہم
اس وقت میں نے یہی مناسب خیال کیا۔ کہ اس کے
پاس پہنچ جاؤں۔ مجھے اس غریب پر غصہ بھی آیا لیکن
چونکہ میری دوسری بہن انا اپنے شوہر کے ساتھ ہندوستان
میں تھی۔ اور انگلستان میں اس کا میرے سوا اور کوئی
عزیز نہ تھا۔ اس لئے ناچار میں نے روانگی کا عزم کرلیا۔
اب میں نے سونا مناسب نہ سمجھا۔ میں کرسی لیکر کھڑکی
کے سامنے بیٹھ گیا۔ اور ویسٹ منسٹر کے گرجا کے پیچھے
سے صبح کی روشنی کے طلوع کا تماشہ دیکھنے میں محو ہوگیا
میں اسی حالت میں بیٹھا ہوا تھا۔ اور وہ خط میرے ہاتھ
میں تھا۔ کہ دفعتہً میرا دل افسردہ ہوگیا۔ اور میری طبیعت
زندگی سے بیزار سی ہوگئی۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ
زندگی کا جو دنیا کی نافرجام خواہشوں اور غیر مطبوع
اور ناخوشگوار دلچسپیوں سے بھری ہوئی ہے مقصد کیا
ہے۔ مجھے زندگی میں کوئی دلچسپی نظر نہ آتی تھی۔ میں حیران
تھا۔ کہ آخر وہ عورت کہاں ہے جس کی نسبت سے مجھے
عجیب و غریب طور پر وقتاً فوقتاً اشارے ہوتے رہے
ہیں۔ دوسری کئی عورتیں دیکھنے میں آئیں۔ اور یاد سے
محو ہوگئیں۔ لیکن وہ عورت جو میری زندگی کے لئے ناگزیر
تھی۔ اور جس کی ضرورت میں زمانہ کے گذرنے کے ساتھ
ہی ساتھ زیادہ محسوس کر رہا تھا۔ بالکل مفقود تھی۔ مجھے
اس کی ضرورت شدّت سے محسوس ہو رہی تھی اور میرے
دل میں اس کی تلاش کی پُرجوش خواہش پیدا ہوتی لیکن
میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کہاں اُس کی تلاش کروں۔

"اور اسی حال میں جب میں وہاں بیٹھا تھا۔ مجھے اپنی
روح میں ایک خفیف سی لرزش محسوس ہوئی پھر بجلی
کی سی سرعت کے ساتھ ایک عجیب رَو میرے تمام بدن
میں دوڑ گئی۔ ایک لہر تھی جو اٹھی۔ اُبھری اور بتدریج
طوفان بنکر میری تمام ہستی پر چھا گئی۔ اس کے بعد
اسی طرح رفتہ رفتہ بالکل اُتر گئی۔ اور پھر میرے اندر ہی
اندر ایک عجیب کیفیت پیدا ہوئی۔ ایک موجِ اضطراب
تھی۔ ایک طغیانِ شوق تھا۔ کہ اُٹھا اور سیلِ رواں کی
طرح مجھے اپنے ساتھ بہالے گیا۔ میں اس سیل کے
ساتھ ساتھ ایک سنہرے غبار میں برابر آگے ہی آگے
بڑھ رہا تھا۔ آخر میں نے دیکھا کہ ایک عجیب و غریب

پُرامن اور جانفزا خطہ میں افق کے قریب ایک نوخیز لڑکی تنہا بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کا رُخ میری طرف نہ تھا لیکن میں نے اسے پہچان لیا۔ کیونکہ دُنیا بھر میں صرف وہی ایک عورت تھی۔ جسے میں "اپنی" کہہ سکتا تھا۔ آخر میری زندگی کی رفیق مجھے مل گئی۔ فرطِ شوق سے میرے دل میں درد کی ایک ٹیس اُٹھی۔ اور میں بے اختیار اس کی طرف بھاگا۔ اور قریب پہنچکر اس کے قدموں میں گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا۔ اور اپنا چہرہ اُس کے کپڑوں میں چھپا لیا۔ وہ مجھ پر جھکی اور مجھے اوپر اُٹھا کر مجھ سے ہمکنار ہو گئی۔ اور کہا "اب رنج و غم کو چھوڑ دو میں ہمیشہ کے لئے تمہاری ہوں اور تم میرے ہو اور پریشانی کی کوئی وجہ نہیں ہے" ہم آپس میں نہایت دھیمی آواز سے باتیں کر رہے تھے۔ اور میرا اضطراب بالکل فرو ہو چکا تھا۔

میں نے اُس کے چہرہ کو نہ دیکھا لیکن مجھے اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ میں دُنیا میں سب سے زیادہ اس سے شناسا تھا۔

"آخر وہ مجھے مل گئی۔ یہ بات کبھی میرے تصور میرے خواب و خیال میرے وہم و گمان میں بھی نہ گذری تھی۔ کہ دُنیا کی کوئی چیز اس درجہ حسین اور دلربا بھی ہو سکتی ہے۔ زبان اس کی تعریف سے عاجز ہے۔ سمندر کے ساحل پر طلوعِ آفتاب کا دلکش نظارہ بھی اس قدر حیرت افزا نہیں ہوتا۔ میرا سر اُس کی آغوش میں تھا۔ میری آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہ رہے تھے۔ اور وہ مجھے تسکین دینے کے لئے اسی طرح تھپک رہی تھی۔ جس طرح مائیں بچوں کو تھپکتی ہیں لیکن وہ خود بھی خوشی سے رو رہی تھی۔ اور اُس کے آنسو میرے چہرہ پر گر رہے تھے۔ جس طرح مجھے اسکی ضرورت تھی۔ اُسی طرح میری ضرورت اُسے بھی تھی۔ اور یہی بات سب سے زیادہ عجیب تھی۔ ہم ایک دوسرے کی طرف بُعد المشرقین سے کھنچے چلے آئے تھے۔ اور اب ہم ایک دوسرے کے کنارِ شوق میں محفوظ و مصؤن تھے۔" پھر بتدریج لیکن غیر معلوم طور پر ایک تغیر پیدا ہوا۔ وہی سیلِ رواں جس نے مجھے اس تک پہنچایا تھا۔ پھر مجھے واپس کھینچنے لگا۔ اور دفعتہً خوف و ہراس نے مجھ پر غلبہ پالیا۔ اور مجھے معلوم ہوا۔ کہ وہ میرے ہاتھوں سے نکلی جا رہی ہے۔ میں نے چاہا کہ اُسے مضبوط پکڑے رکھوں۔ لیکن وہ میری گرفت سے باہر تھی۔ ہم جدا ہو رہے تھے۔ اور اپنے ہاتھ ایک دوسرے کی طرف پھیلا رہے تھے۔ سنہرے غبار میں جو ہر طرف پھیل رہا تھا۔ اس کی صورت لحظہ بہ لحظہ دھندلی پڑ رہی تھی۔ درد و کرب کی حالت میں میں نے

اس سے چلا کر کہا۔ "تم مجھے کہاں ملوگی۔ اور میں کس طرح تم تک پہنچوں"۔ وہ ہنسی اور پھر اس کی پر تمکنت اور مطمئن آواز بلند ہوئی۔ کہ "ہم ضرور ملینگے۔ تم عنقریب مجھ سے ملنے والے ہو۔ میں تمہیں شاہراہ پر ملونگی"۔ ہم ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ اور میں دور دراز فاصلے طے کرتا ہوا پھر اسی کمرہ میں پہنچ گیا۔ اور ویسٹ منسٹر کے گرجا کے پیچھے سے پو پھٹ رہی تھی"۔

میں۔ "حقیقت میں تمہاری آنکھ کھل گئی"؟

سنکلیر۔ "نہیں میں سویا نہ تھا۔ میں صرف اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔ اس وقت مجھے غیر معمولی اطمینان حاصل تھا لیکن جب مجھے یہ خیال آیا۔ کہ میں نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا۔ تو آہستہ آہستہ یہ اطمینان بھی رخصت ہونے لگا۔ یہ تو مجھے معلوم ہو گیا۔ کہ وہ دنیا میں موجود ہے۔ اور میرا انتظار کر رہی ہے۔ لیکن یہ خیال میرے لئے سوہان روح بن رہا تھا۔ کہ آخر ہزار ہا عورتوں میں سے میں اسے کس طرح پہچانونگا۔ اس نے کہا تھا۔ کہ "تم عنقریب مجھ سے ملنے والے ہو۔ اور میں تمہیں شاہراہ پر ملونگی۔ ان الفاظ سے دفعتہً مجھے خیال آیا۔ کہ وہ ضرور ملڈریڈ ہو گی۔ کیونکہ اسی شام میں ملڈریڈ کو ساتھ لیکر موٹر پر سیر کے لئے جانے والا تھا۔ میں نے یہ ارادہ اپنی بہن کا خط موصول ہونے سے پہلے کیا تھا پس خواہ تم مجھے سنگ دل ہی کیوں نہ سمجھو۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر مجھے اپنی بہن کی سخت خطرناک حالت کی اطلاع بھی ملتی۔ تو اس دن صبح میرے لئے پارک شائر جانا ناممکن تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا۔ کہ میرا تمام مستقبل خطرہ میں ہے۔ اور مجھے ضرور پھر ملڈریڈ سے ملنا چاہئے۔ اور اس بات میں مجھے کوئی رکاوٹ گوارا نہ ہو سکتی تھی۔

بہرحال میں ملڈریڈ کو ساتھ لیکر سیر کو گیا۔ اور شام اُسی کے ساتھ باہر گذاری"۔

میں نے کہا۔ "ہاں یہ واقعہ مجھے خوب یاد ہے"۔

سنکلیر۔ "لیکن مجھے معلوم ہوا۔ کہ میں نے دھوکہ کھایا اسے کسی بات کا علم نہ تھا۔ اسی رات میں پارک شائر کو روانہ ہوا۔ لیکن میں نے اپنی بہن کو وہاں نہ پایا۔ کیونکہ اسی شام وہ دفعتہً انتقال کر گئی تھی"۔

میں نے درشتی سے کہا۔ "اگر اس دن تم ملڈریڈ کی جدائی گوارا کر لیتے۔ تو وقت پر پہنچ جاتے۔ اور اُسے دیکھ لیتے"۔ سنکلیر نے بہت دیر تک کوئی جواب نہ دیا آخر اس نے کہا۔ "دس سال تک میں اس کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ کبھی مجھے کسی پر اس کا گمان ہوتا تھا۔ اور کبھی کسی پر۔ میں نے ہزار کوشش کی کہ پہلے کی طرح اُس خواب بیداری ہی میں اس سے ملاقات ہو۔ لیکن میں کامیاب نہ ہوا۔ مجھے اس کا نشان تک نہ ملتا تھا

دس سال تک قطعاً ناکام رہنے پر میرے دل میں خیال پیدا ہوا۔ کہ ممکن ہے اس کا انتقال ہو چکا ہو۔ اس لئے میں بالکل مایوس ہو گیا۔

"وہ زمانہ موسم خزاں کے آخری ایام کا تھا۔ مجھے نقرس کا مرض تھا۔ جس کے علاج کے لئے مجھے سٹریتھ پفر جانا پڑا۔ میری دوسری بہن انا جو اب بیوہ ہو چکی تھی۔ پارک شائر کے اُسی مکان میں قیام پذیر تھی۔ جہاں میری چھوٹی بہن کا انتقال ہوا تھا۔ اس نے مجھے چند دن اپنے ساتھ گذارنے کے لئے لکھا تھا۔ اس لئے میں واپس ہوتا ہوا پارک شائر پہنچا۔ میری بہن مجھے ایک عرصہ دراز کے بعد دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اور میں نے وہاں چند دن مسرت و شادمانی کے ساتھ گزارے۔ میرا وہاں پہنچ جانا مفید بھی ثابت ہوا۔ کیونکہ میرے وہاں پہنچنے کے تیسرے ہی دن بعد میری بہن کو معلوم ہوا۔ کہ ہمارا ایک پرانا وفادار ملازم مصیبت میں گرفتار ہے۔ اور قرض ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے اُس کی زمین قرق ہو جانے والی ہے۔ میری بہن نے مجھ سے بہ اصرار اس کی مدد کے لیے علی الصباح موٹر پر سوار ہو کر جانے کے لئے کہا۔ تاکہ میں اس کی زمین کے نیلام کو روک کر اسے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بنا دوں۔ صبح کے وقت طلوع آفتاب سے پہلے تیس میل کے سفر کا خیال خود میرے لئے بھی دل خوش کن تھا۔ اس لئے میں جانے پر رضامند ہو گیا۔

"میں اس شام کو کبھی نہ بھولونگا۔ سہ پہر کی چائے ہم نے مل کر برآمدہ میں پی تھی۔ سامنے سرسبز و اور جھاڑیاں دُور تک پھیلتی چلی گئی تھیں بجلی کی گرج جو ہم تمام دن سنتے رہے تھے۔ اب لحظہ بہ لحظہ زیادہ بلند ہو رہی تھی۔ آسمان پر گہرے اور غلیظ بادل چھائے ہوئے تھے۔ جن کے نیچے جھاڑیوں کا رنگ سیاہ اور شکستہ معلوم ہو رہا تھا۔ سڑک جو پاس ہی سے گذرتی تھی۔ پہلے سے کہیں زیادہ سفید نظر آ رہی تھی۔ میری بہن مجھے کھڑا کیاں اور دریچے بند کرنے کے لئے تنہا چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اور میں آرام کرسی پر بیٹھا ہوا سڑک کی طرف دیکھنے میں محو تھا۔ اس وقت مجھے وہ الفاظ یاد آئے کہ "میں تمہیں شاہراہ پر ملونگی۔ غلط! سراسر غلط! مجھے تلاش میں دس سال گذر گئے لیکن اس کا نشان تک تو نہ ملا۔ اُسی وقت بہت دُور سڑک پر مجھے ایک عورت تنہا آتی ہوئی دکھائی دی۔ دفعتہً میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ لیکن مجھے یاد آ گیا کہ میں کتنی دفعہ دھوکہ کھا چکا ہوں۔ اور یہ محض ایک نیا دھوکہ ہے۔ میں اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ اور وہ رفتہ رفتہ قریب پہنچ گئی۔ وہ خراماں خراماں

ہمارے مکان کی طرف آ رہی تھی۔ اس کے دونوں طرف جھاڑیاں سر اُٹھائے کھڑی تھیں۔ اور آسمان پر گہرے سیاہ رنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اس کے کندھے پر ایک چھوٹی سی تھیلی لٹک رہی تھی جب وہ نزدیک پہنچی تو وہ سکون جو ہمیشہ طوفان کا پیش خیمہ ہُوا کرتا ہے۔ برق کی چمک اور رعد کی گرج سے ٹوٹ چکا تھا۔ میری بہن نے آکر جلد جلد کرسیاں اندر رکھیں پھر اس کی نظر اس عورت پر پڑی۔ جو اب بالکل قریب پہنچ چکی تھی۔ اس وقت بڑی بڑی بوندیں گرنے لگیں۔ انا بھاگتی ہُوئی دروازہ پر گئی۔ اور اس عورت کو اپنے مکان میں پناہ لینے کی دعوت دی۔ وہ تیز تیز قدم اُٹھاتے ہماری طرف بڑھی۔ اور پھر میری بہن کے ساتھ زینہ طے کرکے اُوپر آئی۔ اس وقت بارش خوب زور سے ہونے لگی۔ اس نے تھیلی کندھے سے اتاری اس کی نگاہ بادلوں پر تھی۔ اس نے کہا۔ "واہ واکیا شاندار نظارہ ہے!" پھر اُس نے کہا۔ "آپ نے کسقدر مہربانی کی۔ کہ مجھے اندر بُلا لیا۔ ورنہ میلوں تک کوئی اور مکان موجود نہیں ہے" وہ بہت حسین عورت تھی عمر تیس سال کے قریب ہوگی۔ چہرہ کے نقش صاف صاف اور کُھلے ہوئے تھے۔ اور بشرہ سے متانت اور سنجیدگی مترشح تھی۔ وہ اپنے سیاہ بالوں کو اپنے

نازک اور خوبصورت ہاتھوں سے سلجھا رہی تھی۔ اس نے ہمارے ساتھ چائے پی اور میری بہن اس سے اس طرح محبت آمیز گفتگو کرتی رہی۔ گویا وہ اس کی نہایت ہی عزیز سہیلی ہے۔ انا ہر کسی سے اسی طرح پیش آتی تھی۔ برق و رعد کا طوفان تو اب فرو ہو چکا تھا۔ لیکن بارش ابھی تک جاری تھی۔ اجنبی عورت کی نگاہ بار بار بارش کی طرف اُٹھتی تھی۔ آخر اس نے اپنی تھیلی اُٹھا کر کہا۔ مجھے اب جانا چاہیئے۔ لیکن میری بہن کو یہ منظور نہ تھا۔ میلوں تک اور کوئی مکان نظر نہ آتا تھا۔ اس نے اس سے رات وہیں بسر کرنے کے لئے کہا۔ ایک کمرہ اس کے لئے صاف کرایا گیا اس کے بعد ہم رات کا مختصر سا کھانا کھانے کے لئے بیٹھے۔ میری توجہ مہمان کی طرف کھنچے بغیر نہ رہی لیکن یہ کشش اس سے زیادہ نہ تھی۔ جو میں نے اس سے پہلے بارہا دوسری عورتوں میں محسوس کی تھی۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ لیکن گذشتہ بیس سال کے عرصہ میں مَیں بہت سی خوبصورت عورتوں کو دیکھ چکا تھا۔ وہ زندہ دل تھی۔ اور زندہ دلی مجھے پسند ہے۔ وہ مجسم صحت تھی۔ اور اس کے چہرہ سے مستعدی ٹپکتی تھی۔ وہ اور انا مسلسل گفتگو میں محو رہیں خصوصاً انا کا سلسلہ کلام تو قطع ہی نہ ہوتا تھا۔ البتہ مَیں نے گفتگو میں زیادہ حصہ

نہ لیا۔ کیونکہ اگرچہ مجھے اب صحت ہو چکی تھی لیکن نقاہت ابھی تک باقی تھی۔ جب ہم کھانا کھا چکے۔ بارش بند تھی اور چاند نکل آیا تھا۔ لیکن ہر طرف دھند چھائی تھی۔ جھاڑیوں کا نشان تک نظر نہ آتا تھا۔ دھند اور غبار کی لہریں آہستہ آہستہ ہمارے پاس سے گذر جاتی تھیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ کسی بہت بڑے سمندر کی سطح سے خاموش موجیں اٹھ رہی ہیں۔ ہمارا مکان اس سمندر میں ایک دور افتادہ جزیرہ معلوم ہوتا تھا۔ رات گرم اور ہوا بالکل بند تھی۔ ہم برآمدہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اور مختلف موضوعوں پر گفتگو چھیڑ رہے تھے۔

انا کی طبیعت وہمی اور خبطی سی ہے۔ اور اس میں ایک عجیب لاابالی پن ہے لیکن تعجب کی بات تو یہ ہے۔ کہ اس کا یہ مرض متعدی ہے۔ اس کی طبیعت حد درجہ اثر پذیر اور دوسروں پر بھروسہ کر لینے والی ہے۔ اور جو اس کے پاس بیٹھا ہو۔ وہ بھی اس کی تقلید کرنے لگتا ہے۔ انا کے خلوص کا دوسروں پر کچھ ایسا اثر ہوتا ہے۔ کہ تکلف کے تمام حجاب خودبخود اٹھ جاتے ہیں۔ بڑے بڑے لوگ اس کے سامنے ایک دوسرے سے بالکل کھل جاتے ہیں۔ اور ایسی ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ جن کے لئے وہ بعد میں یقیناً پشیمان ہوتے ہونگے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جب انا نے دھند اور چاندنی کو دیکھا۔ تو اس کی طبیعت بے طرح نشاط سے کھل گئی۔ میں نہ اسے روک سکتا تھا۔ اور نہ میں نے اس کی کوشش کی۔ میں نے نیند کے بہانے سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور انا نے اس اجنبی عورت کے سامنے جس سے وہ قطعاً ناآشنا تھی اپنے مرحوم شوہر سے اپنی پہلی ملاقات کے متعلق جو غالباً نیپال میں ایک فوجی مہم کے موقع پر ہوئی تھی۔ ایک ایک بات بیان کر دی۔ انا عجیب و غریب زندگی بسر کر چکی تھی۔ ایک عرصہ تک وہ لاماؤں کیساتھ دشت نوردی کرتی رہی۔ یا جنگلی لوگوں کے ساتھ مل کر تو ہموں بہیرینے کا لطف اٹھاتی رہی۔ اور اسی طرح کے مختلف مشغلوں میں محو رہی۔ مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ اس کی شادی ایک نامور لیکن تہی دست سپاہی کے ساتھ ہوئی جس کا چند سال گذرے انتقال ہو چکا ہے۔ لیکن انا نے اس کے ساتھ اپنی پہلی ملاقات کی داستان اس قدر دلچسپ اور پر اثر پیرایہ میں سنائی۔ کہ میں حیران رہ گیا۔ اس نے بتایا کہ کس طرح اس کے شوہر کے ساتھی اسے تنہا چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اور انا نے اسے اپنی جماعت کے ساتھ ملا لیا۔ پھر اس نے بتایا کہ کس طرح تین دن

تک وہ ایک دوسرے کا نام تک جانے بغیر ایک ایسی سرزمین میں ست گذرتے رہے۔ جو گلاب کی بیلوں سے پٹی پڑی تھی۔ اور وہ مختلف مقامات پر مٹی کے چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں کے دروازوں کے سامنے ان کے لئے کھانا پکاتی رہی۔ جس انداز سے انا نے یہ داستان سنائی۔ وہ نہایت دلکش تھا اس دن مجھے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ انا بھی زندگی کے راز سے آشنا ہے۔ اور محبت کی مقدس آگ کی گرمی سے اس کا قلب بھی کسب فروغ کر چکا ہے۔ اور تقاضائے فطرت یہی تھا۔ کہ وہ اپنے عیش رفتہ کی یاد سے جو ہمیشہ اس کے دل میں موجزن رہتی تھی۔ اپنی روح کے لئے سرمایہ تسکین فراہم کرتی رہے۔ میں نے اپنی نیم وا آنکھوں سے دیکھا۔ کہ اجنبی عورت نے ایک اضطراری حرکت کیساتھ اپنا ہاتھ انا کے ہاتھ میں ڈال لیا۔ اور آہستہ سے کہا۔

"آپ بڑی خوش قسمت تھیں"

انا نے کہا "اچھا! میرے خیال میں تو یہ خوش قسمتی تھا ہر شخص کے حصہ میں آتی ہے۔ میں تو سمجھتی ہوں۔ کہ یہ روشنی عمر میں ایک دفعہ ہم سب کے حجلۂ جان کو منور کرتی ہے۔ کیا میرا یہ خیال غلط ہے؟ مجھے یقین ہے کہ آپ کے قلب پر بھی یہ واردات گذر چکی ہوگی۔

اس نے جواب میں کہا۔ "میری شادی نہیں ہوئی اور باوجودیکہ میری عمر کے تیس سال گذر چکے ہیں۔ مجھے کبھی ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ ایک دفعہ شادی کے لئے میری نسبت ٹھیری تھی۔ لیکن مجھے یہ رشتہ توڑنا پڑا۔ کیونکہ مجھے یہ بے سود معلوم ہوتا تھا" پھر اس نے مسکرا کر کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ہم جو آپس میں اس قدر کھل کر باتیں کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبی ہیں"

انا نے جواب دیا۔ "میرے خیال میں اگر لوگ ایک دوسرے سے اجنبی ہوں۔ تو دنیا کے کام اچھی طرح چل سکتے ہیں۔ اور اس صورت میں ہم خوش بھی زیادہ رہ سکتے ہیں"

میرا خیال تھا کہ اجنبی عورت انا کو سودائی یا مجنون سمجھے گی۔ لیکن اس نے نہایت دلچسپی سے جواب دیا۔ "دنیا میں ایک دوسرے سے خوش رہنے کے صرف دو طریقے ہیں۔ پہلی صورت تو یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے سے بالکل ناآشنا ہوں۔ آپس میں ہمارا کوئی تعلق نہ ہو اور دوسری صورت یہ ہے۔ کہ ہم میں کسی قسم کا حجاب حائل نہ ہو۔ اور ہم ایک دوسرے کی دلی کیفیات تک سے واقف ہوں لیکن جو راستہ ان دونوں منزلوں کے درمیان واقع ہے وہ محض شکر رنجیوں غلط فہمیوں

اور مایوسیوں کی جولانگاہ ہے۔"

انا نے جواب میں کہا۔ کہ "محبت کے بغیر ہم کسی کی دلی کیفیات سے واقف نہیں ہو سکتے۔"

اجنبی عورت۔ ہاں صرف محبت ہی ہمیں یہ بات سکھا سکتی ہے۔ خود مجھے اس بات کا اندازہ ہے حالانکہ سوائے ایک خواب کی حالت کے میں کبھی محبت سے آشنا نہیں ہوئی۔"

انا۔ "وہ واقعہ مجھے بھی سنائیے۔"

میں نے بےخبری میں اجنبی عورت پر ایک نگاہ ڈالی۔ چاندنی میں اسکے چہرے سے مسرت اور اطمینان کے آثار ہویدا تھے۔ اس نے پھر اسی دلچسپی سے انا کو جواب دیا۔ "میں نے یہ واقعہ سوائے اپنی بہن کے آج تک اور کسی سے بیان نہیں کیا۔ اور یہ عجیب بات ہے۔ کہ مجھے آج اسی مکان میں اس کا اعادہ کرنا پڑا ہے۔ جہاں مجھے یہ پیش آیا تھا۔

انا۔ "تو کیا آپ پہلے بھی یہاں آچکی ہیں۔

اجنبی عورت۔ "جی ہاں اس بات کو دس سال گذرے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج میں اپنی راہ چھوڑ کر خاص طور پر ادھر نکل آئی۔ تاکہ ایک دفعہ پھر اس جگہ کو دیکھ سکوں۔ میں جہاں ایک مہینے تک قیام پذیر رہی تھی یہاں ایک خاتون مس سنکلیر بیمار تھیں۔ اب ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ اور میں اپنی ایک سہیلی کی مدد کے لئے جو مس سنکلیر کی نرس تھیں۔ یہاں آئی تھی۔ اب میری ان سہیلی کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔

انا "ہم دونوں مس سنکلیر کے بہن بھائی ہیں۔"

اجنبی عورت۔ جی ہاں آپ کو برآمدہ میں دیکھ کر میرے دل میں بھی یہ خیال پیدا ہوا تھا۔ کیونکہ آپ دونوں کی شکل و شباہت ان سے بہت کچھ ملتی ہے میری سہیلی کو جن کے سپرد مس سنکلیر تھیں۔ بہت کام کرنا پڑتا تھا۔ اور درحقیقت اس کام کے لئے دو نرسوں کی ضرورت تھی۔ لیکن انہوں نے شکایت مناسب خیال نہ کی مس سنکلیر کو مجھ سے بہت لگاؤ تھا۔ اور جب تک ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز نہ کر گئی۔ رات کے وقت میں ہی ان کی تیمارداری کے لئے مخصوص تھی۔ ان کے انتقال کے بعد میں فوراً یہاں سے روانہ ہو گئی۔"

انا۔ "ہاں میرا بھائی بعد از وقت یہاں پہنچا۔ ان کا انتقال ہو چکا تھا۔"

اجنبی عورت۔ "مجھے بھی اس کا افسوس ہوا تھا۔ مس سنکلیر نے آخری خط جو اپنے بھائی کے نام مجھ سے لکھوایا تھا اس میں میں نے بھی اپنی طرف سے چند الفاظ ان کی خطرناک حالت کے متعلق ان سے کہے بغیر لکھ دئے

تھے۔ یہ الفاظ چونکا دینے والے تھے۔ اور اگر خط وقت پر ان کے بھائی کو مل جاتا تو وہ فوراً چلے آتے لیکن میرا خیال ہے کہ خط پہنچنے میں دیر ہوگئی مس سنکلیئر کے انتقال سے ایک رات قبل کا واقعہ ہے کہ میں یہاں برآمدے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ رات بہت گذر چکی تھی مگر مجھے اسی وقت فرصت ملی تھی۔ اور اگرچہ مجھے سو جانا چاہیے تھا لیکن میں سونے کی بجائے یہاں آ کر جھاڑیوں کے پیچھے سے صبح کی روشنی کے طلوع کا نظارہ دیکھنے کے لئے بیٹھ گئی۔ اسی اثنا میں جبکہ میں وہاں بیٹھی ہوئی تھی مجھ پر ایک سکون کی کیفیت طاری ہو گئی اور ایسا معلوم ہوا۔ کہ میں نہایت اطمینان کی حالت میں کسی کی آمد کا انتظار کر رہی ہوں۔ بتدریج مجھے اس طرح محسوس ہونے لگا۔ کہ کہیں دور کوئی شخص مصیبت میں گرفتار ہے۔ میں نہ سوئی ہوئی تھی۔ اور نہ بالکل بیدار تھی۔ پھر بہت دور سے مجھے ایک شخص اپنی طرف آتا ہوا نظر آیا۔ وہ جلد جلد قدم اٹھا رہا تھا میرے پاس پہنچکر وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اور اس نے اپنا چہرہ میرے گود میں چھپا لیا۔ اس کی طبیعت میں ہیجان پیدا ہو رہا تھا۔ لیکن مجھے سکون حاصل تھا۔ مجھے کسی قسم کی حیرت نہ ہوئی۔ بلکہ میں نے اُسے اُوپر اُٹھایا اور اس سے ہمکنار ہوئی۔ اور کہا اب رنج و غم کو چھوڑ دو میں ہمیشہ کے لئے تمہاری ہوں۔ اور تم میرے ہو۔ اور پریشانی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اور یہ بالکل صحیح ہے کہ مجھے اس سے بے انتہا اور بے اندازہ محبت تھی۔ اور یہ محبت اب تک اسی طرح قائم ہے۔ رفتہ رفتہ اس کی طبیعت کا ہیجان فرو ہوا۔ وہ میری آغوش میں تھا۔ اور ہم دونوں ایک ایسے بے پایاں سرور اور کیف میں غرق تھے۔ جس کا امکان پہلے کبھی میرے حیطہ خیال میں بھی نہ گذرا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے ملکر خوشی سے رو رہے تھے۔ اور جو کیفیت ہم پر اس وقت طاری تھی۔ کبھی میں نے خواب میں بھی ممکن نہ سمجھی تھی۔ صبح صادق کے طلوع کی دلفریبی بھی یہ حالت پیدا نہیں کر سکتی۔"

انا۔ اور یہ حقیقت میں "طلوع صبح" تھا۔

اجنبی عورت۔ اگر یہ طلوع صبح تھا تو پھر جس دن کی پیش روی اسے کرنی تھی۔ وہ کبھی نہ آیا۔ کیونکہ ہم جلد ہی ایک دوسرے سے جُدا کر دئے گئے۔ اور اس پر پھر وہی خوف وہراس طاری ہونے لگا۔ اور اس نے چلا کر مجھ سے کہا۔ "تم مجھے کہاں ملو گی۔" میں ہنسی۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا۔ کہ وہ ضرور مجھ سے ملنے والا ہے مجھے صاف نظر آ رہا تھا۔ کہ میرے اور اس کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں۔ ہمارا راستہ بالکل سیدھا اور صاف تھا کوئی نابینا

بھی اس راستہ سے بھٹک نہ سکتا تھا۔ آخر ہم جدا ہوئے اور میری آنکھوں کے سامنے پھر اسی جہانِ آب و گِل کی صبح کے طلوع کا نظارہ تھا۔ اس کے بعد بہت دنوں تک مجھے ایسا معلوم ہوتا رہا کہ میں خواب میں چل پھر رہی ہوں۔ مجھے اس کے آنے کا اتنا یقین تھا کہ میں اپنی جان بھی اس بازی میں لگانے سے دریغ نہ کرتی لیکن اس واقعہ کو پیش آئے دس سال گذر چکے ہیں۔ اور وہ آجتک مجھے نہیں مِلا۔"

"جس میرا خیال ہے کہ اس وقت میرے دل کے دیوانہ وار دھڑکنے کی آواز ان دونوں عورتوں نے ضرور سُن لی ہوگی۔ میری زندگی کی حسین لیکن گریزپا رفیقا جس تک رسائی ناممکن معلوم ہوتی تھی۔ آخر میرے سامنے چاند کی چاندنی میں جلوہ گستر تھی۔ وہ آزاد تھی۔ اور ہم دونوں ایک دوسرے کی محبت میں سرشار تھے۔ اور محبت بھی ایسی جس کی مثال ابتدائے آفرینش سے آجتک نہیں مل سکتی۔ مجھ میں نہ ہلنے کی سکت تھی اور نہ بولنے کی طاقت۔ اگرچہ اس وقت مجھے بے انتہا مسرت حاصل تھی۔ لیکن ساتھ ہی میرے دل میں ایک ایسا درد بھی پیدا تھا۔ جس کی جگر گدازی سے اس وقت تک میں بالکل ناآشنا تھا۔ میں حیران تھا کہ میں اس درد کے برداشت کرنے کی طاقت کہاں سے لاؤں

آخر انا نے اس کے چہرے پر ایک محبت آمیز نگاہ ڈالکر کہا۔ کہ وہ اب بھی ضرور آپ سے ملے گا۔

اجنبی عورت۔ "ضرور ملیگا" پھر خود ہی اس نے سر ہلا کر کہا۔ "یہ کہاں ہو سکتا ہے"

آخر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور چاندنی میں اس کے قامتِ دراز سے وقارِ حسن کی جلوہ پاشی ہونے لگی۔ اس وقت میں نے پہلی دفعہ اس کے پُرتمکنت اور شگفتہ چہرہ پر افسردگی کا رنگ دیکھا۔

اس نے کہا۔ کہ "میں نے اپنے اور اسکے درمیان بالکل صاف اور کھلا راستہ دیکھا تھا لیکن میرا خیال ہے کہ وہ کہیں بھٹک گیا۔ اب میرے دل میں یہ خیال پختہ ہوگیا ہے۔ کہ وہ مجھے نہیں ملیگا۔ اور وہ راستہ بھول گیا ہے۔"

"میں ان سے دُور کچھ فاصلہ پر سایہ میں بیٹھا تھا میں دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ میرا حیرت انگیز خواب آخر سچ ثابت ہو رہا تھا۔ میں دل میں کہہ رہا تھا کہ اب کسی خطرہ میں نہ پڑونگا۔ میں لوہے کی زنجیروں سے اسے اپنے ساتھ جکڑ رکھونگا۔

"اس کے کچھ دیر بعد سونے کا وقت ہوگیا۔ انا نے مجھے جگایا اور خود مہمان کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دوسری طرف چلی گئی۔ میں بھی اُٹھا اور مجبوراً اپنے کمرہ

کی طرف چلا مجھ پر لرزہ طاری تھا۔ اور میں سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ اور براؤن نے جو میرا ذاتی ملازم تھا میری حالت دیکھ کر کہا۔ کہ "سرکار آپ علی الصباح چھ بجے سفر کرنے کے قابل نہیں ہیں"

یہ بات میرے حاشیۂ خیال سے بھی اتر چکی تھی۔ کہ صبح مجھے اپنے پرانے ملازم کی مدد کے لئے موٹر پر ایک دوسری جگہ جانا ہے۔ اب میرے لئے وہاں جانا محال تھا۔ ممکن ہے کہ میں شام کو واپس آتا اور میری خاتون میرے ہاتھوں سے نکل چکی ہوتی۔ میں حیران تھا کہ کیا کیا جائے۔ کوئی تار گھر بھی قریب موجود نہ تھا آخر میں نے تجویز کی۔ کہ براؤن سے کہہ دوں۔ کہ جب موٹر والا چھ بجے آئے۔ تو اسے واپس بھیج دے۔ اور ساتھ ہی اسے تاکید کر دے۔ کہ گیارہ بجے پھر موٹر لے آئے۔ اس وقت تک ممکن ہے۔ کہ میری خاتون میرے ساتھ سفر کرنے پر آمادہ ہو سکے۔ اور میں اس سے گفتگو کر سکوں۔ اس نے مجھ سے کہا تھا۔ کہ "میں نہیں شاہراہ پر ملونگی" بس جب ہم دونوں شاہراہ پر تنہا جا رہے ہونگے۔ میں اس پر ثابت کر دونگا۔ کہ میں ہی اس کا عاشق ہوں۔ میں جرأت سے کام لیکر اپنا دعوےٰ پیش کرونگا۔ اور وہ میری مخالفت نہ کر سکیگی۔ کیونکہ جس طرح مجھے اس کی ضرورت ہے۔ اسی طرح میری ضرورت اسے بھی ہے۔

وہ رات میں نے آنکھوں میں کاٹی۔ ایک بے پایاں مسرت امڈ امڈ کر میرے دل پر محیط ہو رہی تھی میں حیران تھا۔ اور مجھے اعتبار نہ آتا تھا۔ کہ آخر ہم مل گئے ہیں۔ میری ہستی میں ایک تغیر برپا ہو رہا تھا۔ میری روح میں از سر نو جوانی کی امنگ پہلے سے بھی کہیں زیادہ جوش کے ساتھ پیدا ہو رہی تھی۔ میرے دل سے مسرت کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ کچھ خوف اور خطرہ کا احساس بھی موجود تھا۔ میرے نہاں خانۂ دماغ میں ایک خیال بار بار پیدا ہوتا تھا۔ اور مجھے بیتاب کر دیتا تھا۔ کہ وہ اب بھی کھو جائیگی۔ لیکن میں اس خیال کو زیادہ اہمیت نہ دیتا تھا۔ میرے دل و دماغ میں ہیجان تھا اور میں نے اس خیال کو محض اپنی پریشاں دماغی کا نتیجہ ٹھیرایا۔

"علی الصباح انا چھ بجے سے کہیں پہلے بیدار ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے کمرہ میں اس کے ادھر اُدھر پھرنے اور برتنوں کے اٹھانے اور رکھنے کی آوازیں سنیں۔ مجھے یاد آگیا۔ کہ اس نے کہا تھا۔ کہ صبح اٹھ کر میں خود تمہارے لئے چلتے کا انتظام کرونگی۔ انا کو کھانا پکانے میں خاص دسترس حاصل ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد انا کے ساتھ ایک اور عورت

کے باتیں کرنے کی آواز بھی مِل گئی۔ مَیں فوراً پہچان گیا۔ یہ میری اپنی خاتون کی آواز تھی۔

" میرے لئے اب زیادہ دیر تک بستر میں پڑے رہنا ناممکن تھا۔ مَیں اُٹھا اور لباس تبدیل کرنے لگا۔ ٹھیک چھ بجے جب موٹر پہنچی۔ مَیں کپڑے پہن رہا تھا کچھ دیر تک دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے کا شور ہوتا رہا۔ اس کے بعد موٹر پھر واپس چلی گئی۔ میں کپڑے پہن کر ہوا خوری کے لئے باغ میں گیا۔ لیکن مَیں نے کسی کو نہ پایا۔ مَیں پھر واپس گھر آیا۔ اور دیکھا کہ میرا ملازم میز پر سے چائے کے برتن اُٹھا کر اسے دوبارہ میرے لئے صاف کر رہا ہے۔ مَیں نے اس سے پوچھا کہ تمہاری مالکہ کہاں ہیں؟ اس نے جواب دیا۔ کہ وہ دوسری خاتون صاحبہ کے ساتھ موٹر پر سوار ہو کر چلی گئی ہیں۔ اور آپ کے نام کا رقعہ لکھ کر چھوڑ گئی ہیں۔ اُسی وقت وہ رقعہ مجھ کو نظر پڑا۔ اس میں لکھا تھا

" مجھے افسوس ہے کہ تم اپنی ناسازیِ طبع کے باعث جانے سے معذور ہو۔ لیکن تمہیں فکر نہ کرنی چاہئے۔ تمہاری جگہ مَیں خود جا کر سب انتظام کرلونگی اپنی صحت کا خیال رکھنا۔ اور دوپہر کے کھانے پر میرا انتظار نہ کرنا۔"

" صبح تو مَیں نے جوں توں کر کے گذار دی۔ لیکن جب انا کی کوفت کے ساتھ جب انا کے واپس پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ تو میرا اضطراب دم بدم بڑھنے لگا۔ دوپہر کا کھانا مَیں نے تنہا کھایا۔ اس وقت تک بھی انا کی کوئی خبر نہ ملی۔ مجھے خوف ہُوا۔ کہ کہیں کوئی حادثہ نہ پیش آگیا ہو۔ لیکن مجھے شوفر کی ہوشیاری پر پورا اعتماد تھا انا کو تو آج تک کوئی حادثہ پیش نہ آیا تھا۔ لیکن میری رُوح اس خیال سے بھی کانپتی تھی۔ کہ میری خاتون پر کوئی مصیبت آئے۔

آخر مَیں نے موٹر کے واپس پہنچنے کی آواز سُنی تھوڑی دیر کے بعد انا بھاگتی ہوئی اندر آئی۔ اس نے خوشی سے چلا کر کہا۔" معاملہ اچھی طرح طے ہو گیا۔ براؤن کی زمین بچ گئی۔ اور وہ اور اس کی بڑھیا دادی حد سے زیادہ تمہارے ممنون ہیں۔ مَیں نے انہیں بتایا کہ یہ سب تمہارے ایما سے ہُوا ہے۔ اور چونکہ تمہاری طبیعت ناساز تھی۔ تم نے اپنی جگہ مجھے بھیج دیا مجھے براؤن سے تمہاری طبیعت کی خرابی کا حال معلوم ہُوا تھا۔ چونکہ صرف ڈیڑھ سو پونڈ درکار تھے۔ اس لئے مَیں نے تمہیں بیدار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اور اس کے لئے مَیں نے اپنا چک دے دیا۔ میرے وہاں پہنچنے پر وہ حیران و ششدر رہ گئے۔ انہیں اپنی احسانمندی کے اظہار کے لئے الفاظ نہ ملتے تھے۔ بیچاری بڑھیا

نے تمہیں ہزاروں دُعائیں دیں"۔

"آخر مَیں نے پُوچھا" ہاں یہ تو کہو۔ تمہاری مہمان ہوا خوری سے محظوظ بھی ہوئیں؟"

انا۔ ہاں وہ بہت خوش ہوئیں۔ اس وقت میرے جی میں رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا۔ کہ کاش میری جگہ تم اُن کے ساتھ موٹر پر سوار ہوتے۔ ہوا مردہ جسم میں جان ڈالنے والی تھی۔ نگاہ کے سامنے نیلے آسمان کے سوائے کوئی چیز حائل نہ تھی۔ ایسا دلچسپ نظارہ میں نے آجتک نہ دیکھا تھا۔ میری مہمان نے کہا۔ کہ مَیں اس منظر کو کبھی نہ بھولوں گی"۔

مَیں۔ وہ سفر سے تھک تو نہیں گئیں؟

انا۔"نہیں، وہ کہتی تھیں۔ کہ مَیں کبھی نہیں تھکتی۔ بلکہ اگر وقت ہوتا تو وہ تمام راستہ پیدل چلنے پر بھی آمادہ تھیں۔ لیکن چونکہ کل کی بارش سے اُن کی روانگی میں پہلے ہی توقف واقع ہو چکا تھا۔ اس لئے اُنہوں نے سواری کو غنیمت جانا۔ رفل سٹیشن کے پاس ایک چوراہے پر میرا اُن کا ساتھ چھوٹا تھا۔ جیرالڈ وہ ایک غیر معمولی عورت تھی"۔

میرا جسم بالکل سرد ہو گیا۔ مَیں نے کہا۔" تمہارا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ وہ چلی گئیں؟"

انا۔ ہاں سہ شنبہ کے دن وہ جنوبی امریکہ روانہ ہونے والی ہیں۔ یہ مجھے یاد نہیں۔ کہ وہاں جانے کا انہوں نے مقصد کیا بتایا تھا"۔

مَیں۔ اُن کا نام کیا تھا؟

انا۔" میرے ذہن سے بالکل اُتر گیا ہے"۔

مَیں۔ انا تمہارا مطلب یہ تو نہیں۔ کہ تم نے نام اور پتہ پوچھے بغیر انہیں رُخصت کر دیا۔

انا۔ مجھے اس کا خیال تک نہ آیا۔ نہ انہوں نے مجھ سے میری نسبت کوئی سوال کیا۔ اور نہ مَیں نے اُن سے اُن کی نسبت کچھ دریافت کیا۔ لیکن اس کی ضرورت بھی کیا تھی۔ ہمیں اُن کے نام سے کیا سروکار ہو سکتا ہے"۔

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد سنکلیئر نے ایک لمبی آہ بھری۔ اور کہا" افسوس مَیں نے اسے اس وقت کھو دیا۔ جب مجھے اس کے مل جانے کا پُورا یقین ہو چکا تھا۔ میری ان آنکھوں نے اسے دیکھا اور پھر وہ اپنا نشان تک چھوڑے بغیر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ یہ محض فریب خیال نہ تھا"۔

مَیں نے جواب دیا۔" شاید تم اس سے پھر ملو۔ میرے الفاظ اکھڑے اکھڑے تھے۔ مَیں نے کہا ممکن ہے تمہیں اس کے آنے کا خیال بھی نہ ہو۔ اور وہ اچانک تم سے آملے۔

سنکلیر نے مایوسی سے اپنا سر ہلایا۔ اس نے کہا۔ "وہ اب مجھے کبھی نہ ملیگی۔ وہ ہمیشہ کے لئے مجھ سے جدا ہو گئی ہے۔ مجھے یہ اچھی طرح معلوم ہے۔ اور وہ بھی یہ جانتی تھی۔ بس میں اسے کھو چکا! وہ گم ہو گئی!!"
اس کے رنج اور شاندار کرہ میں ان الفاظ کے زیر و بم سے ایک گونج پیدا ہو کر رہ گئی۔ بیچارہ سنکلیر ابتک ناکامی اور نامرادی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس کا عقدہ مشکل حل ہوتا نظر نہیں آتا۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آں کہ یافت می نشود آنم آرزوست

حامد

وجدانیاتِ سُہا

یہ کیا گمانِ عشق در دکا بھی بند وبست ہے
رکھا ہو دل پہ ہاتھ اور کہو کہ "دل بدست ہے"

تُم ایک بار چھیڑ کر جنون کا جوش دیکھ لو
بلا سے وسعت و فضائے دہر تنگ و پست ہے

تمہیں تو کیوں خبر ہو اپنی عادتِ گریز کی
مجھی کو ہاں بجا کہا "عجب دراز دست ہے"

نہ پوچھ ہمنشیں بناؤ یا بگاڑ عشق میں
یہاں تو پائداریِ مکانِ دل شکست ہے

نشاطِ لطفِ دید اور رنگ حسن کیا کہوں
ابھی تک اس کی بزم میں خیال مے پرست ہے

ہم اُس کو ڈھونڈتے ہیں جلوہ ہائے کائنات میں
شباب جس سے شوخ ہے شراب جس سے مست ہے

کچھ اس طرح سے زندگی گزارتا ہوں مَیں سُہا
نہ انتشارِ نیستی، نہ اعتبارِ ہست ہے

بقائے اشکال

پروفیسر حامد جمال کی ناگہانی موت، مرزا محمود کی حیرت انگیز دیوانگی، تمام ایک ہی سلسلۂ واقعات کی مختلف کڑیاں ہیں۔ جو حوادث کے بے پناہ اثر سے مجبور ہو کر منتشر ہو گئیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے گویا اب ایک مخبوط الحواس نے اپنی آخری لمحات میں پوری قوت سے کام لیکر تمام واقعات کو بمدارج ترتیب دے دیا ہو۔

یہ ایک اور بات ہے کہ ضمناً اس امانت کو صفحۂ کاغذ پر منتقل کرتے ہوئے۔ میں ایک صادق دوست کی آخری تحریر کو زندہ جاوید کر رہا ہوں۔

اگرچہ مندرجہ ذیل سطور سے مرزا محمود کی بیگناہی تو ثابت نہیں ہوتی۔ مگر یہ کیا کم ہے کہ اس کا قصور بہت کچھ تخفیف اختیار کر لیتا ہے۔ ہم میں سے کتنے ہیں جو کہہ سکتے ہوں۔ کہ وہ اپنی زندگی میں بڑی سے بڑی آزمائش اور سخت سے سخت امتحان میں جادۂ راست سے کبھی نہیں ڈگمگائے۔ اس بے معنی سے عذر کے ساتھ جو اپنی حقیقت میں بہت کچھ نسوانیت رکھتا ہے۔ میں اس بات کا فیصلہ ناظرین پر چھوڑتا ہوں۔ کہ محمود اپنے طرز عمل میں کہاں تک گنہگار تھا۔

مجھے مطلع کیا گیا ہے کہ میں دنیا میں صرف چند گھنٹوں کا اور مہمان ہوں۔ یہ خبر خلاف معمول میرے لئے بہت کچھ خوشگوار ہے۔ وہ دنیا جہاں فطرت کی تصنیف لطیف بیک جنبش نگاہ ایک مرد کی ہستی کو برباد کر سکتی ہے۔ قابل اقامت نہیں۔ آپ سمجھے؟ فطرت کی تصنیف لطیف یعنی عورت۔ کسی نے اسی جنس کو "موسیقی اعتدال اور نزاکت کا مجموعہ" بھی کہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس نے اس کہنہ کتاب کو بہت ہی سرسری نظر سے دیکھا ہے۔ یہ ایک چیز کا ایک تاریک پہلو ہے۔ وہاں آپ خباثت، انتقام سیاہ کاری اور بدنیتی کو نمایاں حروف میں پڑھ سکتے ہیں

مگر یہ پہلو عام نگاہوں سے چھپا رہتا ہے۔ اس کی وجہ بھی جانتے ہو۔ عورت کی ایک خصوصیت امتیازی حسن بھی ہے۔ عورت اس کے بغیر عورت نہیں، حسن عام طور پر مردوں کے لئے ایک ایسی جاذب نظر شے ہے جس سے گریز کرنا ان کے حیطۂ اقتدار سے باہر ہے وہ عورت کے حسن کے لئے سب کچھ گوارا کر لیتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ وہ اس کے تاریک پہلو کو چھپانے کی

کوشش کرتے ہیں اگر کوئی اس پہلو کو نمایاں کرنا چاہتا ہے تو عورتوں سے زیادہ مرد اس کی مخالفت پر تل جاتے ہیں کبھی میں بھی حیات معاشقہ کے خواب دیکھا کرتا تھا اٹھتے بیٹھتے یہی خیال مد نظر رہتا تھا۔ مگر اب وہ زمانہ بدل گیا۔ طبیعت میں انقلاب پیدا ہو گیا۔ مجھے اس پاگل خانے تک پہنچانے والی بھی ایک عورت ہے۔ یہ کہانی بہت دلچسپ ہے۔ سنوگے تو حیران ہو گے۔ کبھی کبھی خیال پیدا ہوتا ہے کہ قدرت نے عورت کے ہاتھ میں اسقدر زبردست ہتھیار دینے میں کیا مصلحت سوچ رکھی ہے حسن کے علاوہ، اور بھی بہت سے ایسے لوازمات ہیں جو اس کی فطرت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ مثلاً اظہار محبت یہ ایک بہت زبردست حربہ ہے۔ عورت اگر سچ بھی کہدے کہ "مجھے تم سے محبت ہے" تو تباہ کر دیتی ہے چہ جائیکہ اس کا بناوٹ سے یہ کہنا کہ اس صورت میں اسے اپنی تمام دلربائی اور دلستانی کی قوتوں کو کام میں لانا پڑتا ہے۔ جب ایسا موقع پیش آجائے۔ تو کوئی ایسا جرم یا گناہ نہیں۔ جو وہ مرد سے سرزد نہ کرا سکتی ہو۔ دوست کی قدر کون نہیں جانتا جسے ایک بھی سچا دوست میسر ہوا ہے۔ وہ سمجھ سکتا ہے کہ ایک دوست صادق کا حصول نعمائے الٰہی میں سے بہترین نعمت ہے خارزار حیات میں، ایک خوش خو، اور ہم مذاق، راہرو کا وجود، وہ ہستی ہے جو چاہے تو کانٹوں کو پھول بنادے۔ پہاڑوں کو کاٹ کر بہادے۔ دریاؤں کو عبور کر ڈالے کوہستانی زمین کو ہموار کردے۔

مجھے ایک ایسا ہی دوست میسر تھا، وہ فرشتہ نہ تھا اس کی ذات عیب سے مبرا نہ تھی مگر انسان تھا۔ اور اپنے حقیقی معنی میں انسان تھا۔ کیا آپ باور کر سکتے ہیں کہ میں ارادتاً اپنے منصوبہ کی تمام جزئیات پر پورا پورا غور و خوض کر کے۔ پروفیسر حامد جمال کے قتل کا موجب ہونگا۔ مگر اس وقت میری آنکھوں پر دو بہت ہی دبیز پردے پڑے ہوئے تھے: ایک تو نفسانی خواہشات کا وہ نقطۂ کمال جس کی حقیقت ہوس ہے۔ مگر جسے عام طور پر عشق کا خطاب دیا جاتا ہے۔ دوسرے نوجوانی کی وہ بدمستی، جو اپنی اندھا دھند رفتار میں تمام حقوق و فرائض کو پامال کرتی ہوئی قعر مذلت میں جا گرتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر کسی اور تیسرے عذر کی ضرورت ہے تو جان لو کہ وہ ایک عورت کا اکسانا تھا

مجھے اس بات کا درگاہِ خداوندی میں شکر ادا کرنا ہے کہ میری تباہی کے باعث نے، اپنے مطلب کے نکل جانے کے بعد میری دلنوازی نہ فرمائی۔ ورنہ ضمیر کی وہ ملامت جو شرمندگی کی محرک ہو کر صفائے نفس کا باعث ہوتی ہے کبھی وجود میں نہ آتی۔ اگر وہ تکمیل کار

کے بعد کہیں میری طرف مائل ہو جاتی تو خدا جانے اس ورطۂ ہلاکت میں پھنس کر کہاں جانا ہوتا۔ خدا کرے۔ وہ کسی اور جگہ میری طرح کسی اور بھولے نوجوان کو اپنے پھندے میں نہ پھنسا رہی ہو۔

میں اور پروفیسر حامد جمال ایک ہی جگہ پیدا ہوئے ایک ہی جگہ بڑھے اور ایک ہی جگہ طفولیّت کی معصوم وادیوں سے نکل کر شباب کی خطرناک اور پُرشور ندیوں میں آپڑے۔ اس کا نتیجہ جو کچھ ہونا تھا۔ وہ ظاہر ہے سالہاسال کے ربط ضبط نے، ہم دونوں میں وہ موانست باہمی پیدا کر دی تھی۔ جو دو بھائیوں میں ہوتی ہے۔ حامد جمال بچپن ہی سے وہمی اور عجوبت پسند واقع ہُوا تھا۔ اس کا نام اُسی کے لئے موزوں تھا۔ سڈول بدن۔ بھرے بھرے ہاتھ پاؤں، گول چہرہ۔ ابتک اس کی بھولی صورت میری آنکھوں کے سامنے آکر، گویا ملامت کرتی ہے۔ کہ واہ خوب دوستی کا حق ادا کیا۔

شروع ہی سے اس کی حرکات و سکنات سے اس افتاد طبیعت کے آثار نمایاں تھے۔ جو آخری عمر میں اسکی ہلاکت کا باعث بننے والی تھی۔ اس کا چہرہ بچپن ہی میں ایسی پختہ کاری کا رنگ لئے ہُوئے تھا کہ باوجود اسقدر عرصۂ بعید کے بھی مجھے یہ واقعہ اچھی طرح یاد ہے کتابوں کی طرف۔ وہ بہت کم خیال کرتا تھا۔ البتہ کتابِ فطرت کا مطالعہ اس کے لئے ایک نہایت ہی جاذبِ نظر شے تھی۔ عہدِ طفولیت کے اوائل میں جب معصومیت جواہرات اور سنگریزوں کو ایک ہی ترازو میں تولتی ہے۔ اطمینان اور فارغ البالی کمسنی کے دوش بدوش چلتی ہے۔ اس کی عادت تھی کہ شہر سے باہر وہ دیہات کی کھلی ہوا میں نکل جاتا۔ اور کسی چشمے کے کنارے اگر رات ہو، تو اختر شماری کرتا۔ اور اگر دن ہو تو پانی کی شفاف بلوریں گہرائیوں کی طرف تاکتا رہتا۔ اُس چھوٹی سی عمر میں وُہ کائنات کے رموز سربستہ کے انکشاف کی فکر کرتا رہتا خنداں پھول اور سربند غنچے ہمیشہ اُس کی دستبرد کے شاکی رہتے۔ اس وقت میں تقاضائے سن، یا شوخیِ طبع سے اُسے چھیڑتا رہتا۔ مگر سخت سے سخت تعریض کبھی اس کے دل پر گراں نہ گذرتی تھی۔ اسی کھیل کود میں روزگار نے ۱۶ ورق اُلٹ دِئے تھے۔ اور اب وہ وقت قریب آپہنچا تھا۔ جب میں اور حامد جمال جُدا ہونے والے تھے۔ امتحان انٹرنس کے بعد حامد جمال تو اپنے والدین کی معیت میں لکھنؤ چلا گیا اور مجھے تقدیر کی گردش پرکار کی طرح روزی کے چکّر میں لئے پھرتی رہی۔

.. ..

اس کے بعد ہماری پہلی ملاقات ایک اتفاقی امر تھا۔ یہ بھی کتنی عجیب و غریب بات ہے کہ انسان کی

زندگی کے تمام اہم حادثات ایک "معمولی اتفاقی امر" سے شروع ہوتے ہیں۔ جب خوشی کی امید بھی موہوم ہوتی ہے تو خوش نصیبی ایک سیلاب عشرت بنکر تمام رنج والم کو ڈبو دیتی ہے۔ جس وقت غم و مصیبت کا سان گمان بھی نہیں ہوتا۔ سر پر الم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔ اگر یوں نہ ہو تو زندگی کے نشاط آور لمحے اپنی دلچسپی اور دل آویزی کو کھو بیٹھیں، اور موت۔ کا ناگہانی حادثہ جس کی اہم ترین شق اس کا بے خبر وارد ہونا ہے خوف سے خالی ہو جاتے۔ ہم دونوں آپس میں بے تکلف دوستوں کی طرح ملے۔ مگر اب حامد جمال وہ حامد جمال نہ تھا جسے میں بچپن میں جانتا تھا۔ وہ اب جرمنی کا پی۔ ایچ۔ ڈی اور امریکہ کا ایک مشہور قانون دان تھا۔ اس کی شہرت دُور دُور تک پھیل چکی تھی۔ مادہ کی نسبت اس کے انکشافات نے علمی دنیا میں ایک ہلچل مچا دی تھی۔ بقائے اشکال کی نسبت جو نظریئے پروفیسر حامد جمال نے وضع کئے تھے۔ ان کی نسبت محققین کا خیال تھا کہ وہ مادہ کے مختلف مظاہر جسمانی کی نسبت جو کچھ ہمیں معلوم ہوا ہے اس میں ایک نئے باب کا اضافہ کرینگے۔

میں یہاں اس کے نظریئے کی نسبت بحث نہیں کرنا چاہتا۔ آئندہ سطور میں اس مسئلے پر کافی سے زیادہ روشنی پڑیگی۔ سر دست مجھے اس ہستی کا ذکر کرنا ہے جو اس تمام کشت و خون کا باعث ہوئی۔

پروفیسر جمال نے اپنی دوسری ملاقات کے موقع پر میرا تعارف۔ ایک شعلہ روزگار سے کرایا۔ جن کی نسبت اُس کے تعارفی کلمات مجھے اب تک یاد ہیں۔ پروفیسر نے کہا "میں آپ کا تعارف مس خورشید سے کروانا چاہتا ہوں۔ آپ ایک نہایت ہی قابل و فاضل خاتون ہیں۔ اور السنہ مشرقی کے علاوہ کئی مغربی زبانوں پر عبور رکھتی ہیں۔"

اس نے مجھ پر ایک غلط انداز نگاہ ڈالی پھر تبسم سے مجھ سے مصافحہ کیا۔ اور نہایت ہی شیریں اور سلیس زبان میں کہا۔ "میں آپ کا ذکر اکثر پروفیسر صاحب کی زبانی سن چکی تھی۔ بچپن کے دوست ہمیشہ بہترین رفیق ثابت ہوئے ہیں۔"

لکھنے کو تو میں یہ فقرات لکھ گیا ہوں۔ مگر اس کیفیت کا بیان کرنا جو اسے دیکھ کر مجھ پر طاری ہو گئی۔ بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔ کبھی تم نے اندھیری رات میں آسمان پر کالی گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی دیکھی ہے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ غیر معمولی طور پر کہیں سے ایک بادل کا ٹکڑا سرک جاتا ہے۔ اور دُور بہت دور ایک سُرخ یا سفید ضوفشاں ستارہ ظاہر ہوتا ہے جو اردگرد کی "باراں تاریکی" کی وجہ سے اپنی حیثیت سے زیادہ

شوخ اور پُرنور معلوم ہوتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے۔ گویا اس کی روشنی آنکھوں میں چھپی جاتی ہے۔

عین اسی طرح میری زندگی کے آسمان پر ایک درخشاں ستارہ طلوع ہُوا۔ ابتک تو حیات کے افق پر کوئی روشنی نہ تھی۔ میری زندگی گویا ایک تاریک لبادے میں لپٹی ہُوئی تھی آرزوؤں کا طوفان منجمد اور ساکن تھا۔ مجھے گرد و پیش کی ہر ایک چیز بازاری اور سوقیانہ معلوم ہوتی تھی۔ خورشید کو دیکھتے ہی یہ معلوم ہُوا گویا دُنیا میرے لئے تبدیل ہو گئی۔ ہر ایک شے سرشاری سے لبریز ہو گئی "مطرب جنون، ترانہ نواز ہونے لگا" جس طرح موسم بہار میں اُجڑے ہوئے باغ پھر آباد ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح میرا ساکن دل متحرک ہو گیا مجھے یوں محسوس ہوتا تھا۔ گویا میں کسی ناخوشگوار خواب سے جاگ اُٹھا ہوں۔ اور اب حقیقت میں دُنیا کو اُس کے اصلی رنگ میں دیکھ رہا ہوں۔ میں خورشید کے حلیہ کو بیان کرنے کی ناکام کوشش نہ کرونگا۔ شاعروں اور ادیبوں کی طرح اُسے زہرہ کا ثانی نہیں بناؤں گا۔ اگرچہ یہ بھی ایک حقیقت نفس الامری ہے۔ کہ ایک عاشق کی نگاہ میں معشوق ہی تمام کمالات انسانی کا مجموعہ ہے۔ اور اس کا مبالغہ دراصل حسن ظن کی خوش اعتقادی پر مبنی ہے۔ میں صرف اس بات کے بیان کرنے کی کوشش کرونگا کہ اس میں اور غیر معمولی عورتوں میں جو فرق تھا، وہ ظاہر ہو جائے۔

معمولی دوشیزہ کی طرح اس کے انداز میں شرمگیں غیر ارادی، قوت دلربائی نہ تھی۔ جو بار بار کے حملوں سے لشکر صبر و ضبط کو شکست دیتی ہے۔ بلکہ ایک تمکنت آمیز شوخی تھی۔ جس میں لگاوٹ کا پہلو نمایاں تھا۔ اور یہ شوخی ایسی اضطراب آمیز شوخی تھی۔ کہ بیک ادائے ناز متاع صبر کو تہس نہس کر دینے کے لئے کافی تھی۔

اس کی نیلگوں۔ سیاہی مائل آنکھوں میں جذبات کا ایک طوفان تھا کہ اُبل رہا تھا۔ اُن میں فطرتی حیا نہ تھی جو ایک دوشیزہ کا خاصہ ہے مگر اُن میں مسحور کر دینے کی قوت تھی۔ میں نے اس کے بعد کئی دفعہ دیکھا ہے۔ کہ جب وہ خاص اسی مقصد سے کسی کی طرف دیکھتی تو یوں محسوس ہوتا تھا۔ گویا اس کی آنکھوں میں دو ستارے ہیں۔ جن کی مقناطیسی چمک دل کو بے اختیار کھینچتی ہے اُس وقت تو مجھے خیال نہیں آیا۔ مگر اب غور کرتا ہوں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی مقناطیسی کشش تھی۔ جو ایک سانپ کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔ اور جس کی وجہ سے اُس کا شکار زد سے باہر نہیں جا سکتا۔

میں اپنے خیالات میں غرق تھا۔ اور اپنی طبیعت کی کایاپلٹ پر غور کر رہا تھا کہ پروفیسر حامد جمال نے کہا۔

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ مس خورشید میرے نظریۂ احتمال پر پورا پورا یقین رکھتی ہیں۔ حالانکہ ارباب نظر کے نزدیک اس کی صداقت ابھی مسلم نہیں۔"

میں نے اپنے آپ کو سنبھالا جس طرح کوئی شرابی مدہوش ہو کر سنبھلنے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ مگر میری زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "نظریۂ احتمال"

میں سوچ رہا تھا۔ کہ مس خورشید کا حامد جمال سے کیا تعلق ہے۔ حامد جمال ہنس پڑا۔ اور خورشید نے مسکرا کے میری طرف دیکھا۔ گویا میری بیخودی کو سرزنش ناز سے متنبہ کیا جا رہا تھا۔

"آپ اس وقت کیا سوچ رہے تھے؟"

میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ خورشید آرام کرسی پر ایک ہاتھ رکھے۔ دوسرے ہاتھ سے اپنی چوڑیوں کو کلائیوں میں پھرتی جاتی تھی۔ اور میری طرف استفہامیہ انداز سے دیکھ رہی تھی۔

میں نے محجوب ہو کر جواب دیا "کاروبار کی نسبت کچھ تردوات نے آگھیرا تھا۔"

پھر گویا عذر کے طور پر "آپ جانتے ایک کاروباری آدمی کی زندگی بہت ہی مصروفیت کی ہوتی ہے۔"

اس نے نہایت ہی آہستہ آواز میں کہا "بیشک"

اس کے بعد ایک ناگوار خاموشی طاری رہی۔ خورشید کھڑکی میں سے باہر جھانک رہی تھی۔ اور پروفیسر حامد جمال کسی گہری سوچ میں مستغرق تھا۔

آخرکار میں نے اس مہر خاموشی کو توڑا۔ "ممکن ہے کہ یہ بات آپ کے جذبات خودستائی کے لئے ناگوار ہو۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ میں ابھی تک آپ کے نظریہ کو نہیں سمجھا۔ کیا آپ کوشش کریں گے۔ کہ آپ کا ایک پرانا دوست آپ کے معتقدین کے زمرے میں داخل ہو جائے۔"

حامد جمال نے مڑ کے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک انبساط کی چمک تھی۔ مگر اس چمک میں ایک انداز غرور بھی تھا ایسی چمک میں نے ایک گانے والے کی آنکھوں میں دیکھی ہے۔ جب اسے کمال فن پر داد دی۔ اس نے مس خورشید کی طرف سائلانہ انداز سے دیکھا۔ پھر اپنی بھویں سکیڑ کر کہنے لگا۔

"کیا تم میری بات کا یقین کرو گے؟"

میں نے جواب دیا "یہ تو آپ کے بیان پر منحصر ہے؟"

حامد نے میری طرف گھور کے دیکھا سامنا سرخ لال لال دیدے۔ کان کی لویں تمتماتی ہوئی۔

"میرا بیان صداقت سے لبریز ہو گا۔ مگر بعض اوقات

صداقت، جھوٹ کی طرح پُر تصنع اور ناپائیدار معلوم ہوتی ہے۔ اس وقت سادگی اور بے عقلی صداقت کا مضحکہ کرتی ہے۔ مگر یاد رکھو۔ دُنیا میں ہزاروں ایسی اشیاء ہیں جن کا علم انسان کو نہ ہو تو بہتر ہے **فطرت** کے انکشافات تعجب خیز ہی نہیں خطرناک اور مہیب بھی ہیں۔ عام انسانی نگاہیں ان کی تاب نہیں لاسکتیں معدودے چند ہستیاں جو تکمیل مقصد کو خوف پر حاوی پاتی ہیں۔ انکشافات فطرت کو آلۂ انتقام بنا لیتی ہیں۔ اس حالت میں فطرت ظالم اور مظلوم دونوں کو تباہ کر دیتی ہے۔ کہ اس کے رموز کے جاننے والوں میں سے کوئی باقی نہ رہے۔ میں نے بھی ایک اسی طرح کا انکشاف کیا ہے۔ اول اول میرا دل بھی ان تمام جذبات سے لبریز تھا۔ مگر کچھ مدّت کے تلخ تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ فطرت کو دھوکہ دینا ممکن نہیں۔ اگر میرے خیالات درست ثابت ہوتے اور میں اپنی سی قوت کو ہر بنی نوع انسان میں ودیعت کر سکا۔ تو دُنیا کے معاشرتی اور تمدنی حالات میں اہم تبدیلیاں ہونگی جرائم کبیرہ کی تعداد بہت گھٹ جائیگی۔ مظلوم ظالم سے عدالت کی وساطت کے بغیر بدلہ لے سکیگا۔ کتبہائے تعزیرات میں سے بہت سے جرائم کا نام نکال دیا جائیگا کیونکہ عدالت میں [illegible] ایسے مقدمے پیش نہ ہونگے۔"

جب حامد نے گفتگو شروع کی تھی تو وہ بہت آہستہ بول رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی آواز بلند ہونے لگی۔ اس کے لہجے میں تندی اور تیزی آگئی۔ آخری فقرہ تو اس نے اس زور سے کہا تھا کہ تمام کمرہ اس کی پاٹ دار آواز سے گونج اٹھا

میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "آخر وہ کیا ایسا انکشاف ہے۔ جس کے کارنامے صفحۂ تاریخ پر ثبت ہو جائینگے۔" پروفیسر حامد جمال نے مرعوب کن اور پُراسرار لہجے میں کہا۔ "بقائے اشکال"

میں خاموش رہا۔ بقائے اشکال، میں سن تو کئی دفعہ چکا تھا۔ مگر یہ نہ جانتا تھا۔ کہ یہ بقائے اشکال ہے کیا چیز۔ اتنا معلوم تھا کہ حامد جمال نے اس کی نسبت کوئی نیا کلیہ وضع کیا ہے۔

"بقائے اشکال، سُننے میں تو ایک معمولی سا لفظ ہے۔ مگر اس کی ماہیت پر غور کرو گے تو کانپ اُٹھو گے۔ مختلف اعمال کے ذریعے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ قدیم فلسفہ کے موافق نہ صرف مادہ ہی ایک قدیم شے ہے۔ بلکہ ہر وہ صورت جو مادہ اپنے عمل اور ردعمل کے متباین درجوں میں اختیار کرتا ہے۔ قدیم ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی تخلیق کردہ شے فنا نہیں ہو سکتی۔ مگر چونکہ مادہ کے مظاہر میں ایک خفیف سا

تغیر و تبدّل ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے ہماری باشعور کیفیت ارادی مدھم ہوتی جاتی ہے۔ اور ہم مظہر کے تبدل کو فنا کے لقب سے پکارتے ہیں۔ اگر کوئی شخص پوری پوری قوت ارادی سے کام لے تو یہ ناممکن ہے کہ اس کا وجود کوئی دوسری شکل اختیار کر سکے۔ اس قوتِ ارادی کا کام اسی وقت سخت ہوتا ہے۔ جب مادہ کے مظاہر میں تغیر و تبدّل ہونے لگتا ہے اس وقت جو شخص اپنی کیفیت شاعرہ کو بہمہ وجود سالم و قائم رکھ سکیگا۔ اس کی حیثیت جسمانی قدیم ہو چکی۔"

مَیں نے پریشان ہو کر کہا۔" تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ دنیا میں کوئی شخص کسی کو قتل نہ کر سکیگا اور تمام اشخاص زندہ جاوید ہو جائینگے۔"

"بیشک۔ اگر ان میں میری سی قوت ارادی پیدا ہو جائے۔"

. . . .

یہ تھا وہ نظریہ جو پروفیسر کی موت کے ساتھ قبر میں چلا گیا۔ اس کی صداقت یا عدم صداقت آئندہ صفحات سے ظاہر ہوگی۔ یہاں مَیں صرف اُن واقعات کا ذکر کرونگا۔ جو آخر کار پروفیسر حامد جمال کی موت کا باعث بنے۔

اس گفتگو کے بعد مَیں اٹھ کر چلا آیا۔ کیونکہ میرا دماغ اسقدر پریشان اور خیالات اسقدر منتشر ہو چکے تھے کہ وہاں بیٹھنا تضیع اوقات تھا۔ راستہ بھر میں حامد جمال کی تقریر پر غور کرتا آیا۔ کبھی تو مجھے اس کی باتوں پر ہنسی آتی۔ کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ انسان ہمیشہ زندہ رہے اور اسے کبھی موت ہی نہ آئے۔ پھر اس کی تمہید، اس کی سنجیدہ نگاہیں، اس کی قوی دلیلیں میرے شبہات کے مقابلے میں آتی تھیں۔ مشاہدے اور قیاس کا مقابلہ تھا۔ کبھی پروفیسر کے پلہ بھاری رہتا اور کبھی تجربہ اور مشاہدہ، اس کے مدلل دعووں پر غالب آجاتا۔ آخر کار اس حیص بیص میں گھر پہنچا اور تکان کی وجہ سے فوراً ہی نیند آگئی۔

. . . .

اب میں اپنی داستان کے اس حصے تک آپہنچا ہوں جہاں ناظرین میری بیگناہی اور گنہگاری کی نسبت فیصلہ کرینگے۔ آزمائش و ابتلا کا مقابلہ کرنا ہنسی کھیل نہیں۔ اور خاصکر جب آزمائش ایک عورت کی طرف سے جاری ہو۔ اس پر محبت کی مجبوریوں کو ایک اور طرۂ امتیاز سمجھ لیجئے۔ اور پھر خیال کیجئے کہ اس وقت جب ایک حسین عورت اپنی تمام دلستانی کی قوتوں کو صرف کر دے۔ صرف اس لئے کہ وہ اپنی قوتِ ساحری کا امتحان کرنا چاہتی ہے کتنے جوانمرد

ہیں۔ جو ثابت قدمی سے اپنی حسیات کی سرد مہری کا نمونہ پیش کر سکتے ہیں۔

"دل سنگ و خشت" نہیں ہوتا کہ درد سے "بھر نہ آئے۔" جب بڑے بڑے مرد میدان، اس معاملے میں ہار گئے۔ تو میری کیا حقیقت تھی۔ ایک ادنیٰ ال دواں، طوفان ہوا کے سامنے گھاس پھوس کیا حقیقت رکھتے ہیں۔

خیر! پروفیسر سے جمال سے ملے ہوئے مجھے ایک عرصہ ہو چکا تھا۔ اور میں چاہتا تھا کہ اور کچھ نہیں تو اپنی دوستی کا ثبوت دیتے وقت ضمناً اپنی آرزوؤں کی ملکہ خورشید کو بھی دیکھ لونگا۔ یہ ایک قسم کی خود غرضی اور دھوکہ دہی ہے۔ مگر نفسیات محبت کو سمجھنے والے جانتے ہیں۔ کہ جہاں محبت انتہائی درجہ کے ایثار اور نفس کشی کی محرک ہوتی ہے۔ وہیں اس کے بعض مرکب جذبات خود غرضی اور سفاکی میں جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ جس محبت کا عنصر جوش و خروش نہ ہو۔ وہ محبت ہی نہیں کہلائی جا سکتی۔ عام طور پر تجربہ کیا گیا ہے کہ رشک و رقابت کے تباہ کن اثرات محبت کے پاک جذبے کو ایک ایسی حقارت و نفرت کے زہریلے خیال سے لبریز کر دیتے ہیں۔ جن کی آخری حد صرف الم و رنج تک ہی ختم نہیں ہوتی۔ بلکہ جو ایسی شرمناک حرکات کا باعث ہوتے ہیں جن کا بیان تحصیل حاصل ہے۔ انطونی اور قلوپطرہ۔ اس جذبے کا نقطہ ہائے کمال ہیں۔ اور یوسف و زلیخا ابتدائے کار۔

شام کے آٹھ بجے کا وقت تھا۔ چاندنی رات تھی اور اتفاق کی بات کہ رات بھی چودھویں۔ پروفیسر کا مکان شہر سے باہر واقع تھا۔ میں شہر سے باہر نکلا۔ تو عجیب منظر درپیش ہوا۔ در و دیوار روشن ہو رہے تھے چاندنی کا کھیت کرنا شاید اسی کو کہتے تھے۔ درختوں کے مرتعش پتوں پر یہ سیمیں روشنی پڑتی۔ اور چھنتی ہوئی تاریک سایوں میں غائب ہو جاتی۔ وہ سہانی رات وہ دلآویز وقت، وہ روح افزا مناظر ابتک چشم تصور کے سامنے ہیں۔ وہ مولسریوں کے درخت، وہ گنجان پودے جن میں جگنو چمک چمک کر لعل شبچراغ کا سا عالم پیدا کر رہے تھے۔ وہ چاروں طرف کی منجمد خاموشی گویا فطرت سو رہی ہے۔ مجھے کیا خبر تھی کہ ایسے باامن وقت میں بھی بدی کی قوتیں بیدار رہتی ہیں۔

میں ایک عالم مدہوشی میں پروفیسر صاحب کے ہاں پہنچا۔ گھنٹی بجائی اور کمرۂ ملاقات میں داخل ہو گیا۔ پہلے تو مجھے یوں معلوم ہوا گویا تمام کمرہ بالکل تاریک ہے کرسیاں صوفے اور میز دھندلی سی دکھائی دے رہی تھیں۔ پھر غور کرنے سے معلوم ہوا کہ کمرے کی دائیں طرف

ایک مکلف صوفے پر کوئی شخص لیٹا ہے۔ اس کے قریب ہی ایک میز پر ایک بجلی کا لیمپ رکھا ہے جس کی سرخ روشنی اردگرد کی چیزوں کو گرداحمر کا رنگ بخش رہی ہے

مَیں نے آواز دی "حامد جمال"

اس کے جواب میں مجھے ایک آواز سُنائی دی۔ نقرئی گھنٹی سے زیادہ ترنم۔ اور شہد مصفا سے زیادہ شیریں۔ "تشریف لائیے مرزا محمود صاحب"

مَیں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا تو گویا مجھ پر بجلی سی گر پڑی۔ قدم جہاں تھے وہیں جمے کے جمے رہ گئے سکتہ سا ہو گیا۔ یا اللہ کیا مَیں خواب دیکھ رہا ہوں۔ یہ کیا طلسمات کا عالم ہے۔

خورشید ایک جوگیا رنگ کے لباس میں ملبوس صوفے پر لیٹی تھی۔ اُف، وہ تصویر میری آنکھوں کے پردوں کو چیر چیر کر میرے دماغ میں خونیں نقوش میں ثبت ہوتی جاتی ہے۔ بہت آنکھیں بند کرتا ہوں۔ مگر وہ نقشہ ہے کہ پتلیوں میں سمایا جاتا ہے۔

اس کے لوچدار بدن کی تمام گولائی۔ اس کے لباس سے عیاں تھی پھنسی ہوئی آستینوں کی کرتی سرخ مخمل کی شلوار۔ بال کھلے اور بل کھاتے ہوئے شانوں پر ڈال دئے گئے تھے۔

مَیں قریب گیا اور جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ابھی تک میرے حواس بجا نہ تھے۔ مَیں اس کی طرف اس انداز سے دیکھ رہا تھا۔ گویا وہ کوئی عجوبہ کار کرشمہ ہے۔ جو ابھی دُنیا کی ہوا میں تحلیل ہو جائیگا۔ یا کوئی پری ہے جو چشم زدن میں رقص کناں، میری حیران آنکھوں کے سامنے سے غائب ہو جائیگی۔

اس نے مصافحہ کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ مگر مَیں جانتا تھا۔ کہ اگر اس کی انگلیاں میرے ہاتھ سے مس ہو گئیں تو مَیں اپنے آپ میں نہیں رہونگا۔ مَیں نے اس فتنۂ سحر کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ گویا دیکھا ہی نہیں۔ مَیں وثوق سے نہیں کہہ سکتا مگر میرا خیال ہے کہ وہ ایک خاص ادا سے مُسکرائی۔ پھر اُس نے اپنا سر ایک عجیب مضمحل انداز سے نیچا کر لیا۔

مَیں نے انتہائی پریشانی سے پوچھا "کیا دشمنوں کی طبیعت ناساز ہے"

"جی آج صبح ہی سے میری طبیعت افسردہ سی ہے"

"افسردگی کا باعث"

صدائے برنخواست۔

مَیں نے کچھ عرصہ جواب کا انتظار کر کے کہا "معاف کیجیئے گا۔ آپ جیسی جوان اور حسین خاتون کے لئے افسردہ خاطر ہونا شباب کی حسیات کی سخت ناقدری ہے"

اس نے میری طرف غور سے دیکھا۔ گویا میرے فقرے

سے کوئی خاص معنی اخذ کرنا چاہتی تھی۔

"شاید۔ عام لوگوں کی طرح آپ بھی شباب کو عشرت کا مترادف قرار دیتے ہیں"

میں اس فقرے سے کھٹکا۔ پھر ذرا مطمئن ہو کر کہا۔ "عام طور پر عشرت کا نقطۂ کمال شباب کی تکمیل احسن پر منحصر ہے"

خورشید صوفے سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ گویا ایک فتنۂ خوابیدہ بیدار ہوا۔ اور انگڑائی لیکر کہا۔ "آپ شباب کی تکمیل احسن سے کیا مراد لیتے ہیں"

میں نے ذرا جرأت سے جواب دیا۔ "عورت کے جذبات کی ترجمانی کرنے کا مجھے کوئی حق حاصل نہیں مگر مرد کا شباب تو مجموعہ ہے ہوس کاری کی نمائش کا جس میں موسیقی اور عورت کا حصّہ غالب رہتا ہے"

میں نے اپنے خیالات کا اظہار تو کر دیا۔ مگر بعد میں پچھتایا۔ گفتگو اس سرعت سے مجھے تباہی کی طرف لیجارہی تھی۔ جس کا بچاؤ اب محال نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ میں نے سلسلۂ کلام کو بدلنے کی کوشش کی۔

"پروفیسر صاحب کہاں تشریف لے گئے ہیں"

اُس نے گویا میرے سوال کو سُنا ہی نہیں۔ اور میری طرف ایک گہری نگاہ ڈالی۔ "میں آپ کو بتاؤں عورت کے شباب کی تکمیل کن اجزا سے ہوتی ہے۔ عورت کے شباب کی تکمیل ہوتی ہے محبت سے۔ سمجھے آپ، محبت سے۔ جس عورت نے اپنی حسیات کو محبت کی تلخی سے آشنا نہیں کیا۔ اس نے گویا ابھی تک زندگی میں قدم ہی نہیں رکھا۔ ۔ ۔ ۔ کیا آپ نے بھی کسی سے محبت کی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

اور یہ کہتے ہوئے وہ برق کی سی تیزی سے اُٹھی اور میری کرسی کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ اس کے کپڑے میرے بدن سے چھو رہے تھے۔ اس کا معطر و معنبر سانس میرے رخساروں کو گرم محسوس ہو رہا تھا۔ مجھ پر ایک خود فراموشی کا عالم طاری ہو گیا۔ کسی نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے جنت میں پہنچا دیا۔ میں اپنی جگہ سے اُٹھا اور اس کے ہاتھوں کو تھام لیا۔ مگر اس کی جانب سے کوئی مدافعانہ کوشش عمل میں نہیں آئی۔ میں خود بخود اس کی طرف کھنچتا گیا۔ اور آخر کار اس کے آتشیں رخسار جو اب پسینے سے گل شبنم آلود کا نقشہ پیش کر رہے تھے۔ میری چھاتی سے آ لگے۔

محبت کی باتیں کچھ سرگوشیوں میں ہی اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ میں نے اس کے کان میں آہستہ سے کہا "اب تمہیں معلوم ہوا میں کس سے محبت کرتا ہوں"

اس نے شرما کر گردن جھکالی۔ مگر میں نے ٹھوڑی پہ ہاتھ رکھ کر گردن اونچی کی اور کہا۔ "خورشید اف مجھے تم

سے کسقدر محبت ہے۔ گویا تم میرے تمام بدن میں سمائی ہوئی ہو۔ میں تمہارے بغیر ایک لمحہ زندہ نہیں رہ سکتا"

اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اور کہا۔ "کیا تم اپنی محبت کا کوئی ثبوت دینے کے لئے تیار ہو؟"

میری آواز وفورِ جذبات سے لبریز تھی۔ "ثبوت! کیا میرا دھڑکتا ہوا دل، میری تیز نبض، میری وارفتگی محبت کے صادق گواہ نہیں ہیں۔ خورشید تم عورت ہو، اور عورت کی فطرت تو اظہارِ تعشق کے بغیر جذبے کی تہ کو پا لیتی ہے۔ تمہاری صورت کی ایک جھلک میرے دل میں اُمنگوں اور آرزوؤں کا ایک طوفان پیدا کر دیتی ہے۔ تمہاری قربت میں نہ معلوم میرے لئے کیا کیا لطف مضمر ہیں۔ اگر لطیف سے لطیف احساسات رنگین سے رنگین جذبات کا ایک مجموعہ ہو سکتا ہے جس کے مختلف النوع رنگ اپنی پوری صفائی میں قوسِ قزح کی آرائش اور دریائے رواں کی مترنم سادگی کو شرماتے ہوں۔ تو حقیقت میں میرا دل اسی طرح کے احساسات سے لبریز ہے تمہیں دیکھ کر میرے دل و دماغ اس قسم کے اضطراری سرور سے آشنا ہو جاتے ہیں۔ گویا کسی نے مجھے شراب پلا دی ہو غیر اختیاری حرکات سرزد ہونے لگتی ہیں، اور اگر تمہاری محبت بار بار مجھے مادی دنیا میں۔ پہنچاتی رہے۔ تو خدا جانے میں کیا کر بیٹھوں۔

خورشید نے اپنے آپ کو میری گرفت سے چھڑا لیا اور مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی ہو گئی۔

"تم محبت نہیں کرتے شاعری کرتے ہو اور وہ بھی مبالغہ آمیز۔"

میں نے جوش سے کہا۔ "شاعری محبت ہے۔ اور محبت شاعری۔ جس محبت کا عنصر ناکامی و نامرادی ہے۔ وہ سوز و گداز کی شاعری ہے۔ جو محبت کامرانی اور شادابی سے متصف ہے، وہ عشرت و عیش کی شاعری ہے۔ ایک محبت کرنے والا شخص بغیر کسی شعر کے بھی شاعر ہے۔ مگر کوئی شاعر بغیر محبت کے شاعر نہیں ہو سکتا۔"

خورشید نے مسکرا کے کہا۔ "تم جو کچھ چاہو کہہ لو۔ مگر غالباً اس سے تمہیں بھی انکار نہیں ہو گا۔ کہ شاعری کا سب سے اہم مظہر بھی لسانی و لفظی ہے۔ اور محبت کا بھی۔"

میرے آگ لگ گئی۔ "تو میں تمہیں محبت کا عملی ثبوت دوں گا۔"

وہ تن کر کھڑی ہو گئی۔ "دو گے؟"

"بیشک"

"سوچ لو۔ تم کیا کہہ رہے ہو۔ تم میری محبت کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کرنے کے لئے تیار ہو؟"

"تیار ہوں۔"

"اگر وہ قربانی تمہیں گناہ میں مبتلا کر دے ؟"

میں اس وقت اندھا تھا۔ عشق کا دیوتا خود بھی اندھا ہے۔ جسے اپنا نشانہ بناتا ہے اُسے بھی اندھا کر دیتا ہے۔ بغیر سوچے سمجھے میں نے جواب دیا "محبت کا خلوص تمام گناہوں کے لئے کافی سے زیادہ کفارہ ہے۔ جب محبت اپنا پرتو ڈالتی ہے تو سیاہ کاریاں انسان کی خصلت میں سے یوں غائب ہو جاتی ہیں۔ جیسے سورج کی شعاعوں سے شبنم اڑ جاتی ہے"

"تو تم میرے لئے ہر ایک قسم کے گناہ کا اقدام کرو گی۔"

"محبت کے گناہ قابلِ معافی نہیں بلکہ قابلِ ستائش بھی ہیں۔"

"پروفیسر کو قتل کرو گے۔"

یہ فطرت کا ایک اٹل قانون ہے کہ ہر ایک انسان کی زندگی میں قطع نظر اس سے کہ وہ گنہگار ہے یا نیکوکار ایک دفعہ ایسا موقعہ پیش آتا ہے۔ جب نیکی کی تمام قوتیں اُسے اُبھارتی ہیں۔ وہ اپنی فطرت سے بلند ہو جاتا ہے۔

اس کی نگاہ وسیع اس کی عقل دُور بین ہو جاتی ہے مگر ایسے مواقعے سے فایدہ اُٹھانا بہت مشکل ہے۔ مجھ پر بھی اس وقت ایسا ہی موقعہ تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ ابلیسی طاقتیں مجھے محبت کے سبز باغ دکھا کر قعرِ ذلت کی طرف کشاں کشاں لیجا رہی ہیں۔ خورشید کے گیسو میری نیکی کے پاؤں کے لئے زنجیریں ہیں۔ اس کا حسن میری فطرت کے چہرے پر ایک بدنما داغ ہے۔ ایک طرف شاداب اور سرسبز وادیاں ہیں۔ جو ظاہر میں بہت دلفریب معلوم ہوتی ہیں۔ دوسری طرف کٹھن اور دشوار گذار راستے ہیں۔ جن کو طے کرنا بعید نظر آتا ہے۔ ایک طرف نیکی ایک طرف بدی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بدی کا مجسمہ ایک پیکرِ انسانی میں جلوہ نما ہوتا ہے۔ اور ایسے پیکرِ انسانی میں جس کی مدافعت کرنا امکان سے باہر ہے۔ ایسے موقعہ پر ضمیر نے ہتھیار ڈال دیئے۔ آنکھوں پر پردے پڑ گئے۔ میں سب کچھ سوچ سمجھ کر بدی کی طرف راغب ہو گیا۔ اس حالت میں بھی ضمیر کی بیداغ شخصیت نے میرے منہ سے بے اختیار یہ لفظ کہلوا دیئے۔ "خورشید تم کیا کہہ رہی ہو۔ اس مہیب واقعیت کو اپنے حسن کے پردوں سے ڈھنپا رہنے دو۔ مجھے فریب میں مبتلا رہنے دو۔ وہ اعتماد نہ گنواؤ۔ جو آج تک مجھے نسوانیت پر رہا ہے۔ میرے خیالات کی صفائی کو ملیا میٹ نہ کرو۔ اس وقت تمام طبقہ نسوان کی عزت تمہارے چند الفاظ پر منحصر ہے۔ مجھے . . . . .

اس نے میری تقریر کو کاٹ دیا۔ اور میری طرف قہرپاش نگاہوں سے دیکھا۔

"میری آغوش کی راحتیں اس بزدل کے لئے نہیں ہیں۔ جو اپنی زندگی کو اخلاقیات پر قربان کر دے یاد رکھو۔ اس دُنیا میں بدی کی راحتیں نیکیاں دیکر خریدی جاتی ہیں۔ صرف راحتیں ہی نہیں یہاں ایک چیز خریدی جاتی ہے کھویا ہُوا وقار۔ ضائع شدہ عصمت حتیٰ کہ وہ چیز جسے لوگ اوصافِ حمیدہ کہتے ہیں خریدی جاسکتی ہیں۔ سونے کی چمکتی ہُوئی ٹکلیاں بہت کچھ کر سکتی ہیں۔ میں خاموش ہو گیا۔ اس منطق کا کوئی جواب نہ تھا اس کے بعد اُس نے مجھے وہ شیطانی تدبیر بتلائی جس کا نتیجہ آپ آئندہ سطور میں دیکھینگے۔ . . .

پروفیسر حامد جمال اپنے کمرۂ ملاقات میں بیٹھا ہُوا کسی کتاب میں غرق تھا۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے وقت بھی میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا تھا۔ پروفیسر نے اپنی آنکھیں اُٹھائیں اور مجھے دیکھ کر کہا۔ "آیئے مرزا صاحب"

مَیں اس کے قریب ایک کرُسی پر بیٹھ گیا" پروفیسر کیا تم بقائے اشکال کی نسبت اپنے نظریے پر کامل اعتماد رکھتے ہو۔"

وہ اس اچانک سوال سے گھبرا گیا۔ پھر ہنس کر کہنے لگا۔ "آپ چاہتے کیا ہیں۔"

مَیں نے ذرا تلخی سے جواب دیا۔ "مشاہدہ کی رد سے آپ کے وہم کی تکذیب کرنا۔"

اس کی آنکھیں غُصّے سے سُرخ ہو گئیں۔ ماتھے پر شکنیں نمایاں ہو گئیں۔ اس نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں "میرا مقصد بھی یہی تھا۔ کیا تم میرے نظریئے کو وہم تصور کرتے ہو۔"

مَیں نے طنز سے کہا۔ "ایسی فضول بات پر یقین رکھنا وہم نہیں تو اور کیا ہے۔"

پروفیسر نے تیز ہو کر جواب دیا۔ "کیا تمہارے پاس کوئی ایسا معیار ہے۔ جو میرے جھوٹ سچ کو ثابت کرے۔"

"ہے تو سہی مگر اس میں خطرہ ہے۔"

"خطرہ؟ جان بھی چلی جائے تو مَیں پروا نہیں کرتا"

اب مَیں نے نرمی سے کہا۔ "تمہارا یہی اعتقاد ہے نا کہ اپنی قوت ارادی کے زور سے مادۂ قدیم کے اس مظہر کو جس سے تمہارا جسم بنا ہے۔ فنا ہونے سے بچا سکتے ہو۔"

اس نے سر کی ایک جنبشِ اثبات سے جواب دیا۔

"فرض کرو مَیں تمہیں قتل کر دوں۔ تو کیا تم جسمانی طور پر زندہ رہو گے۔ مَیں رُوح کی بات نہیں کرتا۔"

پروفیسر نے ہنس کر جواب دیا۔ "میں اسی طرح زندہ رہونگا جس طرح اب تم مجھے دیکھتے ہو۔"

"اچھا تو اس بات کی تصدیق میں خود اپنے ہاتھ سے کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں کوئی خوف تو نہیں محسوس ہوتا"

"میں ہر وقت تیار ہوں۔"

میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "اچھا تو ایک عہدنامہ لکھو۔ جو تمہارے دعوے کی غیر معقولیت کی صورت میں مجھے پولیس کی زد سے امن رکھیگا۔"

اس نے بغیر چون و چرا کے قلم اٹھالیا۔ میں نے کہا لکھو۔"

"اس حالت میں کہ میرے حواس خمسہ بالکل صحیح ہیں۔ میں یہ تحریر بطور سند کے مرزا محمود کو دینا چاہتا ہوں۔ ہم دونوں ایک خطرناک مہم پر جارہے ہیں۔ اگر اس میں میری جان کا نقصان ہوجائے۔ تو۔ یہ ایک اتفاقی امر ہوگا۔ جس کی نسبت میں پہلے غور و خوض کر چکا ہوں"

وہ سر نیچا کئے لکھے جارہا تھا۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ کس حیلے سے اپنا خطرناک فرض انجام دوں۔ آخرکار میرے ہاتھ میں ایک لوہے کا قلمدان آگیا۔ میں نے اپنے دانتوں کو بھینچ لیا۔ اور قلمدان کو اونچا کیا۔ اس وقت ضمیر نے آخری ملامت کی۔ نادان کیا کرتا ہے۔ ایک عارضی راحت کے لئے ابدی لعنت مول لیتا ہے مگر اسی وقت خورشید کا مسکراتا ہوا چہرہ میرے سامنے آگیا۔ میری رگوں میں ایک اضطراری حرکت ہوئی اور قلمدان پروفیسر کی کنپٹی پر جا لگا۔ قرمزی رنگ کے خون کی صرف ایک دھار نکلی۔ جس کے چھینٹے میرے ہاتھوں پر پڑے۔ اور بس۔ دنیا میں ایک اور گناہ کا اضافہ ہوگیا۔ بدی ایک دفعہ اور نیکی پر غالب آئی۔ جذبات کے سامنے ایک دفعہ پھر ضمیر نے شکست کھائی۔

. . . . .

یہ ہے پروفیسر حامد جمال کے قتل کا اصلی واقعہ۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا۔ وہ میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔ اس کے دوسرے دن میں خورشید سے ملنے گیا۔ اس کے ملاقات کے کمرہ میں بیٹھا ہی تھا کہ مجھ پر گویا بجلی سی گر پڑی۔ میرے سامنے ایک آرام کرسی پر پروفیسر حامد جمال اپنے معمولی انداز سے مسکرا رہا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں کو ملا۔ کہ بعض دفعہ وہم مغالطہ بھی دیتا ہے۔ مگر رفتہ رفتہ مجھ پر حقیقت منکشف ہوگئی میری آنکھیں مجھے دھوکہ نہ دے رہی تھیں۔ پروفیسر حامد جمال کا نظریہ سچ تھا۔ میں نے خوف سے اپنے چہرے کو ہاتھوں سے چھپالیا تھا۔ میرا تمام بدن کانپنے لگا۔ مگر اس کے باوجود نہ معلوم اس "شے" کی آنکھوں میں کیا کشش تھی۔ کہ میں دریدہ نگاہوں سے ادھر ضرور دیکھ

لیتا اور اسے موجود پاتا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں وہاں کتنا عرصہ بیٹھا رہا۔ ہاں اتنا یاد ہے کہ آخرکار اس مہیب شے کی موجودگی میرے لئے ناقابلِ برداشت ہو گئی۔ دماغ پریشان ہو گیا۔ حواس جواب دینے لگے۔ مجھے یوں معلوم ہوا۔ گویا میرے دماغ کو کوئی ہتھوڑی سے کوٹنے لگا۔ اور پھر میں ایک دم چلّاتا ہوا اٹھا

"نہیں نہیں۔ تم پروفیسر حامد جمال نہیں ہو۔ میں تمہیں قتل کر چکا ہوں۔ انہیں ہاتھوں سے قتل کر چکا ہوں" اور یہ کہہ کر میں نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ "دیکھو ابھی تک میرے ہاتھوں پر خون کے داغ ہیں" میں دوڑتا ہوا گیا۔ اور اس چیز کو اچھی طرح جھنجھوڑنا چاہا۔ مگر میرے ہاتھ ہوا کو جھنجھوڑ رہے تھے۔ کرسی خالی تھی۔ میں نے پھر ذرا دو قدم پیچھے ہٹ کر دیکھا۔ تو وہ پھر کرسی پر موجود تھا۔ اس وقت میں نے ناخنوں سے اپنا چہرہ نوچ لیا۔ مجھے اس بات کا احساس ہوا۔ کہ پروفیسر بحیثیتِ جسمانی زندہ ہے۔ مگر اب اس کا جسم میری جسمانی طاقتوں سے بالاتر ہے۔ وہ مر کر مجھ پر غالب آ گیا۔ زندہ تھا تو فانی جسم تھا۔ مردہ ہو کر وہ روح باقی بن گیا۔ مجھ پر پھر خوف طاری ہو گیا۔ میں اس کے قدموں پر گر پڑا۔ اور گڑگڑا کر کہا۔ "خدا کیلئے رحم کرو۔ مجھے اس مخمصے سے نجات دو"

مگر وہ شے خاموش رہی۔ میں ابھی زمین پر ہی پڑا ہوا تھا کہ خورشید کمرے میں داخل ہوئی۔ میں نے چیخ کر کہا۔ "جا۔ او ملعونہ جا۔ اپنا منہ کالا کر" اس کے چہرے پر خوف اور تعجب کے آثار پیدا ہوئے۔ اس نے کہا۔ "مرزا محمود کیا بک رہے ہو"

میں نے زمین پر پڑے پڑے ہی کرسی کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔

"دیکھو وہ کون ہے"

اس نے کرسی کی طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ مگر یوں معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس کی نگاہیں پروفیسر جمال کے آر پار ہو کر کمرے کی دیوار پر جم رہی ہیں۔ اس نے متحوّت ہو کر کہا۔

"کہاں"

میں نے دیوانہ وار قہقہہ لگا کر کہا۔ "کرسی پر کیا تمہیں نظر نہیں آتا"

اب وہ حقیقت کو سمجھ گئی۔ اس نے کہا۔

"تم پاگل ہو گئے ہو۔ وہاں تو کچھ بھی نہیں۔ پروفیسر کے اعتقاد نے تم پر اثر کیا ہے۔ یہ محض تمہارا وہم ہے۔ میں نے تمہارے وہم سے ہی کام لیا ہے۔ تمہیں محبت کے وہم میں مبتلا کر کے قاتل بنا دیا۔ اور اس شخص سے بدلہ لیا۔ جس نے میرے عشق کو

اپنے پاؤں سے ٹھکرا دیا تھا سنو۔ جاتے جاتے تمہیں ایک اور چٹکا دیتے جاتی ہوں۔ مجھے دراصل حامد جمال سے محبت تھی۔ مگر اس نے اس نعمت کی قدر نہ کی۔ میری محبت کو اس نے رائگاں گردانا۔ آج میں نے اس کا بدلہ لے لیا۔"

یہ کہکر وہ چھلاوے کی طرح نظر سے غائب ہو گئی...... دوسرے دن مجھے لوگ پاگل خانے لے گئے۔

عابد علی عابد

جذباتِ عزیز

تری کبریائی کی شان ہے سرے رنگ عجز و نیاز میں
یہ وہ راز ہے جو نہ ہوا دا کبھی این و آنِ مجاز میں

کیا یاد رُخ کا جو مشغلہ سحر ایک دم میں تھی رد نما
شبِ غم کا طول ہوا کہ تھا میں خیال زلف دراز میں

مجھے کیا خموش ہی میں رہوں دل ذرہ ذرہ ہے آئینہ
تری خود نمائی نے کر دئے ہیں یہ رخنے پردۂ راز میں

مری خامشی کا سبب ہے یہ کہ خیال ابروئے یار ہے
تجھے ہمنشیں یہ خبر نہیں کوئی بولتا ہے نماز میں

مرے عرض شوقِ وصال پر "طلب محال" تو کہہ دیا
مگر اک اشارۂ گوئگو ہے نہاں تبسم ناز میں

دل ہوشمند شکستہ ہیں، ہیں قلوب اہلِ دلاں فگار
کوئی کیا بتائے ہے کیا مزا تری لطف خستہ نوازمیں

نہ ہے خاک سجدہ نقشِ پا، دو جہان وحیرت آئینہ
کہ نگار خانہ چیں نہاں ہے مری جبینِ نیاز میں

یہ نمائش صورِ جہاں ابھی اور ہوش اُڑا ئیگی
کہ ہنوز نقش ہزار ہا، ہیں خیال آئینہ ساز میں

وہ ضرور آئے تھے ہاں مگر کسے علم گفت وشنید کا
یہ مجال کب ہے کہ جا سکے کوئی غیر خلوت راز میں

مجھے موت آئے حجاز میں، یہی آرزو ہے عزیز کی
کہ نوید عیش ابد ملی جسے موت آئی حجاز میں

عزیز بدایونی

بچپن

بچپن ایک ایسا پُر معنی اور جامع لفظ ہے۔ کہ اُس کے ہونٹوں سے نکلتے ہی دماغ میں ایک گونہ مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ بعض زندہ دل طبیعتوں کو تو یہ نام سحر کی سی تاثیر دکھاتا ہے۔ چنانچہ مشاہدہ اس کا شاہدِ حال ہے کہ ایسے مواقع پر انسان سے ایسی خفیف حرکات ظہور میں آنے لگتی ہیں۔ جن کے واسطے شیخ سعدیؒ شیراز کو بھی کہنا پڑا ؎

چہل سال عمرِ عزیزت گذشت
مزاجِ تو از حالِ طفلی نگشت

حقیقت الامر یہی ہے۔ کہ بچپن کی ہر ہر ادا ہر ہر حرکت معصومیت کی مجسم تصویر ہُوا کرتی ہے کسی کو کیا خبر کہ انہیں بھولی بھالی صورتوں اور فرشتہ سیرت طبیعتوں نے کیسے کیسے شاعروں اور ادیبوں کو اپنا گرویدۂ محبت بنا لیا ہے۔ اور کِن کِن طریقوں سے دُنیائے ادب پر آج اپنا زبردست سکّہ جما دیا ہے۔ تاریخ عالم کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ دُنیا میں کوئی قوم، کوئی طبقہ اور کوئی مُلک ایسا نہیں جس نے بچپن کی یاد کو تازہ نہ کیا ہو اگر ایک طرف عربوں نے اس عہدِ زرّیں کی سحر کاریوں پر اپنی بیشل فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دئے ہیں۔ تو دوسری طرف فارسی شعرا نے بھی بچپن کی خوشنما زندگی پر اپنی طبیعت کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ تغزل کے دلفریب رنگ میں بچوں کی فطرت و عادت کا مرقع کھینچنا شاعری کا ایک ادنےٰ کرشمہ ہے۔ حضرت نصیر الدین علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

گہ شادم و گہ غمگین از حالِ خودم غافل
میگریم و میخندم چوں طفل بخواب اندر

کمسن بچوں میں یہ ایک عجیب بات دیکھی جاتی ہے کہ اکثر سوتے میں منہ بنایا کرتے ہیں۔ ابھی بچہ کے چہرہ پر مسکراہٹ پائی جاتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد جو دیکھا۔ تو وہ بسور رہا ہے۔ اس میں انسان کی کشمکش حیات کی طرف بلیغ اشارہ ہے۔ اس کی عارضی خوشیوں اور تکلیفوں کے لئے کیسی لطیف تشبیہات ہیں۔ اگر کوئی سمجھنے والا ہو!

مُلّا غنی کشمیری کا ایک شعر ہے ؎

توکل پیشہ را روزی بدستِ خویش میباشد
مکد انگشتِ خود کودک چو نبود شیر پستاں را

جو شخص دُنیا کے اسباب و علائق سے بے نیاز ہوکر

توکل علی اللہ کرنا چاہیے۔ اس کا رزق دست غیب سے خود اس کے ہاتھ میں پہنچ جاتا ہے۔ جس طرح ایک شیر خوار بچہ دودھ نہ ملنے پر انگوٹھا چوس کر اپنی بھوک کو دور کر لیتا ہے۔

ایک مقام پر لکھتے ہیں ؎

فلک در گردش است از بہر خواب بخت ناسازم
بود در جنبش گہوارہ راحت طفل بد خو را !

انسان کی مثال اس چلبلے بچہ کی سی ہے جس کو ایک حالت پر کسی طرح سکون نہیں۔ اس کا چین آرام اسی میں ہے کہ پالنا ہلتا رہے۔ یہی باعث ہے۔ کہ انسان کے پائے قسمت میں چکر ہے۔ اور آسمان تقدیر انقلاب پسند۔

دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں ؎

آدمی در عہد پیری بیخرد گردد غنی
می شمارم طفل خود را بخت تا دندان مرا

کسی کا مقولہ ہے کہ بچے اور بوڑھے میں صرف "آمد و رفت" کا فرق ہے۔ ورنہ قوت اور زور شوق اور مزاج۔ شعور اور تمیز میں دونوں یکساں ہیں۔ وہ ناسمجھ بچہ جس کے ابھی دودھ کے دانت بھی نہیں نکلے۔ اس ضعیف العمر آدمی سے کسی طرح کم نہیں۔ جس کے دانت گر چکے ہوں۔ اور عقل سٹھیا گئی ہو۔

حاصل کلام فارسی والوں نے اس موضوع پر جو کچھ کہا ہے۔ وہ اپنے فرض سے سبکدوشی حاصل کرنے کے لیے کافی ہے۔ مگر اردو کی حالت قابل افسوس ہے۔ اس نے شاعری کے اس شعبہ میں بھی اگرچہ فارسی کی تقلید کی لیکن وہ محض "طفل اشک" اور "دختر رز" کے چند معمولی استعارات سے آگے نہ بڑھ سکی۔ چنانچہ ذیل میں نمونۃً اردو زبان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

نیں[۱] چھوڑتا ہے اشک میرا دامن وکنا
یہ طفل بد سرشت نہ گہوارہ سے ہلا (سودا)

گوشمالی دو نہ گلگشت میں گل کو پیارے
طفل غنچہ ہے غریب اس کو ڈراتے نہ چلو (آتش)

طائر دل کو ہوا کیا اس قفس کی قید سے
چھوڑ کر طفل چمن پھڑکا پھڑک کر رہ گیا (سلیمان)

غرض یہ کہ شاعری اور بچپن کا ہمیشہ سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ البتہ موجودہ جدید دور شاعری میں۔ جو درحقیقت مغربی شاعری کی زیر بار احسان اور ایک حد تک تقلید ہے۔ شعراء اردو نے بھی بچپن پر مستقل نظمیں لکھی ہیں۔ جو اکثر اردو رسائل میں چھپی ہیں۔ مرحوم لسان العصر اکبر کے اشعار گوہر بار، سر محمد اقبال، سرور جہان آبادی مولانا محوی لکھنوی وغیرہ غرض اکثر شعراء نے طبع آزمائی

۱؎ یعنی نہیں

کی ہیں، اور فطری جذبات کی ایک حد تک ترجمانی کی ہے
علامہ اقبال کی متعدد نظموں میں سے ایک نظم "طفلِ شیر خوار" کے چند ابتدائی اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں۔

میں نے چاقو تجھ سے چھینا ہے تو چلاتا ہے تو
مہرباں ہوں میں مجھے نامہرباں سمجھا ہے تو
ایسی چیزوں کو جو تو سمجھا ہے سامانِ خوشی
کیا کسی دکھ درد کے مکتب کی ابجد سے یہی
درد سے اسے تو اسیرِ حلقۂ گرداب درد
ہوتی جائیگی تجھے آگاہی اسبابِ درد
پھر پڑا رہ جائیگا اے نو واردِ اقلیمِ غم
چھ نہ جائے دیکھنا باریک ہے نوکِ قلم
آہ! کیوں دکھ دینے والی شے سے تجھ کو پیار ہے
کھیل اس کاغذ کے ٹکڑے سے یہ بے آزار ہے
اس چمکتی چیز کی خاطر یہ بیتابی ہے کیا
اب سیاہی کے گرانے کی تجھے سوجھی ہے کیا

... ...

ان اشعار میں کس قدر فلسفۂ حقیقت کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ اہل بصیرت غور فرمائیں،
جناب سرور جہان آبادی کی نظم "امید اور طفلی" کے چند چیدہ اشعار بھی ملاحظہ فرمائیں۔

یاد بچپن کے ہیں وہ دن اے امید
جب تھی تو آہ! صغر سِن امید
تو کھلونا تھی میرے بچپن کا
تجھ سے تھا ساتھ چولی دامن کا
میرے بچپن کی غمگسار تھی تو
میری طفلی کی یادگار تھی تو
رات کو لوریاں سناتی تھی
دن کو جھولا مجھے جھلاتی تھی

... ...

[illegible] میرے باغ کی کلی امید
میری طفلی کی لاڈلی امید
گو کھلونے تھے مجھ کو سب سے عزیز
تھی مگر آہ! تو کچھ اور ہی چیز
وہ لڑکپن کے مشغلے نہ رہے
وہ اُمنگیں، وہ ولولے نہ رہے
وہ تیری جان نثاریاں نہ رہیں
آہ! وہ نئے سواریاں نہ رہیں

لیکن وہ خصوصیت کے ساتھ انگریزی کی جو توجہ بچپن کے حال پر رہی ہے۔ وہ ادبِ انگریزی کا ایک نمایاں کارنامہ ہے، انگریزی شاعری پر ایک عمیق نظر ڈال کر اس کو ذرا واضح طور پر بیان کرنا ہی ہمارے مضمون زیرِ بحث کا مقصدِ اصلی ہے۔

مغرب کے ادبِ لطیف میں بچپن کی زندگی پر خیال آرائی کوئی جدید مضمون نہیں ہے۔ چنانچہ یونان کے سب سے قدیم شاعر ہومر نے بھی اُن بچوں کی تصویریں کھینچی ہیں، جو ساحل سمندر پر بیٹھے ریگ میں قلعے (گھروندے) بنا رہے ہیں۔ اور فوجی معرکوں اور بہادریوں کے خیالی پلاؤ پکا رہے ہیں۔ اس کے تذکرہ میں ایک ننھا اچیلیز ہے جو اپنے باپ کے دوست کی گود میں جانا چاہتا ہے۔ اور شراب کے جام سے خود بھی پینے کی کوشش میں اس کو اُلٹ دیتا ہے۔ دوسرا بچہ ’الیسیس‘ نامی ہے۔ جو باپ کی اُنگلی پکڑے پکڑے اپنے باغ میں جاتا ہے۔ اور تمام درختوں اور پھولوں کے نام معلوم کرتا پھر رہا ہے۔ گویا ایک خاص تحکمانہ انداز کے ساتھ اُس قطعۂ زمین کی پیمائش کرنا چاہتا ہے۔ جو اس کے نام پر مخصوص کر دی گئی ہے۔ علاوہ بریں تاریخ نے زمانۂ مابعد میں بھی اس مضمون کو فراموش نہیں کیا۔ چنانچہ یورپ میں مصوری کے بعض اعلےٰ سے اعلےٰ نمونے بچپن کی کرشمہ سازیوں کے شاہدِ حال ملتے ہیں۔ جس میں کامیابی کا سہرا خصوصیت کے ساتھ رفائیل کے سر رہا۔

انگلستان نے بھی سرزمین نظم میں کچھ کم گلکاریاں نہیں کی ہیں۔ بلکہ یہ وسیع میدان چاسر کے وقت سے آج تک تمام انگریزی شعراء کا خاص جولانگاہ رہا ہے۔ ان میں چند وہ شاعر بھی ہیں۔ جنہوں نے اپنی دقت نظری اور معاملہ فہمی سے بچپن کی دل فریبیوں کو کسی نہ کسی مخصوص رنگ میں پیش کیا ہے۔ بلیک اکثر اپنے دائرہ تصوف سے بھی خارج ہو جاتا ہے۔ وہ بچپن کے بیانات میں اپنے کو انسانی رنج و راحت کا ہم رشتہ قرار دینے پر آمادہ نظر آتا ہے۔ ورڈسورتھ کا بہترین کلام بھی اسی کی تائید میں پایا جاتا ہے۔ اسٹیونسن نے اسی تتبع کو مدِ نظر رکھ کر بچپن کی زندگی پر جو تنقید لکھی ہے۔ اُس میں بچپن کی فطرت کا بعینہٖ خاکہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ ایک ”بچہ کا گلشنِ نظم“ اس کی نہایت قابل قدر یادگار ہے۔ حتیٰ کہ سونبرن بھی نہایت آہنگی کے ساتھ خدائے خالق کے ترانۂ حمد کو الاپتا ہے۔ اور ایک ہی شعر میں ان معصوم ہستیوں کی ہست و بود کا قطعی فیصلہ صادر کر دیتا ہے۔

لانگ فیلو کا شمار بھی اُن شعرائے ذی وقار میں کیا جاتا ہے۔ جن کی نگاہِ التفات اس مضمون خاص کی طرف بہت زیادہ رہی ہے۔ دُور کیوں جائیے خود ہندوستان ہی میں قدیم روایات کا زمانہ بچہ کی موجودگی کا پتہ دیتا ہے۔ سری کرشن جی کی سُریلی بانسری نے انکو اوتار کے مقدس مرتبہ تک پہنچا دیا۔ بلکہ آج رابندرناتھ ٹیگور کی ذات والا صفات میں بچپن کی نظموں نے جو جدید رنگ اختیار کر لیا ہے وُہ اسکی مشہور نظم ”ماہِ ہلال“ کو دیکھنے سے ذہن میں آ سکتا ہے یہاں نادر نظموں میں سے ہے جس کی ہم پلہ نظم آج تک کسی زبان میں بچپن کے

جذبات وحسیات پر نہیں لکھی گئی۔

شاعری نے کس حد تک بچے کی محبت اور پرستش کا حق ادا کیا ہے۔ اس کے واسطے صرف ایک دو نمونے ہی کافی ہونگے۔ جیسس رسل اوّل کے نزدیک "بچے خدا کے بھیجے ہوئے رسول ہیں۔ جو اس جہان میں محبت امید اور صلح و آشتی کی تبلیغ کے لئے یوماً فیوماً آتے رہتے ہیں"۔

سوئنبرن ان کو خدا کا محض پیغمبر ہی نہیں تسلیم کرتا۔ بلکہ اس قانون سے بھی بلند تر اپنا ایک جداگانہ نظریہ پیش کرتا ہے۔

"جس مقام پر بچہ کا وجود نہیں پایا جاتا وہاں آسمان کا سایہ معدوم ہے۔ اور جس وقت یہ بچے نہ ہونگے تو پھر آسمان بھی ابدالآباد کے پردۂ عدم میں جا چھپیگا"۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ بچہ کے بھولے بھالے معصوم چہرے، اُس کی پیاری پیاری شیریں آواز میں نوشتۂ فطرت اور منشائے خداوندی کی تحریر نظر آتی ہے۔ اسی بنا پر والٹر سیویج لینڈور جیسا اہل قلم بھی بچپن کی تعریف میں اس قدر رطب اللسان ہوا۔ کہ انسان کی تمام اعلےٰ صفات سے یکلخت متنفر ہو گیا۔ وہ لکھتا ہے:۔

اگر ایک طرف بچہ کی نامکمل ہستی کے روبرو عقیدہ تمنا اور سخاوت جیسی اعلےٰ خوبیاں دست بستہ رہتی ہیں۔ تو دوسری جانب تکبر حسد اور عداوت اشرف المخلوقات انسان کے مطیع فرمان ہیں:۔

بچہ کی معصومیت اور بھولا پن بھی شاعری کے لئے ہمیشہ نئے سے نئے مضامین پیدا کرنے کا محرک رہا ہے۔ ٹینی سن کی زبان میں "بچے وہ جلیل القدر شاعر ہیں۔ جنہوں نے آجتک ایک شعر بھی نہیں کہا"۔

بقول لانگ فیلو "بچے اُن تمام غزلوں اور گیتوں سے کہیں بڑھ کر ہیں۔ جو اس وقت تک لکھنے یا گانے میں آئے ہوں۔ کیونکہ نظر حقیقت بین کے لئے 'وہ زندہ اشعار ہیں"۔

بلیک اپنے "ترانہ ہائے معصومیت" کی تمہید میں اپنی ہستی کو ایک جویائے الہام تصور کرتا ہے۔ اور اُس کے واسطے وہی ایک بچہ کی ذات ہے جو بادلوں میں بیٹھی شاعر سے "میمنہ کے گیت" کی تحریک کرتی ہے

بچہ کے شاعرانہ دماغ پر بھی جب کبھی کچھ لکھا گیا ہے وہ جدّت طرازی اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک عجیب فلسفہ معلوم ہوتا ہے۔ فی الحقیقت بچہ کی آزاد خیالی اُس کی منطقیانہ جرح اور اس کے حدِ یقین تک پہنچے ہوئے قیاسات نے یگانوں اور بیگانوں سے یکساں خراج تحسین وصول کیا ہے۔ ورڈسورتھ نے اپنے قصیدے "غیر فانی دُنیا کی معلومات" میں بچہ کی بلند پروازیوں

کو نہایت خوبی سے قلمبند کیا ہے۔ جس کو پڑھکر بچپن
کی بے لوث طبیعت اور سادہ مزاجی کا نقشہ آنکھوں
میں پھر جاتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہوتا ہے۔ جبکہ بچّہ اپنے
کو آسمانی دُنیا میں ہی محسوس کرتا ہے۔ آخر کار رفتہ رفتہ
اُس کی نگاہوں کے سامنے اس قیدِ حیات کا سیاہ پردہ
چاک ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ بچّے کے ذہن میں
زمانہ طفلی کے مشاہدات کا ایک دھندلا سا مٹا ہُوا
مرقع محفوظ ہے۔ جس کو شاعر نے اپنی چند ابتدائی سطور
میں اس طرح کھینچ کر دکھایا ہے۔

"وہ بھی ایک وقت تھا۔ جب کہ سرسبز میدان،
درختوں کا جھنڈ، صاف شفاف چشمہ اونچی نیچی زمین
غرض ہر معمولی سے معمولی شے کا منظر بھی مجھ کو بہشتی نور میں
ملبوس نظر آتا تھا۔ گویا میں کوئی نہایت ہی خوش آئند
اور پُرعظمت خواب دیکھ رہا تھا۔"

اسٹیونس بچّے کے اُن عجیب وغریب خیالات
کو جو ہر شب اُس کے دماغ میں آیا کرتے ہیں۔ اپنے
لطیف پیرایے میں یوں بیان کرتا ہے۔

"شب کے وقت جبکہ میری ماں چراغ کو بجھا
دیتی ہے۔ میں تمام تمام رات طرح طرح کے آدمیوں کو اپنے
آگے چلتا پھرتا دیکھا کرتا ہوں۔ رنگ برنگ کی پلٹنیں
جاہ و حشم والے بادشاہ، پرسطوت و باہیبت سلاطین

سب مختلف قسم کے اسلحہ لئے ہُوئے اس کرّ و فر کے
کے ساتھ میرے سامنے سے گذرتے ہیں۔ کہ دن کے
وقت ایسا نظارہ کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ بلکہ میں سمجھتا
ہوں، بڑے بڑے سرکش بھی کسی میدان میں بھی ایسا
تماشہ نہ دکھایا ہوگا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے
صاف طور پر آدمیوں اور درندوں کو ایک قطار میں
اس قافلہ کے ہمراہ چلتے ہُوتے دیکھا ہے۔"

والدین کو اپنے بچّہ کے ساتھ جو فطری محبّت
ہو جاتی ہے۔ ادب لطیف اس سے سرتاپا لبریز ہے
خصوصاً اس موضوع پر جرمنی کے فلسفی شاعر فریڈرک
روکرٹ نے اپنی مقبول عام نظم "عقل برہمن" میں
جسقدر نازک خیالی کو جگہ دی ہے وہ کچھ اُسی کا حصّہ
ہے۔

"روزانہ شب کو سونے سے قبل باپ اپنے خوابیدہ
بچے پر ایک بار دست شفقت ضرور پھیر دیا کرتا تھا
وہ خاص طور پر اُس کے ننھّے ننھّے ہاتھوں یا گلاب
سے نازک رخساروں ہی کو نہیں دیکھتا تھا۔ بلکہ
تمام رات کی جدائی کی بنا پر صرف ان کو چھو لینا ہی
کافی سمجھتا تھا۔ حالانکہ وہ بخوبی جانتا تھا۔ کہ اس کا کمزور
و ناتواں ہاتھ بچّہ کی کچھ بھی حفاظت نہیں کر سکتا۔ اگر
اس سے بھی زبردست ہاتھ (فرشتے) ہر وقت اس کی

دیکھ بھال میں نہ لگے رہیں۔ بالفرض باپ بچّہ کے پاس نہ جائے تو کچھ مضائقہ بھی نہیں۔ بچّہ اسی طرح گہری نیند سوتا رہیگا۔ لیکن باپ کہتا ہے کہ اگر میں بستر پر جانے سے بیشتر اُسے چھُو نہ لوں۔ تو آدھی رات تک مجھے نیند نہ آئیگی۔ اور میری تمام شب نہایت بے چینی اور اُلجھن میں کٹیگی۔

کاونٹرسی پاٹمور نے کھلونوں کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اس میں بھی اسی بات کو نمایاں طور پر دکھلایا ہے۔ "ایک دفعہ وہ اپنے چھوٹے سے بے ماں کے بچے کو اس کی ساتویں نافرمانی پر غصّہ کی حالت میں مار بیٹھا۔ بظاہر بچّہ کا قصور یہی ہو سکتا ہے کہ اس نے ناسمجھی میں کوئی پردہ پھاڑ دیا ہو۔ روشنائی کی بوتل بیخبری میں گرا دی ہو۔ یا کسی کتاب پر کہیں کوئی دھبّہ ڈال دیا ہو۔ مگر پھر اس خیال سے کہ شاید رنج سے بچّہ کی نیند نہ خراب ہوتی ہو۔ باپ اپنے بسترِ راحت پر جانے سے پہلے خود اس کے پلنگ تک جا کر دیکھتا ہے۔ اور بچّے کو نہایت سُکھ کی نیند میں پاتا ہے۔ قریب ہی بچّے کے چند کھلونے رکھے ہوئے ملتے ہیں۔ جو گویا پاس بیٹھے اس کے ننھے سے نازک دل کی تسلّی و تشفی میں مشغول ہیں۔ جملہ اشیاء کی تفصیل یہ ہے۔

ایک چھوٹی سی گولک، ایک شیشہ کا رنگین ٹکڑا، چھ سات گھونگھے، ایک بوتل جس میں نیلے نیلے گھونگرو بند سے تھے، اور وہیں دو فرانسیسی پیسے بھی نہایت احتیاط سے رکھے ہوئے تھے۔

اس سلسلہ میں یہ بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ بچّے کی محبّت نے انسان کے خیالات اور خصائل پر کیا اثر ڈالا ہے۔ چنانچہ ورڈسورتھ نے مندرجہ ذیل فصیح و بلیغ الفاظ میں اس کا اعتراف کیا ہے۔

"بچّہ خدا کی دی ہوئی ایک برکت ہے۔ اور اُن تمام نعمتوں سے زیادہ بیش بہا ہے جو انسان جیسی ضعیف البنیان ہستی کو اس دُنیائے بے ثبات میں میسر ہیں۔ اسواسطے کہ بچّے سے بڑی بڑی حوصلہ افزا امیدیں اور دورِ مستقبل کی بہترین تمنائیں وابستہ ہوتی ہیں۔"

ان سطور کا اقتباس اس جگہ نہایت ہی موزوں اور برمحل ہے۔ یہاں ہم کو جارج ایلیٹ کے سیلاس مارنیر کا قصّہ یاد آجاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سیلاس کی طبیعت زمانہ کی چند در چند گردشوں کے باعث تنہائی پسند ہو جاتی ہے۔ اور اس کی حالت بے حسی و دیوانگی تک پہنچ جاتی ہے لیکن محض ایک بچّہ کی اُلفت جس کی پرداخت اس نے اپنے ذمہ لی تھی۔ اُس کو پھر دُنیا میں واپس لے آتی کسی شاعر نے سچ کہا ہے کہ "دُنیا کی یہ تکالیف ناقابلِ برداشت ہو جاتیں۔ اگر اس جہان میں بچوں کا گذر نہ ہوتا" اور یہ

نغمۂ حیات اپنی ولفریبی کھو دیتا۔ اگر چھوٹے بچے اس سرود کے ابتدا کرنے والے نہ ہوتے"۔

یوں تو ابھی بچے کی طالبعلمانہ زندگی کا مطالعہ باقی ہے۔ لیکن ہم طول کے خوف سے بچپن کی چند اور خوبیوں پر ایک سرسری نگاہ ڈال کر اس بحث کو ختم کر دیں گے۔ یہ ایک عام اصول ہے کہ جن لوگوں سے بچوں کو راحت پہنچتی ہے۔ بچے ان سے فطرتاً انس و محبت کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ نظمیات میں ہر ہر مقام پر اس کا تذکرہ موجود ہے۔ بلکہ زندگی کے آیندہ زمانہ میں بھی بچپن کے دوستوں کا ایک خاص تعلق قائم رہتا ہے۔

جارج ایلیٹ نے "بھائی بہن" کے زیر عنوان جو نظموں کا سلسلہ لکھا ہے۔ اس میں خود اپنے اور اپنے بڑے بھائی کے درمیان اسی قسم کی محبت اور تعظیم کا نمونہ پیش کیا ہے۔ ننھی بچی اپنے چالیس انچ کے قد آور بھائی کے آگے پیچھے دوڑتی پھرتی تھی۔ اور وہ ہاتھ نہ آتا تھا۔ وہ یہ سمجھتی تھی کہ میرے بڑے بھائی کی علمیت اور وسعت نظر اس حد تک بڑھی ہوئی ہے۔ جہاں شاید بڑا آدمی بھی نہ پہنچ سکیگا۔ کیونکہ وہ پرندوں، پتنگوں اور تتلیوں کے متعلق بہت کچھ جانتا تھا۔ آخیر میں ایلیٹ خود یہ آرزو کرتی ہے۔

"اے کاش! میرے واسطے کوئی دوسری دنیا ہوتی، جہاں میں پھر وہی چھوٹی بہن بن کر آتی"۔

چارلس لیمب اپنے "دیرینہ شناساؤں" کی یاد کو اس طرح تازہ کرتا ہے:-

"کہاں ہیں وہ دوست جو بچپن میں میرے ساتھ کھیلا کرتے تھے! آج وہ میرے ہم مکتب دوست کدھر گئے! آہ! وہ میری شناسا صورتیں کیا ہوئیں"!

شیکسپیئر نے بھی "مڈسمر نائٹس ڈریم" میں اسی بچپن کی دوستی کا راگ الاپا ہے۔ ہلینا کے الفاظ یہ ہیں:-

"اف! بچپن کی معصوم زندگی، مدرسہ کی ساری الفتیں دوستی، کیا یہ سب باتیں فراموش کر دی گئیں! اے حرمیہ! کیا ہم دونوں نے ایک ہی تکیہ سے سہارا لیکر ایک ہی نمونہ کو سامنے رکھ کر ایک ہی پھول پر اپنی جدت پسندی کا ثبوت نہیں دیا ہے! کیا ہم دونوں نے ایک ہی سُر میں ایک ہی گیت کو بارہا نہیں گایا ہے! اور ہمارے ہاتھ، ہمارے پہلو، ہماری آوازیں اور ہمارے دل و دماغ ایک جان دو قالب کی مصداق نہیں رہا کرتے تھے!"

ہم کو بعض نظمیں ہیمنس کے "کیسے بیانکا" کی طرز پر ملتی ہیں۔ جس میں لڑکپن کا احساسِ فرض کے اعلیٰ ترین جوہر کے بھیس میں دکھلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی

سلسلہ میں وہ دلگداز اور پُر سوز نظمیں بھی آجاتی ہیں، جو "بچوں کی فریاد" کے عنوان سے الزبتھ براؤننگ نے لکھی ہیں۔

ڈرامہ کے پُر خطر موقعوں اور غمناک منظروں میں بچے بھی بڑوں کے دوش بدوش نظر آتے ہیں۔ مثلاً کنگ جان کے تماشے میں شہزادہ آرتھر کس فصاحت و روانی کے ساتھ اپنے سنگدل چچا کے خلاف ہیوبرٹ سے وکالت کرتا ہے۔

اسی پر کیا منحصر ہے، میکبتھ ہی کا کھیل ملاحظہ ہو شریف زادی میکڈوف اور اس کے کمسن لڑکے کو میکبتھ کے مخبروں نے گرفتار کر لیا ہے، بچہ کے باپ پر بغاوت کا الزام لگایا جاتا ہے، مگر ہمارا ہیرو نہایت دلیری اور بے خوفی کے ساتھ اس کو باطل ثابت کر کے رکھ دیتا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ جس وقت وہ جاسوس کے ہاتھ سے قتل کیا جاتا ہے تو چلا کر کہتا ہے:۔

"ہائے! ---- اماں! ---- ظالم نے مجھے مار ڈالا۔ خدا کے واسطے تم بھاگ کر اپنی جان بچاؤ"

مظفر حسین

نوائے ہوش

یہ منزل ابتدائی تھی طریقِ جذبِ کامل کی
کہ چشمِ قیس میں پھرنے لگی تصویر محمل کی

سُنایا سوزِ دل کا حال خاموشی کے پردہ میں
زبانِ شمع تھی گویا سبق آموز محفل کی

تھپیڑے دے رہی ہے بیقراری کشتیِ دل کو
غریقِ کس مپرسی ہوں خبر کیا مجھ کو ساحل کی

تصوّر دل کو اس رہبر کا خضرِ راہ ہو یارب
کہ ہر نقشِ قدم جس کا بنے تصویر منزل کی

کہے دیتے ہیں تم سے ہوش یہ مدہوشیاں چھوڑو
کہیں ایسا نہ ہو برباد کر دے آرزو دل کی

ہوش

پبلک کا فیصلہ

سنہ ۱۹ء کی نہ بھولنے والی گرمیوں میں غیٹو اور زیٹک دونوں کے دونوں بی زلفن کی زلفِ گرہگیر کے اسیر ہو گئے۔ بی زلفن ایک نازنین ایکٹرس تھی غیٹو اور زیٹک مذاقیہ پارٹ میں اپنی مثال آپ تھے۔ اور تینوں بمبئی کی ایک معلوم الاسم پارسی کمپنی میں ملازم تھے۔

غیٹو لوگوں کا ایسا منظورِ نظر تھا۔ کہ ابھی اس کے منہ سے ایک حرف بھی نکلنے نہ پاتا تھا کہ سب قہقہے لگانے شروع کر دیتے تھے۔ اور زیٹک یہانتک مقبول تھا کہ اس کی خاموشی سے بھی پبلک کے پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے۔

وہ جو ایک فن کے لوگوں میں قدرتی حسد ہوتا ہے وہ تو تھا۔ پھر بھی وہ آپس میں گہرے دوست تھے۔ حالانکہ ایک ہی معشوقہ کے دلدادہ تھے۔ اور اس کی وجہ فقط یہ تھی کہ بی زلفن کی نظرِ عنایت دونوں پر یکساں تھی۔ نہ تو وہ فربہ اندام غیٹو پر زیادہ مہربان تھی۔ اور نہ لاغر بدن زیٹک سے خاص طور پر بے تکلف تھی۔ آخر وہ اس توازنِ تعشق سے تنگ آ گئے۔ اور بی زلفن کو ایسا مجبور کیا کہ اسنے ایک دِن جھنجھلا کے کہہ دیا۔ کہ وہ اِن میں سے بہتر ایکٹر سے شادی کریگی۔

خوب! ابتک پختہ طور پر نہ کوئی تھیٹر والا اور نہ کوئی نقاد ہی کہہ سکا تھا کہ دونوں میں کس کو ترجیح دی جائے ایسا طرار فقرہ بی زلفن کو ہی سوجھ سکتا تھا۔

غیٹو نا امید ہو کر پوچھنے لگا۔ "مگر اس کا فیصلہ کون کریگا؟ تمہیں کس کی رائے پر اعتماد ہے؟"

زیٹک مایوسی کے لہجہ میں کہنے لگا۔ "آخر کسی کو منصف بنانا چاہیئے۔ اس کا فیصلہ ہونا چاہیئے۔"

بی زلفن تڑاق سے بول اُٹھی۔ "اس کا منصف بمبئی کا شہر ہوگا۔ ہم سب پبلک کے نوکر ہیں۔ مجھے پبلک کا فیصلہ منظور ہے۔" یقیناً وہ بہت حسین تھی۔ بہت ہی حسین تھی۔ ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ اس طرح کی باتیں کرتی۔

آخر بیچارہ زیٹک اُٹھ کر اپنے کمرہ میں آرام کرسی پر لیٹا ہوا سوچتا رہا۔ زیٹک کا خیال تھا کہ بی زلفن انہیں جان بُوجھ کر اُلجھن میں ڈال رہی تھی۔ غیٹو کی بھی یہی رائے تھی۔ پبلک دونوں کی مداح تھی۔ دونوں پر یکساں مہربان تھی۔ پبلک کے فیصلے کا انتظار کرنا گویا شبِ فراق کی سحر تلاش کرنا تھا۔ زیٹک کو منزلِ مقصود پر پہنچنے کا

کوئی راستہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ غیٹو کو حصول آرزو کی کوئی تدبیر نظر نہ آتی تھی۔

ہفتہ کی چھٹیوں سے کوئی دو دن پہلے جب دونوں دوست کسی اپنے دلپسند قہوہ خانہ میں بیٹھے ہوئے چائے پی رہے تھے۔ تو غیٹو نے زینک کو مخاطب کر کے کہا "ہمیں اس جھگڑے کا تصفیہ کرنا چاہئے۔ آؤ کوئی تدبیر سوچیں۔

یہ لو سیگرٹ! تم ایکٹر ہو۔ اور اس لئے تم اپنے آپ کو مجھ سے زیادہ صاحب کمال تصور کرتے ہو۔ میں بھی ایکٹر ہوں۔ اور اس لئے تمہیں اپنے مقابلہ میں ہیچ سمجھتا ہوں۔ خیر یہ تو ہوا ہمارا صنعتی نقطہ نظر! لیکن ہم دونوں دانا آدمی ہیں۔ دنیا دیکھی ہوئی ہے۔ اس لئے ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ہم یونہیں لوگوں کو ہنساتے ہنساتے مرجائیں تو بھی ہم ثابت نہ کر سکینگے کہ دونوں میں بہتر ایکٹر کون ہے۔ ٹھیک؟ تو پھر نجات کا ایک ہی طریقہ ہے۔ جیت اس کی جو ٹریجک (دردناک) پارٹ کامیابی سے کرے۔"

یہ کہکر وہ زینک میاں کو نہایت اطمینان سے دیکھنے لگا۔ کیونکہ انہیں تو قدرت نے بنایا ہی مذاقیہ تھا۔

زینک "درست!" کہکر اپنے ساتھی کو کامیاب نظروں سے دیکھنے لگا۔ کیونکہ غیٹو کو اس ڈیل ڈول کے ساتھ ٹریجیڈی میں تصور کرنا بھی ناممکن تھا۔

غیٹو پھر کہنے لگا "لیکن اس تجویز میں ایک نقص ہے اور وہ یہ کہ کمپنی ہمیں تو نہیں دیگی۔ سرکتیٹر میں یہی بات ہے۔ آدمی اگر ایک خاص روش میں کامیاب ہو جائے تو عمر بھر سے اسی روش پر بنا پڑتا ہے۔ اگر میں ابتدا میں ان ہیرو کا پارٹ کرنے میں کامیاب ہوجاتا تو آج ویسا ہی پارٹ کر رہا ہوتا۔ اور اب جو اتفاقیہ میں نے کامک میں شہرت حاصل کی ہے تو سب سمجھتے ہیں کہ میں اور کچھ نہیں کر سکتا۔"

زینک نے بھی اس کی رائے سے اتفاق ظاہر کیا۔ "یہی حال میرا ہے۔ تو پھر اب کیا کیا جائے؟"

غیٹو کچھ دیر سوچ کر کہنے لگا "اب چونکہ سٹیج پر تو اجازت نہیں ملیگی۔ اس لئے ہمیں خود کوئی موقعہ تلاش کرنا چاہئے چھٹیوں میں ——"

"ہم ایکٹروں کے سامنے پارٹ کریں؟" یہ کہکر زینک کچھ سوچنے لگا۔ اور پھر خود ہی کہنے لگا "مگر اس میں ایک دقت ہے اور وہ یہ کہ فیصلہ کے لئے تو پبلک کی پبلک درکار ہے۔"

غیٹو دبی آواز سے بولا "بیشک یہ . . . . "

دونوں نہایت مایوسی سے آہستہ آہستہ چسکیاں لے کر چائے پینے لگے۔ کتنی گردنیں ان کے میز کی

طرف جھکی ہوئی تھیں۔ لوگ کہہ رہے تھے" وہ دیکھو زینک اور غیٹو بیٹھے ہوئے ہیں۔ انہیں جب کبھی دیکھو بے اختیار ہنسی آجاتی ہے" کسی کو گمان تک نہ تھا کہ یہ ہنسی کے بادشاہ کسقدر شکستہ دل بیٹھے ہوتے تھے۔

آخر زینک نے آہ بھر کر کہا" اب کیا کرنا چاہیئے"

غیٹو تیوری چڑھا کر خاموش ہو رہا۔ دونوں اپنے خیالات میں غرق تھے۔ اسی محویت کے عالم میں ایک دراز قامت، چوڑا چپٹا سیاہ پوش آدمی ان کو پہچان کر پاس آ کھڑا ہوا۔ اور پھر کچھ جھجکتا ہوا کہنے لگا" مجھے معاف کیجئے۔ میں یوں دخل انداز ہو رہا ہوں۔ مگر مجھے آپ سے مشورہ لینا ہے۔ میں فیس دینے کے لئے تیار ہوں۔ اجازت ہو تو عرض کروں؟"

غیٹو جواب میں کہنے لگا" صاحب اس وقت تو ہم خود آپس میں اپنے تازہ پارٹ کے متعلق مشورہ کر رہے ہیں۔ ہاں کسی فرصت کے وقت۔۔۔"

نووارد اصرار کرنے لگا" مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس بھی وقت بہت کم ہے۔ میں بھی اپنا تازہ ترین پارٹ کر رہا ہوں۔ سٹیج پر آتے ہوئے تو مجھے بیس برس ہو چکے ہیں۔ مگر یہ پہلا پارٹ ہے کہ جس میں مجھے بولنا پڑا ہے"

زینک منہ بنا کر بولا" ہیں؟ تو کیا آپ اب تک سہیلیوں میں نکلا کرتے تھے"

"نہیں صاحب" اجنبی کے چہرہ پر سیاہی کی ایک نئی تہ جم گئی۔ "میں سرکاری جلاد ہوں اور اب مجھے اپنی ملازمت کے خوفناک تجربات لیکچر میں بیان کرنے ہیں"

دونوں ایکٹروں کے چہرہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ روشن کمرہ سولی کے پرچھائیں سے تاریک ہو رہا تھا۔

"میرا نام ہلاکو خاں ہے۔ میں نے نوکری سے استعفٰے دے دیا ہے۔ اور اب جو مجھے کانگریس ہال میں لیکچر دینا ہے۔ تو میرا دل اندر ہی اندر بیٹھا جاتا ہے کیا یہ عجیب بات نہیں کہ میں جو بیس سال سے اپنا خوفناک کام کر رہا ہوں۔ جب کبھی آزمائش کے طور پر پلیٹ فارم پر کھڑا ہوتا ہوں۔ تو میرا دل دھڑکتا ہے۔ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ گویا میں ہمہ تن پارے لرزاں ہوں۔ میری بانہیں ہیجان ہو کر لٹکنے لگتی ہیں۔ پہلے مجھے ان کا خیال بھی نہ ہوتا تھا۔ مگر جب میری توجہ مجرم کی بندی ہوئی لرزنے والی ٹانگوں اور بازوؤں کی طرف ہوتی تھی خیر میں نے خیال کیا تھا کہ شاید آپ مجھے کچھ ہدایتیں دے سکیں۔ غالباً ایک دو سبق کافی ہونگے"

غیٹو فوراً کہنے لگا" تشریف رکھئے۔ مگر آپ نے استعفٰے کیوں دیا؟"

ہلاکو خاں نے جواب دیا۔" اس لئے کہ سچائی کی روشنی نے میری آنکھوں سے تاریکی کے پردہ اٹھا دیئے ہیں۔ میں پھانسی کی سزا کو جرم تصوّر کرتا ہوں۔"

"ضمیر کی ملامت۔ ہیں؟" "بجا ہے" غیٹو نے چیختا کہنے لگا۔" بہت خوب! یہ لیکچر کیا ہی ڈرامیٹک موقعوں سے بھرا ہوتا ہے!۔ ہاں تو اس کا مضمون کیا ہوگا"

"میری سوانحمری ہوگی۔ میری جوانی، غربت اور پچھلے بیس برس کے تجربات پشیمانی اور توبہ!"

"بہت خوب!" غیٹو کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"بہت خوب!" اور مردہ مجرموں کی روحیں تمہیں پلیٹ فارم پر بھی ستانے آتی ہیں۔ تمہاری آواز رک جاتی ہے۔ تمہاری آنکھیں خوف کے مارے باہر اچھلنا چاہتی ہیں۔ تمہارے منہ سے "رحم۔ رحم" کی آواز نکلتی ہے۔ اور تخیل کو تمہارے پھیلے ہوئے ہاتھ خون سے رنگین نظر آتے ہیں۔ حاضرین کانپ اٹھتے ہیں۔ عورتوں کو غش آجاتا ہے۔ توانا آدمیوں کا سانس ہجوم جذبات سے بند ہوجاتا ہے۔" غیٹو نے یکایک میز پر زور سے مکا مارا اور بیچارا زیٹک اچھل کر دور جا پڑا۔ کیونکہ اس نے اپنے رقیب کے خیالات کا درست اندازہ کرلیا تھا

"سنو!" یہ کہکر غیٹو ہلاکو خاں کی طرف مخاطب ہوا۔ "کیا تمہیں کانگریس ہال والے جانتے ہیں؟"

"ہاں میرے نام سے آگاہ ہیں۔" "واہ میرا مطلب ہے کہ وہ تمہاری صورت سے آشنا ہیں!"

"نہیں۔ کیوں؟" "ہاں تمہیں کوئی پہچان تو نہیں سکیگا؟" "قریباً ناممکن ہی ہے۔"

"تمہیں منافع کسقدر ہوگا" "بال چھوٹا سا ہے۔ اور ٹکٹ بہت کم قیمت ہیں۔ کوئی سو روپیہ کے قریب جمع ہوجائیگا۔" "اور تم پلیٹ فارم پر جانے سے گھبراتے ہو۔ اور تم چاہتے ہو کہ تاخیر ہوجائے۔"

"یہ سب کچھ درست ہے مگر بات کیا ہے۔" "لو بتائے دیتا ہوں۔ میں تمہیں دو سو روپیہ نقد دونگا۔ اگر تم مجھے اپنی جگہ لیکچر دینے دو۔" "ہیں؟" "کہو منظور ہے؟"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"میری عرصہ سے تمنا تھی۔ کہ کامک کے علاوہ بھی کوئی پارٹ کروں۔ تم دوسرے دن کہہ سکتے ہو۔ کہ ٹرین سے رہ گئے تھے۔ یا بیمار تھے۔ غرض ایسے ہزار معقول عذر بن سکتے ہیں۔ اور یہ تو کسی کو معلوم ہی نہیں ہوسکیگا کہ تمہیں بھی اس شخص کا کچھ علم تھا۔ اس کی تمام ذمہ واری مجھ پر ہے کہو۔"

اس نے جھجک کر جواب دیا۔" مگر دو سو روپیہ تو کم ۔ ۔ ۔ ۔"

"ہرگز نہیں۔ تمام بمبئی کے پریس میں یہ خبر شائع ہوجائیگی

کہیں غیلٹو نے ہلاکو خاں کی جگہ لیکچر دے کر حاضرین کا خون خشک کر دیا۔ لاکھوں آدمیوں میں تمہارے لیکچر کا ذکر ہوگا۔ دیکھو میں تمہارے لئے ایسے عظیم الشان اشتہار کا سامان مہیا کر رہا ہوں اور گرہ سے قیمت بھی دے رہا ہوں۔ اور کہو گے تو لیکچر بازی کے متعلق ایک دو گر بھی بتا دونگا۔ کیوں یہ سودا منظور ہے؟"

ہلاکو خاں مان گیا۔ "بہت اچھا صاحب!"

بیچارا زیٹک اب بی زلفن کے خیال سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ بھلا اب غیلٹو کا مقابلہ کیسے ممکن تھا؛ رات کو تھیئٹر میں زیٹک پہلے سے زیادہ عاجزی و زاری سے بی زلفن کے آگے پیچھے پھر رہا تھا۔ مجمع کو جواب نالیاں بجا بجا کر داد دے رہا تھا۔ اس کی مایوسی کی کیا خبر تھی؟ اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ وہ دل ہی دل میں پارٹ کے کے چھوٹے ہونے پر مصنف کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔

اور غیلٹو پھولا نہ سماتا تھا۔ اگر وہ اپنے ارادوں میں کامیاب ہوگیا تو پھر؟ ۔۔۔ بی زلفن نے ارادہ ظاہر کیا کہ وہ بھی یہ "تماشہ" دیکھنے کے لئے موجود ہوگی۔ زیٹک نے بھی وعدہ کیا۔ غیلٹو تمام رات لیکچر تیار کرتا رہا اور اپنی شکل چھپانے کے لئے مختلف بھیس تجویز کرتا رہا۔ تاریخ حسب معمول اس ضروری نقطہ پر خاموش ہے۔ کہ آیا بی زلفن غیلٹو کی کامیابی کی متمنی تھی یا نہ تھی۔ لیکن بعض روایتوں میں آیا ہے کہ وہ زیٹک کی طرف پہلے سے زیادہ متوجہ تھی۔

خیر تمام کانگریس ہال پہنچ گئے۔

غیلٹو ایک خاص وقار سے داخل ہوا۔ تیسری قطار میں زلفن اور زیٹک بیٹھے ہوئے تھے۔ اور اس نے ان کی طرف آنکھ سے خفیف سا اشارہ بھی کیا۔

"معزز خواتین! صاحبان ......"

تمام نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ لوگوں کو جلاد کی آواز میں ایک خاص مہلک تغیر معلوم ہوتی تھی۔

شروع شروع میں تو لیکچر نہایت مزے مزے سے ہوتا رہا۔ کہیں کہیں بچپن کے تجربات اور مذاقیہ قصے بھی تھے۔ لوگ کچھ کچھ ہنس بھی رہے تھے مگر ایک نمایاں گھبراہٹ سے بی زلفن زیٹک کے کان میں کہنے لگی۔

"غیلٹو ضرورت سے زیادہ مذاقیہ ہو رہا ہے۔ ضرور ناکامیاب رہیگا" مگر زیٹک نے نہایت پژمردگی سے کہا۔ "ابھی ٹھہر جاؤ۔ شاید وہ تضاد پیدا کر رہا ہو۔"

زیٹک کا خیال درست نکلا۔ آہستہ آہستہ لیکچرار کی آواز سے مسرت کم ہو رہی تھی۔ مذاقیہ قصے ختم ہو چکے تھے۔ ہیبت ناک حکایتیں۔ ڈراؤنی جرمیات بیان ہونے لگیں۔ اب وہ مرنے والوں کے آخری لمحوں کے خوف الم کا ذکر کرنے لگا۔ اور چیخیں مار مار کر اپنی پشیمانی کا اظہار

کہنے لگا۔ سسکیاں بھر بھر کے کہنے لگا۔ "میں قاتل ہوں۔ خونی ہوں" اب ہال میں سوئی گرنے کی آواز بھی سُنائی دے سکتی تھی لیکچر کے خاتمہ پر کسی نے بھی تالی نہ بجائی۔ گویا یہ اس کی کامیابی پر آخری مہر تھی۔

اخباروں کے نمائندے ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کے لئے دوڑ کر ہال سے باہر نکلے تاکہ ہلاکو خاں کے لیکچر کی "عدیم المثال کامیابی" کا حال سب سے پہلے شائع کریں۔

غیثو کی کامیابی! زیٹک فراخدلی سے مبارکباد دے رہا تھا۔ بی زلفن کیا ہی میٹھی میٹھی تعریفیں کر رہی تھی۔ اور پھر سونے پر سہاگہ یہ کہ نواب ذوالقدر جاہ بہادر کی طرف سے دعوتی رقعہ تھا۔ جس میں گذارش کی گئی تھی کہ اسی شام کو ہلاکو خاں نواب صاحب موصوف کو "شرف ملاقات سے سرفراز فرمائے۔

"آہا!" غیثو کی رئیس پسند طبیعت آپے سے باہر ہو رہی تھی۔ "ایک نواب کے ہاں دعوت ہوگی۔ سب مجھے کیسی کامیابی ہوئی ہے!" زیٹک پوچھنے لگا۔ "مگر یہ نواب کون ہے؟ میں نے تو ذوالقدر جاہ بہادر کا نام کبھی نہیں سُنا۔" "تمہارا سُننا یا نہ سُننا اس معاملہ میں کوئی خاص وقعت نہیں رکھتا۔ ایک نواب میرے ساتھ گفتگو کرنا چاہتا ہے اور یہ ایک ایسی عزت ہے جس کی ہر ایک کو قدر کرنی چاہیئے۔ میں ضرور جاؤنگا۔"

یہ کہہ کر غیثو ایک خاص شان سے فٹن میں سوار ہو کر چل دیا۔

راستہ کوئی زیادہ نہ تھا۔ اور مکان کی شکستہ حالت دیکھ کر غیثو جھجک سا گیا۔

ایک گنوار ملازم نے دروازہ کھولا۔ اور اسے ایک کمرہ میں بٹھا دیا۔ جہاں فقط چند شمعیں تھیں اور ایک چائے کا سیٹ۔ ملازم نے آکر اطلاع دی کہ نواب صاحب کو ڈاکٹر سے ملنا ہے۔ اس لئے چند منٹ کے لئے اجازت طلب کرتے ہیں۔

غیثو اب شمعدانوں کو دیکھ دیکھ کر محظوظ ہو رہا تھا مگر سوچ رہا تھا کہ زلفن کے ساتھ کھانا کھانے کا مزا کچھ اور ہی ہوتا۔

دروازہ دیر کے بعد کھلا۔ نواب ذوالقدر بہت ہی معمر آدمی تھا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ نواب صاحب چلتے چلتے پرزے پرزے ہو جائینگے۔ جلد کا گندمی رنگ تھا اور تمام منہ پر جھریوں کا جال پھیلا ہوا تھا پچکی ہوئی گال تھے۔ جن پر کہیں کہیں بھورے بھورے بال۔ اس عجیب چہرہ پر ابروؤں کے نیچے دھنسی ہوئی آنکھیں نیم مجنونانہ رنگ سے چمک رہی تھیں۔

نواب صاحب نہایت ہی پست آواز میں کہنے

لگے۔" ہلاکو خاں صاحب معاف رکھئے۔ آج شام کی غیر معمولی جدوجہد سے مَیں تھک گیا تھا۔ اس لئے مجھے ڈاکٹر کے پاس جانا پڑا۔ آپ کا لیکچر بہت ہی عبرت خیز تھا۔ مجھے عمر بھر نہ بھولیگا۔"

غیٹو جھک کر آداب بجالایا۔

"خانصاحب تشریف رکھئے۔ لیجئے بندہ چلے پیش کرتا ہے۔ مجھے تو ڈاکٹر کی طرف سے ممانعت ہے۔ مَیں ایک غریب میزبان ہوں۔ مگر میری عمر ایک کافی عذر ہو سکتی ہے۔"

غیٹو بھلا تکلفات میں کسی سے کم تھا۔ "نواب صاحب آپ جیسے رئیسوں کے ساتھ ملاقات ایک ایسا فخر ہے۔ ایک ایسی عزّت ہے جسے ....."

نواب صاحب نے آہ بھر کر کہا "مَیں تو عنقریب اس جمہوری ملک کی طرف سفر کرنے والا ہوں۔ جہاں تمام انسان ایک جیسے ہیں۔ جہاں فقط کیڑے مکوڑے مالک ہیں۔ مَیں نے آپ کو تکلیف اس لئے دی ہے کہ مجھے آپ سے ایک دردناک واقعہ ایک خاص دردناک واقعہ کے متعلق گفتگو کرنی ہے۔ آپ نے دورانِ لیکچر میں علیم اللہ کے پھانسی پانے کے متعلق ذکر کیا تھا۔ اس نے مرتے دم بزدلی کا اظہار تو نہیں کیا؟"

غیٹو نے چائے کی چسکی بھر کر کہا "نہیں بالکل نہیں ایسے بہادر دُنیا میں کم ہوتے ہیں۔" گھبراہٹ کے معمولی آثار بھی نمایاں نہ تھے۔ اس نے پھانسی کی ٹوپی کے لئے اپنا سر نہایت مردانگی سے پیش کیا۔" غیٹو کو تو کچھ خبر ہی نہ تھی کہنے لگا "ہاں ایک شجاع آدمی کی طرح" [redacted]

"بہت خوب!" اب نواب صاحب فخریہ لہجہ میں کہہ رہے تھے۔ "خوب! ایسا ہی چاہیئے تھا۔ تم نے کسی قیدی کو اس سے زیادہ بہادری سے موت کے لئے تیار ہوتا نہیں دیکھا ہوگا۔" غیٹو نہایت تذبذب سے کہنے لگا "اسکی بہادری کی عزّت میرے دل میں ہمیشہ جاگزیں رہیگی۔"

"کیا تمہارے دل میں یہ عزّت اس وقت بھی تھی؟"

"نواب صاحب معاف فرمائیے۔ مگر مَیں سمجھا نہیں۔"

مَیں پوچھتا ہوں کہ کیا تم نے اس بہادری کی اسوقت بھی عزّت کی تھی۔ کیا تم نے اسے تمام غیر ضروری تکالیف سے بچایا تھا۔" غیٹو کہنے لگا "تکلیف تو کچھ ایسی ہوتی نہیں آدمی ایک ہی جھٹکے سے ......"

میزبان جھنجھلا کر پوچھنے لگا "مَیں دماغی تکلیف کا ذکر کر رہا ہوں۔ کیا تم اس بیگناہ آدمی کی حالت کا اندازہ نہیں کر سکتے جسے یونہی پھانسی کی سزا دی گئی ہو گیا..."

"بے گناہ؟ خیر یہ تو ہر کوئی کہتا ہے۔" مگر علیم سچ بول رہا تھا۔ مجھے معلوم ہے۔ وہ میرا اکلوتا بیٹا تھا۔"

غیٹو گھبرا کر رک رک کر کہنے لگا "بیٹا۔ آ۔ آ۔ پکا۔"

"میرا اکلوتا بیٹا۔ میرا پیارا بیٹا۔ ہاں ہلاکو خاں صاحب وہ بیگناہ تھا۔ معصوم تھا۔" اور تم نے اسے ہلاک کیا ہے۔ تم نے تم نے۔۔۔"

"میں۔ میں تو فقط قانون کا ایک آلہ ہوں۔" غیثو کی کی آواز تھرا رہی تھی۔ "میں تو اسکی قسمت کا ذمہ وار نہیں۔"

نواب فوۃ القدر جاہ سوچ سوچ کر کہنے لگے۔ "ہلاکو صاحب آپ نے ایک نہایت ہی معرکۃ الآرا لیکچر دیا ہے اور میں دیکھتا ہوں کہ مجھے آپ کی ہر ایک بات سے اتفاق ہے میرے لڑکے کا خون تمہاری گردن پر ہے۔ واقعی تم اس کے "قاتل" ہو۔ "خونی" ہو۔ مجھے امید ہے کہ چائے بہت لذیذ ہوگی۔ بہت ہی لذیذ ہوگی۔ اور شوق فرمایئے چائے؟"

غیثو سب کچھ سمجھ گیا۔ اور کانپتا ہوا کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"چائے؟" اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ بڑھا نہایت اطمینان سے کہنے لگا۔ "ہاں اس میں زہر ملا ہوا تھا۔ اور آدھ گھنٹہ کے اندر اندر تم اپنے مقتولوں میں جا ملو گے۔"

غیثو کراہ رہا تھا۔ وہ ابھی سے عجیب عجیب کیفیتیں محسوس کر رہا تھا۔ اس کا خون سرد ہو گیا تھا۔ اس کے اعضا بھاری ہو رہے تھے۔ اسکی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا

بڑھا کہہ رہا تھا۔ "مجھے کوئی خوف نہیں۔ میں کمزور ہوں۔ تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتا ہوں۔ مگر تمہاری تندی تمہارے کسی کام نہ آئیگی۔ لڑو یا غش میں گر پڑو۔ جو چاہے سو کرو مگر اب تم جانبر نہیں ہوتے۔"

چند سیکنڈ دونوں مبہوت ہو کر چپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ایکٹر تو خوف کے مارے کانپ رہا تھا۔ اور میزبان کے چہرہ پر ایک مجنونانہ تبسم تھا۔

پھر جنونی نے آہستہ آہستہ اپنے دانتوں سے پلاسٹر کے ٹکڑے اکھاڑنے شروع کر دئے اور مصنوعی چہرے اور بالوں کو اتار دیا۔

جب تمام واقع شائع ہوا تو بمبئی کی پبلک ہنسی سے لوٹ رہی تھی۔ مگر کوئی بھی دونوں ایکٹروں میں کسی کو ترجیح نہ دیتا تھا۔ اگر غیثو نے تمام بمبئی کو الو بنا دیا تو زینک نے غیثو کو چاروں شانے چت گرایا۔ مگر زینک غیثو کا دوست تھا۔ اس کے کیریکٹر سے واقف تھا اس لئے کامیاب رہا لیکن تمام شہر اور پریس کی آنکھوں میں خاک ڈالنا کارے دارد۔ مگر . .

غرض لوگوں کی رائے اسی طرح منقسم رہی۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور بی زلفن آجتک اپنی ضد پر قائم ہے۔

تاثیر

حکیم احمد شجاع صاحب بی اے علیگ ایڈیٹر ہزارداستان و نونہال

کے اہم ادبی کارنامے

حسن کی قیمت:۔ جس میں عورت کی محبت، گناہ کی کشش اور نیکی و بدی کی مہیب طاقت کے ہر پہلو کو ایک نہایت دلکش اور پُرزور انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اپنی قسم کے افسانوں کا پہلا کامیاب مجموعہ ہے۔ اگر آپ حقائق زندگی کے عجیب و غریب انکشافات کے مشتاق ہیں تو اسے ضرور دیکھئے۔ ملک کے بہترین ادیبوں اور رسائل و اخبارات نے اس کتاب کو بنظر پسندیدگی دیکھا ہے۔ اندھا دیوتا۔ آرام شاہ کی بیٹی۔ گناہ کی رات جیسے سحر آفریں افسانے اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ قیمت صرف دو روپے۔

باپ کا گناہ:۔ پہلا کامیاب ڈرامہ جو پڑھنے میں بھی ویسا ہی دلچسپ نتیجہ خیز اور زبردست نظر آتا ہے جیسے اسٹیج پر۔ ایک عورت کی زرپرستی، ایک عیار کی مکاری، ایک شریف لڑکی کی قربانی کا عبرت خیز اور دلپسند افسانہ ہے۔ جسے ضروری نظر سے آراستہ کر کے نہایت ہی دیدہ زیب سامانِ طباعت سے شائع کیا گیا ہے۔ اس کی مقبولیت کا اس سے اندازہ کر لیجئے۔ کہ ہندوستان کی تھیٹریکل کمپنیاں اس کی قائل ہیں۔ اور صوبجات متوسط میں نارمل اسکولوں کے لئے کورس میں داخل کر لیا گیا ہے۔ ڈرامہ کی روش کو پہلی مرتبہ اس ناٹک نے تبدیل کر دیا ہے۔ اسے پڑھ کر قابل مصنف کے کمال فن کی داد دیجئے۔ حجم تین سو صفحات قیمت دو روپے (عہ/)۔

بینا۔ منوش۔ تارا

یہ تینوں ڈرامے بنگال کی موجودہ معاشرت کا مرقع ہیں، بنگال کے قابل ڈرامانویس بابو کشیرود چندر چٹرجی کی بہترین تصانیف ہیں۔ جس کو حکیم صاحب موصوف نے اپنی مشہور قدرت تحریر کو کام میں لا کر نہایت سلیس عام فہم اور دلچسپ اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔ تینوں افسانوں کا پلاٹ ازبس نتیجہ خیز اور عبرت آموز ہے۔ آپ دیکھ لیں گے کہ دو لائق مصنف کس طرح ایک کتاب کو کامیاب بنا سکتے ہیں۔ اور مترجم کی قابلیت کس طرح ایک زبان کے مفہوم کو دوسری زبان میں ادا کر سکتی ہے۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب قیمت حسب ذیل ہے۔ بینا ۱۲ار۔ منوش ۸ر۔ تارا ۸ر

ان کتابوں کے ملنے کا پتہ:۔

مینجر رسالہ ہزارداستان ا۔ لاج روڈ لاہور

برقعہ نوایجاد

آپ کی خواتین کو اس کی ضرورت ہے

پُرانی وضع کے بدنما تکلیف دہ اور ناکافی پردہ دار برقعہ بنانے میں اپنا روپیہ ضائع نہ کریں۔ انہی داموں میں **برقعہ نوایجاد** خرید کر کے خواتین کو زیبِ تن کرائیں تاکہ وہ آرام کے ساتھ مکمل پردہ کرلیں۔

برقعہ نوایجاد

سولہ سال سے ہندوستان کے ہر طبقہ اور ہر گوشہ کے مسلمانوں میں مقبول ہے۔ ریل کے سفر، ڈولی اور گاڑی کی سواری میں یکساں آرام دیتا ہے۔ ہر موقعہ اور ہر جگہ کے لئے موزوں ہے۔

آج ہی منگوائیں خود ملاحظہ کریں و خواتین کو معائنہ کا موقعہ دیں۔ پسند نہ ہو واپس کردیں۔

سفید سوتی	رنگین	اکپلہ	چینی ریشم	رنگین ریشم
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

(ناپ) کندھے سے ایڑی تک قد کی لمبائی اور سر کے دور کی ناپ۔

ترکی ٹوپیاں

ہم نے ترکی ٹوپیاں ساختہ مصر، قسطنطنیہ و آسٹریا براہِ راست منگوانے کا انتظام کیا ہے۔ آپ کو جو شیپ یا رنگ مرغوب ہو روانہ کرسکتے ہیں۔ ایک دفعہ منگوا کر ضرور ملاحظہ کریں۔

احمد تاج ([illegible]) نواتی ([illegible]) سلطانی ([illegible])

منگوانے کا پتہ:۔ **خاتون اسٹورز۔ نمبر ۱۲ فیض بازار دہلی**

قیمت سالانہ چھ روپیہ

قیمت ششماہی ... فی پرچہ ۱۰/

ہزار داستان

ایڈیٹر: حکیم احمد شجاع بی اے (علیگ)

جائنٹ ایڈیٹرز:

سید عابد علی عابد بی اے — محمد ہادی حسین

جلد ۳ — اشاعت ماہ اگست ۱۹۲۳ء — نمبر ۲

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	نمبر صفحہ
۱	صفحہ ادارت	ایڈیٹر	۲
۲	الف لیلہ کی ایک رات	سید عابد علی عابد بی اے	۳
۳	گورا	جناب عبدالستار خاں	۱۱
۴	کلام حسرت	مولنا حسرت موہانی	۱۶
۵	جوان بیمار	جناب مولنا محوی صدیقی	۱۷
۶	غزل	جناب احسن	۲۷
۷	گلکدہ	جناب محمد الدین تاثیر بی اے	۲۸
۸	غزل	جناب عزیز	۴۱
۹	نشاط زریں	جناب سبطین احمد	۴۲
۱۰	کلام شاد	جناب شاد عظیم آبادی	۵۳
۱۱	وصال جاوید	جناب محمد صادق	۵۴
۱۲	جذبات عزیز	جناب عزیز	۶۳
۱۳	غم نصیب	جناب محمد ہادی حسین	۶۴
۱۴	خوش کلامی	حضرت عابد	۷۰
۱۵	مولیئر	جناب نور الہی محمد عمر	۷۱
۱۶	تبصرہ اشاعات جدیدہ	جائنٹ ایڈیٹرز	۷۹

صفحہ ادارت

ہزار داستان کی پچھلی اشاعت کو جن معاصرین و ناظرین نے نگاہِ قدردانی سے دیکھا ہے۔ میں ان کا ممنون ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھے ہزار داستان کی اس اشاعت میں مضامین اور افسانوں کے معیار کو بلند اور مستحکم کرنے میں ایک حد تک کامیابی ہوئی۔ امید ہے کہ موجودہ اشاعت ان کوششوں ہی کی کامیابی کا ایک مزید ثبوت ثابت ہوگی۔ کیونکہ اس ماہ میں بارِ ادارت اُٹھانے کے لئے میرے بازو پہلے سے زیادہ مضبوط تھے۔ اور انشاء اللہ رہینگے۔ عزیزی سیّد عابد علی صاحب عابد بی۔ اے و محمدؐ ہادی حسین صاحب جن کے افسانوں اور تراجم کو ناظرین ہزار داستان نے ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اور جو علمی اور ادبی معاملات میں بیحد دلچسپی لینے کے علاوہ صاحبانِ نقد و رائے ہیں۔ ہزار داستان اور نونہال کے دفتر میں اس ماہ سے بحیثیت جائنٹ ایڈیٹر باقاعدہ طور پر کام کر رہے ہیں۔ مضامین کی ترتیب و انتخاب شاید اتنا مشکل کام نہ ہو۔ لیکن بوقت ضرورت رسالہ کے لئے اعلیٰ پایہ کے مضامین لکھنا اور اس طرح رسالہ کے ادبی معیار کو مبتذل ہونے سے بچانا یقیناً ایک مشکل کام ہے اور عملۂ ادارت کا سب سے اہم فرض۔ میں خوش ہوں کہ عزیزانِ موصوف ہر طرح سے اس ذمہ داری کے اہل ہیں۔ اور آئندہ رسالہ بھرتی کے مضامین سے بے نیاز ہونے کی توقع رکھ سکتا ہے محض اسی صورت میں انتخابِ مضامین میں کسی معیار کو مدِنظر رکھنا ممکن ہو سکتا ہے یورپین رسالوں کی کامیابی کا راز زیادہ تر عملۂ ادارت کی قابلیت ہی میں مضمر ہے۔ مجھے اب ایک گونہ تسلی و اطمینان ہے کہ میرے شرکائے کار ہر طرح سے اس ذمہ داری کے اہل ہیں۔

پچھلی مرتبہ میں کمی گنجائش کے باعث مضامین کا تعارف نہ کرا سکا۔ گورا، جس کی دوسری قسط اس اشاعت میں شائع ہو رہی ہے۔ ہندوستان کے مایۂ ناز فلسفی اور شاعر ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور کا ایک معرکۃ الآرا افسانہ ہے۔ جو زبانِ انگریزی میں اب ماڈرن ریویو کلکتہ میں بالاقساط شائع ہو رہا ہے۔ میں جناب عبدالستار خاں مدظلہٗ کا مرہونِ منت ہوں۔ کہ اُنھوں نے ہزار داستان کے ناظرین اور اردو زبان پر احسان کیا کہ اس نہایت ہی دلچسپ اور فلسفیانہ افسانے کو اُردو کا جامہ پہنایا۔

گلکدہ (دیوانِ حضرت عزیز) پر ایک مبسوط تنقیدی مضمون جو جناب محمد الدین صاحب تاثیر کا نتیجۂ فکر ہے۔ اس اشاعت میں شائع ہو رہا ہے۔ ان کا تبحرِ علمی اور واقفیتِ ادب کسی ستائش کی محتاج نہیں۔ وہ حضرتِ عزیز کے ایک سخن شناس مداح ہیں۔ اور اُنھوں نے ان اعتراضات کا کامیاب جواب دینے میں اپنی معروف لیاقت سے کام لیا ہے۔ اگرچہ بعض الفاظ سے وہ جوش بھی مترشح ہوتا ہے۔ جو شاعروں اور شاعروں کے قدردانوں کا خاصہ ہے۔ ان میں سے بعض الفاظ کو میں نے بوجوہات حذف اور بعض کو تبدیل کر دیا ہے اس کے لئے میں جناب تاثیر سے عذر خواہ ہوں۔ اور شفاعت کے لئے ادارت کی چند رسمی (اگرچہ غیر ضروری) مجبوریوں کو پیش کرتا ہوں

سیّد عابد علی صاحب عابد کی الف لیلہ کی ایک رات، اور محمدؐ ہادی حسین صاحب کے غم نصیب کی میں اب تعریف نہ کرونگا۔ کہ یہ بھی شاید رسمیاتِ ادارت کے اعتبار سے معیوب ہو۔

مولیئر کی زندگی کے حالات کو میرے کرمفرما جناب نور الٰہی و محمد عمر صاحب نے بڑی کوشش و کاوش سے مرتب کیا ہے۔ ڈراما کی دُنیا میں مولیئر ایک موجد کا درجہ رکھتا ہے۔ اور اپنی جدّت و آزادیِ طبع کے باعث اس کو جن مظالم کا شکار ہونا پڑا۔ انہوں نے اُسے جہانِ تخیل کا ایک بلند پایہ ہیرو بنا دیا ہے۔ ہجوِ ملیح اور کنایہ کی وساطت سے اس نے اپنے زمانے کی معاشرتی زندگی پر ایک ایسا اثر ڈالا۔ جو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس قسم کے علمی مضامین ذرا خشک ہوتے ہیں۔ مگر قابل مولفین نے اس تاریخی مضمون کو ہر طرح دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے

مولانا محوی کا افسانہ جہانِ بیمار میری ایک پیشینگوئی کو پورا کر رہا ہے۔ میں نے اپنی کسی تحریر میں لکھا تھا کہ اگر وہ مختصر افسانوں کے لکھنے کی طرف توجہ کرینگے۔ تو مجھے یقین ہے کہ وہ مُلک کے موجودہ بہترین افسانہ نویسوں میں امتیاز پیدا کر لینگے۔ کیونکہ ان کے اندازِ تحریر میں خواہ وہ نظم میں رونما ہو۔ یا کسی علمی مضمون میں وہ خصوصیات موجود ہوتی ہیں۔ جو افسانہ نگاری سے متعلق ہیں ٭

آخر میں میں پھر ہزار داستان کے معزز ناظرین کو اس کی اشاعت میں زیادہ دلچسپی لینے کے لئے یاددہانی کرانا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ کہ رسالہ کی کامیابی بہت کچھ اس پر بھی منحصر ہے

ایڈیٹر

الف لیلہ کی ایک رات

(۱)

قہوہ خانے کی فضا دھوئیں سے مکدر ہو رہی تھی۔ اور وہ ایک گوشۂ تنہائی میں بیٹھا ایک انداز حقارت سے گرد و پیش کی چیزوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے گرد سامانِ عشرت کا ہجوم تھا۔ مختصر میزوں پر بلوریں کنٹر رکھے تھے۔ جن میں سے کئی بادۂ خوشگوار کے عقیقیں رنگ کو نمایاں کر رہے تھے میزوں کے گرد مغربی رنگین ادا اپنے شوخ ریشمی اور چست کپڑوں میں ملبوس سُریلے قہقہوں سے جھوٹی اور رعایتی خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ صرف نوکروں کی "حضور کچھ چاہیئے" انہیں ذراسی دیر کے لئے سنجیدہ کر دیتی تھی۔ کمرے کے انتہائی گوشے کے قریب ایک اونچی سٹیج پر دبیز مخمل کے زرتاری پردے پڑے ہوئے تھے۔ آدھے آدھے گھنٹہ کے توقف کے بعد وہ پردے کھنچ جاتے۔ اور خوبصورت نوجوان لڑکیوں کا ایک گروہ رقص میں مشغول دکھائی دیتا۔ ان کی عریانیِ انداز۔ ان کا جوشِ شباب ہر شے کو ایک تڑپ ایک سوز سے آشنا کر دیتا۔ ان کے شاداں و شگفتہ چہروں میں لوگ تو صرف جوانی کی آرزوؤں کو جھلکتا ہوا دیکھتے تھے۔ مگر وہ جانتا تھا کہ اس خوشنما نقاب کی تہوں میں وہ احساس ذلت ہے جو روپے کے بدلے پاکبازی دیکر خرید اجاتا ہے۔ تمام قہوہ خانہ تالیاں پیٹ رہا تھا۔ مگر اُس کا دل غمگین تھا۔ ایسی شادمانی کا دور پیاپے چلتا رہا۔ لوگ آتے اور جاتے رہے۔ اپنے گناہوں کی یاد کو شراب میں غرق کرنے کے لئے آتے رہے فراموشی حاصل کرنے کے لئے آتے رہے۔ اور سیاہ مست ہو کر جاتے رہے۔ مگر وہ ان تمام واقعات سے بے نیاز اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا مُسکراتا رہا۔ اب رات کا دوسرا حصّہ جا چکا تھا آمد و رفت میں کمی واقع ہو گئی تھی۔ ناچ والیوں کے پاؤں میں تکان کی لغزش تھی۔ آنکھوں میں تب بیداری کا خمار مگر وہ ناچتی رہیں۔ ہاں اسی طرح ناچتی رہیں جس طرح ایک رنگین تیتری موسم بہار میں اپنی عمر کو ناچ کر ہی تباہ کر دیتی ہے یا کسی آتشین رُخسار بچے کی گلابی انگلیوں میں مسلی جاتی ہے۔ . . . .

وقت گذرتا گیا۔ آمد و رفت کم ہوتی گئی اور اس کے دل پر اندوہ کے بادل چھا گئے۔ جبتک قہوہ خانے میں رونق رہتی تھی اس کا دل مضطرب نہ ہوتا تھا۔ وہ ہندوستان کا ایک تعیش پسند امیر تھا۔ جس کا خمیر عشق سے گوندھا گیا تھا وہ اپنے مُلک کے حسن میں معاشقات کی نشو و نما نہ کر سکا۔

جہاں تک وہ جانا چاہتا تھا کوئی نہ جا سکا۔ لوگ متلاطم سمندر کی سطح پر رہ جاتے تھے۔ وہ تہہ میں جانا چاہتا تھا۔ لوگ گناہ کرتے تھے وہ گناہ سے واقف ہونا چاہتا تھا۔ بدنامی اور رسوائی اس کے لئے مہمل نام تھے۔ جو ان لوگوں کے لئے وضع کئے جاتے ہیں جن کو گناہ کرنے کا سلیقہ نہیں۔ یہ سوچ کر وہ پیرس آ گیا۔

پیرس! حسن وعشق کا مولد۔ گناہ کا مسکن۔ جہاں بدی مسکراتی ہے۔ معصومیت لٹا دی جاتی ہے۔ اور جہاں عشرت کا دور دورہ ہے۔ اس کے پہلے چند دن بہت اچھے گذرے واقعات کا انوکھا پن فرسودہ سے فرسودہ شے کو دلچسپ بنا دیتا تھا۔ حسینوں کی کثرت نے اسے یقین دلا دیا تھا۔ کہ بہار فردوس زمین پر اتر آئی ہے۔ مگر حقیقت کی تلخی نے اس خوشگوار نشے کو دور کر دیا۔ اسے معلوم ہوا کہ یہاں محبت کی نہیں جاتی خریدی جاتی ہے۔ اس ابتذال نے اسے مایوس کر دیا۔ وہ ہر ایک چیز کو دور سے دیکھنے لگا۔ وہاں ہر ایک دلچسپی کی دوری اس کی اصلی خوشنمائی تھی۔ ورنہ قرب میں تو زہر ہلاہل کے پیالے تھے۔ جن پر جو اسے اعتماد تھا جاتا رہا۔ اس کا معمول ہو گیا۔ کہ وہ ہر شام کسی قہوہ خانے میں جا بیٹھتا اور دیکھتا کہ لوگ کس طرح اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں البتہ جب کوئی خلاف معمول خوبصورت چہرہ اس کے دل میں ایک طوفان برپا کر دیتا۔ تو اس کی خواہشات دبی ہوئی چنگاری کی طرح سلگ اٹھتیں۔ اس دن وہ خلاف معمول بہت زیادہ غمگین تھا۔ سوچ رہا تھا۔ کہ ہندوستان واپس چلا جائے۔

(۲)

اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں پر ٹیک لیا۔ اور اپنی تمام حسرت کو ایک ہوس انگیز لہجہ میں مجتمع کر کے کہا۔

"کیا مجھے یہاں خوشی نصیب نہ ہوگی۔ پیرس! عشرت کی ملکہ پیرس۔ کیا تجھ میں اتنی توفیق نہیں کہ میری محبت کو مطمئن کر سکے۔"

ابھی آخری الفاظ اس کے منہ میں ہی تھے۔ کہ اس کو ریشمی کپڑوں کی سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا ایک عورت سیاہ فرغل میں لپٹی ہوئی نقاب اوڑھے ہوئے کھڑی تھی۔ اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ اسے بہت غور سے دیکھ رہی ہے۔ فرغل کی شکنوں سے اس کے گدرائے ہوئے اعضا کا تناسب ظاہر ہو رہا تھا۔

وحید کے دل میں معاً شک گذرا۔ اسی طرح کی کئی عورتیں دن بھر میں کئی نوجوانوں کو فریب دیا کرتی ہیں۔ اس نے اپنی آنکھیں نیچی کر لیں۔

اس عورت نے وحید کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وحید کو یوں معلوم ہوا گویا اس کے تمام بدن میں بجلی کی رو دوڑ گئی ہے۔ پھر اسے ایک نہایت ہی نرم اور شیریں آواز سنائی دی۔

"موسیو! ابھی آپ کیا کہہ رہے تھے۔"

وحید چونک پڑا۔ "میڈم آپ نے کیا سنا ہے؟"

خاتون ہنس پڑی۔ "آپ عشرت کی تلاش میں ہیں؟"

وحید نے مسکرا کر جواب دیا۔ "میرا یہ مقصد نہ تھا کہ کوئی میری گفتگو سن لے۔"

"اگر کسی نے سن لی ہو؟"

"میں آپ کو معاف کر سکتا ہوں۔"

خاتون بیٹھ گئی۔ اور نقاب اتار دیا۔ وحید ششدر رہ گیا۔ اس نے بہت سے دلربا چہرے دیکھے تھے مگر یہ رنگ کسی میں نہ پایا تھا۔ اس نے اپنے دل میں کہا۔ "یہ تو ایک حسن کی دیوی معلوم ہوتی ہے۔"

تھوڑا عرصہ چپ رہنے کے بعد خاتون نے کہا "میں آپ سے بیگانہ محض ہوں۔ مگر مصیبت دشمنوں تک کو ایک کر دیتی ہے۔ کیا میں عشرت کی تلاش میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں۔"

وحید سوچنے لگا اس کے دل میں شبہات پیدا ہونے لگے ایک عورت کو اور وہ بھی اجنبی کیا پڑی ہے۔ کہ اس کی مدد کرے اتنا عرصہ پیرس میں رہ کر وہ وہاں کے چھل بل سے واقف ہو گیا تھا۔ وہ اسی طرح کے خیالات میں غرق تھا۔ مگر جب وہ خاتون کی نیلی آنکھوں کی طرف دیکھتا جن میں یک گونہ شوخی تو ضرور موجود تھی۔ مگر صداقت اور بھولپن کا رنگ گہرا تھا تو اسے تسلی ہو جاتی۔ یک بیک اس نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا۔

"آپ میری کیا مدد کر سکتی ہیں؟"

خاتون نے وحید کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور کہا

"میں آپ کو عشرت کے شیش محل میں لے جاؤں گی جہاں سدا بہار عیش کے پھول کھلتے ہیں۔ جہاں فوارے موسیقی سے لبریز ہیں۔ جہاں جنت الفردوس کی حوریں زمین پر اتر آئی ہیں۔ جہاں نغمہ ہے۔ جہاں تعطر ہے۔ جہاں حسن ہے۔ اور جہاں حسن و عشق کی دل افروز رنگینیاں ہیں۔"

وحید مسکرایا۔ "میں اسی طرح کے بہت تلخ تجربے کر چکا ہوں خود فروش حسن مجھے پسند نہیں۔"

خاتون کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "آپ خود دیکھ لینگے کہ حسن خود فروش ہے یا خوددار۔ اگر آپ کو چلنا ہو تو چلئے۔"

یہ کہہ کر خاتون اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور دروازہ کی طرف چلدی۔ وحید بھی اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے پیچھے چلدیا۔ اس نے اپنے تئیں تقدیر کو سونپ دیا۔

(۳)

پیچ در پیچ بازاروں میں سے گذر کر جن میں باوجود اس قدر رات گذر جانے کے بھی ایک ہنگامہ گرم تھا۔ وحید اور اس کی نازنین رہبر شہر سے باہر کھلی فضا میں جا پہنچے۔ اندھیری رات تھی۔ آسمان بادل کے سیاہ لبادوں میں ملفوف تھا۔ شہر کی روشنی کے مقابلے میں تاریکی بہت گہری معلوم ہوتی تھی۔ گرد و نواح کے بلند بالا درخت جن کے پتوں میں ہوا کی موجیں سرسراہٹ پیدا کر رہی تھیں جنات کا ایک عظیم الشان لشکر معلوم ہوتے تھے۔ جو دور تک پھیلا چلا

گیا ہو۔ کبھی کبھی بجلی کی چمک حدِ افق تک ایک سُرخ چمکتی ہوئی لکیر کھینچتی چلی جاتی تھی۔ گویا کوئی آتشیں سانپ پھنکاریں مار رہا ہو۔ وہ نازنین جھپٹتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ اگرچہ وحید بھی سائے کی طرح ساتھ ساتھ تھا۔ مگر اس کے دل میں شبہ کا زہریلا تخم نشو و نما پا رہا تھا۔ کیا وہ عورت کسی رہزن کی معشوقہ تو نہ تھی۔ جو اُسے گھیر کر لے جا رہی ہو۔ اس کے دل میں یہ شبہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتا چلا گیا۔ اُسے کچھ خوف سا محسوس ہونے لگا مینہ کے چند موٹے موٹے قطرے پڑے۔ بجلی ایک خوفناک طریق سے چمکی۔ تمام میدان ایک شعلہ سا بن گیا۔ اور پھر یکایک عناصر نے اپنی قوتوں کی باگ ڈھیلی چھوڑ دی۔ ہوا شائیں شائیں کرتی آئی۔ اور دونوں کے قریب سے دھاڑتی ہوئی نکل گئی۔ بادل گرجے مینہ بے انتہا زور سے برسنے لگا ہر چہار طرف تاریکی مسلط ہو گئی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا پاس کے ایک درخت پر بجلی گری۔ اور اس طرح کا دھماکا ہوا۔ گویا تحت الثریٰ کے تمام ارواح خبیثہ زمین کو پھاڑ کر باہر نکل آئیں۔

کچھ تو اس سنسان مقام کی اجنبیت اور کچھ منظر کی خوفناکی کی وجہ سے وحید کے دل پر ہیبت طاری ہو گئی۔ اُسے چند ایک کتابیں یاد آئیں۔ جو اُس نے پیرس میں خرید کر پڑھی تھیں۔ اور جن میں وہاں کے علم الجرائم پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی گئی تھی۔ ہزاروں مہیب حادثے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس کے خیال میں آئے۔ ان تمام پریشان کن خیالات نے ایک اضطراری جذبہ غضب کی صورت اختیار کی۔ اس نے بہت درشتی سے اپنے رہبر کے قرغل کو تھام لیا۔ اور طنزاً کہا۔ "نیلے نیناں والی فریب کار مجھے کہاں لئے جا رہی ہو؟"

نازنین نے مڑ کر وحید کی طرف دیکھا پھر اسی طرح جھپٹتی ہوئی چلی گئی۔ وحید کو اس انداز استغنا پر غصہ آ گیا۔ اُس نے نازنین کے دونوں شانوں کو اپنی مضبوط گرفت میں پکڑ لیا۔ اور اُسے جھنجھوڑ کر کہا۔ "بولو۔ سُنتی ہو۔ میں نہیں جاتا۔ تم مجھے کہاں لئے جا رہی ہو؟"

نازنین کے آبدار دانت اندھیرے میں موتیوں کی طرح چمکے۔ مسکرائی "اس مینہ میں ٹھیرنے کا کیا موقع ہے (ادھر اُدھر دیکھ کر) وہ دیکھو سامنے ایک شاہ بلوط کا درخت ہے۔ اس کے نیچے باتیں ہونگی۔"

مینہ کی بوچھاڑ مُنہ پھیرے دیتی تھی۔ درختوں کے پتوں پر پانی پڑتا تو یوں معلوم ہوتا کہ پتوں میں سوراخ ہو جائینگے سڑک کیچڑ میں لت پت ہو رہی تھی۔ بجلی ایک دفعہ پھر چمکی اور دونوں نے دوڑ کر شاہ بلوط کے نیچے دم لیا۔ دونوں کے کپڑے شرابور ہو گئے تھے۔ نازنین نے اپنا لبادہ اُتار ڈالا تھا اسکے گنجان بھورے بال ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ اُس نے قہقہہ مارا اور کہا "سچ ہے۔ موسیو۔ خوشی حاصل کرنے کے لئے بھی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے"

وحید کا غصہ ابھی فرو نہ ہوا تھا۔ "میں کیا جانوں کہ اس خوشی کے حاصل کرنے کے لئے مجھے کیسی کیسی مصیبتوں میں مبتلا ہونا ہوگا۔ تم میری جگہ اپنے آپ کو تصور کرو۔ اور پھر سوچو کہ تم بھی اس معاملہ میں قدم رکھتے ہوئے تامل کرتیں یا نہیں"

وہ خاموش رہی پھر درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگی۔ "وہ منزلِ مقصود قریب ہے۔ اب تامل کیا تھوڑے عرصہ میں عشرت کی دیوی تمہارے قدم چومے گی"

یہ کہکر وہ پھر چل دی۔ وحید یہ سوچکر کہ جانا بیکار ہے واپس مڑا۔ نازنین نے ذرا دور جاکر آواز دی۔

"میرے بزدل عشرت کے طالب خدا حافظ"

یہ تیر نشانہ پر لگا۔ اس آواز میں حقارت تھی۔ استہزا تھا گویا یہ وحید کی مردانگی پر چوٹ تھی۔

اس نے زہر خند ہنسی ہنسکر کہا۔ "نیلے نیناں والی لے میں آتا ہوں"

یہ کہکر وہ اس کے تعاقب میں چلدیا۔ باقی سارا راستہ خاموشی میں طے ہوا۔ پندرہ منٹ کے سفر کے بعد وہ نازنین رکی ساتھ ہی تیرہ وتار آسمان منور ہوگیا۔ ایک لمحہ میں اس نے دیکھا کہ وہ ایک عظیم الشان عمارت کے سامنے کھڑا ہے جس کی بیرونی دیواریں سنگ سیاہ سے تراشی گئی ہیں نازنین نے دستک دی۔ ایک چھوٹا سا دروازہ کھل گیا۔ دونوں اندر داخل ہوتے وحید نے ادھر اُدھر دیکھا۔ اور اس کی آنکھیں یکایک خیرہ ہوگئیں۔ وہ ایک خانہ باغ میں تھا۔ ہزاروں درخت دور تک پھیلے ہوئے چلے گئے تھے۔ جن میں بجلی کے لیمپ اس صنعت اور کاریگری سے لگائے گئے تھے کہ بایدوشاید ایک ایک منٹ کے وقفے کے بعد ان کا رنگ تبدیل ہوتا رہتا تھا۔ ابھی سبز تھے۔ ابھی سرخ۔ ابھی نارنجی شاخوں پر مختلف قسم کے مصنوعی جانور جن کے شوخ رنگوں کو بجلی کی شعاعیں نمایاں کر رہی تھیں نغمہ سنجیاں کر رہے تھے۔ وہ ایک بڑی روش پر سے گذرتے ہوئے ایک غلام گردش میں پہنچے۔ وہاں سے نکلے تو ایک سیاہ آبنوس کا دروازہ ملا۔ جس پر دو حبشی غلاموں کے مجسمے تعینات تھے۔ انکی خوفناک صورتیں اور ان کی چمکتی ہوئی سرخ آنکھیں اصل سے اسقدر مشابہ تھیں کہ وحید بھی بیک نظر دھوکہ کھا گیا۔ چشم زدن میں یہ دروازہ کھل گیا۔ اور ایک ریشم کا پردہ اٹھا۔ اور کمرے میں وحید نے جو کچھ دیکھا۔ وہ ایک عالم کو مبہوت کرنے کے لئے کافی تھا۔

کم سن پری جمالوں کا ایک عظیم گروہ۔ ایک بے ترتیب شعریت کے ساتھ پھیلا ہوا تھا۔ کمرے کے تمام سامان آرائش کی رنگینی ان کے پیراہنوں کی رنگینی میں جذب ہوکر رہ گئی تھی۔ وہ خوشنما تیتریوں کی طرح ادھر اُدھر پھر رہی تھیں۔ وحید ششدر ہوکر کھڑا ہو گیا۔ مگر اس کی رہبر خاتون نے اس کے کان میں ہنس کر کہا۔ "یہ تو کتابِ عشرت کا دیباچہ ہے"

وحید چونکا اور اس کے پیچھے ہولیا۔ اس کے بعد وحید کو

مطلقاً ہوش نہ تھا کہ وہ کہاں چلا جا رہا ہے۔ ہاں اُس کے دماغ میں ایک دُھندلا سا خاکہ رہگیا۔ کبھی تو وہ ایک چشمہ کے قریب سے گذرتے جس میں سے ارغنون کی خوشنما صدائیں نکلتیں کبھی ایک تاریک کمرے میں پہنچتے جسکی سیاہ دیواروں پر آتشین حروف میں عجیب وغریب زبانوں کی عبارات کندہ ہوتیں اور کبھی ایک ایسے دشوار گذار راستہ میں سے گذرنا پڑتا جو بالکل پہاڑوں کی کٹھن اور تنگ وادیوں سے مشابہ ہوتا۔ آخرکار وہ ایک ہال کے سامنے پہنچے جس کے دروازہ کے پٹ سنگ مرمر کے ایک سالم ٹکڑے سے تراشے گئے تھے۔ خاتون نے ایک بٹن دبایا۔ دروازہ کے پٹ کھل گئے۔ نازنین نے جھک کر کہا۔ "نگاہِ روبرو! آپ اس وقت ملکہ حسن کے سامنے ہیں۔"

(۴)

وحید نے آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ مگر بظاہر اُسے کمرے میں کوئی متنفس نظر نہ آیا۔ عین اُس کے سامنے والی دیوار پر دوساٹن کے پردے پڑے ہوئے تھے جن کے کنارے پر سُنہری گوٹ ٹانکی گئی تھی۔ تمام ہال میں سیاہ آبنوس کی کرسیاں بچھائی گئی تھیں۔ جن کے وسط میں ایک چھوٹا سا راستہ چھوڑ دیا گیا تھا۔ کمرے کی دیواریں نایاب تصویروں سے لپٹی پڑتی تھیں۔ وحید خود ایک مصوّر تھا۔ اس نے بیک نظر دیکھ لیا کہ وہ تصاویر یورپ کے ایک مشہور سحر طراز مصوّروں کے موقلم کی ممنون ہیں۔ چھت سے کنول کی صورت کا فانوس آویزاں تھا۔ جس میں متعدد بجلی کے قمقمے لگے ہوئے تھے۔ چھت پر سنہری کام کیا گیا جو ایک مصنوعی تالاب کو محیط کئے ہوئے تھا۔ اس پر بجلی کی روشنی پڑتی تو یوں معلوم ہوتا گویا خالص سونے کا ایک ڈلا موجیں مار رہا ہے۔ وحید نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اسکی نازنین رہبر جا چکی تھی۔ دروازہ بند تھا۔ اس بات کو دیکھ کر اس کے گذشتہ شکوک تازہ ہو گئے۔ اس نے دروازہ کو دھکیلنا چاہا۔ مگر مضبوط کواڑوں نے اس کی قوت کی مدافعت کی۔ وہ ایک مقید شیر کی طرح جھلا کر دروازہ کو ٹکّے مارنے لگا۔ یکایک اس کے کانوں میں ایک آواز آئی۔ نہایت شیریں نہایت مترنم۔ مگر اس میں خفیف سی ہنسی کا ارتعاش موجود تھا۔

"موسیو! آپ بیشک طاقتور ہیں۔ مگر لکڑی سے انسان کی قوّت کا کیا مقابلہ"

وحید نے مڑ کر دیکھا کالے پردوں کو جنبش ہو رہی تھی۔

"آگے آجایئے۔"

وحید کو یوں معلوم ہوا گویا کوئی مقناطیسی قوت اُسے کھینچے لیجا رہی ہے۔ تمام شکوک یکقلم اس کے دل سے زائل ہو گئے۔ وہ بڑھا اور درمیانی راستوں میں سے گذرتا ہوا پردوں کے بالکل قریب جا پہنچا پھر اُس نے جھک کر مشرق کے بہترین انداز میں سلام کیا۔ پردوں کے نیچے سے ایک سُریلے قہقہہ کی آواز آئی "آپ پیرس میں بھی اپنے مشرقی تمدن کو برقرار رکھتے ہیں۔"

وحید مسکرایا۔ "بیشک مگر آپ نے مشرقیت کیوں اختیار کی۔ کیا مغربی تمدن کے یہی معنے ہیں کہ اپنے مہمان سے پردا کیا جائے۔"

پردے کھنچ گئے اور وحید کی آنکھوں کے سامنے ایک نقاب ظاہر ہوئی حقیقت میں اُسے ملکۂ حسن کہنا بیجا نہ تھا۔ اسکی خوبصورتی عیب سے مبرا تھی۔ شاذو نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ اعضا اپنی اپنی جگہ خوبصورت رہکر تناسب کی صورت اختیار کریں۔ مگر اس حالت میں یہ کلیہ ٹوٹ گیا۔ اس کا رنگ سُرخی مائل سفید تھا بالکل سیاہ بال جو ایشیائی طریق سے گوندھے گئے تھے۔ چمکتی ہوئی سیاہ آنکھیں جن پر گنجان پلکیں بنا سایہ ڈالے ہوئی تھیں پیازی ہونٹ۔

اُس نے قرمزی رنگ کا گون پہن رکھا تھا جس کی پیٹی سیاہ تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا۔ گویا کالے پردوں کے درمیان لالے کا ایک سرخ پھول کھل گیا ہو۔ وہ ایک تخت نما صوفہ پر اپنی کہنیوں کو ٹیکے ہوئے لیٹی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں کے اشارہ سے وحید کا خیر مقدم کیا۔ وحید پاس کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا

وحید بیٹھ چکا تو نازنین نے اس کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔

"موسیو آپ عشرت کی تلاش میں آئے ہیں۔"

وحید نے جواب دیا۔ "نہیں، محبت کی تلاش میں۔"

"محبّت اور عشرت ایک ہی معنے کے دو لفظ ہیں۔"

وحید نے اپنے تمام تجربہ کو ایک فقرے میں جمع کر کے کہا۔ "ممکن ہے محبّت کا نتیجہ عشرت ہو مگر محبّت کی تلاش تو ناکامی پر ختم ہوتی ہے۔"

"میرے فلسفی مزاج نوجوان محبّت اور عشرتِ دنیا میسر آ سکتی ہیں۔ میری دولت عشرت اور میرا حسن محبت کے لئے بنا ہے۔ مگر انہیں حاصل کرنے کے لئے ذرا دلیری کی ضرورت ہے۔"

وحید اس کے حسن سے متاثر ہوتا چلا جا رہا تھا اس گفتگو نے اُسے دیوانہ کر دیا۔ اسکے سینے میں آرزوؤں کا ایک طوفان برپا ہو گیا

اس نازنین نے اپنے الفاظ کا اثر دیکھ کر کہا۔ "ہاں ہاں میں تمہیں اپنی بے انتہا دولت دے سکتی ہوں۔ اس مکان کی تمام عشرت دے سکتی ہوں۔ محبّت دے سکتی ہوں اور سب سے بڑی بات یہ کہ طاقت کے لطف سے آشنا کر سکتی ہوں۔ تم اگر چاہو تو یہاں حکمرانی کر سکتے ہو۔ یہ تمام باغات اور عجائبات جنہیں تم دیکھ آئے ہو تمہارے ہونگے۔ یہاں کا ذرّہ ذرّہ تمہارے حکم کی تابعداری کریگا۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

وحید نے مضطرب ہو کر کہا۔ "مگر وہ شرط تو بتاؤ جس سے میں یہ تمام باتیں حاصل کر سکتا ہوں۔"

"بھولے نوجوان غور کر لو۔ ایسا نہ ہو کہ پیچھے کو تمہیں پچتانا پڑے۔"

وحید نے ناراض ہو کر کہا۔ "تم مجھے بتاؤ میں نہیں پچتاتا۔"

اس نازنین نے جھک کر وحید کے کان میں کچھ کہہ دیا۔ ایک لمحہ کے لئے اس کا رنگ فق ہو گیا۔ مگر اس نے اپنے آپکو سنبھال کر کہا۔ "بہت اچھا کل میں یہ شرط پوری کر کے آپ سے ملونگا۔"

(۵)

دوسرے دن وحید سو کر اُٹھا۔ تو اُس کو گذشتہ رات کے واقعات خواب کی طرح معلوم ہونے لگے۔ اُسے باور نہ آتا تھا کہ ایسا حیرت انگیز واقعہ گذر چکا ہے۔ اس طرح کی کہانیاں اس نے الف لیلہ میں پڑھی تھیں۔ اُسے یوں معلوم ہوتا تھا گویا وہ رات کو کسی پرستان میں رہا ہے۔ پھر جب اُسے رات والی شرط کا خیال آیا۔ جس کی بجا آوری پر حصول عشرت ممکن تھا۔ تو وہ کانپ گیا۔ اب کہ اس کے حواس خمسہ پوری طرح کام کر رہے تھے۔ اُسے یقین نہ آتا تھا۔ کہ رات کو اس نے کوئی ایسی شرط منظور کر لی ہے۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ اسے ایک خط موصول ہوا۔ جس کی عبارت مندرجہ ذیل تھی:

جناب عالی

انجمن "لالۂ صحرائی" پیرس کی طرف سے جناب کے ذمے ۲۵۰ پونڈ واجب الادا ہیں۔ حساب حسب ذیل ہے:

انجمن کے انعقاد خصوصی کا خرچ۔ جو کہ محض آپ کے لئے مرتب کیا گیا	۵۰ پونڈ
ہمارے ایجنٹ کا کمیشن	۵۰ پونڈ
آپ کے دل میں مختلف جذبات پیدا کرنے کی فیس	۵۰ پونڈ
ایجنٹ کی پوشاک کی قیمت جو مینہ میں خراب ہو گئی	۵۰ پونڈ

سکرٹری انجمن ہذا

کاغذ کی پشت پر درج تھا۔

انجمن کے مقاصد

۱۔ وہ نوجوان جو زندگی کی فرسودگی کی شکایت کرتے ہوں ان کو ایک رات کے لئے نئے ماحول کے زیر اثر لاکر تمام تفکرات کو زائل کرنا۔

۲۔ بھولے نوجوانوں کو اس بات کی تعلیم دینا کہ دنیا میں عشرت صرف فریب دہی کا نام ہے۔

. . . .

وحید اس خط کو پڑھ کر مسکرایا۔ اور بہت عرصہ ہنستا رہا۔ اسی وقت اُس نے چک کے ذریعے سے ۲۵۰ پونڈ انجمن کو ارسال کر دئے۔

آج تک جب دوستوں میں اس واقعہ کا تذکرہ کرتا ہے۔ تو اس رات کو "الف لیلہ کی ایک رات" کا خطاب دیتا ہے۔ مگر جب کوئی شرط کے اظہار پر مصر ہوتا ہے۔ تو مسکرا کر خاموش ہو جاتا ہے۔ کیا ہمارے ناظرین اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کہ وہ شرط کیا تھی۔

سید عابد علی عابد

گورا

(گذشتہ سے پیوستہ)

باب (۲) دوم

بارش کا موسم تھا۔ شام ہوتے ہی تاریکی پھیل گئی۔ چاروں طرف سے ابر گھر آیا۔ اس اندھیری گھٹا کے نیچے کلکتہ کا شہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ایک بڑا کتا عالم خاموشی میں اپنی دم پر سر رکھے ہوئے سست پڑا ہانپ رہا ہے۔ کل شام سے بارش برابر جھم جھم ہوتی رہی۔ جس سے کیچڑ ہو گئی۔ مگر پانی اتنے زور سے نہ برسا کہ کیچڑ دھل جاتی۔ آج تیسرے پہر پانی تو بند ہو گیا لیکن ابر ویسا ہی گھرا رہا۔ اور اتنا محیط ہے کہ جس سے زور کی بارش ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ ایسے سہانے وقت میں جب گھر میں طبیعت نہیں لگتی اور باہر ہوا خوری کے لئے جانے کو بھی جی نہیں چاہتا تو اکثر امرا اپنے بالاخانہ پر بیٹھ کر قدرتی مناظر کا لطف اٹھاتے ہیں۔ اسی حالت میں ہم ایک سہ منزلہ عمارت کے گیلے چھجے پر دو نوجوان شخصوں کو تپائیوں پر بیٹھے ہوئے دیکھتے ہیں۔

یہ دونوں دوست بچپن کے زمانہ میں مدرسہ آ کر اسی چھت پر کھیلا کرتے تھے۔ امتحان کے زمانہ میں یہیں ٹہل ٹہل کر زور زور سے اپنا سبق یاد کرتے۔ گرمیوں میں کالج سے آ کر شب کو کھانا کھاتے اور اکثر کسی مضمون پر دو دو بجے رات تک بحث کیا کرتے۔ بعض اوقات باتیں کرتے کرتے ہی ان کی آنکھیں لگ جاتیں اور صبح کو جب آفتاب کی شعاعیں ان پر پڑتیں تو جاگ اٹھتے اور حیرت سے کہتے "ہیں ہم تو چٹائی پر پڑ کر سو رہے"۔ اب وہ زمانہ ہے کہ ان دونوں کی کالج کی تعلیم مکمل ہو چکی ہے۔ اور اسی چھجے پر آجکل "ہندو حب وطنی" کے اکثر مہینے میں ایک یا دو اجلاس ہوا کرتے ہیں۔ اس مجلس کا ان دونوں میں سے ایک تو صدر ہے اور دوسرا مہتمم۔

صدر کا نام گورموہن ہے لیکن اس کے اعزہ اور احباب اسے گورا یا گور کہتے ہیں۔ وہ ایک ممتاز حیثیت سے رہنا پسند کرتا ہے۔ چونکہ وہ بہت گورا چٹا آدمی ہے۔ اس لئے اس کو کالج کے پروفیسر کوہ سفید کہا کرتے تھے۔ اس کا قد ۶ فیٹ کا ہے۔ ہڈیاں چوڑی اور مضبوط ہیں۔ اس کی مٹھیاں مثل شیر کے پنجے کے ہیں۔ آواز موٹی اور کرخت ہے اگر آپ اسے "کون ہے؟" کہتے سنیں تو یقیناً چونک

پڑیں گے۔ چہرا بڑا اور مضبوط ہے۔ بینی بلند اور ستواں آنکھیں چھوٹی چھوٹی لیکن چمکدار اور ان میں بجلی کی تڑپ بھری ہوئی ہے۔ مجموعی حیثیت سے گورموہن خوشرو جوان تو نہیں ہے۔ لیکن اُسے نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ہر جلسہ میں نمایاں اور ہر صحبت میں ممتاز رہتا ہے۔ اور لوگ اس کے دیکھنے کے متمنی رہتے ہیں۔

اس کا دوست بی نتے بھوشن تعلیم یافتہ بنگالی شرفا کی طرح ایک نازک اور خوشرو جوان ہے۔ لطافت مزاج اور تیز طبعی نے ملکر اُس کے چہرے پر ایک عجیب رونق پیدا کر دی ہے۔ زمانہ طالب علمی میں وہ ہمیشہ زیادہ نمبر پاتا رہا۔ اور اُسے وظیفے بھی ہمیشہ ملا کئے۔ گورموہن لکھنے پڑھنے میں اس کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ اور نہ اُسے بی نتے کی طرح کتب بینی کا ذوق تھا۔ نیز بی نتے کے ذہن کی طرح نہ تو اُس کا ذہن تھا۔ اور نہ وہ کسی مسئلہ کو اتنی جلد سمجھ ہی سکتا تھا۔ اُس کا حافظہ بھی بی نتے جیسا نہ تھا۔ بلکہ اپنے امتحانوں میں وہ بی نتے ہی کی بدولت کامیاب ہوتا رہا۔

یہ دونوں اس تختے پر بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔

گوردھن۔ سُنئے! اُس دن جب ابھی ناش نے "برہمو" کی مذمت کی تو اس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے مذہب کا کیسا سخت پابند ہے۔ اور اُس کے خیالات کیسے پختہ ہیں لیکن آپ اُس پر اتنے ناراض کیوں ہوئے؟

بی نتے۔ یہ بھی کیا لغو سوال ہے۔ اس معاملہ میں کسے اختلاف ہوگا۔

گورا۔ اگر واقعی ایسا ہے تو پھر یہ خاص آپ کی غلطی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے۔ کہ کسی جماعت کے چند افراد اس سے منکر ہو کر علیحدہ ہو جائیں۔ اور اس جماعت کے قواعد وضوابط کو بالائے طاق رکھ کر اُس کے خلاف عمل پیرا ہوں اور وہ جماعت خاموشی سے اُن کے اس قسم کے افعال کو دیکھتی رہے؛ میرے نزدیک تو اس کا یہ فعل فطری جذبات کے خلاف ہوگا۔ ایسی حالت میں تو اُن کا ہر فعل اور طرزِ عمل جماعت کے نزدیک قابلِ اعتراض وقابلِ مذمت ہوگا۔ جسے وہ اچھا سمجھیں گے۔ جماعت اسے بُرا کہیگی اور یہی ہونا بھی چاہئے۔ چنانچہ یہ بھی منافقین کے لئے ایک عذاب ہے

بی نتے۔ لیکن مجھ کو اس سے اتفاق نہیں۔ کہ جو کچھ فطری ہے وہ اچھا بھی ہے۔

گورا بگڑ کر کہتا ہے۔ "اسے جانے دیجئے کہ کیا اچھا ہے۔ اور کیا بُرا ہے۔ دُنیا میں چند ہی نفوس ایسے ہونگے جو فطرت کے قائل نہ ہوں۔ ورنہ سارا زمانہ تو فطرت کا مطیع ومنقاد ہے۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو دُنیا کے سب کام رُک جاتے۔ جو حضرات "برہمو" مذہب کے پیرو ہیں اُن کے ہر فعل پر ہندو سوسائٹی ضرور نکتہ چینی کریگی۔ اور انہیں یہ برداشت

کرنا چاہتے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ تو اپنے اس فعل پر فخر کریں اور اُن کے مخالفین اُن کی ثنا اور توصیف کرتے پھریں؟ اگر ایسا ہوا تو یہ دُنیا نہ رہیگی۔

بی نتے۔ مجھے کسی خاص جماعت کی مذمت کرنے پر اعتراض نہیں ہے۔ ذاتیات پر حملہ ضرور قابلِ اعتراض ہے۔

گورا۔ کسی خاص جماعت کے کیا معنے؟ بھلا اس کے خلاف کون ہو سکتا ہے لیکن ذاتی مذمت بھی ضروری ہے۔ اے میرے ولی صفت دوست میں آپ ہی سے دریافت کرتا ہوں۔ کیا آپ نے کبھی کسی کی مذمت نہیں کی ہے؟

بی نتے۔ میں کرتا ہوں اور خوب کرتا ہوں لیکن اپنے اس فعل پر محجوب بھی ہوں۔

گورا نے اپنی مٹھی باندھ کر کہا۔ "بی نتے! ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔

تھوڑے سے سکوت کے بعد بی نتے کہتا ہے "کیوں؟ کیا ہے؟" پھر پوچھتا ہے۔ "آپ اتنے ڈر کیوں گئے؟"

گورا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ ایک نازک اور پرخطر راستے پر چل رہے ہیں۔

بی نتے نے کسی قدر انتشار کے لہجہ میں جواب دیا۔ "واقعی یہ کمزوری ہے۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ کہ میں اب بھی اُن کے یہاں جا سکتا ہوں۔ اُنھوں نے مجھ کو مدعو بھی کیا ہے لیکن آپ دیکھتے کہ میں نہیں جاتا۔

گورا۔ جی ہاں میں دیکھتا ہوں کہ آپ رات دن اسی کی رٹ لگاتے رہتے ہیں۔ کہ میں نہیں جاتا۔ میں نہیں جاتا۔ بہتر ہے کہ آپ تشریف لے جایئے اور اس ضیق کا خاتمہ کیجئے۔

بی نتے۔ واقعی آپ مجھے وہاں جانے کا مشورہ دے رہے ہیں۔

گورا اپنے زانو پر ہاتھ مار کر۔ جی نہیں میں آپ کو وہاں جانے کا ہرگز مشورہ نہیں دیتا۔ مجھ سے لکھوا لیجئے کہ جس دن آپ وہاں گئے بس وہیں کے ہو رہے۔ دوسرے ہی دن سے تو آپ اُن کے ہاں کھانا پینا شروع کر دینگے اور برہمو سماج کے زبردست حامی بن کر اس مذہب کے زبردست مبلغ بن جائینگے۔

بی نتے مسکرا کر۔ "آپ درست فرماتے ہیں۔ پھر اور کیا ہوگا؟"

گورا کھسیانا ہو کر۔ آپ دریافت کرتے ہیں کہ پھر اور کیا ہوگا؟ برادرِ من دنیا میں موت سے بھی بڑھ کر کوئی چیز ہے؟ آپ کا خاتمہ ہو جائیگا۔ اور کیا ہوگا۔ بفضلِ خدا آپ ایک برہمن کے یہاں پیدا ہوئے ہیں جب آپ اپنی قومی روایات اور مذہبی پابندیوں کو خیرباد کہہ چکینگے تو بعینہٖ آپ کی حالت اس مردار نعش کی سی ہوگی۔ جو گھوڑے پر پھینکدی جاتی ہے۔ یا آپ کا حشر اس کشتی کا سا ہوگا جس کا قطب نما ٹوٹ گیا ہو۔ بندرگاہ تک پہنچنے کا خیال جاتا رہیگا اور جسے آپ توہم اور تنگ خیالی سے تعبیر کرنے لگیں گے۔

اعلیٰ بحری سیاحت کے خیالات جاتے رہینگے محض سطح
آب پر تیرتے رہنا آپ کا منتہائے نظر ہو جائیگا۔ اب مجھ
میں یہ تاب نہیں کہ آپ سے زیادہ مباحثہ کروں۔ میں تو
صرف یہ کہتا ہوں کہ اگر آپ جانا چاہتے ہیں تو ضرور
تشریف لے جائیے۔ اور یہ جھگڑا چکائیے۔ خود بھی تذبذب
میں رہ کر آپ مجھے بھی اسی طرف کھینچتے ہیں۔

بی نتے قہقہہ لگا کر۔ یہ کوئی ضروری بات تو نہیں ہے
کہ وہ مریض جسے ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہو مر ہی جائے
مجھے اپنے خاتمہ کے کچھ آثار نظر نہیں آتے۔

گورا مضحکہ خیز لہجہ میں "کیا آپ نہیں دیکھ سکتے"

بی نتے۔ جی نہیں! میں تو کچھ نہیں دیکھتا۔

گورا۔ کیا آپ کو اپنی نبض چھوٹی ہوئی معلوم نہیں ہوتی۔

بی نتے۔ بالکل نہیں۔ بلکہ میری نبض زوروں سے چل
رہی ہے۔

گورا۔ کیا آپ یہ محسوس نہیں کرتے کہ اگر صنف نازک کے
خوبصورت ہاتھ ایک ایسے شخص کے یہاں کا کھانا جس کی
ذات پات کا کچھ اتا پتہ نہ ہو۔ آپ کے سامنے دستر خوان پر
چنیں تو وہ خوان محض آپ ہی نہیں۔ بلکہ دیوتاؤں کے قابل ہوگا۔

بی نتے شرما کر "گورا بس کرو۔ تم حد سے گذرے جاتے
ہو۔ خاموش رہو"

گورا۔ آخر کیوں؟ خدانخواستہ میرا منشا ذلیل کرنیکا تو ہے نہیں

اور نہ اُس ناز آفرین خاتون کے دست نازک ایسے ہیں۔ کہ
جنہیں ہوا بھی نہ چھو جاتی ہو۔ بلکہ شرفا برابر اُن سے مصافحہ
کرتے ہیں۔ درآنحالیکہ آپ کو اُن ہاتھوں کا ذکر بھی ناگوار
ہوتا ہے۔ تو پھر ہم آپ سے بچنے کی کیا توقع رکھ سکتے ہیں؟

بی نتے۔ گورا سنو میں صنف نازک کا احترام کرتا ہوں اور
ہماری مذہبی کتابیں بھی . . . . . .

گورا بس۔ آپ اپنے دلی محسوسات کے اظہار میں مذہبی
کتابوں کا حوالہ نہ دیجئے۔ اس کو احترام نہیں کہتے۔ بلکہ کچھ
اور کہتے ہیں۔ جس کا نام سنتے ہی آپ جامہ سے باہر ہو جائینگے

بی نتے۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ آپ میں خود سائی
آتی جاتی ہے۔

گورا اصرار سے۔ مذہبی کتابیں کہتی ہیں کہ عورت قابل پرستش
ہے۔ کیونکہ وہ تاریک مکان کی روشنی ہے لیکن انگریزی رسم و رواج
کے مطابق اُسے جو عزت دی گئی وہ اس وجہ سے دی گئی ہے
کہ وہ مردوں کے دلوں کو گرماوے۔ ایسی حالت میں کیا
ہم اُسے قابل پرستش کہہ سکتے ہیں؟

بی نتے۔ کیا آپ ایسے اہم مسئلہ کو محض اس وجہ سے
نظرانداز کر دینگے۔ کہ اُس کے متضاد پہلو بھی ہیں۔

گورا بے صبری کے لہجہ میں "بی نتے۔ اب چونکہ آپ کی
قوت فیصلہ زائل ہو چکی ہے۔ اس لئے آپ کو میرے کہنے
پر عمل کرنا چاہئے۔ میں یہ باصرار تمام کہتا ہوں۔ کہ انگریزی

کتابوں میں 'عورت' کی جتنی بھی ثنا و توصیف کی گئی ہے اُن سب کی بنیاد خواہشات پر ہے۔ 'عورت' کو چونکہ 'ماں' ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس لئے وہ اسی امتیازِ خصوصی کی وجہ سے قابلِ پرستش سمجھی جاتی ہے۔ اگر اسکو اس خصوصی امتیاز کے مقام سے ہٹا دیا جائے تو جتنی ثنا و توصیف ہوگی۔ اسکے پردہ میں عورت کی ہجو اور مذمت ہے۔ آپ کا دل جو پریش بابو کے مکان پر پروانہ وار نثار ہو رہا ہے۔ اُس کی خاص وجہ وہی ہے جس کو انگریزی میں 'محبت یا عشق' کہتے ہیں۔ کہیں انگریزوں کی ریس میں آپ اس 'عشق' کو دوسری امتیازی خصوصیات پر ترجیح نہ دینے لگیں۔ اور خدانخواستہ کہیں اس عشق کا بھوت آپ کے سر پر نہ سوار ہو جائے

بی نتے پر یہ الفاظ تازیانہ کا کام کر گئے۔ اور وہ اُچھل پڑا۔ "بس جناب معاف کیجئے! گورا تم بہت بڑھتے جاتے ہو!"

گورا ابھی کیا ہوا ہے۔ مَیں اپنے مقصد پر ابتک آیا بھی نہیں ہوں۔ ہمارا ادراک خواہشات سے کچھ ایسا ملوث ہو رہا ہے کہ ہم مرد اور عورت کے تعلقات کو صحیح معنوں میں سمجھنے سے عاری ہیں۔ اور یہ مضمون شعرا کے تخیلات کی جولانیوں کا محتاج ہے۔

بی نتے۔ مَیں یہ تسلیم کرتا ہوں۔ کہ عورت و مرد کے صحیح تعلقات کے سمجھنے میں خواہشات ہمارے ادراک کی سدِّ راہ ہوتی ہیں مگر اس کا الزام صرف انگریزوں پر عاید نہیں ہو سکتا۔ ہمارے مصلحان اخلاق بھی خواہشات نفسانی کی مذمت کرتے وقت 'عورت' کو ان برائیوں کی جڑ بتلاتے ہیں۔ اور اُن سے احتراز کرنے کی تلقین فرماتے ہیں۔ یہ تضاد محض ایک ہی مسئلہ کے دو پہلوؤں کا نام ہے۔ جو دو مختلف الخیال گروہ کے دلوں کا متضاد رجحان ہے۔

گورا۔ مَیں نے فی الحقیقت آپ کی مزاج شناسی میں غلطی کی تھی جب تک آپ کا دماغ مسائلِ فلسفہ کی نکتہ سنجیاں کر سکے۔ اس وقت تک آپ بلاخوف و خطر 'عشق بازی' یا 'محبت' کیجئے۔ لیکن سر سے پانی گذرنے سے پہلے پہلے اپنے کو سنبھال بھی لیجئے۔ یہی آپ کے بہی خواہوں کی ایک التجا ہے۔

بی نتے ذرا چین بجبیں ہو کر کہیں آپ کا دماغ چل تو نہیں گیا ہے؟ مجھ کو عشق کیسا؟ محض آپ کے اطمینان کی خاطر یہ تو ضرور اعتراف کرتا ہوں کہ جب سے مَیں نے پریش بابو اور اُن کے خاندان کو دیکھا ہے یا جو کچھ ان کے متعلق سنا ہے اس وقت سے مجھ میں اُن کے خانگی معاملات و انتظامات کے دیکھنے کی ایک عجیب خواہش پیدا ہو گئی ہے۔

گورا۔ اس سے چنداں ہرج نہیں۔ مگر اپنی خواہش سے ذرا ہوشیار رہیے۔ اگر آپ کا اکتشافی تجسس غیر مکمل رہ جائے تو کیا نقصان ہے؟ یہ یقینی بات ہے کہ وہ ایسے زبردست غار تگرِ جنس ہیں کہ جہاں آپ اپنے تحقیق تجسس

کی وجہ سے ان کے قریب گئے۔ اور انھوں نے اپنے میں ایسا جذب کیا کہ آپ کا نام و نشان تک باقی نہ رہیگا۔

بی ننّے۔ گورا تم میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ تم ہمیشہ یہ سوچتے ہو کہ خدا نے جتنی قوت پیدا کی ہے وہ سب تم کو مِل گئی۔ اور دوسرے اس سے معرّا ہیں۔ بی ننّے کے اس جملے نے گورا پر بڑا اثر کیا۔ اور اُس نے بی ننّے کی پشت پر ہاتھ مار کر کہا۔ "سچ مچ میں مجھ میں یہ بہت بڑا نقص ہے"۔

بی ننّے۔ تم میں اس سے بھی بڑا ایک نقص اور ہے اور وہ یہ کہ جب تم کسی کے سر ہو جاتے ہو تو یہ محسوس نہیں کر سکتے۔ کہ تمہاری وجہ سے اسے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ اتنے میں گورا کے بڑے اور سوتیلے بھائی مہم اپنا لحیم شحیم جسم لئے ہوئے ہانپتے کانپتے اوپر پہنچے۔ اور گورا کو پکارا۔

گورا مؤدب کھڑا ہو گیا اور جواب دیا۔ "ارشاد"

مہم۔ ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ بارش کا سارا بادل ہماری ہی چھت پر برس پڑا ہے۔ آج بڑی دیر سے یہ کیا مباحثہ ہو رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اتنی دیر میں تم نے انگریزوں کو بحر ہند کے پار بھگا دیا۔ اس سے ان کو چنداں نقصان نہیں۔ لیکن تمہاری بھاوج نیچے کمرے میں سر پکڑے پڑی تمہاری شیر ببر کی سی گرج سے اُن کو تکلیف ہوتی ہے۔

یہ کہکر مہم واپس ہو گئے۔

(باقی آئندہ)

عبد الستار خاں

کلام حسرت

لے کے دل پہلے تو کس ڈھب سے وہ عیار گیا
اب یہ کہتا ہے کہ تو کیا مرے سر بار گیا

شکوۂ جور میری عرضِ کرم کو جانا
آہ کس بات پہ وہ شوخ ستمگار گیا

آرزو پر ترے انکار نے ڈھائی آفت
سینۂ شوق سے اِک ناوکِ غم پار گیا

اور تو کس کی رسائی تری خلوت میں ہوتی
اِک فقط میں ترے جلوے کا طلبگار گیا

جاں نثاری کی اُنہیں قدر ذرا بھی نہ ہوتی
حوصلہ عاشقِ سرباز کا بیکار گیا

اب تو ہم کو بھی یہی دھن ہے پئیں چل کے وہیں
ابر جب جھوم کے اُٹھا سوئے کہسار گیا

ہو گیا دے کے سر اُن کے حقِ خدمت سے ادا
حسرت آیا تھا سبکسار سبکسار گیا

مرسلہ بیگم حسرت موہانی

جوانِ بیمار

"... آہ! گردشِ زمانہ، انقلاب روزگار بھی کیا چیز ہے۔ تمہارے والد بزرگوار میرے زمانۂ طفلی کے دوست اور رفیق مدرسہ تھے۔ بیروت کے کالج میں ہم دونوں ساتھ رہتے تھے۔ مگر انہوں نے تکمیل سے پہلے ہی کالج کو خیرباد کہہ دیا۔ اس وقت سے پھر نہ اُن سے ملاقات ہوئی اور نہ میں نے ان کی کوئی خبر سُنی۔"

بیروت کے مشہور ڈاکٹر نے کہا۔

نوجوان کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو اُمنڈ آتے مگر اُس نے ضبط سے کام لیکر کہا:-

"ہاں اُن کا تو اسی وقت انتقال ہو گیا تھا جب میں بہت چھوٹا تھا یعنی جب میں نے اپنی زندگی کے پہلے سال میں قدم رکھا ہے۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔ مگر کل شام کو میں اپنی محترمہ والدہ کے کمرہ میں داخل ہوا تو دیکھا کہ اُن کے ہاتھ میں ایک تصویر ہے۔ اور موٹے موٹے آنسو آنکھوں میں ڈبڈبا رہے ہیں۔ وہ نگاہِ حسرت کے ساتھ ٹکٹکی لگائے اُسے دیکھ رہی ہیں۔ میں یہ منظرِ دلخراش دیکھ کر دروازہ ہی پر ٹھٹک کر رہ گیا۔ پھر میرا دل کسی طرح اندر جانے کو نہ چاہا۔ میں اس طرح کھڑا تھا جس طرح کوئی عزیز بیٹا اپنی ماں کے اسرارِ سربستہ سے مطلع نہ ہونا چاہتا ہو، مگر وہ فوراً چونک کر میری طرف متوجہ ہو گئیں۔ اور اپنے کو سنبھال کر کہنے لگیں:-

"فواد! بیٹے کیوں کیا چاہتے ہو؟"

میں نے نہایت دبی زبان سے کہا "اماں جان! یہ آپ کے ہاتھ میں کس کی تصویر ہے؟"

ماں:- "بیٹے یہ تمہارے مرحوم ابا جان کی تصویر ہے"

اب میں آگے بڑھا اور غور سے اُسے دیکھنے لگا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ میری تصویر ہے۔ ہاں میں نے لوگوں سے سُنا بھی ہے کہ میں اپنے والد مرحوم سے بہت مشابہ ہوں۔ مگر اماں جان اس سے انکار کرتی رہتی ہیں انہوں نے میرے کمرے کی دیوار میں ایک تصویر آویزاں کر دی ہے جس سے قوت شباب و رعنائی نشاط نمایاں ہے۔ اماں جان مجھ سے کہتی تھیں۔ کہ یہ تمہارے باپ کی تصویر ہے۔ پھر میں نے ان کے ہاتھ سے وہ تصویر لے لی اور کہا:-

"اماں جان! یہ تصویر تو اس تصویر سے بالکل نہیں ملتی، جو آپ نے میرے کمرہ میں آویزاں کی ہے"

امّاں نے مجھے دیکھا اس طرح کہ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں، پھر کہا۔ "میری تصویر تمہارے ابّا جان نے اپنی وفات سے چند روز پہلے کھنچوائی تھی اور تمہارے پاس، جو تصویر ہے وہ اس وقت کی ہے۔ جب وہ نوجوان اور صحت و تندرستی سے مالامال تھے۔"

مجھے اپنی ماں کے اس قول پر شک ہونے لگا اور میں سمجھ گیا کہ ضرور اُن کا سینہ کسی ایسے راز کا حامل ہے جسے وہ مجھ سے چھپانا چاہتی ہیں۔ میں خاموش ہو گیا۔ اور پھر کبھی دل نہ چاہا کہ مزید سوالات سے اُنہیں تکلیف پہنچاؤں، اور ان کے پنہاں جذبات کو ٹھیس لگاؤں،

مگر میرے معزز و محترم ڈاکٹر! اب میں آپ سے جدا نہیں ہو سکتا جبتک کہ آپ اپنے مرحوم دوست اور رفیق طفلی کے تمام تر حالات نہ بتائیں۔"

گذشتہ ہفتہ میں بہت زیادہ اس جستجو میں رہا کہ والد مرحوم کے کسی ایسے دوست سے مل سکوں، جن کے خلوص و صداقت پر مجھے اتنا اعتماد ہو۔ کہ جو کچھ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں وہ بتائیں۔ مگر مجھ کو اپنی محترم والدہ سے پوچھنے کی صرف اس وجہ سے جسارت نہ ہوئی۔ کہ پھر اُن کے خیالات ادھر نہ متوجہ ہو جائیں۔ اور پھر ان کے پرانے زخم ہرے نہ ہو جائیں۔ آخر کار میرے دل میں ڈاکٹر ... کا خیال گذرا، وہ معزز شخص جس کا میں بہت زیادہ ادب و احترام کرتا ہوں۔ ڈاکٹر ..... کا خیال آتے ہی یہ بھی یاد آگیا کہ ایک بار میری والدہ نے مجھ سے ذکر کیا تھا کہ وہ تمہارے باپ کے دیرینہ دوست ہیں۔ چنانچہ ایک روز علی الصباح میں ان کے مطب میں گیا۔ وہ مجھ سے ملنے کو کچھ ایسی مسرت و انبساط کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ کہ میں اُن سے فوراً مانوس ہو گیا۔ مصافحہ کے لئے اُنہوں نے ہاتھ بڑھایا اور مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔

میں بیٹھ کر دیر تک ان کی صورت دیکھتا رہا، پھر جرأت کر کے ڈاکٹر ... سے کہا:۔

"میں نہایت شکرگذار ہونگا اگر جناب مجھے والد مرحوم کے سوانح حیات سے آگاہ فرمائینگے۔ میں صرف اسی غرض سے حاضر ہوا ہوں۔ کہ آپ سے اپنے والد کے وہ حالات زندگی دریافت کروں۔ جو جناب کے علم میں ہیں۔ میں نے اپنی زندگی کے اس سن میں قدم رکھا ہے۔ جبکہ میں تمام معاملات معلوم کرنے کا اہل ہو سکتا ہوں۔ میں اپنی ماں سے پوچھنا نہیں چاہتا۔ اس لئے کہ اس قصہ کا چھیڑنا انہیں ایسی باتیں یاد دلانا ہے جو ان کے قلب کو پاش اور اُن کے جگر کو مجروح کر دیگی۔ میں اُن کے جذبات و احساسات کا خیال رکھتا ہوں۔ اور نہیں چاہتا کہ اُن نازک شیشہ کو چوٹ لگے۔ لہذا جناب کی خدمت میں وہ معلومات حاصل کرنے آیا ہوں۔ جن کی تلخی بیان میری

غمگین ماں کے لئے فراقِ شوہر کی تلخیوں سے کچھ کم نہیں ہے۔ آپ کو خدا کی قسم جو کچھ مرحوم کی تاریخ حیات آپ جانتے ہیں۔ اس کا اعادہ فرمائیے۔ اور مجھ سے کوئی خفیف سا خفیف جزو بھی نہ چھپائیے۔ آپ جانتے ہیں۔ دُنیا میں بیٹے سے زیادہ کون اپنے باپ کے سوانح حیات معلوم کرنے کا مشتاق و مستحق ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر عمر جو نہایت شریف النفس پاک طینت عالی ظرف آدمی تھے انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے دیکھا کہ اُن کا چہرہ مکدر سا ہو گیا تھا۔ پھر انہوں نے کہا۔

میرے دوست آخر تم مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہو؟ اچھا سنو! سب سے پہلے تمہارے والد مرحوم سے میری ملاقات کالج کے ابتدائی درجہ میں ہوئی۔ اسی وقت سے وہ میرے دوست بن گئے۔ اور میں بھی ان سے خوب گھل مل گیا۔ کالج میں ایک مرحوم پاکیزہ خو نیک مزاج اور ہر دلعزیز لڑکے تھے۔

مگر آئندہ سال کے اوائل ہی میں میں نے محسوس کیا کہ تمہارے والد کا دل تعلیمی مشاغل سے اچاٹ ہے اور ان میں خطرناک تغیر ہو گیا ہے۔ وہ کالج سے بالکل بیزار ہو چکے ہیں۔ اور اپنے اسباق میں مطلق دلچسپی نہیں لیتے۔ میں یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا۔ کہ اُن کی ذہانت اور تعلیمی دلچسپی بالکل بدشوقی اور بددلی سے بدل گئی ہے۔ وہ کالج کا تمام وقت عاشقانہ ناول پڑھنے اور ایسی ہی لغویات میں ضائع کرنے لگے۔ جن کا کالج کے مقاصد سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اُن کی مصروفیت قصہ کہانیوں کی کتابوں میں رہنے لگی۔ یہ شکایت عام طور پر بکثرت طلباء میں پائی جاتی ہے۔ کہ وہ اپنے مشاغل اور قوت دماغی کو اس قدر وسیع دائرہ میں پھیلا دیتے ہیں۔ کہ اس کے اثر سے بہت جلد قوائے دماغی میں ضعف و انحطاط پیدا ہو جاتا ہے۔

ایک روز میں نے اُن کے کمرہ کا دروازہ کھٹکھٹایا دروازہ تو کھول دیا گیا لیکن وہ مبہوت ہو رہے تھے۔ مجھے دیکھا تو قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ پھر اپنے پلنگ کے نیچے سے ایک لفافہ نکالا۔ جسے اس خوف سے چھپا دیا تھا۔ کہ اس وقت رات کو آنے والا کالج کا کوئی پروفیسر آیا نہ ہو۔ کیونکہ کالج سگار و سگرٹ کا نہایت سخت مخالف ہے۔ اور شاید یہ سگار وغیرہ ہی اس فسادِ اخلاقی کی سیڑھی کا پہلا زینہ ہے جس پر تمہارے مرحوم باپ نے قدم رکھا تھا اسی سال اور بہت سے ایسے افعال و حرکات ان سے صادر ہوتے جو اصولِ صحیحہ کے بالکل منافی ہیں۔ چنانچہ بارہا میں کلیہ (کالج) کی بلا اجازت شہر کو چلے جاتے تھے۔ عزیز من! میں تم سے یہ بھی چھپانا نہیں چاہتا کہ وہ پورے سال بھر حصول علم کی آڑ میں مصروف لہو و لعب رہے۔ یہانتک کہ ششماہی امتحان

میں اس کا نتیجہ ظاہر ہوا یعنی وہ ہندسہ میں بالکل فیل ہوگئے۔ جس عزت وناموس نفس کی بدولت مرحوم کالج کے تمام رفقاء میں ممتاز تھے اُسی نے اب مجبور کیا کہ اس مرکزِ علوم سے ہمیشہ کے لئے علیحدہ ہوجائیں چنانچہ کالج کی دنیا میں فوراً یہ خبر پھیل گئی کہ وہ کالج چھوڑنا چاہتے ہیں۔ اور ان کے فیل ہونے کا بھی یہی سبب ہے اس خبر سے اُن کے رفقائے مدرسہ میں ایک سنسنی پھیل گئی اور بہت بُرا اثر ہوا۔ مگر تمہارے والد مدرسہ کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ کر چلدئے۔ انہوں نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا انھوں نے اپنی خطرناک وتباہ کن غلطی کا احساس بھی نہ کیا اور نہ اپنے وقتِ عزیز کا جسے بیدردی سے برباد وضائع کرنے کا تہیہ کرلیا تھا۔ اس وقت سے پھر جب کبھی وہ خود ہی ہم لوگوں سے ملنے آجاتے تھے تو ملاقات ہو جاتی ورنہ کہیں صورت بھی نظر نہ آتی تھی حقیقت یہ ہے کہ اس طرح مرحوم کے کالج چھوڑ کر جانے کا تمام مدرسہ کو افسوس تھا پھر ایک بار میں نے سنا کہ وہ تجارتی صیغہ میں کسی خدمت پر مامور ہوگئے ہیں۔ پھر یہ معلوم ہوا کہ وہ کسی اخبار کی کمپنی میں شریک ہوتے ہیں۔ مگر واقعہ یہ تھا کہ وہ اپنے چند کاہل بدچلن ناکارہ احباب میں عزیز وقت رائگاں کرنے لگے۔ وہ احباب جو ہر شہر اور ہر گلی کوچہ میں بکثرت مل جاتے ہیں۔ کئی مہینے اس طرح گذرے کہ میں نے انہیں کہیں نہ دیکھا مگر کالج کے احباب میں عام طور پر یہ مشہور ہوگیا تھا کہ خلیل کی اخلاقی حالت بہت خراب ہوگئی ہے۔ وہ نفسانی لذائذ اور ناجائز خواہشات میں محو ہیں۔ وہ بادہ نوشی قماربازی میں اپنی گرانبہا زندگی ضائع کر رہے ہیں۔ آوارگی اور بدچلنی اب اُن کی رفیق ودمساز ہے۔ ایک بار اتفاقاً وہ ایک مقام پر مجھے مل گئے۔ بہت تپاک سے پیش آتے۔ اور ہم دونوں مختلف امور پر باتیں کرتے ہوئے "شارع منارہ" پر بہت دور تک چلے گئے۔ مرحوم نے مجھ سے کوئی بات نہ چھپاتی۔ میں نے اپنے دوست کی حالتِ زار پر بہت افسوس کیا' افسوس کیا اس لئے کہ میں نے دیکھا جمالِ اخلاق اور محاسنِ اوبی' بالکل اُن سے رخصت ہوچکا تھا۔ انسان کے مافی الضمیر کا نقشہ خود بخود اس کی آنکھوں میں کھنچ جاتا ہے۔ اور انسان جو کچھ بھلا یا بُرا کرتا ہے اسکا نقش ناصیۂ حال پر مرتسم ہوجاتا ہے۔ پاکیزہ اخلاق اور شریفانہ عادات انسان کے بشرہ پر حسن اخلاق کو اس طرح نمایاں کردیتے ہیں۔ کہ جمالِ جسمانی' رنگینی خط وخال' جاذبیت رنگ وغیرہ اس کے سامنے ماند پڑجاتی ہے اور شرمانے لگتی ہے۔

میں چاہتا تھا۔ کہ میرے عزیز دوست کے ساتھ یہ مباحثہ ومکالمہ اُن امور کے متعلق ہو۔ جو اس زندگی مستعار میں مفید وکارآمد ہوسکتی ہیں۔ میں نے بتایا کہ عزیز دوست! کیا ایک شریف نوجوان کے لئے یہ بات شرمناک نہیں

ہے کہ وہ اپنی نفسانی خواہشوں کا بندۂ بے دام ہو جاتے۔ اور اپنی غیر مشروع آرزوؤں کا اسیرِ بے بس مگر تمہارا باپ خاموش سب سنتا چلا گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پھر وضاحت سے کہا۔ پیارے دوست ہم تم دونوں بہارِ زندگی کے عالم میں ہیں بہت سی خطرناک برائیوں کا انبوہ، اور آفتوں کا ایک زبردست ہجوم ہماری تاک میں ہے۔ پھر میں نے اس سے کہا۔

"پیارے دوست! یاد رکھو! بہت سے جسمانی لذائذ ایسے ہیں جن سے اجتناب نہیں کیا جا سکتا۔ مگر انسان اپنے دورِ شباب و ہنگامِ جوانی میں افراط و تفریط کی طرف مائل نہ ہو کیونکہ ضمیر اور عقل کے لئے اس سے بڑے بڑے لذائذ ہیں۔ برائیاں گویا ایک ایسی نہر جاری ہیں کہ جس قدر اپنے سرچشمہ سے دور ہوتی جاتی ہے۔ اسی قدر پھیلتی اور بڑھتی جاتی ہے۔ پس تم اے عزیز دوست رذائل کا نقشہ اپنی نگاہوں کے سامنے مرتسم کر لو۔ لو اُس آخری نقطہ پر نظر رکھو۔ جس پر تم اپنے کو ایک زمانۂ دراز کے بعد پاؤ گے۔ اصلی مسرت انسان کا پیکرِ اخلاقی میں آ جانا ہے۔ پس تم طبقۂ عالیہ کی گمنامی، خمول، اور طبقۂ ادنیٰ کی عام جہالت و نادانی سے بچو۔ اس میں شک نہیں کہ جن جواہر علوم و معارف کو تم نے اپنے دامن میں چن رکھا ہے۔ وہ تم کو مصائبِ گمنامی و جہالت سے بچا سکتے ہیں۔

میں دعا کرتا ہوں خدائے بزرگ و برتر تم کو طبقۂ اعلیٰ کی گمنامی و رسوائی سے بچاتے۔ اور اس آفت و بلا سے بچائے جو انسانی جسموں کو زہر آلود کر دیتی ہے۔ جو عقلوں کو کوتاہ اور حواس کو منتشر کر دیتی ہے۔ جس کی بدولت جذبات مردہ اور احساس فنا ہو جاتے ہیں۔ جو غیرت و حمیت کو فنا کر دیتی ہے۔ عقل و خرد کی رفتار کو گھٹا دیتی ہے۔ مجھے نہایت افسوس ہوگا۔ اگر زمانہ کے تمدن و تہذیب میں میں نے اس آفت کو پھیلتے اور بڑھتے ہوئے دیکھا۔ انسان ہر زمانہ میں قرونِ گذشتہ کے نتائجِ طبع کا ایک ثمرہ ہوتا ہے جسے قرونِ ماضیہ زمانۂ حاضرہ تک پہنچاتے ہیں۔ بھائی جان! جو کام ہم کرتے ہیں۔ وہ اپنی رفتار سے برابر چلتا اور ہم سے دوسروں کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے۔

میں یہ تقریر کر رہا تھا۔ اور تمہارا باپ میرے ساتھ تھا۔ مگر اس کی آنکھیں پتہ دے رہی تھیں کہ اس کی قوتِ متخیلہ عالمِ خیال میں بھٹکتی پھر رہی ہے۔ اور میں نے محسوس کیا۔ کہ اب وہ میری باتوں سے تنگ آ گیا ہے۔ لہٰذا مجبوراً میں نے موضوعِ گفتگو بدلا۔ اب ہم دونوں کالج کے قریب پہنچ گئے تھے۔ میں نے اپنے دوست کو رخصت کیا۔ اور وہ تنہا شہر چلا گیا۔

اس دن رات کو میرا جی کسی طرح سبق میں نہ لگا کیونکہ میرے تمام خیالات اُسی نوجوان کی طرف تھے یعنی اگر وہ

بھی کالج میں ہمارے ساتھ ہوتا تو آج ڈاکٹری کے تیسرے سال میں ہوتا۔ . . .

ایک زمانہ دراز گذر گیا۔ کہ میں نے تمہارے والد کو نہ دیکھا۔ اس سال کے بعد میں نے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کر لی۔ اور اپنا مطب کھول دیا۔ جہاں اس وقت تم بیٹھے ہو۔ کالج کے احباب قدیم میں سے جس دن کسی کی ملاقات نصیب ہو جاتی ہے۔ اس روز تو میں بہت مبارک اور اپنے کو بڑا خوش نصیب سمجھتا ہوں۔ مجھے بڑی مسرت ہوتی ہے مگر سب سے زیادہ اس روز ہوئی جس روز تمہارے باپ مجھ سے ملنے آتے ہیں۔ میں نے بڑھ کر مصافحہ کیا میرا دل کثرت سرور و شادمانی سے لبریز ہو رہا تھا۔ ہم دونوں ایک جگہ بیٹھ کر ان گذشتہ سالوں کی باتیں کرنے لگے جن میں اکثر اپنے دوست کی زیارت و ملاقات سے محروم رہا تھا۔

عزیز من! میں اس سے انکار نہ کرونگا کہ اس دفعہ میں نے تمہارے باپ کی صحت میں تھوڑا سا تغیر پایا۔ اس کی آواز میں کچھ ایسی نسیرینی اور گھلاوٹ نمایاں تھی۔ جو دعوت شک دیتی تھی۔ اس کے چہرہ کی زردی بھی کچھ پیام اشتباہ دینے والی تھی۔

پھر ایک سال گذر گیا۔ اور میں نے تمہارے باپ کو نہ دیکھا۔ اس وجہ سے کہ میں کلب، ہوٹل، تھیٹر اور اس قسم کے مقامات لہو و لعب میں بہت ہی کم جاتا تھا۔ آخر موسم بہار میں پھر ملاقات ہوئی۔ مگر اس کے ضعف و نقاہت نے مجھے بہت غمگین بنا دیا۔ گویا وہ قبر سے اُٹھ کر بھاگا ہے۔ ہاتھ پکڑ کر میں نے بٹھا لیا۔ اور اپنے دیرینہ مراسم محبت سے متاثر و مجبور ہو کر کہا۔

خلیل! یہ تم کو کیا ہو گیا۔ کیا تم بیمار ہو؟ اس سے قبل جب تم ملے تھے۔ تو میں نے ضعف کے آثار اور نقاہت کا آغاز ضرور تم میں پایا تھا۔ مگر یہ خیال نہ تھا کہ اس قدر جلد اتنا تغیر ہو جائیگا۔ سچ سچ بتاؤ کیا شکایت ہے دیکھو مجھ سے چھپانا نہیں۔

مگر خلیل نے جواب میں سکوت سے کام لیا اور گردن جھکا لی۔ تو میں اسے ہاتھ پکڑ کر کمرہ میں لے گیا۔ اور معاینہ طبی کیا۔ میں نے اسے بیمار پایا۔ اور سخت بیمار۔ مجھے خلیل سے بے انتہا محبت تھی۔ یہ گوارا نہ ہوا کہ محض دواؤں سے اس کا پیٹ بھر دوں۔ اور غیر مفید جڑی بوٹیوں سے تسلی کر دوں میں اٹھا۔ میرے ہاتھ میں اس کا ہاتھ تھا اور اس سے کہا میں "آؤ خلیل! میرے ساتھ پروفیسر صاحب کے پاس چلو، وہ بہترین ڈاکٹر ہیں۔ تمہاری بیماری کے متعلق ان سے مشورہ کریں"۔

میں حضرت اُستاد کے مطب میں پہنچا۔ انہوں نے بھی معاینہ کر کے بہت افسوس ظاہر کیا۔ اور کہا کہ مرض نے پورا کام کر چکا ہے۔ بات یہ ہے کہ تمہارے باپ نے تو

عیاشانہ زندگی گذاری تھی۔اس نے اُن کے جسم میں ایسا مہلک مرض پیدا کر دیا تھا جس کے علاج سے تمام اطبائے عالم عاجز و مجبور ہیں۔

میں نے تمہارے باپ کو رخصت کیا مگر میرا دل انکی دردناک مصیبت و جانگزا بیماری سے متاثر اور بے چین تھا میرا افسوس اس وجہ سے اور زیادہ تھا کہ اپنے کو مرحوم کی ہمدردی سے مجبور اور اپنے ہاتھوں کو معطل پایا۔میں اب بالکل اس کی امداد کے قابل نہ تھا۔اس کی جسمانی بیماری انسان کی امکانی طاقت مداوا سے بہت بڑھ چکی تھی

چند مہینوں کے بعد میں پھر تمہارے باپ سے ملا۔اب اس کی حالت ایسی نہ تھی کہ خارجی اسباب خفیف حال کی پردہ پوشی کر سکتے۔میں نے دیکھا کہ وہ بڑے بڑے قدم ملتا ہُوا گوشہ قبر کی طرف جا رہا ہے۔خیر۔ہم دونوں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔تمہارے باپ نے مجھ سے کہا۔

عزیز دوست! میں تجرّد و تنہائی کی زندگی سے تنگ آگیا ہوں۔اپنی تنہائی سے بہت بیزار و نالاں ہوں میرے دل میں تو شادی کرنے کا خیال نہیں۔مگر بعض احباب بے حد مصر ہیں۔میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انکے اصرار سے کیونکر نجات ہو سکیگی۔

میں نے صاف صاف کہہ دیا۔تمہارا شادی کرنا سخت غلطی ہے۔انسان اپنی زندگی میں اس سے زیادہ ذلّت، و حماقت کا ارتکاب نہیں کر سکتا۔پھر میں نے طبی اصول سے سمجھایا کہ تم ہرگز شادی کے قابل نہیں ہو۔تمہاری صحت بہت خراب ہو چکی ہے۔

عزیز من! تمہارے باپ کو در حقیقت نکاح کا زیادہ خیال نہ تھا مگر اس کا بڑا الزام اور بڑی ذمہ داری تمہارے نانا کے سر ہے۔اس جہاں دیدہ بوڑھے کے سر جو تمہاری غریب و بیکس بیوہ ماں کا باپ ہے۔ہاں تمہارے باپ کی بڑی غلطی ناجائز شرم و حیا اور ان امور و اسباب سے خاموشی ہے جن کا اظہار لازمی تھا۔میں تمہارے باپ کو شادی نہ کرنے پہ آمادہ کر چکا تھا مگر تمہارے نانا برابر کوشش کرتے رہے۔یہانتک کہ اس کو میری رائے کے خلاف راضی کر لیا۔

ایک مقامی اخبار میں جب میں نے پڑھا کہ مسٹر خلیل کی منگنی ہو گئی۔تو میں حیران رہ گیا۔اس سے پوچھا کہ یہ کیا حماقت کی؟ مگر وہ خاموش رہا۔ایسے شخص کی طرح خاموش جس کے اعصاب ضعیف ہو کر جواب دے چکے ہوں۔اور جس کا عزم پوشیدہ ہو گیا ہو۔مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ نکاح اور رخصت کا زمانہ بھی کچھ دور نہیں ہے۔ایک رات میں اپنے مطب میں بیٹھا ہوا انہیں خیالات میں ڈوبا تھا میں لبیبہ کی بدقسمتی پر غور کر رہا تھا۔جس کی داستان غم کا میرا دوست ہیرو ہونے والا تھا۔اور میں نے محسوس کیا

کہ ضرور ضمیر اور خدا کی عدالتِ عالیہ میں مجھ سے باز پرس ہوگی۔ میرا ہاتھ بھی ایک دوشیزۂ بیگناہ کے خون میں رنگا ہوگا۔ اگر میں خاموش رہا۔ میں یقیناً مجرم ہوں۔ اگر اس راز کے اظہار سے سکوت اختیار کیا۔ جو ایک شریف خاندان کی بدنصیبی و تباہی کا باعث ہونے والا ہے۔ پس میں نے طے کر لیا کہ اپنے عزیز دوست کی بہترین خدمت جو میں کرسکتا ہوں یہ ہے کہ جو کچھ مجھے معلوم ہے۔ اس سے لبیبہ کے والدین کو مطلع کر دوں۔

میں گاڑی پر سوار ہوا اور چند ہی منٹ کے بعد دروازہ پر گاڑی جا کر رکی۔ گھر والوں نے بڑے تپاک اور مسرت سے میرا خیر مقدم کیا۔ اس اتحاد کی بنا پر جو مجھ میں اور ان میں تھا۔ میں نے لڑکی کے ماں باپ سے تنہائی چاہی اور جو کچھ تنہائی میں دونوں سے کہا اس پر ہرگز شرمندہ نہیں ہوں۔ میں بالکل آزاد و بے لوث تھا۔ میرا جذبہ شریفانہ تھا۔ اس کی ماں تو بنگاہِ شک مجھ کو دیکھتی اور بڑے غور سے کان لگا کر میری باتیں سنتی رہی۔ مگر باپ کو تابِ ضبط نہ رہی عنانِ اخلاق ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ جو کچھ برا بھلا زبان پر آیا سب کہہ ڈالا۔ افسوس جسقدر میرا پرجوش خیر مقدم کیا گیا تھا۔ اسی قدر غیر مہذب و غیر شریفانہ الفاظ سے میری توہین کی گئی۔ آخر میں گھر سے مایوس و خاموش نکل آیا۔ نہ نکل کیا آیا بلکہ اس گھر سے نکال دیا گیا۔ جو میرے ایک عزیز ترین دوست کا گھر تھا۔

جب میں باہر نکل آیا تو زور سے دروازہ بند کر لیا گیا۔ میں نے اپنے کو سڑک پر کھڑا پایا۔ اور میری آنکھوں سے اشکِ حسرت رواں تھے۔ میں رو رہا تھا اور اس آفت ناگہانی پر جس کا آنا میرے نزدیک مستحق تھا۔ پھر مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان لوگوں نے تمہارے باپ کو مجھ سے بولنے اور بات کرنے سے بھی منع کر دیا ہے۔ اور وہ تعمیلِ حکم پر مجبور تھا۔ ان لوگوں کا جادو چل چکا تھا۔ اور وہ اس پر حاوی ہو چکے تھے۔ مگر مجھے اپنے دیرینہ عزیز دوست سے بہت محبت تھی۔ میں رویا۔ اور میں جانتا تھا کہ قابلِ ملامت اور موردِ الزام وہ نہیں بلکہ یہ ملامت عاید ہوتی ہے۔ اس خاندان پر جس نے میری دوستانہ نصیحت کی پروا نہ کی جس نے میرے مخلصانہ مشورہ کو ٹھکرا دیا۔

کیا میں نے وہی نہیں کہا تھا جو میرے ضمیر کا تقاضا تھا۔ کیا میں نے اسی حقیقت کا انکشاف نہیں کیا تھا۔ جس کا اظہار ایک ضروری فرضِ انسانی تھا۔ جو کچھ میں نے کہا اس پر ہرگز شرمندہ نہیں ہوں۔ ایک بے گناہ کا خون میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اگرچہ میں نے اپنے دوستوں کو اپنا دشمن بنا لیا۔ میں مطمئن اور مسرور ہوں کہ جس فرض کا بوجھ میرے کاندھوں پر ناقابلِ برداشت تھا۔ اس سے سبکدوش ہو گیا۔

تھوڑے دن بعد معلوم ہوا کہ تمہارے باپ نے عقد کرلیا۔ اور ہم دونوں میں جو دوستانہ مراسم و دیرینہ مخلصانہ تعلقات تھے۔ وہ منقطع ہو گئے۔ اور یہ مرحوم کی زندگی کے آخری مہینے تک منقطع رہے۔ یعنی دمِ آخر مرحوم کو پھر میرا دیرینہ خلوص اور مخلصانہ نصائح یاد آئے۔ اور مجھے بلایا۔ جبکہ وہ بسترِ مرگ پر تھا۔ میں گیا تو مرحوم نے حد درجہ ندامت و حسرت کا اظہار کیا۔ عزیز من: اس نازک وقت میں بھی جب تم پر نگاہ پڑتی تھی۔ تو مرحوم خلیل تمہیں سینے سے لگا لیتا تھا۔ کیونکہ تم اس کی یادگارِ حیات تھے۔ مگر اس کے بشرۂ صاف پر تاریک و غلیظ بادل چھا جاتے تھے۔ اس لئے کہ زندگی سے یاس اور تمہاری بہارِ شباب دیکھنے سے ناامیدی ہو چکی تھی۔

رخصت ہونے سے قبل میری طرف متوجہ ہو کر نہایت ضعیف آواز میں کہا۔ "عالم کائنات اگرچہ ایک نہایت تیز تلوار ہے۔ مگر نہایت شریف بھی ہے۔" یہ آخری الفاظ تھے جو میں نے مرحوم کے منہ سے سنے تھے۔ کیونکہ دوسرے ہی دن صبح کو جبکہ نورِ سحر اپنی سہانی روشنی سے ہر گوشۂ عالم کو منور بنا رہا تھا۔ اور ہر متنفس کو پیامِ بیداری دے رہا تھا مرحوم ایسا سویا کہ پھر نہ جاگا۔ اس نے ہمیشہ کے لئے اس دنیا کو خیر باد کہا۔

یہ ہیں تمہارے باپ کے سوانح حیات اے فواد!

میں تمہیں شروع سے آخر تک سنا چکا۔ اور ماشاءاللہ اب تم جس عمر میں ہو اس کا یہی تقاضا ہے کہ تم کو اپنے باپ کے سوانح و حالات سننے کا اشتیاق ہو اور وہ تمہیں بتائے جائیں میں کچھ چھپا کر اپنے ضمیر پر بارِ گراں دھرے رہنا نہیں چاہتا۔ تم سے تمہارا باپ اس وقت جدا ہوا جب تم بچے تھے۔ اب عزیز من تم جوان ہو۔ یاد رکھو کہ اپنی غمگین ماں کی کائناتِ حیات اور سرمایۂ زندگی تمہیں ہو اے فواد! تم اس کے بہترین شریکِ غم اور مونسِ زندگی بن جاؤ۔ تم کو چاہئے کہ اس کے لئے بہترین وجہ تسلی ثابت ہو۔ اچھا لاؤ اپنا ہاتھ بڑھاؤ اور میں تمہارا ایک مخلص دوست اور ایک شفیق باپ بنتا ہوں۔ میں شکر گذار ہونگا۔ اگر مجھ پر اعتماد کروگے اور اپنی مشکلاتِ زندگی میں میرے مشورہ سے کام لوگے۔ پس عہد استوار کرو۔ اور مرد بن جاؤ۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ ہوائے صاف و پاکیزہ کو اپنی ضعف و نقاہت کا مداوا سمجھو۔ اور آفتاب کی حرارت کو رفیقِ زندگی

عزیز من! تمہاری یہ کمزوری و نقاہت موروثی ہے اور اس کے لئے کوئی مفید دوا دنیا کے کسی دواخانہ میں نہیں مل سکتی۔"

نوجوان فواد یہ داستانِ دلخراش سنکر محترم ڈاکٹر عمران کے مطب سے نکلا۔ اسے اپنی جانِ عزیز گراں تھی۔ اور سینے میں اسے آلام کا ہجوم تھا جو اسے ہلاک کئے دیتے

سُنئے۔ پھر اس جوانِ بیمار نے مجھ سے کہا کہ مَیں جو کچھ جانتا ہوں اس کے بیان کرنے میں ذرا بھی بخل نہ کرونگا۔ اسلئے کہ اپنے سینہ سے ان کو نکال دینے میں راحت و بشاشت پاتا ہوں۔ اور مجھے اس سے بھی انکار نہیں کہ والد مرحوم کے حالاتِ زندگی کو مَیں اپنے لئے وجہ تسلی قلب اور موجب تلقینِ صبر پاتا ہوں۔

اب مَیں یہ بھی سمجھنے کے قابل ہوگیا کہ کیوں کسی کی محبت کا اہل نہیں ہوں جس طرح میرے اور بہت سے شناسا نوجوان ہیں۔ اور اب مَیں یہ بھی سمجھ گیا کہ نازنین میری جو میری ہمسایہ بھی ہے۔ کیوں مجھے نگاہِ ترحم سے دیکھتی ہے۔ جب مَیں اُسے ایک شیدائے محبت و عشق کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ ہاں ہاں مَیں ضعیف و ناتواں ہوں۔ میرا جسم نحیف و کمزور ہے۔ لیکن یاد رہے کہ میری کی محبت کے لئے ان تمام دلوں سے مضبوط و قوی ہے۔ جو محبت و عشق کے نام لیوا اور دعویدار ہیں۔

. . . . .

مَیں فواد کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ اور موٹے موٹے آنسو بے اختیار میری آنکھوں سے رواں تھے مَیں اس نوجوانِ مغموم کی حالتِ زار پر نوحہ خواں تھا اور ابھی اس کی گفتگو سے سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر مصافحہ کیا۔ اور مجھ سے رُخصت ہوگیا۔ مجھے حیران و پریشان چھوڑ گیا۔ مَیں بڑے حسرت و تعجب سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اور وہ مجھ سے دُور ہوتا چلا جاتا تھا۔ اُس کے دونوں کمزور پاؤں اس کا بار نہیں اُٹھا سکتے تھے۔ مگر وہ لڑکھڑاتا ہُوا تیزی کے ساتھ اپنے گھر جا رہا تھا۔ مَیں کھڑا ہوکر اس کے اس ضعیف و نحیف جسم اور اُس حساس قلب کو دیکھتا رہ گیا۔ اس وقت میرا جی چاہتا تھا کہ کاش انسانی ظالمانہ قوانین کا مجموعہ میرے ہاتھ میں ہوتا کہ مَیں اُسے پارہ پارہ کر دیتا۔ یا جو نقائص اس میں پائے جاتے ہیں۔ اُن کی اصلاح کرتا۔

اب میری آرزو ہے کہ کاش قانون میں کوئی ایسی دفعہ اضافہ کی جائے۔ جو شادی اور مریض نوجوانوں کے درمیان میں ایک مضبوط دیوار کا کام دے سکے۔ جو سختی کے ساتھ مریض نوجوان کے لئے شادی ممنوع قرار دے۔ جو کسی نوجوان کو اجازت نکاح نہ دے۔ جبتک کہ وہ اپنی صحت جسمانی کے متعلق ایسی سند طبی نہ پیش کریں۔ جو بتاتی ہو کہ اُس نوجوان کا جسم دور حال کے ناپاک جراثیم سے پاک ہے۔ یہ دفعہ بہت سی بیگناہ، پاکباز اور بے زبان لڑکیوں کو اپنے بیمار اور قریب الموت شوہروں کے پیچھے اسفل السافلین میں گرنے سے بچائے۔ اُن مجرم ماں باپوں کو سزائے سخت دے۔ جو اپنی معصوم و بے زبان لڑکیوں کو اپنے گھروں میں ناخواندہ مہمان سمجھتے ہیں اور

جلد سے جلد اُن کے بار سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں گو یہ سبکدوشی اس دُنیا کی جہنم ہیں جھونکنے ہی سے کیوں نہ حاصل ہوتی ہو۔

اور میری دلی تمنا ہے کہ کاش شریف گھرانے بجائے خود اس کو محسوس کریں اور خود ہی یہ قانون رائج کر یں کہ جسمانی صحت کے متعلق کسی معتبر امانتدار ڈاکٹر یا طبیب کی طبی سند پیش کرنے سے پہلے کوئی نوجوان اُن کے خاندان میں عقد نہ کرنے پائے۔

دیر تک میری یہ حالت رہی کہ اس ضعیف نوجوان کا پیکرِ خیالی میرے سامنے تھا وہی ضعیف و نحیف مگر پُر ہول پیکر مجھے معلوم ہوتا تھا کہ وہ پیکرِ ضعیف تمام تر عالمِ انسانی کو انحطاطِ نسل قلتِ اولاد اور انتشارِ امراض کے خطرے سے متنبہ کر رہا ہے۔

پھر میں فوراً اپنے کمرہ میں چلا آیا تاکہ اس جوان بیمار کی وہ داستانِ غم لکھ لوں جو خود میں نے اُس کی زبان سے سُنی ہے۔ (ترجمہ) محوی

غزل

دل تھا تو یہ فطرت کے مناظر تھے نظر میں
اب شام میں کچھ لطف ہے باقی نہ سحر میں

اُٹھنے لگی پھر اے شبِ غم ٹیس جگر میں
کھنچنے لگی پھر موت کی تصویر نظر میں

اللہ کمی کچھ بھی نہیں سوزِ جگر میں
فریاد کہ اک آگ لگی ہے مرے گھر میں

پھر دل کو تمنا ہے کسی تیرِ نظر کی
شاید کہ کوئی خون کا قطرہ ہو جگر میں

میں دیکھ چکا شامِ غریبی کا تماشا
اب منظرِ ہستی بھی ہے تاریک نظر میں

نالوں پہ ہے اب تک مجھے شک بے اثری کا
ہر چند کہ یہ ڈوب کے نکلے ہیں اثر میں

وہ صبحِ شبِ وصل وہ تاروں کی اُداسی
سو داغ نظر آتے تھے دامانِ سحر میں

کیا جانے کوئی اشکِ ندامت کی حقیقت
بخشش کے یہ موتی ہیں مرے دامنِ تر میں

نظارہ ہے اُس جلوہ گہ ناز میں حیراں
بیتاب ہیں جلوے مری آغوشِ نظر میں

بے وجہ تو احسنؔ یہ یہ غفلت نہیں طاری
شاید کوئی تسکین کی صورت ہو نظر میں

گلکدہ

عالم ہمہ زگلکدۂ تو معطر است
گلدستہ بندِ نسترن و یاسمن تو ئی (صفی)

فنون لطیفہ کی مختلف انواع خصوصاً شاعری اور مصوری میں خاص ربط ہے۔ جس کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے انگلستان میں تحریک ماقبل رافیل کا پہلا اصول یہ قرار دیا گیا کہ شعر میں یہ التزام رکھا جائے کہ اُس کی تصویر کھینچ سکے۔ اور تصویر ایسی ہو کہ وہ کسی شعر کا مضمون ہو سکے نفسیاتی نقطۂ نظر سے شاعری اور مصوری میں کوئی فرق نہیں یہ مصور شاعرانہ جذبات کو ایک رنگین کاغذی پیرہن میں ملبوس کرتا ہے۔ اور شاعر اُنہیں جذبات کو اپنے رنگ میں جامۂ سخن پہناتا ہے شعر تصویرِ جذبات ہے۔ اور تصویر ایک متحجر جذبہ۔ مگر اس ترجمانیِ جذبات میں مظہر کے لطیف یا ٹھوس ہونے سے بہت کچھ تخالف پیدا ہو جاتا ہے۔ ہاں خاص ہستیوں کو قدرت نے یہ طاقت ودیعت کی ہوتی ہے۔ کہ وہ اِن رُکاوٹوں پر غلبہ پا لیتے ہیں۔ چند مصور ایسے ہوتے ہیں۔ کہ انہیں شاعر بھی کہا جا سکتا ہے۔ اُن سے کہیں کم ایسے شاعر بھی ہوتے ہیں۔ کہ جنہیں ہم مصور بھی کہہ سکتے ہیں

حضرتِ عزیز ان چند افراد میں سے ہیں۔ ان کی شاعری بیشتر مصوری ہے اور اس کی زندہ تصویر اُن کا دیوان گلکدہ ہے۔ یہی نہیں کہ اُن کے ہاں اکثر مصوری کی نازک تشبیہات مستعمل ہیں ؎

نظر آئیں گی تجھ کو اس میں کچھ بے رنگ تصویریں
ورق اُلٹے گا جب مجموعۂ گورِ غریباں کا

بلکہ وہ نظیری کی طرح اکثر جذبات کی تشبیہ مادیات سے دیتے ہیں۔ اور اس طرح وجدانی کیفیات مجسم بن کر سامنے آجاتی ہیں۔ آجکل مغربی فسانہ نگاروں میں یہ روش بہت مقبول ہے۔ وہ ہر ایک حالت کے لئے ایک استعارہ ایک "معہودِ صوری" کی تلاش کرتے ہیں۔ تاکہ ایک جذباتی فضا پیدا ہو سکے۔ یہی ایک مصور کا کام ہے۔ اس رنگ میں یہ شعر ملاحظہ ہو۔ ؎

تھی صبح اور ستارے کچھ جھلملا رہے تھے
بیمارِ شامِ فرقت دُنیا سے جا رہے تھے

کئی جگہ تو انکے اشعار

کا ایک ساخت کردہ زندہ مجسمہ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ شعر جو عارفانہ رنگ میں بے مثال ہے۔ تئیس[۲۳] برس کی عمر میں کہا گیا تھا ؎

اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم مجھے انگڑائی کا

آجکل مغربی شاعری کے پھیکے پھیکے دھندلے نقوش کو شوخ رنگ کی مشرقی تصاویر پر ترجیح دی جاتی ہے۔ استعارہ اور تشبیہ کو تصنع شمار کیا جاتا ہے۔ حالانکہ انکا استعمال شاعر کے لئے ایسا ہی قدرتی ہے جیسا ایک معمولی آدمی کا نکھرے ہوئے آسمان کو دیکھ کر نیلگوں کہہ دینا۔ شیکسپیر کے اس طرزِ تحریر کو دیکھئے۔ جو اس نے معراجِ کمال پر پہنچ کر اختیار کیا۔ طبیعت ایک اُمنڈتا ہوا دریا ہے۔ استعارہ پہ استعارہ اور تشبیہ پہ تشبیہ چلی آرہی ہے یہی حالت ہوتی ہے جب شاعری اور مصوری میں بہت باریک فرق رہ جاتا ہے۔ مرزا عزیز بھی نادر تشبیہات کے مالک ہیں ؎

موسے چک نہیں یہ خطِ برقِ طور کی
تیوری چڑھی ہوئی ہے کسی پر غرور کی

پھر کہا ہے ؎

سرمایۂ جمال ہے اک لہر نور کی
زنّار سے گندھی ہوئی چوٹی ہے حور کی

غرض یہ تمام غزل مرصع ہے۔ اور غالب کی غزل ایسی غزل لکھنا مرزا ہی کا کام تھا۔ عاشقانہ جذبات کو نفسیاتی جزئیات اور لطیف تجزیہ کے ساتھ بیان کرنا اور پھر ایسی سُلجھی ہوئی زبان میں مرزا کی خصوصیت ہے ؎

دل تابعِ کشش تھا کشش تابعِ جمال
ہاں ہاں محبت آپ سے کی اور ضرور کی

تمام دیوان ان عارفانہ خیالات سے بھرا ہوا ہے۔ آپ کا ایک شعر ہے ؎

دل سمجھتا تھا کہ خلوت میں وہ تنہا ہونگے
مَیں نے جو پردہ اُٹھایا[۵۱] تو قیامت دیکھی

یہ منصور نگر کے ایک مشاعرے میں پڑھا گیا تھا۔ اور بقول جناب یاس یہ وہ شعر ہے کہ پڑھتے ہی سارا مشاعرہ چیخ اُٹھا تھا۔ ہر طرف سے پھر ارشاد ہو۔ پھر ارشاد ہو کا غل مچ گیا۔ کم از کم چھ سات بار یہ شعر پڑھا گیا۔ اور اس قدر داد کیوں نہ ملتی۔ یہ وہی شعر ہے۔ جس کی بابت اکبر مرحوم لکھتے ہیں[۵۲]۔ "آپ کے شعر پہ شاعرانہ وجد آیا۔۔۔۔۔ شعر بہت پاکیزہ اور شاعرانہ تکلّف کے ساتھ عارفانہ ہے۔ کیا بات پیدا کی ہے۔" مگر حاسدان تیرہ باطن کہ ہر صاحب کمال کے ساتھ سایہ کی طرح لپٹے رہتے ہیں

۵۱ "پردہ اُٹھایا" کا اشارہ : فکشفنا عنک غطاءک ال
اس آیت سراپا ہدایت کی طرف ہے۔

۵۲ مکاتیب اکبر (۱۴۲)۔ اگست ۱۹۱۴ء

ایسی مقبولیت کو کب دیکھ سکتے تھے۔ لگے لکھنو کی گلیوں میں غل مچانے۔ وہی یاسؔ صاحب جو اپنے آپ کو "خدائے سخن" اور "فاتح لکھنو" لکھا کرتے ہیں۔ بمصداق ع۔

فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست

اس شعر پر یوں "تنقید" فرماتے ہیں[۵۱] "........

لوگ کہنے لگے بھئی پردہ اُٹھایا تو کیا دیکھا ..... خدا کسی غیرت دار تماش بین کو یہ تماشہ نہ دکھائے ..... آخر وہاں کیا ہو رہا تھا۔ کچھ کھل کر تو کہو۔ کیا معاملہ بے ڈھب تھا اللہ توبہ .... اب مارے بوکھلاہٹ کے اس شعر میں مسائلِ عرفان و تصوف ٹھونسنے کی کوشش کی گئی۔ انھوں[۵۲] کو دکھایا گیا کہ یہ شعر ہمہ تن رنگ حقیقت میں سرابور ہے۔"

"تنقید" ہو تو ایسی۔ ستم تو یہ ہے کہ یہ "تنقید" ایک ایسے رسالے میں درج ہے۔ جو بقول مصنف ٹیچر شپ کے کورس میں داخل ہے۔ ع گر ہمیں مکتب وہمیں مُلّا۔ کارِ طفلاں تمام خواہد شد

ایسی سوفیانہ تحریر کا کیا جواب ہو سکتا ہے ای اعتراض کے متعلق اکبر مرحوم[۵۲] نے عزیز صاحب کو ایک خط لکھا تھا اس کے چند فقرے نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ .... "معترض صاحب کا اعتراض اگر میں نہ سُنتا تو کبھی یہ وہم بھی نہ آتا۔ 'وہ' کے لفظ سے اگر فطرتِ سامع کی زبردستی سے خیال بی گوہر جان کی طرف رجوع ہو گیا۔ تو دوسرا مصرعہ نامعلوم کیا اگر وہ منظر اس کے سامنے پیش کرے لیکن عارفانہ مذاق اور بلند خیالی اس ضمیر کو شاہدِ تنہا نشینِ مسندِ حسن (عرفی) کی طرف رجوع کرے گی۔ حالتِ تنہائی و موجودگیِ غیر کا تقابل ہو سکتا ہے۔ تنہائی اور مباشرت کا منطقی تقابل نہیں۔ لیکن معترض صاحب معذور ہیں۔ سوسائٹی کا یہی مذاق ہے اُنھوں نے نیک نیتی سے ایسا خیال کیا ہوگا۔ تماشا ست کا لفظ قابلِ داد ہے۔ اور بھی نازک مفہوم پیدا ہوتے ہیں بیان میں لطف جاتا ہے۔" اکبر مرحوم نے لکھا بھی کہ "اس مضمون کے چھپنے میں کچھ حرج نہ تھا۔ مگر عزیز صاحب بس یہ کہہ کر چپ ہو رہے۔ ؎

بہ گفتن من شد ہنرِ حاسدِ منکر
صد شکر کہ عیبم ہنرِ بے ہنراں است (فغانی)

---

[۵۱] چراغ سخن ص ۴۴ [۵۲] یہ وہی اکبر ہیں۔ جن کے متعلق یاسؔ صاحب نے "نظارہ" میں ایک مضمون لکھا تھا جس کی بابت اکبر مرحوم ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "یاسؔ صاحب نے بہت مبالغہ آمیز مدح کی ہے . . غالب کو میرے سامنے طفلِ مکتب کہنا کیا معنی رکھتا ہے۔ یاسؔ صاحب کے سامنے غالباً طفلِ مکتب ہونگے لیکن میرے سامنے اُستاد ہیں میں اندیشہ ناک ہوں کہ ناواقف حضرات یہ سمجھیں گے کہ میرے اشارے سے ایسا لکھا جاتا ہے۔.. یاسؔ صاحب نے میرے متعلق چراغِ سخن میں بھی بہت کچھ تحریر فرمایا تھا میں نے انکو پہلے بھی لکھا تھا۔ .. "ایک جگہ لکھتے ہیں۔" عزیز اپنی شاعری پہ غالب ہیں اور یاسؔ پر شاعری غالب ہے سد باب فضائل محبت آمیز طینت و آب و گل نہیں ہے۔ معاف فرمائیں یاس صاحب دماغ رکھتے ہیں دل نہیں ہے۔"

(میں اس ناگوار بحث کو طول نہ دیتا مگر یہ سب قرائین تنقید سے مجبور ہو کر لکھا گیا ہے۔ ورنہ میں ذاتی طور پر نہ تو عزیز صاحب کو اور نہ یاس صاحب کو جانتا ہوں) گلکدہ میں عارفانہ مضامین کی بہت کثرت ہے۔ لیکن ان کے سمجھنے کے لئے دل کی ضرورت ہے نہ دماغ کی۔ اور ان لوگوں کو تو آتش کے ایسے کھلے کھلے اشعار میں حلاوت آتی ہے ؎

دوپہر گرمیوں کی لطف سے گذرے کیا خوب
ساتھ لیکر ہمیں خسخانہ میں آرام کریں

یا ؎ بخیلوں سے موافق ہو طبیعت کیوں نہ دنیا کی

اور اسپر "یادگار آتش" حضرت یاس مصر ہیں کہ آتش کا دیوان دیکھنے سے پہلے 'بھگوت گیتا' اور 'نہج البلاغت' پر نظر ڈالنی لازمی ہے:

عزیز کا دامن شاعری ہر ایک ابتذال سے پاک ہے اور یہ بھی ان کا طغرائے امتیاز ہے۔ اور ان کا تصوف محض "برائے شعر گفتن" نہیں ہے۔ بلکہ ان کا ہر ایک شعر ایک "آتش نشیں' جذبۂ عشق سے مشتعل ہے۔ جدید نفسیات میں جذبات کے مظہر جسمانی کا بیان ایک خاص موضوع ہے۔ ہمارے قدیم شعرا کے ہاں اس کا عام استعمال ہے انور مرحوم کا ایک نہایت لطیف شعر ہے۔ ؎

نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے
پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے

تعشق فرماتے ہیں ؎

صبح کے پہچاننے والوں میں رسوائی ہوئی
شب کی خبریں دے رہی ہے آنکھ شرمائی ہوئی

خوب شعر ہیں مگر وہی کھلی کھلی باتیں ہیں۔ اسی موضوع پر عزیز کہتے ہیں ؎

دل کی بے چینی کوئی دیکھے ذرا اس بزم میں
جب کوئی آیا تو میں زانو بدل کر رہ گیا

"زانو بدل کر رہ جانا" کیا کیا معانی لئے ہوئے ہے بے بسی رشک اور جوش محبت کی کشمکش کس لطیف پیرائے میں بیان ہوتی ہے۔ یہی یا کنایہ ہے۔ جو صنعت کی جان ہے۔ اس کا مطلع ہے:۔ ؎

شمع بجھ کر رہ گئی پروانہ جل کر رہ گیا
یادگار حسن و عشق اک داغ بنکر رہ گیا

اسی مضمون کا ایک اور شعر ہے ؎

حسن و عشق ایک ہی جوہر نظر آتے ہیں ہمیں
آئینہ میں جو کبھی شکل بہم دیکھتے ہیں

مگر معشوق اس یگانگت کو نہیں سمجھتا۔ کیونکہ وہ اپنی حقیقت سے خود آگاہ نہیں ؎

ہمہ تن محو رہا گو کہ تو خود بینی میں
آئینہ تجھ پہ میرا منظر اصلی نہ ہوا

یہ وہ شعر ہے جس پر بلیغ الملک مولانا تاجور

نے مخزن[۵] (مارچ ۱۹۲۰ء) میں یوں اعتراض کیا ہے۔

"اس شعر میں گوکہ خلافِ محاورہ ہے اور اسی غلط استعمال سے شعر کے معنی بگڑ رہے ہیں۔ مصرعہ ثانی میں 'منظرِ اصلی' سوا معشوق کے جو محوِ خود بینی ہے۔ اور کوئی ہو نہیں سکتا۔ حضرت عزیز کے الفاظ سے شعر کا مطلب نثر میں یہ نکلتا ہے۔ گوکہ تو محوِ خود بینی رہا میرا منظرِ اصلی تجھ پہ ظاہر نہ ہوا۔ اب اربابِ سخن ملاحظہ فرمائیں کہ محاورہ کا استعمال بے محل ہے یا نہیں"۔

تاجور صاحب اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ..... شعر کی اصلاح فرمانا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ "اس شعر کو یوں ہونا چاہئے تھا۔

ہمہ تن محو رہا بس کہ تو خود بینی میں
آئینہ تجھ پہ مرا منظرِ اصلی نہ ہوا

یعنی تو خود بینی میں اسقدر محو رہا کہ میں تجھے دیکھا کیا اور تجھے خبر نہ ہوئی۔" یہ وہ مقام ہے جہاں "اربابِ سخن" چپ ہو جاتے ہیں۔ کہ کہیں اشتعال میں فاضل نقاد کی شان میں گستاخی نہ ہو جائے۔ کیسے بلیغ شعر کو عامیانہ بنا دیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہر چند تم معشوق ہو (رات دن آئینہ تمہارے سامنے رہتا ہے) اور خود بینی کے سوا تمہارا کوئی کام نہیں ع

ہمہ تن محو رہا گو کہ تو خود بینی میں

مگر حالت یہ ہے کہ تمہیں اپنی اصلی حالت کا اندازہ نہیں۔ جو جلوے مجھے تم میں نظر آتے ہیں تم اُن سے بے خبر ہو۔

ع آئینہ تجھ پہ مرا منظرِ اصلی نہ ہوا

جنابِ تاجور کا ایک اور اعتراض سنئے۔ شعر ہے ؎

وہ حال ہے کہ بس اب کچھ کہا نہیں جاتا
مریضِ غم کا تصور کیا نہیں جاتا

تاجور فرماتے ہیں:۔ "اس مطلع کے قافیوں میں ذرا گفتگو ہے 'کہا' اور 'کیا' یہ دونوں الفاظ ہم قافیہ ہو نہیں سکتے۔ اس لئے کہ ایطائے جلی ہے....... اگر دونوں علامتِ اتحادی (الف) کے نکال دینے پر ہم قافیہ ہو سکتے تو ایطا واقع نہ ہوتا جیسے 'کہا' اور 'رہا' میں... " فاضل نقاد جب ایطا کی یہ شناخت لکھ چکا تو اس کو معاً خیال آیا کہ اس سے اور کچھ نہیں تو "چراغِ سخن" کی صریح تردید ہو جاتی ہے۔ جھٹ یہ اضا

[۵] افسوس ہے کہ ہاشمی صاحب نے گلکدہ کا دیباچہ لکھنے میں اپنے فرض کو اچھی طرح ادا نہیں کیا اوّل تو صاحبِ گلکدہ کسی اشتہاری سرٹیفکیٹ کے محتاج نہ تھے۔ اور اگر اُن کا شائع کرنا ایسا ہی ضروری تھا تو چاہئے تھا کہ درست اقتباس درج کئے جاتے۔ مثلاً جہاں مخزن کا حوالہ دیا گیا ہے۔ وہاں یہ بھی تو لکھ دیا ہوتا۔ کہ ایڈیٹر کی رائے میں "گلکدہ اُردو ادب میں کوئی مفید اضافہ نہیں .... یہ نہیں کہ گلکدہ میں کوئی سُلجھا ہوا شعر نہیں۔ کم کم ایسے بھی ہیں۔ مگر اُن میں نہ کوئی جدت ہے نہ کوئی خاص لطافت... ڈر ہے کہ گلکدہ سے نکلکر یہ مسموم ہوا اور مقلات کی سرزمینِ سخن پہ نہ پھیل جائے...."

کر دیا" ایطا واقع نہ ہونے کی صورت اور بھی ہے۔ یعنی اگر علامت اتحادی کے نکل جانے پر ایک لفظ بے معنی رہ جائے" یہ شناخت یاس نے سید اولاد حسین شاداں بلگرامی سے نقل کی ہے۔ اور ساتھ ہی اُن کا یہ قول درج کیا ہے۔ کہ یہ شناخت اس فن کی کتابوں میں تو نظر سے نہیں گذری۔ مگر سینہ بہ سینہ چلی آتی ہے جو ہمارے نزدیک قابل [illegible] ہم نہیں

تاجور صاحب کا یہ اعتراض اور ہمیں اس سے اتفاق نہیں کہ...

"اس اعتراض کا ایسا جواب قابل تسلیم نہیں ہو سکتا کہ زید نے یونہی کہا ہے۔ یا خالد کے کلام میں اسی طرح ہے۔ غلطی مبتدی سے سرزد ہو یا منتہی سے بہر صورت غلط ہی قرار پائیگی۔ یہ بحث علم قافیہ کی ہے۔ اگر علمی دلیل گرفت کے پنجہ سے اس مطلع کے قافیوں کو چھڑا سکے تو البتہ ایک معقول بات ہے۔" دیکھئے اس آخری فقرے کی بے ترتیبی ہیجان جذبات کی مظہر ہے۔ اور ایسی اضطراری حالت میں اگر انسان کوئی بے معنی بات بھی کہہ دے۔ تو اسے قابل معافی سمجھنا چاہئے۔ خیر ایطا کی دوسری شناخت درج کرنے سے اتنا ثبوت تو ملتا ہے کہ تاجور صاحب کے نزدیک شاداں اور یاس زید اور خالد سے زیادہ مستند ہیں۔ اور کم از کم اُن کی رائے خواہ قدیم عروضیوں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ قابل وثوق سمجھی جائیگی۔

شاید تاجور صاحب کو یہ معلوم ہوگا کہ شوق نیموی (جو عروض کے مستند عالم ہیں) اور یاس (ان کا حوالہ اس لئے دیا گیا ہے کہ وہ "معیار پارٹی" پر ہمیشہ اعتراض کرتے رہتے ہیں) اور دیگر اساتذہ فن اس معاملہ میں متفق ہیں۔ کہ اگر حرف علت علامت افعال ہندی متصل بحرف اصلی ہو تو ایطا نہیں ہوتا۔ خیر ان ہندیانہ اصولوں کی توضیح محض تاجور صاحب کی تسلی کے لئے کی گئی ہے۔ مولانا کو اگر اعتراض ہی کرنا تھا تو ان اشعار پر کرتے ؎

یہ اپنا اپنا مقدر یہ اپنا اپنا نصیب
زمانے بھر کو ہنسائے ہمیں رُلائے بہار
یہ آج کس کی جوانی کو مَیں نے دیکھا ہے
مری نگاہ کو تکتے ہیں آشنائے بہار

ان قافیوں میں تعقید مکتوبی و غیر مکتوبی لاحق ہوتا ہے ظاہر ہے کہ "رُلائے" میں الف کے بعد ہمزہ اور ہمزہ کے بعد تے ہے۔ اور "آشنائے" میں الف کے بعد صرف ایک تے ہے جس کو بوجہ اضافت کسرہ ہے اور کسرہ کی وجہ سے وہ تے لہجہ میں ہمزہ سے بدل گئی ہے۔ اور اس کسرہ کا اشباع کیا گیا ہے جس سے دوسری تے صرف تلفظ میں پیدا ہو گئی ہے۔ اس کو کتابت سے کچھ علاقہ نہیں۔ علم قافیہ میں ایسے قافیوں کا استعمال سقم ہے۔ مگر ناسخ نے "چھڑائے لکھنؤ" اور "ندا نے لکھنؤ" باندھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ قاعدہ جمہور فصحا کے کلام کے تابع ہوتا

ہے نہ یہ کہ کلامِ جمہور قاعدہ کا پابند ہوتا ہے۔ اور آجکل تو جنابِ تاجور نثرِ مرجز کو نظم قرار دے رہے ہیں۔

تاجور صاحب نے ایسے بہت سے اعتراض کئے ہیں۔ مگر چونکہ یہ دو اعتراض نمایاں طور پر جواب طلب تھے۔ اس لئے انہیں کے جواب پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ شاعری کو ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں۔ عزیز کی برتری اُن کے جذبات کی پاکیزگی اور اُن کے خیالات کی بلندی سے ہے ایک عاشقانہ رنگ کا شعر ملاحظہ ہو ؎

بس طرح چاہو درست اٹھوا دو۔ ایک بیکس کی کیا حقیقت ہے

جدّت طرازی دیکھئے طولِ شبِ فراق ایک پامال مضمون ہے۔ مگر یہاں کس قدر تازگی کے ساتھ بندھا ہے اور یہ بھی عزیز کی خصوصیت ہے ؎

طولِ شبِ فراق کی کچھ انتہا نہ پوچھ
اتنے جئے کہ زیست سے بیزار ہوگئے

وارداتِ قلبی کو کس سلجھے ہوئے طریق سے بیان کرتے ہیں ؎

مدتیں گزریں کہ دل میں کوئی بات آتی نہیں
مَیں ہوں اور دن رات دُہرانا تری تقریر کا

مگر لوگ ہیں کہ پھر بھی کہے جاتے ہیں کہ عزیز کا طرزِ بیان اُلجھا ہوا ہے۔ یہی اعتراض غالب پر کیا جاتا تھا۔ اس غلط فہمی کی اصل وجہ یہ ہے کہ ”طرز“ اور ”جذبہ“ میں تمیز نہیں کی جاتی۔ عمیق خیالات اور طرزِ بیان کے تناسب کو نظر انداز کیا جاتا ہے محض اضافت کے استعمال کو قابلِ ملامت سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ ”فارسی کی ایک چھوٹی سی ترکیب جس وسیع مضمون کو ادا کر دیتی ہے۔ اُردو کی طویل عبارت بھی اس کے لئے ناکافی ہے۔“ ایک جدید ترکیب ایک نیا استعارہ ملاحظہ ہو ؎

بنی ہیں شہر آشوبِ تمنا   خمار آلودہ آنکھیں رات بھر کی

ذرا معترضین میر تقی کے اس شعر کو اضافتوں سے پاک کر کے دکھائیں۔ ؎

شب فروغ بزم کا باعث ہوا تھا حسن دوست
شمع کا جلوہ غبارِ دیدۂ پروانہ تھا

مرزا عزیز محض زبان کے لئے شعر نہیں کہتے۔ مگر دیکھئے یہ اشعار صفائی اور بے ساختہ پن کے لحاظ سے داغ کے اشعار سے کسی طرح کم نہیں ؎

جھینپتے کیوں ہو جو سر تا بقدم دیکھتے ہیں
یہ کوئی اور نہیں ہے تمہیں ہم دیکھتے ہیں

یہ مشورہ ہم اُٹھے ہیں چارہ جو کرتے
اب اس مریض کو اچھا تھا قبلہ رو کرتے

ہجر کی رات کاٹنے والے
کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی

دل نے دُنیا نئی بنا ڈالی۔ اور ہمیں آجتک خبر نہ ہوئی

کبھی حوصلے دل کے ہم بھی نکالیں
ادھر آؤ تم کو گلے سے لگالیں
یہ مانا کہ آزردہ تم سے نہیں تھے
مگر آؤ اب ہم تمہیں کو منالیں

اب پھینکئے یہ خون بھری تیغ پھینکئے
کیا سوچتے ہیں آپ جو ہونا تھا ہو چکا

تو مجھ سے پوچھتا ہے مرض کا مرے سبب
دیوانہ ہو نہ جائے مرا چارہ گر کہیں

ہنس رہا ہے دیکھ کر یہ کون مجھ کو دیر سے
سر اٹھا اسے دل سے باتیں کرنیوالے سر اٹھا

جنونِ عشق میں کوئی مری رفتار تو دیکھے
وہ چلنا تھوڑی دور اور چلتے چلتے پھر جانا
نثار اس بچپنے کے اور اس نازک دماغی کے
سیاہ بالوں سے اپنے نیند میں خود آپ ڈرجانا

پوچھا ہے آج آکے میرا حال اس نے خود
کیا پوچھنا ہے اب دلِ خانہ خراب کا
آگے خدا کو علم ہے کیا جانے کیا ہوا
بس اُن کے رُخ سے یاد ہے اُٹھنا نقاب کا

اس سلاست بیان کے ساتھ بلند خیالی کو قائم رکھنا مرزا کا کمال ہے۔ یہ پاکیزگیِ جذبات صرف اسی لئے ہے کہ ان کی آنکھوں کے سامنے حقیقت کے جلوے ہیں۔

حقیقت میں جو سیر عالمِ ایجاد کرتے ہیں
وہ ہر ذرہ میں اِک دُنیا نئی آباد کرتے ہیں

اسی چشمِ حقیقت بین کا بیان ہے

ہر گل میں تو ہے تجھ میں ہزاروں تجلیاں
دیوانہ کر دیا سب مجھے نفصلِ بہار نے

ایک اور جگہ لکھتے ہیں

مٹے طلسمِ تصوّر تو اب قدم اُٹھیں
کہ ذرّہ ذرّہ پہ تصویرِ یار راہ میں ہے

اسی قافیے میں آتش کہتا ہے

شباب تک نہیں پہنچا ہے عالمِ طفلی
ہنوز حسن جوانی یار راہ میں ہے

حضرت عزیز کو مناظرِ فطرت سے خاص دلبستگی ہے۔ محض تفریحِ طبع کے لئے نہیں بلکہ

چشمِ حقیقت بیں اک ہوتی باغ کا بوٹا بوٹا ہوتا

اِسی لئے قرآنِ کریم میں جابجا مناظرِ فطرت کو دیکھنے کا ارشاد ہے (افلا ینظرون ... الخ) جیسے غالب نے کہا ہے ع شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے زہے موسمِ گل اسی موضوع پر ٹینی سن ... کی مشہور نظم قابلِ غور ہے:- "اے پھول اگر میں تیری حقیقت کو پوری طرح سمجھ لوں تو میں خالق و مخلوق کی حقیقت سے آگاہ ہو جاؤں"۔ ... یہی حکیم افلاطون کا اصلی نظریہ ہے

اور حضرتِ عزیز اسی کے پیرو ہیں یعنی اُن کے خیال میں حقیقت تک پہنچنے کے لئے مجاز کی ضرورت ہے۔ انہیں اس ظاہری دُنیا کے مناظر میں غیر مرئی دُنیا کے جلوے نظر آتے ہیں۔ ؎

یہ خزاں کی فصل کیا ہے فقط انکی چشم پوشی
وہ نقاب اگر الٹ دیں تو ابھی بہار آئے

بہار جس کو سمجھتے ہو وہ ہے اور ہی شے
نگار خانۂ ہستی ہے اک ادائے بہار

اسی لئے ان کی شاعری میں نیچرل تشبیہات بہت ہیں ؎

رہ رہ کے میرے دل کا چھالا تپک رہا ہے
بجلی چمک رہی ہے کوندا لپک رہا ہے

؎ اٹھ کے چمکی اور چمک کر ہو گئی پانی میں جذب
قلزمِ ہستی میں میری زندگی اک لہر ہے

؎ نور لے کر دیدۂ یعقوب سے نکلا جو اشک
شب کو زنداں پر ستارہ اک چمک کر رہ گیا

مناظرِ قدرت پر غور کرنے سے آدمی کا صاحبِ فکر ہونا لازمی ہے۔ اور شاعر جو خاص طور پر سریع الحس ہوتا ہے ان روشن تصوّرات کے مجموعہ سے جن کا ماحول محض جذباتی ہوتا ہے۔ وجدانی طور پر زندگی کے متعلق ایک رائے اخذ کرتا ہے ایک جذبہ کو دوسرے جذبہ سے مدد ملتی ہے اور اس طرح ایک "جذباتی عادت" پیدا ہو جاتی ہے۔

اور اس طرح وہ تمام دُنیا کو ایک فلسفیانہ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ مگر یہ فلسفہ محض ڈھانچ ہوتا ہے۔ شاعر کی اصلیّت جذبہ ہے۔ شاعر کو فلسفی کہنا اسی لئے غلط ہے مصائب سبھی پر آتے ہیں۔ مگر شاعر سمجھتا ہے کہ یہ خصوصیّت کے ساتھ ع "خانۂ انوری کجا باشد" پوچھتے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ دیکھئے عزیز اسی مضمون کو کس طرح بیان کرتا ہے ؎

حفاظت کرنے والے خرمنوں کے مطمئن بیٹھیں
تجلّی برق کی محدود میرے آشیاں تک ہے

دُنیا مصیبتوں سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں رنج بہت زیادہ ہے۔ اور مسرت "النادر کالمعدوم" کا حکم رکھتی ہے جرمن فلسفی شوپن ہار کہتا ہے۔ کہ "یہ سچ ہے کہ گل بے خار کجا است، مگر ہزاروں خار ایسے ہیں جن کے ساتھ کوئی پھول نہیں ہے۔ . . اکثر چیزیں جنہیں باعثِ مسرت سمجھا جاتا ہے۔ موجبِ غم ہوتی ہیں" اسی لئے نیٹشے کہتا ہے کہ غمخواری بے فایدہ ہے۔ اس سے دُنیا کے غم میں اضافہ ہوتا ہے۔ جنابِ عزیز بھی اسی کے قائل ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ ؎

مَیں اور اپنی زیست سے مایوس ہو گیا
جب رو دیا مجھے کوئی غمخوار دیکھکر

اور اس غم کدہ میں اگر کوئی تسلّی بخش بات ہے تو یہ ہے

کہ زندگی کی میعاد بہت تھوڑی ہے۔

ع کہیں یہ راز کیا اے ہنسنے والو
اگر جیتے تو کچھ دن اور جیتے

ع کیا ہے انجام پہ دُنیا کے نظر جب میں نے
چند ٹوٹی ہوئی قبروں کا سماں دیکھا ہے

اور یہ فانی زندگی بھی محض ایک سراب تخیل ہے ع

صرف اک نظر فریبیِ وہم و خیال ہے
کیا ہستیٔ طلسمِ جہاں جب ہمیں نہیں

مگر وہ بالکل مایوس نہیں ہوتے۔ کہتے ہیں اور کس دلنشیں پیرائے میں کہتے ہیں ع

تمہارا فرض ہے اپنی سی کوشش چاہیے تم کو
مگر آساں نہیں ہے میری ہستی کو مٹا دینا

یہ خیالات ہیں جن سے اُن کا کلام ہمہ تن درد بن گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ گلکدہ کا ہر پھول خون کے آنسوؤں سے سینچا گیا ہے۔ ع

یوں آئے رُلا کے جانے والے
جیسے کہ ہمیں ہنسا ہی دیں گے

ع ہنسنے والے اب ہنسی کو روک لیں
رونے والوں سے رہا جاتا نہیں

ع ہونگے بدنام تو ہو لینے دو
ہم کو جی کھول کے رو لینے دو

ضبطِ گریہ کا نہ دو حکم سے مجھے
دل میں کچھ داغ ہیں دھو لینے دو
مشورہ چارہ گروں میں ہے یہی
جسقدر رو سکے رو لینے دو

ع عزیز اب ضبط سے بھی کام لے کچھ
ارے مر جائیگا تو روتے روتے

ع ارے مُنہ ڈھانپ کے رونے والے
دم اُلٹ جائے گا فریاد تو کر

وہ خود کہتے ہیں "اہل دل کبھی کبھی گورِ غریباں کی بھی سیر کر لیتے ہیں۔ آپ بھی گلکدہ کو اسی نظر سے دیکھیں" دیکھئے کس انداز سے درد انگیز مضامین پیش کئے ہیں ع

جائیں قبروں پہ دوستوں کی کیا
ہم سے تو کوئی بولتا ہی نہیں

ع رگیں کھنچنے لگیں اب نزع کا ہنگام آتا ہے
وہ جائیں ورنہ ان کے سر پہ سب الزام آتا ہے

ع اِک بات تھی کہ چُبھ گئی دل میں میرے عزیزؔ
بھولونگا میں ہنسی نہ شکستہ قبور کی

ع کیا کنارہ ڈھونڈھتا ہے تو محیطِ عشق کا
ڈوبنے والوں کی لاشیں ہیں یہاں ساحل کہاں

اس سے یہ مطلب نہیں کہ گلکدہ محض ایک محفلِ مرثیہ خوانی ہے مگر ایسے مضامین کی کثرت ہے۔ اور یہ ڈر ہے کہ یہ طرز جو

اپنی جدّت کی وجہ سے مقبول ہو رہی ہے محض ایک رسمی بات نہ ہو جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ورڈز ورتھ کی شاعری جس نے انگریزی ادبیات میں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ رسمی اعادہ کی وجہ سے طبیعت کو اکتا دیتی ہے۔ اقبال کے "طلوعِ اسلام" میں بھی یہی نقص ہے۔ اسی ضمن میں لغتِ شاعری کی بحث بھی آگئی ہے۔ دُنیا کا عام دستور ہے کہ ہر مجدد کی مخالفت کی جاتی ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ عزیز عام طور پر نامانوس، غیر شاعرانہ الفاظ" (سواالخمری وغیرہ) استعمال کرتے ہیں۔ مگر معترض یہ نہیں دیکھتے کہ عزیز کی جدّت طرازی فقط جائز نہیں بلکہ ضروری ہے۔ اور شاعری کے لئے کوئی خاص لغت مقرر کرنا صریح غلطی ہے جب ورڈز ورتھ نے شاعری کی لغت وسیع کرنی چاہی۔ تو انگلستان میں بھی اسی قسم کے اعتراض ہونے لگے۔ گلکدہ اٹھا کر دیکھو اور پُرانے شعرا کے دیوانوں سے مقابلہ کرو۔ پھر معلوم ہوگا۔ کہ عزیز نے ثقیل الفاظ سے کس قدر اجتناب کیا ہے۔ اور فقط اُنہی کو رہنے دیا ہے جن کا کوئی لطیف مترادف نہیں۔ میر کی زبان بہت سلجھی ہوئی ہوتی ہے۔ مگر سُنئے۔

؎ جہاں کے مصطبہ میں مست طافح ہی نظر آتے
نہ تھا اس دور میں آیا جسے ہشیار کہتے ہیں

ناسخ جن کی متروکات مشہور ہیں فرماتے ہیں ؎

باعثِ گریہ ہوئی فرقت میں مجھ کو میکشی
ساقیا اشکوں سے مے کا استحالہ ہو گیا

؎ تیغِ قاتل نے جو کھولے میری چھاتی کے کواڑ
حسرتِ دل کے نکلنے کو عجب در ہو گیا

حضرتِ عزیز بھی ثقیل الفاظ کا استعمال کرتے ہیں مگر دیکھئے کس پیوستگی کے ساتھ ؎

اک جزوِ مستقل ہے دلِ بے قرار کا
پیکان اب حضور کا پیکان ہی رہا

مگر معترضین کی نزاکت کے کیا کہنے وہ تو عزیز کے اس شعر کو بھی ثقیل قرار دیتے ہیں۔ . . . ؎

ترے وعدہ کی حقیقت کو ہمیں سمجھے ہیں
وہ حریصِ زندگی ہے جسے اعتبار آئے

مگر یہاں بھی یہی خوف ہے۔ کہ 'جذبات' 'مرکز' اور 'ذرات' کا اس کثرت سے استعمال محض رسمی نہ ہو جائے خصوصاً اس صورت میں جب جناب جوش بھی اس روش کے پیرو ہیں۔ لیکن ان کی ترویج کی اور صورت بھی کیا ہو سکتی تھی؟ ہاں 'ناسور' کے لفظ کا اس قدر تکرار نہ فقط غیر ضروری بلکہ ناخوشگوار ہے۔ پرانے اساتذہ نے بھی ناسور کو کوچہ جاناں باندھا ہے۔ مگر اس مجموعۂ غزلیات میں جو بقول علّامہ اقبال "اردو ادبیات کی اس نئی تحریک کا بہترین ثبوت ہے جس کی نظر حقائق پر ہے۔" ایسی تشبیہات زیب نہیں دیتیں۔ گو یہ جناب عزیز کی جدّت طرازی کا

ایک اور ثبوت ہے۔ کہ انہوں نے اس گھناؤنے مضمون میں بھی جابجا اِک بات پیدا کی ہے مثلاً ؎

دِل کے ہر زخم میں ناسور کا فوارہ ہے
عشق کو شوق ہوا ہے چمن آرائی کا

؎ خندۂ حسن ستمگر کی صدا آتی ہے
دِل کے ناسور سے جس وقت ہوا آتی ہے

؎ اشکوں سے اس نے گن لئے ناسور ہائے دل
دیکھے کوئی کہاں سے کہاں تک نظر گئی

اس غم پسند طبیعت کے ہوتے ہوئے آپ کے دیوان میں ظریفانہ رنگ کے اشعار بھی ہیں۔ ہماری اردو شاعری میں اگر مسلسل نظموں کی کمی ہے[۱] تو خالص ظریفانہ نظمیں قریباً معدوم ہیں۔ البتہ ناصح، شیخ، اور واعظ پر ہر کوئی پھبتیاں کستا ہے۔ یہانتک کہ میر اور ناسخ نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ مگر بہر از تکلف میر تو گالیوں پر اتر آئے ہیں ؎ بن عصا شیخ اک قدم نہ رکھے

راہ چلنا نہیں یہ خر بے چوب

؎ بہکے جو ہم مست آگئے سو بار مسجد سے اٹھا
واعظ کو مارے خوف کے کل لگ گیا جلاب سا

شیخ ناسخ جنہوں نے پہلے پہل سوقیانہ مضامین کو ترک کیا تھا جیسے فحش سے بچے ہوئے ہیں۔ ویسے ہی ظرافت سے معرّا ہیں۔ ؎

دیکھیو ناسخ سرِ شیخ معمم کی طرف
کیا کلس مسواک کا ہے گنبدِ دستار پر

غرض یہ مضامین سبھی ہو گئے۔ غالب۔ داغ اور خصوصاً حالی نے اس میں کئی طرح سے جدت پیدا کی ہے۔ اس زمانے میں ریاض خیر آبادی اس فن کے اُستاد ہیں۔ مگر آپ بھی کئی بار ان ' پیرانِ پارسا ' سے بیحد بے تکلف ہو جاتے ہیں۔ ؎

اتنی تو پتہ کی ہے کہ بہکے ہوئے ہم تھے
مجرم ہیں جو واعظ کی کہیں سے خبر آئے

؎ شیخ صاحب برائیاں مے کی
اور جو کوئی چھینٹ کی آ جائے

گر جابجا کہیں حضرتِ عزیز نے اس مقدس گروہ سے خطاب کیا ہے۔ تو شوخی کے ساتھ متانت کو قائم رکھا ہے۔

؎ جواب حضرتِ ناصح کو ہم بھی کچھ دیتے
جو گفتگو کے طریقے سے گفتگو کرتے

؎ ہے سرتاقدم سادہ لوحی کا نقشہ
غنیمت زمانے میں ناصح کا دم ہے

[۱] حضرت عزیز نے اس کمی کو ایک حد تک پورا کیا ہے۔ وہ نہ صرف قصائد اور غزلیات لکھنے میں بے نظیر ہیں بلکہ ان کی نیچرل نظمیں بہت بلند پایہ ہوتی ہیں۔ فوارہ والی نظم کے متعلق مولانا اکبر کی رائے تھی کہ ایسی نظم مغربی ادبیات میں بھی کم نظر آتی ہے۔

سہ کانٹے زبانِ حضرتِ واعظ میں پڑ گئے
تعریف کرتے کرتے شرابِ طہور کی

اکبر کے رنگ میں کہا ہے سہ
کنارہ کیجئے گا صحبتِ رندانِ کالج سے
غضب ہی ڈھائینگے اے شیخ یہ پڑھے ہیں انگریزی

غالباً حضرتِ عزیز پہلے شخص ہیں جنہوں نے ناصح کی کسی بات سے اتفاقِ رائے ظاہر کیا ہے۔

سہ یاد آ ہی جاتا ہے کبھی ناصح کا قول بھی
سب کیجئے جہان میں اُلفت نہ کیجئے

اب مَیں گلکدہ کی اُن غزلوں کے اشعار لکھتا ہوں جو غالب کی غزلوں پر کہی گئی ہیں۔ مرزا عزیز کا کمال یہی نظر آتا ہے مجھے اس سے یہ بھی دکھانا منظور ہے کہ مولانا تاجور اور یاس صاحب کی رائے کہاں تک درست ہے۔ تاجور فرماتے ہیں "غالب کے رنگ کی چھاؤں بھی گلکدہ پر نہیں پڑی" یاس جہاں یہ کہتے ہیں کہ "غالب کے تخیل اور الفاظ سے اکثر دیہاتیوں کی بو آتی ہے۔ یعنی پڑھے لکھے دیہاتی اگر چاہیں تو ایسی شاعری کر سکتے ہیں۔ مگر میر و آتش کے رنگ میں وہی کہہ سکتا ہے جو اہلِ زبان ہو۔" وہاں آپ مرزا عزیز کو غالب کا صحیح مقلد تسلیم کرنے کو بھی عار سمجھتے ہیں۔

سہ مدتیں گذریں کہ دل میں کوئی بات آتی نہیں
مَیں ہوں اور دن رات دُھرانا تیری تقریر کا

سہ نظر آئینگی تجھ کو اس میں کچھ بے رنگ تصویریں
ورق اُلٹے گا جب مجموعۂ گورِ غریباں کا

سہ ستم ہے لاش پر اُس بیوفا کا یہ کہنا
کہ آنے کا بھی کسی کے نہ انتظار کیا

سہ ہمہ تن محو رہا گو کہ تو خود بینی میں
آئینہ تجھ پہ مرا منظرِ اصلی نہ ہوا

سہ کب پوچھتے ہیں آکے مزاجِ مریضِ عشق
جب بدنصیب بات کے قابل نہیں رہا

سہ مجھے منظرِ دو عالم وہ دکھا کے کہہ رہے ہیں
تجھے کچھ نظر نہ آتا اگر انتظار ہوتا

سہ آہوں سے مری زلفِ شکن در شکن بنی
آرائشِ جمال کا سرمایہ دود تھا

سہ ایک عالم کی نگاہیں ہیں میرے چہرہ پر
تیری محفل سے کچھ اس طرح میں حیران نکلا

سہ بتا برقِ تجلی یوں ہی دیتے ہیں جواب اسکا
اگر شوخی سے طرزِ لکنتِ سائل پسند آیا

سہ دل کے اس حوصلہ کی بھی کوئی حد ہے یارب
اس نے جو بات کہی اُس کو میں ارماں سمجھا

سہ وابستہ عمر سے ہے پرستاریِ صنم
تارِ نفس نہیں ہے۔ تو زنّار بھی نہیں

سہ میری خاموشی کی شرحیں لوگ جو چاہیں کریں

راز دل میں کیا کہوں جب رازداں کوئی نہ ہو
ایک وہ دلکش جہاں بیٹھے خدائی جمع ہو
ایک میں بیکس جہاں بیٹھوں وہاں کوئی نہ ہو
پائی جب خلوت کہیں پابندِ رسمِ ضبط نے
رو لیا یہ سوچ کر شاید یہاں کوئی نہ ہو

دیکھئے ان میں کا ہر ایک شعر کیا کیا دفتر معانی لئے ہوئے ہے۔ اب میں اس مختصر سی تنقید کو جو حقیقت میں چند پریشان خیالات کا مجموعہ ہے۔ ان تین اشعار پر ختم کرتا ہوں جو گلکدہ میں تو نہیں مگر مکاتیب اکبر میں چھپ چکے ہیں۔

ہم تھے اور تم تھے چاند نکلا تھا
ہائے وہ رات یاد آتی ہے
تم نے چھیڑا تو کچھ کھلے ہم بھی
بات پر بات یاد آتی ہے
ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی
اکثر اوقات یاد آتی ہے

تاثیر

غزل

عرش سے بھی بلند ہے بسکہ دماغ ناز کا — حوصلہ یوں ہی رہ گیا ناصیۂ نیاز کا
خاکِ رہ حجاز کیا ہاتھ لگی نہ پوچھئے — نسخہ یہ خوب مل گیا غازۂ رخ طراز کا
سامنے ان کے چپ لگی، شکرِ خموش بن گیا — قابلِ دید رنگ تھا نالۂ جانگداز کا
تھا نگہِ عتاب کا کس کے جگر میں حوصلہ — خیر ہوئی کہ کھل گیا پردہ ہے یہ بھی ساز کا
پھر عیادت آئے ہیں چشم پر آب، وقتِ نزع — میں کہ شہید ناز تھا تشنہ ہوا نیاز کا
بزم میں بات رہ گئی غمزۂ کامیاب سے — تجھ سے وگرنہ خوف تھا پردہ دری راز کا

سعی تو کی مگر عزیز چھپ نہ سکا کہ کون ہوں
چاک رفو نہ ہو سکا پیرہن مجاز کا

عزیز

نشاطِ زرّیں

دو تین سال ہوئے ہونگے پیرس میں یہ خبر بڑی مسرت کے ساتھ سُنی گئی تھی کہ "نشاطِ زریں" کے نام سے اس دارالسرور میں ایک انجمن قائم ہے۔ جس کی سرگرمیاں دائرۂ ادب تک محدود ہیں۔ چینی شعرا کا مطالعہ اور مشرقی گلدستہ ہائے ادب سے کاشانۂ مغرب کو زینت دینا اس جماعت کے مقاصد بتائے جاتے تھے۔ اہلِ پیرس کہ نو عمر ادب پرستوں کی نازک خیالیوں کے عادی تھے۔ طرح طرح کی چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ اور اک معنی خیز تبسم کے ساتھ بارہا یہ سوال کیا گیا۔ کہ اس انجمن کو ایک دو سے زیادہ اراکین بھی میسر ہو گئے یا نہیں۔ ایسا تو نہ ہو کہ فرضی ڈھکوسلا بنا کر کوئی نوخیز شاعر تشہیر کے حوصلے نکالنے چاہتا ہو۔ لیکن میرے لئے اس انجمن کے وجود کا علم اور معنی رکھتا تھا۔ خفیہ جماعتوں کی تحقیق میں اک عمر بسر کرنے کے بعد مجھے تجربہ ہو گیا تھا کہ دُنیا کے پردہ پر اگر یہ جماعتیں کہیں مخدوش ہو سکتی ہیں۔ تو وہ سرزمین چین ہے۔ یورپ کے مخفی گروہ اُن سازشوں کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ جو اُس خدائی بادشاہت میں رخنہ انداز یاں کرتی رہتی ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ چینی جماعت جتنی دلیر اور قوی ہوتی ہے۔ اُسی قدر معصوم اور شاعرانہ لقب اختیار کرتی ہے۔ مثلاً وہ خوفناک انجمن "سوسنِ آبی" جس نے چالیس سال ہوئے جنوبی چین کو خون سے رنگین کر دیا۔ فرانسیسی پولیس سیاسی خفیہ جماعتوں کے ساتھ نہایت محتاط رہتا ہے۔ مگر "نشاطِ زریں" وہاں قابلِ التفات نہ سمجھی گئی بہرکیف میں نے تحقیقات شروع کر دی۔

تھوڑے ہی عرصہ میں یہ امر تو پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا۔ کہ جماعت مذکور اک لاطینی شاعر کی نازک خیالی سے زیادہ اصلیت رکھتی تھی۔ چنانچہ دریافت ہوا۔ کہ اسی عرصہ میں اور اسی قسم کے ادبی ناموں کے ساتھ لندن، برلن، نیویارک وغیرہ میں متعدد جماعتیں قائم ہو چکی تھیں۔ اور باہم سلسلہ مراسلت برابر جاری تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ پیرس والی انجمن اک خانہ نشین فرانسیسی مدبر کی کتابت کر رہی تھی۔ جو دس برس پیکن رہ کر واپس آیا تھا۔ یہ شخص سرتاپا چینی خیالات سے لبریز اور حکومت چین کا سچا ہمدرد تھا۔ یہ بھی تحقیق ہو گیا کہ اس انجمن کا دفتر مسٹر سنگول کے ایک ہونہار مصوّر کا مکان تھا۔ وقتاً فوقتاً جلسے منعقد ہوتے تھے۔ اور روئداد کارروائی محفوظ رکھی جاتی تھی۔

اس روئیداد میں جگہ جگہ عالم اسفل کی ارواح کا ذکر تھا۔ جن پر اہل چین کامل اعتقاد رکھتے تھے۔ اور کہیں کہیں مبہم اندراج تھے جن سے ایسی رسوم کا ادا ہونا مترشح ہوتا تھا۔ کہ انہیں صرف ساحری سے متعلق کیا جا سکتا ہے سردست میری کوئی خاص غرض اس سے وابستہ نہ تھی۔ مگر یہ خیال تھا کہ ممکن ہے آئندہ یہ تفتیش کچھ مفید ثابت ہو اس اثنا میں چین سے خوفناک بغاوت اور قتل عام کی خبریں موصول ہوئیں۔ دُنیائے مغرب میں تنفر کا اک طوفان برپا ہو گیا۔ اور کم سن "نشاط زریں" اس ہنگامہ میں کہیں روپوش ہو گئی۔ میرا ذہن اُس کے تصور سے خالی ہو چکا تھا۔ کہ ایک روز میرے میر منشی نے ایک "اطلاعی کارڈ" میرے ہاتھ میں دیا۔ اور دریافت کیا کہ میں اُس وقت کسی سے مل سکتا تھا یا نہیں۔ میں نے کارڈ پڑھا۔ اُس پر "ایم کیرے مل بگ ناؤ" لکھا ہوا تھا۔ یہ شخص ایک مشہور شاعر تھا جس کا مخصوص طرز سخن "گل بلاس" کے اوراق میں کافی مقبول ہو چکا تھا۔ لیکن مجھے اس نام کے ساتھ دوسری وجہ سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی میں نے "نشاط زریں" کے صدر کا نام یہی لکھا دیکھا تھا۔ چنانچہ میر منشی سے میں نے کہہ دیا۔ کہ اس کو بلا لے اس وقت مجھے اک حیرت آمیز مسرت تھی۔ کیونکہ اِس جماعت کی نسبت میرے قدیم شکوک صحیح ثابت ہو رہے تھے۔ غرض میں بے چینی کے ساتھ انتظار کرنے لگا۔ میں سوچتا تھا۔ دیکھئے کیرے مل بگ ناؤ مجھ سے کیا کہنا چاہتا ہے۔ اتنے میں شاعر کمرہ میں داخل ہو گیا۔ میں نے خاموشی کے ساتھ ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ اور وہ بیٹھ گیا ایک لاپروا انداز کے ساتھ پشت کے تکیہ پر سہارا دیکر اور اپنی سیاہ خمار آلود آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال کر اُس نے کہا۔

"مسٹر وی! میں آپ سے دریافت کرنے آیا ہوں کہ آپ ایک دُور دراز۔ ایک نہایت دور دراز سفر کے لئے تیار ہو سکتے ہیں۔ یا نہیں مگر روانگی سے پہلے آپ کو یہ نہ بتایا جائیگا کہ وہاں پہنچکر کیا خدمت انجام دینی ہوگی۔ میں نے کہا" اس کا جواب صاف ہے یعنی میں تیار ہوں۔ بشرطیکہ میرے وقت اور محنت کا معقول معاوضہ دیا جائے۔ مجھے اس سے کیا بحث کہ آپ کہاں بھیجنا چاہتے ہیں۔ اور کیا کام لینا چاہتے ہیں لیکن واضح رہے اس صورت میں مجھے اختیار ہوگا کہ جا ہوں تو بغیر کوئی سبب بتانے تعمیل حکم سے انکار کر دوں۔ نیز یہ کہ میرا معاوضہ سفر ہر حالت میں آپ پر واجب ہوگا"۔

ایم بگ ناؤ نے کہا۔" آپ کی شرائط نہایت معقول ہیں جس قدر روپیہ درکار ہو پیشگی لے لیجئے لیکن یہ فرمائیے آپ کب تک روانہ ہو سکینگے"۔

میں نے تھوڑی دیر غور کیا۔ "اگر آپ مجھے یورپ یا امریکہ میں کہیں مامور کرتے تو شاید میں ابھی روانہ ہو سکتا۔ مگر آپ چین بھیجنا چاہتے ہیں۔ اس لئے کم از کم چھ گھنٹے کی مہلت دیجئے۔"

شاعر کی مخمور نگاہوں سے حیرت ٹپکنے لگی۔ اور بظاہر کچھ پریشان ہو کر اُس نے پوچھا۔

"مگر میں نے تو آپ سے چین کا ذکر نہیں کیا۔"

"ہاں آپ نے کچھ نہیں فرمایا لیکن میں اس پیشے میں رہکر نتائج اخذ کرنے کا عادی ہو گیا ہوں۔ بہرحال اگر مجھے چھ گھنٹے کے بعد روانہ ہو جانا ہے۔ تو وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔"

شاعر نے ایک تبسم کے ساتھ جواب دیا "کام اسقدر ضروری نہیں مگر مغرب کی عجلت اور زود کاری اُس خوشگوار خطہ میں نہیں پائی جاتی۔ اگر آپ کل یا پرسوں تک چل سکیں تو بھی دیر نہ ہوگی۔"

"بہت خوب! لیکن مجھے پیکن جانا ہوگا یا سنگ فو؟"

"آپ سنگ فو جائینگے" میری صحت قیاس پر اُسکے لہجہ میں اک خفیف استعجاب تھا۔ اُس نے پھر کہا۔

"میں سمجھتا ہوں یہ جتانے کی ضرورت نہیں، کہ یہ خدمت خفیہ ہے۔"

اس قسم کے جملے ہمیشہ مجھے ناگوار ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں نے فوراً جواب دیا۔

"میں بھی خفیہ کار پرداز ہوں۔ یہ فرمائیے وہاں مجھے کس کے پاس جانا ہوگا۔"

مسٹر بگ ناؤ نے آگے جھک کر آہستہ سے کہا "ملکہ دواگر کے پاس"

میں نے اس ہدایت کو نہایت سکون کے ساتھ سُن لیا "کیا مجھے کچھ خطوط بھی دئے جائینگے۔"

"نشاط زریں" کے صدر نے کوٹ کے بٹن کھولے اور جیب سے ایک چھوٹا سا پارسل نکالا جو زرد ریشم کے پارچہ میں لپٹا ہُوا تھا۔ اس نے مودبانہ احتیاط کے ساتھ پارچہ کے پیچ کھولنا شروع کئے۔ آخر شفاف پتھر کی ایک لوح برآمد ہوئی۔ اُس کا رنگ ایسا تھا جیسا روشنی میں دور سے زیتون کا درخت معلوم ہوتا ہے۔ یہ زمرد کا ایک ٹکڑا تھا۔ اہل یورپ اس کی قدر نہیں کرتے لیکن چینی لوگ اکثر جواہرات سے بہتر سمجھتے ہیں۔ لوح کو اس کے ہاتھ سے لیکر میں نے دیکھا۔ تو اژدھے کی ایک مہیب شکل منقش تھی۔ جس کے آگے نکلے ہُوئے بازوؤں میں پانچ پانچ پنجے نمایاں تھے

"یہ شاید شاہی تعویذ ہے"

"نہیں یہ پروانہ راہداری ہے۔ صرف اس لوح کا دکھا دینا آپ کو حضور شاہی میں باریاب کر دیگا" پھر اس نے ایک آہ بھری اور کہنے لگا "مسٹر وی تمہاری قسمت قابلِ رشک ہے۔"

"یہ ابھی کیا معلوم" کہکر میں نے اپنے مصارف اور معاوضہ کا تعیین شروع کیا۔ اور مسٹر بگ ناؤ نے بلا پس و پیش وہ کل رقم ادا کر دی۔ وہ جانا چاہتا تھا۔ کرسی چھوڑ چکا تھا لیکن اُس سے نہ رہا گیا۔ اور پوچھنے لگا" آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ آپ کو چین کی طرف سفر کرنا ہوگا۔ یا آپ کو اس بات کے اظہار میں کچھ تامل ہے۔"

مَیں نے کہا" یہ صرف قیاس تو نہ تھا' مَیں جانتا تھا کہ مجھے "نشاط زریں" کے صدر کا شرف ملاقات حاصل ہے۔"

اس انکشاف نے شاعر پر عجب اثر کیا۔ اور یہ دیکھ کر مجھے اپنی صاف گوئی سے پشیمانی ہُوئی۔ اُس کا چہرہ زرد ہوگیا لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے اُس نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر نہ کہہ سکا اور چلدیا۔

سیاحت چین کے مفصل واقعات لکھنے مشکل ہیں مختصر یہ کہ نصف کرّۂ ارض کا سفر کرکے مَیں اُس عجیب و غریب عورت کو دیکھنے جا رہا تھا۔ جس نے اس عصر جدید میں 'سیمی رمیس' کے افسانہ سطوت کو تازہ کر دیا تھا۔ مَیں سوچتا تھا یہ امر کسقدر قابل استعجاب ہے۔ کہ دورِ حاضر میں جبکہ خواتین مغرب کشمکش حیات میں مزید حصّہ لینے کے لئے شور مچا رہی ہیں۔ ایک تاریک خیال جاہل اور قدامت پسند قوم کی عورت پچاس لاکھ نفوس کی قائد اعظم بن جاتی ہے اور یورپ و امریکہ کے مدبرین کو انگلیوں پر نچا دیتی ہے۔

پیکن تک بہ آسانی رسائی ہوگئی لیکن وسط سلطنت کا خطرناک سفر جب شروع ہوا تو مشکلات کی ابتدا ہوئی۔ اب مجھے ایسے خطوں سے گذرنا پڑا۔ جہاں غیر ملکی شیاطین کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ باوجودیکہ میری مقدس لوح میں طلسمی اثر تھا۔ مگر اس جگہ پہنچکر مَیں نے یہی مناسب سمجھا کہ معمولی چینی افسر کا بھیس بنا کر اپنی مغربی نسل پر پردہ ڈال دوں۔ اس بھیس میں مَیں آرام اور حفاظت کے ساتھ سفر کرتا رہا۔ اور اک معزز سردار کی طرح جس کو دربار قدس میں طلب ہونے کا فخر حاصل ہو۔ میں جس جگہ پہنچتا تھا۔ عزت و احترام کے ساتھ ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ آخر وہ خطرناک منزلیں ختم ہوئیں اور سنگ فو قریب آگیا۔ یہاں کے لوگوں کو پیکن کے واقعات کی اطلاع بھی نہ تھی۔ نہ اُن کو یہ معلوم تھا کہ البانیہ سے کوئی فولاد بازو 'میکائیل' آیا ہوا ہے۔ جو اپنے سفیر کے قتل کا جواب اور تلافی طلب کر رہا ہے۔ وہ صرف اتنا جانتے تھے۔ کہ ساحل دریا پر بعض وحشی غارتگر تاخت و تاراج کرنے لگے تھے۔ جن کی سرکوبی کرنے کے بعد آسمانی فرزند' اُن کے شہر میں تفریح کی خاطر برائے چندے فروکش ہوگیا تھا میرے ساتھیوں نے یہ ظاہر کیا تھا کہ میں اک مژدۂ جانفزا لیکر آیا ہوں۔ اور وہ یہ کہ حکم شاہی

کے بموجب بدمعاشوں کا تمام گروہ کیفرِ کردار کو پہنچا دیا گیا واقعہ تو یہ ہے کہ میری ایسی تعظیم کی گئی گویا میں قیصرِ المانیہ اور زارِ روس کو شہر پیکن کے دروازہ پر درحقیقت آویزاں چھوڑ کر آیا تھا۔

یک پست سلسلۂ کوہ کے دامن میں اور شاداب درختوں کے جھنڈ میں جزنی سرسبزی ایک دلفریب چشمہ کا عطیہ تھی۔ لشکر خسروی خیمہ زن تھا۔ سرداران عظام کے عالیشان قصر حسب مراتب جھنڈوں سے مزین تھے اور گرداگرد دس ہزار لشکریوں اور خدمتگاروں کے خیمے نصب تھے۔ وسط میں ایک جنت نشان محل پر شاہی پرچم لہراتا تھا اور یہی وہ مکان تھا جسکے ریشمی پردوں اور مخملی تختوں میں "مادرِ مہر و ماہ" کی مقدس شخصیت مستور تھی۔ شاہی ایوان کے ایک گوشہ میں وہ بدنصیب شاہنشاہ اسیری کی زندگی بسر کر رہا تھا جس کا مال کار ابھی تک اہلِ ملک سے پوشیدہ رکھا گیا تھا۔

اس وقت مجھ کو معلوم ہوتا کہ پیریس کے مستشرق نے جو لوح مجھ کو عنایت کی تھی۔ وہ کس قدر اہمیت رکھتی تھی۔ میں جتنا اپنے باسطوت موکل سے قریب ہوتا جاتا تھا اس نقش کی ہیبت آفرینی ترقی کرتی جاتی تھی۔ آخر میں اس منزل تک پہنچا جس سے ملحق دوسرے کمرے میں ملکہ دواگر رونق افروز تھی۔ اس مقام پر میں نے دیکھا کہ حریم سلطانی

کے دربان میری لوح کو دیکھ کر واقعی سجدہ میں گر پڑے اور جبتک میں نے پھر اس کو ریشمی پیرہن میں محجوب نہ کر دیا ہرگز سر اٹھانے پر راضی نہ ہوئے۔ میری جرأت و ہمت کے باوجود محض ایک نقش کی اس درجہ تعظیم و تکریم نے مجھ پر بڑا اثر لیا۔ اور آخر کار جس وقت میں اس ہستی کے روبرو لایا گیا جس کو لاکھوں بندگانِ خدا معبود سمجھ کر پوجتے تھے۔ تو میرے قلب میں خوف کا ایک احساس پیدا ہو رہا تھا۔

'سلطان گر' ملکہ بانس کی بنی ہوئی سادہ کرسی پر تمکن تھی اس کا جسم نازک' اس کے بال سیاہ اور رنگ زردی مائل تھا۔ مجھے "کوٹو" (کورنش) بجالانے کی ضرورت نہ پیش آئی کیونکہ میری ملاقات بالکل نجی اور خانگی حیثیت رکھتی تھی۔ بعدہٗ مجھے معلوم ہوا کہ اس سے پہلے ہی "محکمۂ رسمیات" نے ایک فوری منشور کے ذریعہ سے میرے دادا کو (مارکوئس) کا خطاب نوازش کر دیا تھا۔ تاکہ میں پیشگاہ حضوری میں حاضری کے قابل ہو جاؤں۔ سلسلۂ گفتگو ایک مترجم کی وساطت سے فرانسیسی زبان میں شروع ہوا۔ یہ مترجم خود ایسے مرتبہ کا آدمی تھا۔ کہ میرے اجداد کو سلسلۂ امرا میں داخل نہ کر دیا جاتا۔ تو براہ راست کبھی ہمکلام نہ ہوتا اس نے کہنا شروع کیا۔

"ملکۂ عالم امید کرتی ہیں کہ تم پر سفر کی تکان کا اثر نہ ہوگا" میں نے نیم قد ہو کر جواب دیا۔ " حضور شاہی تین تکان کا

احساس ناممکن ہے۔"

ایک خفیف تبسم اُن خوفناک لبوں پر نمایاں ہوا جس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا۔ کہ ملکہ دوا گر ہماری گفتگو بخوبی سمجھ رہی تھی۔ مترجم بھی اس بات سے ضرور آگاہ تھا کیونکہ میرا جواب سنکر اُس نے ایک خوفزدہ صورت بنائی اور کہا۔

"والدہ شاہ کی خدمت میں مجھے اتنی مجال سخن نہیں کہ تمہاری بے باکانہ تعریف گوش گذار کر سکوں۔" اُس کے لہجہ میں تنبیہ کا انداز تھا۔ "لہذا تمہاری طرف سے میں یہ عرض کرتا ہوں کہ تم احکام خسروی کے منتظر ہو۔"

کچھ دیر تک چینی زبان میں گفتگو کرنے کے بعد وہ پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔

"ملکۂ عالم کا حکم ہے۔ تمہیں بتا دیا جائے کہ چند غیر مہذب اور وحشی سرداروں نے دار الخلافت میں فتنہ و فساد برپا کر رکھا ہے۔ جن میں سے ایک بد باطن واپسی کے معاوضہ میں ایسا گستاخانہ مطالبہ پیش کرتا ہے کہ اُس کو محض ایک جاہل کا زعم باطل کہہ سکتے ہیں۔ جس سردار کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ وہ مغرب کے اُن اخوان الشیاطین پر کچھ تسلط بھی رکھتا ہے۔ جو خود کو ڈچ اور ٹیوٹن کے نام سے مشہور کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "شاید آپ کا مطلب قیصر جرمنی سے ہے۔"

اس پر مترجم ایسا دہشت زدہ بن گیا۔ گویا میری زبان سے کوئی کلمہ کفر نکل گیا تھا۔

"مہربانی فرما کر خاموش ہو تمہیں خیال نہیں کہ تم کس مقدس ہستی کے سامنے کھڑے ہو خیر صرف ایک بادشاہ کو ملکۂ عالم کی اجازت ہے کہ سیاہ مو اقوام پر حکومت کرے باقی سب لٹیروں نے بادشاہ کا غصب بلا استحقاق اختیار کر لیا ہے اور یہ امر دربار خداوندی کو نہایت ناگوار ہے تم سمجھتے ہو؟ صرف ملکۂ عالم کی چشم پوشی کا صدقہ ہے۔ کہ ان نوخیز مدعیان سلطنت کا وجود ابھی تک باقی ہے اس لئے آیندہ تم شخص مذکور کو صوبہ انبانیہ کا حاکم کہنا۔"

میں نے معذرت کے طور پر گردن توجھکالی مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ آ ہی گئی قیصر جرمنی کو اپنی قوت پر کافی ناز ہے۔ میں نے سوچا کاش یہ مکالمہ اس کے سامنے دھرایا جاتا چینی امیر نے پھر سلسلۂ کلام شروع کیا۔

"اس باغی حاکم کی گستاخی دُنیا میں اپنی مثال نہیں رکھتی۔ وہ چاہتا ہے۔ کہ خاندان منچو کا شاہزادہ اُس کے محنت آباد تک زحمت سفر گوارا کرے۔ اور سفیر کے قتل پر اظہار تاسف فرمائے۔"

یہ اطلاع میرے لئے کوئی نئی خبر نہ تھی۔ میں پیکن میں سن چکا تھا کہ شرائط صلح میں ایک مطالبہ یہ بھی شامل تھا۔ مترجم نے تقریر جاری رکھی۔ "یہ بے ادبی مسامع خسروی

یہ جس قدر ناگوار گذر سکتی ہے۔ اُس کا اندازہ تم اس تمثیل سے کر سکتے ہو کہ وسطِ افریقہ کے ایک حبشی رئیس کا غلام لندن میں قتل ہو گیا ہو اور وہ ملکہ وکٹوریہ سے اصرار کر رہا ہو کہ اپنے فرزند کو اُس کے ہاں بھیجدے۔ تاکہ اُس کے حضور میں سرِ نیاز خم کرے۔ اور اس واقعہ کی معذرت چاہے۔"

مَیں خاموشی کے ساتھ یہ تشبیہ سنتا رہا۔ اس سے معلوم ہُوا کہ ملکہ وہ اگرچہ وحشیوں کو ناقابلِ التفات سمجھتی تھی۔ اُن کے سیاسی فرق مراتب سے بخوبی آگاہ تھی شاہی مترجم نے تقریر کا سلسلہ قائم رکھا۔

"اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے۔ کہ دودمانِ خسروی کے ایک نونہال کو مغربی ساحروں کے خطرناک دسترس سے کوئی گزند نہیں پُہنچ سکتا تو بھی یہ ناممکن ہے کہ 'مہر و ماہ کا بھائی' ایسی تذلیل کا حامل ہو سکے کہا جاتا ہے تم لوگوں کے پاس ایک شیطانی آلہ ہوتا ہے۔ جسے 'کودک' کہتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ 'نسل آسمانی' کا فرزند اس کودک کا معمول بنا دیا گیا تو ممکن ہے 'خورشید خاور' اس توہین کا خود انتقام لے۔ اور کرۂ زمین کو روشنی سے محروم کر دے۔"

اُس کا لہجہ نہایت متانت آمیز تھا لیکن ملکہ کے چہرہ پر مَیں نے ایسے آثار دیکھے گویا اس فضول طوالت سے کبیدہ خاطر ہو رہی تھی۔ مَیں نے تھوڑی سی جرأت سے کام لیا۔ اور چینی مترجم کو اصل مطلب کی طرف پھر رجوع کر دیا۔

"یہ ارشاد فرمایئے۔ کہ ملکۂ عالم مجھے کس خدمت پر مامور کرنا چاہتی ہیں۔"

"تمہیں ملکۂ عالم کے اعتماد کی عزّت حاصل ہے۔ مغربی ولایت میں جو غلامانِ شاہی مقیم ہیں۔ انہوں نے یقین دلایا ہے۔ کہ تم 'کھنگ' اعظم کے مقولہ پہ کاربند ہو یعنی دو آدمی معافی کے مستحق نہیں۔ ایک تو وہ ندیم جس نے آقا کا راز فاش کر دیا۔ اور دوسرے وہ بچّہ جس نے ماں کو گزند پُہنچایا۔

"فرمایئے فرمایئے" میں کسی قدر بے صبر ہوتا جاتا تھا

"حاکم البانیہ کا مطالبہ پورا نہیں کیا جا سکتا اور ملکۂ عالم کی فیاض طبیعت یہ بھی نہیں چاہتی کہ اُس کو انکار کی ذِلّت نصیب ہو۔ چنانچہ ایک معمولی آدمی تلاش کر لیا گیا ہے۔ یہ پیکن کا ایک حجام ہے۔ جس کو قدرت نے اپنی عنایت سے شاہزادہ 'چنگ' کا ہمشکل بنا دیا ہے۔ اس کی حقیقت دیکھتے ہُوئے وہ کافی ذہین اور ہوشیار ہے جُہالِ مغرب کو فریب دینے کے لئے ایک ملبوس فاخرہ اُس کو مہیا کر دیا گیا ہے۔ جو شاہی خاندان کی پوشش سے بالکل مشابہ ہے۔ گذشتہ چند ہفتوں سے اُس کو آدابِ مجلسی بھی تعلیم کئے جا رہے ہیں۔ اب وہ مغرب کی طرف جانے والا ہے۔ تاکہ حسب شرائط حاکم البانیہ

[redacted]

کے غرورِ باطل کی تسکین کر دے۔

"بیشک۔ یہ ضروری ہے تاکہ صوبہ دار کی تشفی ہو جائے اس میں شاہزادہ کے نام کی ذلت تو ہوگی لیکن یہ اچھا نہیں کہ وحشی سپاہی آسمانی سلطنت کو پامال کرتے رہیں"۔

ہر چند کہ یہ تجویز اتنی دلیرانہ اور بیباک تھی مگر کامیابی دشوار نہیں معلوم ہوتی تھی۔ مغربی نگاہ میں ایک چینی دوسرے سے زیادہ مختلف نہیں ہوتا۔ پھر برلن میں شاید ہی چند افراد ایسے مل سکتے جو ایک اپنی قوم کے شاہزادہ اور حجام کے انداز و ادا میں امتیاز کر سکتے۔ میں نے کسی قدر بلند آواز سے کہا۔

"ناکامی کا کوئی سبب نہیں معلوم ہوتا۔ اس کی جرأت ہی کامیابی کی ضامن ہے۔"

اس فقرہ سے ملکہ کے چہرہ پر اطمینان کے آثار ظاہر ہوئے۔ مترجم نے جلدی سے جواب دیا۔

"تمہارے الفاظ سے دور اندیشی کی بو آتی ہے۔ ملکۂ عالم تم کو اس نقلی شاہزادہ کے ساتھ جانیکی عزت بخشتی ہیں۔ بظاہر تم اک رفیق اور ہمسفر ہوگے۔ در اصل تم اُس کے محافظ اور اتالیق بن کے جاؤگے۔ تم کوشش کروگے کہ راز افشا نہ ہو۔ اور جو امر تمہیں خلاف مصلحت نظر آئے اُس سے آگاہ کر دوگے"۔

میں نے جواب دیا۔ "مجھے ارشاد عالی بسر و چشم منظور ہے"۔

اس سے پہلے کہ مترجم میرے جواب کا نمائشی ترجمہ کر کے سُنائے۔ ملکہ نے چینی زبان میں کچھ کہا جسے سُنکر وہ ایسا ہکا بکا رہ گیا گویا ملکہ کے الفاظ یکسر ناقابل یقین تھے۔ ملکہ دواگر نے اس خاموش ظرافت کو دیکھ کر اک اشارہ کیا۔ جس سے بے صبری مترشح ہوتی تھی چنانچہ مترجم فوراً مجھ سے مخاطب ہوا اور کہنے لگا۔

"مجھے اجازت دیجئے کہ اپنی مؤدبانہ مبارکباد آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ ملکۂ عالم نے آپ کے واسطے چائے لانے کا حکم دیا ہے"۔

میں نے محسوس کیا۔ کہ یہ التفات خسروانہ میرے لئے ایسا ہی موجب توقیر تھا۔ جیسا کسی وحشی کا سلطانہ سے بغلگیر ہو جانا۔ چائے حاضر کی گئی۔ مترجم نے زیر لب ہدایت کر دی۔ کہ پیالے کو چھو کر رخصت ہو جانا چاہیئے۔ واپسی میں وہ میرے ساتھ آیا تاکہ ضروری انتظامات کی تکمیل کر دے۔ اُس کا نام "ڈو ٹانگ" تھا۔ اور ملکہ کی خوفناک نگاہوں سے دور ہوتے ہی نہایت خوش اخلاق اور باخبر ثابت ہوا۔ مجھے افسوس رہا کہ وہ شہزادہ کیساتھ یورپ آنے والا نہ تھا۔

مصنوعی شاہزادہ سے میرا تعارف کرایا گیا جو اپنے بھیس کا اچھی طرح خوگر ہو چکا تھا۔ وہ میرے ساتھ ایسے

اندازسے پیش آیا گویا آفتاب و ماہتاب کا عم زادہ اور سارے کہکشاں کا برادرِ نسبتی تھا۔

سفر مغرب کا حال لکھنا فضول ہے چینی اخباروں میں ہماری روزانہ نقل و حرکت بالتفصیل شائع ہو چکی ہے جرمنی پہنچکر اس حجام کا متعدد بار فوٹو لیا گیا۔ اور اس معاملہ میں دربارِ چین کی بدگمانیاں واقعی صحیح ثابت ہوئیں ہمارے وفد کے متعلق جو خاص واقعہ پیش آیا۔ ابھی سب کو یاد ہوگا قیصر کا اصرار تھا کہ شاہزادہ 'کوٹو' (بندگی) بجالائے۔ اور ادھر سے پیہم انکار کیا جاتا تھا۔ یہی وہ موقعہ تھا کہ میری خدمات ملک و دو اگر کے انعام بے پایاں کا استحقاق حاصل کر رہی تھیں۔ بدنصیب حجّام اگر اپنی مرضی پر چھوڑ دیا جاتا تو وہ سجدۂ توہین ادا کر دیتا۔ جس کے بعد خاندان مغفور کی ناموس ہمیشہ کے لئے برباد ہو جاتی' وہ کمبخت وطن کی دوری سے پریشان تھا۔ اور آئینِ مغرب سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ڈرتا تھا۔ کہ قیصر کی ناخوشی قتل یا قید کی صورت میں نہ ظاہر ہو۔ خوش قسمتی سے ہم اس وقت سوئیٹزرلینڈ میں تھے۔ میں نے اپنے خفیہ آدمیوں کے ذریعہ سے ایک چینی سفیر کو جو اک اور جگہ متعین تھا مطلع کیا۔ اور ملکۂ چین کا ایک فرضی فرمان تیار کر لیا جس میں شہزادہ 'چنگ' کے قائمقام کو سخت ہدایت تھی کہ اُس دلخراش مطالبہ کو ہرگز منظور نہ کرے۔

اس میں شک نہیں کہ ہم قصر برلن کے جلسہ عام میں جس طرح شریک ہوتے۔ اُس سے ہر بہروپیئے کا پتّا پانی ہو جاتا۔ میری شکل ناقابلِ شناخت تھی لیکن جس وقت قیصر ولیم کے روبرو جس کے راز بارہا میری امانت میں رہ چکے تھے کھڑا ہوا میں شاہزادے کی بلند برابرام تقریریں رہا تھا اور میرے اندر ایک خفیف سراسیمگی پیدا تھی۔ اس وقت قیصر اپنا مکلّف ترین ملبوس پہنے ہوتے تھا۔ مشہور پر دار خود اس کے زیب سر تھا۔ اور چاروں طرف وزراء داعیانِ حکومت جمع تھے۔ جن کی زرق برق فوجی پوشش نگاہوں کو خیرہ کئے دیتے تھی۔ غالباً اس منظر سے مشرقی دل و دماغ کو مرعوب کر دینا منظور ہوگا۔ میں نے بھی دل میں اس تماشہ کی تعریف کی۔ لیکن افسوس یہ رہا کہ ساری نمود و نمائش ایک گمنام خدمتگار پر ضائع ہو رہی تھی۔ اصلی شاہزادہ اگر موجود ہوتا تو شاید کوئی مفید سبق لے کر جاتا اور واپسی پر فرمانروائے چین کو اپنے نیک مشورے مستفید کر سکتا۔ اس جلسہ کے بعد شام کو شاہزادہ ایک دعوت میں مجبوراً شریک کیا گیا۔ جو قیام صلح کی خوشی میں ترتیب دی گئی تھی۔ میری حیثیت نہ تو ایسی تھی کہ مدعو کیا جاتا نہ کوئی معمولی خدمتگار تھا۔ کہ ساتھ جا سکتا۔ چنانچہ اس ضیافت میں شرکت نہ ہو سکی۔ مجھے آج تک نہ معلوم ہوا کہ وہاں کیا واقعہ پیش آیا۔ جس نے قیصر کے

دل میں شبہات پیدا کر دیتے۔ خود وہ بدنصیب حجام کچھ نہ بتا سکا لیکن رات کافی گذر چکی تھی کہ مجھے اپنے پیرس کے دفتر سے ایک برقی پیغام اس مضمون کا ملا۔

"قیصر ولیم کا تار موصول ہوا ہے۔ آپ کو فوراً برلن طلب کیا گیا ہے۔ کیا جواب دیا جاتے؟"

یہ پیغام پاکر میرے دماغ میں اک روشنی سی پیدا ہوگئی اوّل دن سے میرے دل میں اک وسوسہ جاگزیں تھا جس کو میں دور کرنا چاہا۔ مگر نہ ہوا۔ یعنی اتنی کثیر اجرت اور اتنقدر فضول خدمت پر مجھے مامور کرنے سے ملکہ دواگر کا کیا فایدہ تھا۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ یہ عقدہ حل ہوگیا۔ یقینی اس غیر معمولی عورت نے اپنے یوروپین جاسوسوں سے اس راز کی نسبت مشورہ لیا تھا۔ اور ان لوگوں نے اسکو مطلع کر دیا ہوگا۔ کہ میں قیصر کا محبوب جاسوس تھا۔ اگر اس کو ذرا سا شبہ بھی پیدا ہوگیا۔ تو مجھے ضرور بلایا جائیگا چنانچہ ملکہ نے پہلے ہی اپنی جانب سے میری خدمات حاصل کر لی تھیں۔ اس وقت میرے سامنے بڑا نازک سوال تھا یعنی میں مجبور تھا کہ ملکہ دواگر کا وفادار رہوں۔ اور ایک قدیم مربی کو فریب دوں۔

آخر کرنا کیا تھا؛ میں صاف انکار کر دیتا یا جواب نہ دیتا۔ تو ولیم کسی دوسرے مخبر سے رجوع کرتا جس سے بازی لے جانا ممکن سے مشکل ہو جاتا۔ برخلاف اس کے اگر میں ایسی خدمت قبول کر لیتا جس کو وفادارانہ انجام نہ دے سکتا تھا۔ تو میری زندگی کا ایک دوامی اصول شکست ہوا جاتا تھا۔ عقل اور شرافت کا صرف ایک راستہ مجھے نظر آتا تھا۔ اور اسی پر میں نے فیصلہ کر لیا۔ میں اسی صورت سے فوراً ایوان شاہی میں پہنچا پرائیویٹ سکرٹری سے ملا۔ اور اپنی درخواست پیش کی۔

"ناممکن، تم کون ہو؟ قیصر آرام میں ہے" یہ الفاظ تھے، جو اس کی زبان سے نکلے۔

میں نے کہا۔ "جاؤ قیصر کو اطلاع کر دو۔ کہ جس شخص کو بلانے کے لئے ابھی پیرس کو پیغام بھیجا گیا تھا۔ وہ حاضر ہے۔"

سکرٹری نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ اور چلا گیا ایک لمحہ کے اندر وہ واپس آیا۔ تاکہ مجھے فوراً قیصر کے سامنے حاضر کر دے۔ قیصر اس وقت بالکل تنہا تھا۔ اس نے دیکھتے ہی پوچھا۔

"مسٹر وی! کیا درحقیقت اس بھیس میں تم ہو؟"

میں نے کہا۔ "میری صورت سے زیادہ آپ میری آواز کو پہچانتے ہونگے۔"

"بیٹھ جاؤ۔ مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ اک نہایت اہم معاملہ میں تم سے مشورہ لینا ہے۔"

میں نے ہاتھ بڑھا کر سلام کرنا چاہا۔ یہ پہلا اتفاق تھا

کر میں نے کسی تاجدار کا قطع کلام کیا۔

"حضور عالی! میرا قصور معاف ہو۔ میں ہزار بار معافی چاہتا ہوں۔ پہلے مجھے عرض کرنے کی اجازت دیجئے۔"

ولیم نے ترش رو ہو کر کہا۔ "اس کے کیا معنی؟"

"سرکار عالی! اس کے یہ معنی ہیں کہ اس جان نثار نے جو وفادارانہ خدمات انجام دی ہیں۔ اُن کے صلہ میں صرف ایک عنایت کا خواستگار ہے۔ جس کے بغیر اس کی رُوح اذیت کی نیش زنی سے نجات نہیں پا سکتی۔"

"اچھا کہو" قیصر کا لہجہ اب بھی غضبناک تھا لیکن اُس کی نگاہ میں ملاطفت کا اک پرتو نظر آیا۔

میں نے کہا۔ "جس معاملہ میں حضور عالی کو میری امداد درکار ہے مجھے اس کا علم ہے۔"

"تمہیں علم ہے" قریب تھا کہ حیرت اُسکی قوتِ فکر زائل کر دے۔

میں نے جواب دیا۔ "میرا پیشہ ہی یہ ہے کہ واقعات سے آگاہ رہوں۔ چنانچہ یہ معاملہ بھی مجھ کو معلوم ہے مجھ کو یہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے۔ کہ ایسی تفتیش سے جس کا کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا آپ کو حاصل کیا ہوگا؟ نتیجہ خیز نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ آپ کے پاس ان شبہات کی تصدیق کا ذریعہ کوئی نہیں۔ بالفرض آپ کامیاب ہو بھی جائیں تو اُس آگاہی سے فایدہ نہیں اُٹھایا جا سکتا دُنیا کو بتا دینا کہ آپ کے ساتھ عیاری کی گئی۔ کوئی پسندیدہ خیال نہیں۔ غالباً آپ بھی اس اعتراف کو گوارا نہیں کر سکتے پھر خیال فرمایئے۔ بازاری بذلہ سنج اس انکشاف سے کیا کیا لطف اُٹھائیں گے۔ اور کارن ڈی ایک کا جادو نگار قلم کیسی کیسی گوہر فشانیاں کریگا۔"

میں نے دیکھا کہ ولیم کے جسم کو ایک مضطربانہ حرکت ہوئی اور میں سمجھا کہ اب کامیابی یقینی ہے۔ میں نے دوبارہ تقریر شروع کی۔ "اب دوسرا رُخ ملاحظہ فرمایئے۔ فرض کیجئے آپ کے شبہات بے بنیاد ثابت ہوتے۔ اس صورت میں آپ کو اُن تمام خطرات کا سامنا کرنا ہوگا۔ جو اُلٹ سرنگوں دشمن کے اشتعال یا کسی عاجز حریف کی تذلیل سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کی شہرت مجروح ہو جائیگی۔ تدارک کا وقت گذر چکے گا۔ اور پیرس کے قہقہہ باز ایسے پُرلطف موقعہ سے ضرور فایدہ اُٹھائینگے۔"

قیصر نے تیوری پر بل ڈال لئے۔ اور اپنی مونچھ کھینچنے لگا۔ ظاہر تھا میری بات مان لینے کے لئے وہ کوئی بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

"آپ غور تو فرمایئے۔ جو امر آپ کے لئے محض ایک سیاسی مسئلہ ہے۔ وہ اُس مجبور عورت کے لئے جس کا غرور آج خاک میں ملا ہے۔ اک مذہبی سوال ہے۔ آپ کا مدعا پورا ہو گیا۔ اور چین کا دروماں سلطانی "ہوہن زلرن"

کے سامنے ذلیل ہو چکا۔ ممکن ہے مذہبی خیال سے یہ سیاسی فعل کسی قائم مقام کے ذریعہ سے انجام دیا گیا ہو مگر اس کا علم مخصوص افراد کے سوا کسی کو نہیں ہو سکتا اور یہ لوگ افشائے راز کی جرأت کر نہیں سکتے۔ کیونکہ خود انکی اغراض اس سے متعلق ہیں۔"

اب تو قیصر اس معاملہ کو دبا دینے کا اتنا ہی آرزومند تھا۔ جیسا پہلے وہ اس کی تحقیق کا مشتاق تھا

"اگر میں تمہاری صلاح مان لوں۔ اور یہ شبہ دل سے نکال دوں۔ تو اس کے معاوضہ میں تم مجھے دو باتیں بتا دو گے"

"حضور فرمائیں مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے"

"اچھا تو یہ بتاؤ کہ تم برلن میں کیوں موجود ہو اور تمہیں اس معاملہ کی نسبت اس قدر واقفیت کیوں ہے؟"

"میں یہاں شاہزادہ عالی کے ہمراہیوں میں شامل ہوں۔ اور ملکۂ چین کی طرف سے خفیہ خدمت پر مامور ہوں"

اس پر قیصر نے مجھے غور سے دیکھا اور ہونٹ چبانے لگا۔ مگر تبسم نہ رک سکا۔

"مسٹر وی۔ اتم عجیب ہستی ہو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں گرفتار کر لوں یا چھوڑ دوں۔ خیر میں تم کو آزادی دیتا ہوں۔ مگر یہ بتا دو کہ شہزادہ واقعی کون ہے۔"

"حضور یہ تو واقعی شاہ مانچ کا بھائی ہے"

ولیم میری طرف بڑھا اور میرا شانہ پکڑ کے کمرہ سے باہر دھکیل دیا۔ (ترجمہ) سبطین احمد

کلام شاد

جواب کے بھر کے کوئی جام ساقیا دینا
نظر گذر کی خدا کے لئے گرا دینا

غضب ہے میرے دم قتل غیر سے ان کا
اشارہ یہ کہ مری آستیں چڑھا دینا

بہار شبنم و گل تیرے اختیار میں ہے
کہیں کسی کو ہنسانا کہیں رلا دینا

اندھیری رات ہے ٹھوکر لگے نہ رہرو کو
کوئی چراغ مری قبر پر جلا دینا

ہمارے واسطے میخانہ بند ہے تو کیا
ہمارا کام ہے ساقی تجھے دعا دینا

جو نامہ بر یہی منظور ہے تو بسم اللہ
کسی جگہ مرا خط راہ میں گرا دینا

شاد

وصال جاوید

(۱)
پہلا باب

گاڑی پر سوار ہونے سے پہلے حمیدہ اسقدر مضمحل نہ تھی۔ مگر گاڑی کے چھوٹتے ہی نہایت حسرت بھری نظروں سے اُس نے پلیٹ فارم کی ہر سامنے آنے والی چیز کو دیکھا۔ اس کا ننھا اور نازک دل سرعت کے ساتھ اُسکے پہلو میں دھڑکنے لگا۔ اس کا چہرہ زرد تھا۔ لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی۔ اور آنکھیں باوجود کھلے ہونے کے کسی چیز کو خاص طور پر نہیں دیکھ رہی تھیں۔ محمود حمیدہ کی اس حالت کو دیکھتا تھا۔ محسوس کرتا تھا۔ اور مضطرب تھا۔ کبھی ریل کی رفتار کبھی گرد و نواح کا سبزہ۔ کبھی کھیتوں میں بھاگتے ہوئے جانور اور کبھی تار پر بیٹھی ہوئی چڑیاں۔ ان سب کی طرف محمود نے حمیدہ کو مخاطب کرنا چاہا۔ مگر حمیدہ خاموش تھی۔ اور خاموش کیوں نہ ہوتی! سولہ برس کا سن۔ پہلے پہل کا سفر۔ والدین کی مفارقت۔ نئی زندگی کا احساس اور مستقبل کے میدان میں ناتجربہ کار دماغ کی بنائی ہوئی تفکر آمیز تصویریں!!

بیشک عزیز و اقارب کے خیال پر۔ بدنامی و رسوائی کے اندیشہ پر اور تعلقات نو کے خوف پر محمود کی محبت اس درجہ غالب آگئی تھی۔ کہ شریف الطبع اور غیور مزاج حمیدہ اپنے گھر اور وطن کو خیرباد کہکر پوشیدگی کے ساتھ نکل کھڑی ہوئی۔ لیکن باوجود محمود کی ہمت، فراخی، قول و قسم اور محبت سے پیدا ہونے والی امید کے جب اُسے اُس چہار دیواری کا خیال آتا جس کے اطراف عافیت میں اس نے سولہ برس گذارے تھے۔ تو اس کا دل دھک سے ہوگیا۔

آخر محمود نے حمیدہ کے خیالات پریشاں دُور کرنے کے لئے سلسلۂ گفتگو چھیڑا۔

محمود۔ اگر خدا کو منظور ہے تو تھوڑی دیر میں ہم لکھنؤ پہنچ جائیں گے۔

حمیدہ۔ لیکن وہاں پہنچکر تم کرو گے کیا؟

محمود۔ مَیں تم سے کہہ چکا ہوں کہ میرا ارادہ تجارت کرنے کا ہے۔

"لکھنؤ بڑا شہر ہے۔ دیکھئے تمہارا کاروبار کب تک سرسبز ہو" (حمیدہ نے کسی قدر لاپروائی سے کہا)

محمود۔ اگر خدا کو منظور ہے تو وہ دن بہت قریب ہے جب فارغ البالی کے ساتھ ہم تم مسرت کی زندگی بسر کرینگے۔

حمیدہ۔ مجھ کو صرف یہی تامل تھا کہ وہ ذرائع اختیار کئے جائیں۔ کہ ہم جائز طریقہ سے مل سکیں۔ اسلامی حدود کے باہر قدم رکھنا میرے لئے قطعاً غیر ممکن ہے۔

محمود۔ میں تم کو اپنے الفاظ دے چکا۔ اگر دنیا میں کسی ذات سے جائز رشتۂ تعلق جوڑونگا تو وہ تمہاری اور صرف تمہاری ہی ذات۔ . . "

محمود ابھی اس فقرہ کو ختم بھی نہ کرنے پایا تھا۔ کہ ایک غیر معمولی جھٹکا لگا۔ وہ حمیدہ کو گرنے سے روکنا چاہتا تھا۔ مگر کہاں۔ جھٹکے ایک دوسرے کے بعد نہایت شدت کے ساتھ محسوس ہونے لگے۔ بنچوں پر بیٹھے ہوئے مسافر کبھی آپس میں اور کبھی کمپارٹمنٹ کی کھڑکیوں سے ٹکرائے چیخوں کی آواز نے شور محشر بپا کر دیا۔ اور یہ سماں اس وقت تک برابر جاری رہا۔ جب تک کہ انجن۔ آگ اور پانی کھانے والے بیناسے۔ اپنی ٹکڑوں سے چور چور ہو کر گر نہ گئے۔ ایسے خوفناک حادثوں کو یزدانی غیض وغضب کے نمونہ سے تعبیر کرنا شاید بیجا نہ ہو۔ تھوڑے ہی عرصہ میں کچھ پولیس اور سیوا سمتی کے لوگ وہاں آن پہنچے۔ اور مسافروں کی دیکھ بھال میں مصروف ہوئے۔ بہت سے نیم جان بھی زندہ درگور کے مصداق دفن کر دیئے گئے۔ پیچھے کی چند گاڑیاں محفوظ رہ گئی تھیں۔ ان گاڑیوں کے مسافر بھی اُتر آئے تھے۔ اور امداد میں مصروف تھے۔ ایک پرانی وضع کا سن رسیدہ شخص جو پیچھے کے سکنڈ کلاس میں سوار ہونے کی بدولت اس قہر یزدانی اور بلائے ناگہانی سے بال بال بچ گیا تھا۔ گھومتا پھرتا حمیدہ کے قریب پہنچا۔ حمیدہ خاموش تھی۔ آنکھیں بند تھیں اور چہرہ پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اس بندۂ خدا کو مجروح حمیدہ کی حالت پر رحم آیا اور یہ اس کو اپنے درجہ میں اُٹھوا لے گئے۔ اور اس کوشش میں مشغول ہوئے۔ کہ حمیدہ غش سے آنکھیں کھول دے محمود نے بُری طرح چوٹ کھائی تھی۔ ظن غالب یہ تھا کہ شاید یہ بھی دوسرے زخمی مسافروں کی طرح مرنے پر مجبور کر دیا جائے۔ مگر نہ معلوم کس وجہ سے اور کیوں . . . . اس کو ان مسافروں کے ہمراہ جن کے زندگی کے اسباب زیادہ نمایاں معلوم ہوتے۔ لکھنؤ کے سرکاری ہسپتال میں بھیج دیا گیا۔

قریب قریب دو گھنٹوں کے بعد دوسرا انجن وہاں لایا گیا۔ بچی بچائی گاڑیاں اور رہے سہے مسافر راستے بریلی واپس کر دیئے گئے۔

دوسرا باب (۲)

راستے بریلی کے اسٹیشن پر پہنچنے تک حمیدہ کو غش سے

افاقہ ہو چکا تھا۔ آنکھ کھولتے ہی جو پہلا خیال اس کے دماغ میں تھا۔ وہ محمود اور سکی قسمت کا خیال تھا۔ اسنے اپنے محسن سے دوسرے مسافروں کا حال دریافت کیا۔ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے اس سن رسیدہ شخص نے حمیدہ سے اُس کا نام اور پتہ پوچھا۔ شرم دامنگیر ہوئی۔ اور حمیدہ نے باوجود متعدد سوالات کے اس کے سوا اور کچھ نہ بتلایا۔ کہ وہ اپنے چچا زاد بھائی کے ہمراہ لکھنؤ آ رہی تھی۔ دفعتاً گاڑی لڑ گئی اور تب سے وہ اس سے بے خبر ہے۔

یہ مرد خدا ترس۔ اسمٰعیل بھائی۔ کلکتہ کا ایک مالدار تاجر تھا۔ اس کے نہ کوئی آل تھی نہ اولاد۔ فطرتاً یہ اپنے آپ کو حمیدہ کا ہمدرد پاتا تھا۔ اور اس کی دلی خواہش جس کی وجہ شاید یہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔ یہ تھی کہ حمیدہ اس سے جدا نہ ہو۔ اور اسی کے گھر رہے۔ حمیدہ کی مایوسی محتاج بیان نہیں جس کی خاطر اُس نے گھر بار بھائی بہن۔ دھن دولت سب کچھ تج دیا۔ آج وہ اس کے ملنے سے قطعاً مایوس تھی حمیدہ کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ دُنیا اس کی نظروں میں اندھیر تھی۔ حمیدہ کی اس حالت یاس کو دیکھ کر اسمٰعیل بھائی کا دل بھر آیا۔ اور سچے دل اور پدری شفقت سے اسمٰعیل بھائی نے حمیدہ کو تشفی دیتے ہوئے کہا " بیٹی! ملول نہ ہو۔ آج سے تو میری بیٹی ہے۔ اور میں تیرا باپ "

شام ہوئی اسمٰعیل بھائی نے اپنا کلکتہ چلنے کا ارادہ حمیدہ پر ظاہر کیا۔ اور کہا کہ آج شب کو ہم مغلسرا سے ہو کر روانہ ہونگے۔ حمیدہ عجیب کشش و پنج میں تھی کہ اب کیا کروں۔ حمیدہ عورت تھی۔ اور ایک پردہ دار عورت محمود کا ملنا غیر ممکن تھا۔ گھر واپس جاتے۔ تو کس منہ سے اور کس امید پر۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ آخر کلکتہ چلنے پر رضامند ہو گئی۔

تیسرا باب (۳)

محمود نے آنکھ کھولی۔ تو اپنے کو ہسپتال کے ایک کمرہ میں چارپائی پر پایا۔ جسم میں کئی جگہ زخموں کی وجہ سے تکلیف محسوس کی۔ حمیدہ کی خیالی تصویر آنکھوں کے سامنے تھی۔ قوت متخیلہ نے رہبری کی۔ اور باوجود اپنی اس نقاہت و ناتوانی کے محمود نے حمیدہ کی تلاش خیالی دُنیا میں شروع کر دی۔ بہت ڈھونڈھا۔ لاکھ غور کیا۔ ہزار کوشش کی۔ مگر سوائے اس فہرست کے جس پر اُس سانحہ کے پسماندگان کے نام درج تھے کہیں خیال نہ جما۔ فہرست پر تصور کے بعد تھوڑی دیر کے لئے پژمردہ چہرہ پر آثار مسرت نمایاں ہوئے۔ مگر یہ خیال تھا۔ اور صرف خیال جس کا دوسرا رُخ نہایت ہولناک تھا۔ اگر حمیدہ زندہ ہے۔ تو کہاں ہے۔ اور کس حال میں ہے۔ وہ دُنیا کے ان اصناف نازک میں ہے۔ جو کھلے الفاظ میں اپنا حال بھی دوسروں سے نہیں

کہہ سکتے۔ "بے بسی اور پھر ایسی بے بسی" دو روز تک محمود اس قابل بھی نہ ہو سکا۔ کہ کہیں آ جا سکتا۔ تصویر یار سامنے ہوتی اور یہ اُس سے تصوّر میں باتیں کرتا۔ اور نہ معلوم کس خیال پر کبھی کبھی دست حسرت ملتا ہوا کروٹ لے لیتا۔

تیسرے دن صبح کو وہ لکھنؤ کے اسٹیشن ماسٹر کے کمرہ میں اُس سانحہ کے پسماندگان کی فہرست دیکھ رہا تھا۔ محمود کو یقین تھا۔ اور یقین کامل کہ اس فہرست میں حمیدہ کا نام وہ پا دیکھتا ہے۔ اس کی بے چینی اور نظر کی تیزی کا وہی حضرات خوب اندازہ کر سکتے ہیں۔ جنہوں نے کبھی اپنے امتحانات کے نتیجہ گزٹ میں یا کسی جنگ کے مقتولین کی فہرست پر اپنے قریبی اعزا کی نام کی تلاش کی ہے چشم زدن میں از ابتدا تا انتہا فہرست دیکھ گیا۔ "خدا کسی کو مایوس نہ کرے" حمید کا نام نہ ملا۔ وحشت بڑھنا شروع ہوئی۔ "بھول چوک فطرت انسانی میں ہے" دوبارہ پھر نظر ڈالی۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر فہرست دیکھی۔ مگر حمیدہ کا نام نہ ملنا تھا نہ ملا۔ ابھی تیسری بار فہرست پر نظر نہ ڈالنے پایا تھا کہ آنکھوں کے تلے اندھیرا آیا۔ سر چکرایا۔ دل کی دھڑکن بڑھی اور یہ زمین پر دھم سے گر پڑا۔

جسقدر دن ڈھلتا اسی قدر محمود کی ناامیدی بڑھتی جاتی۔ تمام دن سر مارا۔ مگر کہیں پتہ نہ چلا۔ وہ محبوب جس کے لئے دُنیا کے مصائب گوارا کئے۔ جس کے لئے والدین اور گھر بار سب سے ہاتھ دھویا۔ جس کے لئے بدنامی و رسوائی کو فخر و مباہات سمجھا۔ اس سے وہ محروم اور اپنے خیال و گمان میں ہمیشہ کے لئے محروم کر دیا گیا۔

ابھی شام نہیں ہوئی تھی کہ محمود کا دوست حبیب (جس کے پاس ٹھیرنے کے لئے یہ مکان سے چلا تھا) ان کو ملا۔ "پریشان صورت۔ پژمردہ خاطر۔ گردن جھکائے۔ محمود سڑک کے کنارے کھڑا کچھ سوچ رہا تھا حبیب اس کو دیکھ کر ٹھٹکا اور دوسری بار نظر ڈالتے ہی پہچان گیا۔

"ہائیں! تم کہاں!! خیر تو ہے!!!" اس آواز نے محمود کی نظریں اُٹھوا دیں۔ حبیب کو دیکھ کر اس کا غم اور بڑھا اور اس نے پھر سر جھکا لیا۔ حبیب کے مصر ہونے پر اُس نے اتنا کہا۔ کہ بھائی خدا کے لئے مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ حبیب محمود کو کیونکر چھوڑ دیتا اور پھر اس عالم کس مپرسی میں۔

امتداد زمانہ نے محمود کے زخم دل پر مرہم رکھا۔ اور محمود کی بے چینی کسی قدر کم ہوئی۔ بیشک محمود پریشان تھا۔ اور غایت درجہ پریشان۔ غربت میں تھا اور بیکسی میں مگر حیا اور شرم اس کے دمساز تھے۔ حبیب حد درجہ اس کی دلچسپی اور دلجوئی کی کوشش کرتا تھا۔ مگر دو چار ہی روز میں محمود کے خیالات بدلے اور اس نے سوچا کہ پرائے گھر

رہنا ہرگز مناسب نہیں۔ گھر واپس جانا غیر ممکن۔ کسی عزیز کا احسان لینا دوست کے احسان سے بدتر۔ حمیدہ کا غم ہی اس کو کیا کم تھا۔ آج سے فکر بھی ہوگئی۔ انٹرنس پاس تو تھا ہی حبیب کی تھوڑی سی کوشش پر کچھ دن بعد ایک عینک ساز کمپنی کا ایجنٹ ہوگیا۔ ایک سال تک اس نے لکھنؤ میں زندگی بسر کی جسقدر زمانہ گذرا اس کی حالت رو بصحت ہوتی گئی۔ مگر ہر صبح اس کو حمیدہ یاد آتی۔ اور یہ اپنی قسمت کو آٹھ آٹھ آنسو روتا۔ دوسرے سال اُسی تاجر کو مال فراہم اور روانہ کرنے کے لئے یہ کلکتہ روانہ ہوگیا۔ اسی سلسلہ میں اسمٰعیل بھائی کے یہاں بھی اس کا جانا ہُوا۔ چونکہ اسمٰعیل بھائی ایک بڑا سوداگر تھا۔ اور اس کو مال وہاں مقابلتاً سستا اور اچھا ملتا۔ یہ زیادہ تر وہیں سے مال خریدا کرتا۔ اسی لین دین کی بدولت اسمٰعیل بھائی سے اس کا ربط ضبط بڑھ گیا۔

کلکتہ کے بازار سے واقف ہوکر محمود کے دماغ میں نوکری سے تنفر اور اپنا علیحدہ کاروبار شروع کرنے کا خیال پیدا ہُوا۔ اس آرزو کے پورا ہونے کے لئے سرمایہ کی ضرورت سب سے پہلے تھی۔ قسمت نے یاوری کی اور اسمٰعیل بھائی ان کو ایک کافی تعداد روپیہ کی دینے پر رضامند ہوگئے۔ جس سے یہ اپنا کاروبار شروع کردیں۔ روپیہ کی ادائیگی کے لئے معاہدہ ہُوا کہ محمود چھ ماہ بعد ان کی رقم ان کو واپس کردے۔ اس طرح قرض لیکر اُنہوں نے تجارت شروع کی۔ مگر بدقسمتی کی بدولت جس میں ان کا ضرورت سے زیادہ حصّہ تھا۔ انکا کاروبار نہ چلا۔ گھاٹا ہُوا اور یہ اصل سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ مروت کہاں تک۔ آخر اسمٰعیل بھائی نے اپنا روپیہ طلب کیا تو محمود کی جان سوکھ گئی۔

چوتھا باب (۴)

حمیدہ کے لئے آرام چین سب کچھ تھا لیکن اکثر اسے اس کی سہیلیوں اور ہم عمر لڑکیوں نے روتے دیکھا کبھی باتیں کرتے کرتے خاموش ہوجاتی اور کبھی ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگتی۔ گھر سے دوری الگ۔ والدین سے عمر بھر کے لئے قطع تعلق الگ۔ اور محمود کی جوان موت اور اپنی بدقسمتی الگ۔ اسمٰعیل بھائی حمیدہ کی اس حالت کو دیکھ کر متاثر ہوتے۔ اور اکثر و بیشتر سمجھاتے۔ کہ بیٹی رنج و ملال بیکار ہے۔ صبر کرو! خدا جانے تمہاری آئندہ زندگی کیونکر کٹتی۔ شکر کرو اس مسبب الاسباب کا جس نے مجھے تمہارا ہمدرد بنادیا۔ کئی بار اثنائے گفتگو میں اسمٰعیل بھائی نے گول الفاظ میں حمیدہ پر یہ بھی ظاہر

کردیا۔ کہ میں تمہاری شادی کی فکر میں ہوں۔ اور دل میں اکثر غور کیا کرتے کہ حمیدہ کا ناکتخدا رہنا اب اچھا نہیں۔

یہ خبر حمیدہ کے لئے خبر موت سے زیادہ تلخ ہوتی اس کا چہرہ متغیر ہو جاتا۔ ہاتھ پاؤں میں سنسنی شروع ہو جاتی اور وہ دل ہی دل میں نہایت عجز و زاری سے دعا کرتی کہ خدایا اس دن کے لئے تو مجھے زندہ نہ رکھنا۔ اسمٰعیل بھائی اس کو کیا سمجھتے اور کیونکر سمجھتے۔ وہ حمیدہ کی اس خاموشی کو اس تہذیب اور طرز معاشرت پر محمول کرتے جو مشرقی دنیا اور علی الخصوص ہندوستان کی کنواریوں کے لئے ایک لازمی اور یقینی صفت ہے جس قدر زمانہ گذرتا اسمٰعیل بھائی کو اس امر کی فکر بڑھتی جاتی۔ ایک روز اس مسئلہ پر غور کر رہے تھے کہ ان کو فی الفور محمود کا خیال آیا۔ محمود تعلیم یافتہ سعید عقلمند اور خوبصورت نوجوان تھا۔ اور اس کی مجبوری ان کی پیش نظر تھی۔ یہ ایک خیال تھا جو پیدا ہونے کے بعد برابر بڑھتا گیا۔ اسمٰعیل بھائی اپنے اس خیال کے ہر ہر پہلو پر غور کرتے اور اس کو نہایت مناسب اور اس میں کامیابی یقینی پاتے۔

ایک دن محمود کے آنے پر اسمٰعیل بھائی نے کسی حد تک ترشرو ہو کر اپنی رقم طلب کی۔ محمود نے سر جھکا لیا اسمٰعیل بھائی اس وقت اپنے کمرہ میں تنہا تھے۔ فوراً اپنے ارادہ کا اظہار محمود سے کر دیا۔ اور آئندہ دولت کی امید دلائی!

روپیہ کی فراہمی معلوم اور حمیدہ سے ملنا ظاہر رسوائی و ذلت سامنے! دنیا گذشتنی و گذاشتنی ہے۔ مجبور و لاچار قہر درویش بر جان درویش۔ محمود سے ہاں کرتے ہی بن پڑی۔

اسمٰعیل بھائی مکان پر آئے اور سامان عروسی شروع ہوا۔ شدہ شدہ یہ خبر حمیدہ کے کانوں تک پہنچی۔ اس کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والی محلّہ کی لڑکیوں نے آکر اسے مبارکباد دی۔

پانچواں باب (۵)

اسمٰعیل بھائی پرانی وضع کے ایک سن رسیدہ شخص ہونے پر اور چہرہ منقطع ریش سفید ہونے کے باوجود اس شادی کو شرعی شادی نہ بنا سکے۔ سب اہل محلہ اور کلکتہ کے تمام بڑے بڑے سوداگر مدعو تھے۔ وہ لوازمات جو ایسے موقعوں کی دلچسپی اور رونق کی افزونی کے لئے درکار ہوتے ہیں۔ سب کچھ تھے بلکہ کچھ گھر میں حمیدہ کو دلہن بنانے کے سامان ہو رہے تھے۔ شاہانہ جوڑا زیب بدن کرنے سے پہلے اسے دو مرتبہ غش آچکا تھا

جس کی وجہ مہمانوں کی کثرت پیش نظر تبدیلی کا خیال اور اس کی نازک مزاجی سمجھی گئی۔ اس کو غسل دیا جا چکا تھا۔ اور لباسِ عروسی پہنایا گیا۔ دولہن بنا دینے کے بعد تمام دن کی مشغول اور تھکی ہوئی لڑکیاں دم لینے کے لئے اور حمیدہ کے دل سے دن بھر کی زحمتیں بھلا دینے کے لئے اس کو تنہا چھوڑ کر ذرا ادھر اُدھر ہو گئیں حمیدہ اُٹھی اور نظر بچا کر نزدیک ہی کے ایک حجرہ میں گئی۔ اور چشم زدن میں واپس آئی۔ سکون و تسکین اور یکسوئی قلب و دماغ کے نشانات حمیدہ کے چہرہ پر نمایاں تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اُس عمیق دریائے خیال سے جس میں وہ تمام دن غوطہ زن رہی نکلی اور دُرِّ مقصود لیکر نکلی۔ وہ لوگ جنہوں نے اب سے چند منٹ پہلے حمیدہ کو اور حمیدہ کی بجھی بجھی طبیعت کو دیکھا تھا۔ اس کی حالت میں بیّن فرق معلوم کرتے تھے۔ رسم زمانہ کے موافق دو چار لڑکیاں بول اُٹھیں "ماشاء اللہ چہرہ پر کیسا نور ہے"

. . . . . .

کمرے میں داخل ہو کر محمود نے دیوار پر لگی ہوئی تصویریں۔ میزوں پر رکھی ہوئی مختلف خوشنما چیزیں اور الماریوں میں رکھے ہوئے اسلحہ دیکھے۔ محمود ان چیزوں کو دیکھ رہا تھا۔ مگر عجب ادھیڑ بُن میں تھا۔ کبھی چیزوں کو دیکھتے دیکھتے ٹھٹک جاتا۔ اور پھر دیکھنے میں مشغول ہو جاتا۔ محمود نے جو کچھ بھی سوچا ہو فیصلہ یہ تھا کہ وہ اب چارپائی پر تھا اور اُس نے اس خاموش اور مجبور ہستی کے چہرہ سے ریشمی گھونگھٹ ہٹایا۔ گھونگھٹ ہٹا اور با عصمت مگر مغموم آنکھوں سے آنکھیں دوچار ہوتیں نظریں ملتے ہی ادھر محمود اور اُدھر وہ ناقص العقل ہستی دونوں جھجکتے ہوئے اور اپنی نظروں کو غلط اور بالکل غلط ٹھیراتے ہوئے جُدا جُدا ہو گئے۔

محمود کے لئے حمیدہ کا زندہ ہونا اور حمیدہ کے لئے محمود کا عالم وجود میں ہونا یکقلم غیر ممکن اور خیال باطل تھا دوسری بار نہایت تعجب کے ساتھ اور اپنی پہلی نظری غلطی کو صحیح کرنے کے خیال سے ایک نے دوسرے کو بغور دیکھا۔ دونوں پر سکتہ کا عالم طاری تھا۔ اور دونوں تھوڑی دیر کے لئے صورت تصویر تھے۔

کچھ دیر بعد حمیدہ کی زبان سے انتہائی تعجب کے ساتھ یہ الفاظ نکلے

" . . . . . . کیا . . . . . . تم . . . "

قریب قریب حمیدہ کے ساتھ محمود بھی بول اُٹھا

" کیا میں . . . . پیاری حمیدہ . . . . کو دیکھتا ہوں "

نظر کے علاوہ اب قوتِ سامعہ نے بھی دونوں کا غو

[redacted]

کو ایک دوسرے کی شناخت کرنے میں مدد دی۔ معلوم ہو گیا کہ یقیناً محمود اور حمیدہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔

اس علم کے بعد محمود کا انتہائے شوق میں پلنگ پر بیٹھ جانا اور حمیدہ کا ہمہ تن تصویر بن کر اٹھ بیٹھنا ایک لازمی نتیجہ تھا۔ اور نہایت مختصر الفاظ میں اپنی اپنی بیتی دُھرا جانا قطعاً تقاضائے فطرت تھا۔ محمود کے اس اظہار پر کہ آخر جامع المتفرقین نے دو جُدا ہو جانے والے محبّت سے چور دلوں کو پھر مسرت آمیز زندگی کے لئے یکجا کر دیا۔ حمیدہ کے چہرہ پر مایوسی اور حسرت کا نمایاں ہونا ایک غیر معمولی بات تھی۔ اس بیجا حسرت کو محمود کی نگاہ کیونکر نہ تاڑتی۔ اور اس کا قلب کیوں نہ بیچین ہوتا۔

"پیاری حمیدہ کیا ہم دونوں کا بالآخر ہمیشہ کیلئے جائز طور پر مل جانا ہماری تکالیف اور مصائب کا بیش بہا معاوضہ نہیں۔"

حمیدہ نے اس سوال کا جواب محض ایک ٹھنڈی سانس اور جھک جانے والی نظروں میں دیا۔ حمیدہ کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

محمود گھبرا کر بولا۔ "پیاری حمیدہ اس غم کی وجہ"

حمیدہ (بھرائی ہوئی آواز میں) کُلّ من علیھا فان۔

محمود۔ "بیشک دُنیا اور اس کی ہر ایک چیز فنا پذیر ہے۔ مگر وہ مسرتِ حقیقی جو ہم دونوں کو اس وقت حاصل ہے اس لائق نہیں کہ ایک نہ ایک دن آنیوالی موت کے خیال پر اس کا اظہار نہ کیا جائے۔ زندگی کتنی ہی محدود سہی۔ لیکن ہم دونوں کی یکجائی میں اس کا ایک ایک لمحہ جاودانی ہے۔"

حمیدہ (اسی حسرت آمیز لہجہ میں) "جاودانی نہیں فانی ہے۔ محمود مجھے تمہاری زندگی کا خیال مارے ڈالتا ہے"

محمود (متعجب ہو کر) "اس سے تمہارا کیا مطلب ہے میں مطلق نہیں سمجھا۔"

حمیدہ۔ "یہی کہ اب تم میری جُدائی پر اسقدر ہراساں نہ ہو جاؤ کہ کوئی نہ کرنے والی حرکت کر بیٹھو۔"

حمیدہ۔ "اگر وہ ختم ہو جانے کے بجائے تھوڑے ہی عرصہ میں پھر شروع ہونے والی تو!"

محمود (نہایت گھبرا کر) یعنی!"

حمیدہ۔ "یعنی یہ کہ میں اب تھوڑے ہی عرصہ کی مہمان ہوں۔"

محمود (گھبرا کر۔ حمیدہ سے علیحدہ ہوتے ہوئے) خُدا کے لئے بتاؤ تو اس سے تمہارا کیا مطلب ہے۔ پیاری حمیدہ میرا دماغ بیکار ہے۔ میں پریشان ہُوا جاتا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیا کہتی ہو!!

حمیدہ (محمود کے قریب ہو کر اور خود اس کے گلے میں

باہیں ڈال کر) مَیں یہ کہتی ہوں کہ (الفاظ اب اُس کا ساتھ نہ دے سکے)

محمود۔ جان سے زیادہ عزیز حمیدہ خدا کے لئے صاف صاف بتاؤ کیا معاملہ ہے۔

حمیدہ (رُک رُک کر) معاملہ کچھ نہیں!! مشیت ایزدی!! محبّت میں ثابت قدمی!!

محمود۔ "کیا تم نے زہر کھالیا؟"

حمیدہ (رُک رُک کر) کیوں نہ کھا لیتی۔ جب مجھے معلوم ہوتا تھا کہ مَیں محمود کے سوا کسی اور کی شریکِ زندگی بنائی جا رہی ہوں۔ پیارے محمود! حمیدہ بدنصیب سہی۔ عاجز سہی۔ بیکس سہی۔ لیکن شریف ہے۔ غیور ہے۔ راستباز ہے اور محبّت کی آزمائش میں ثابت قدم رہنا اسکا فرض تھا۔

محمود نے چاہا کہ وہ حمیدہ سے علیحدہ ہو جائے۔ لیکن حمیدہ کی باہیں جو اس کی گردن میں حائل تھیں آسانی سے الگ نہ ہو سکیں۔ حمیدہ کے جسم میں ایک تشنج کی سی کیفیت پیدا ہو چکی تھی۔ زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ اور پتلیاں پھری جاتی تھیں۔

نہایت رُک رُک کر ادھورے جملے نیچی آواز میں اس کے مُنہ سے نکلے۔

"محمود رخصت۔ حمیدہ آخری وقت تک تمہاری آغوش میں ثابت قدم رہکر اس دنیا سے ......"

اس کی زبان رُکی۔ گردن کھنچی اور ایک ہچکی آئی۔

محمود گرا چاہتا تھا مگر سنبھلا۔ پلنگ ہاتھ سے بڑھا کر الماری میں نظر آنے والا ریوالور اُس نے اُٹھا لیا۔ جو خوش قسمتی سے اُسے بھرا ملا۔ ریوالور کو داہنے ہاتھ میں لیکر اس نے اپنے اُلٹے ہاتھ سے حمیدہ کے ٹھنڈے ہوتے جانے والے جسم کو اپنی آغوش میں کھینچا اور کہا۔ "پیاری حمیدہ ٹھیرو۔ مَیں تمہیں اکیلا نہیں جانے دُونگا۔"

انگوٹھے نے گھوڑے کو دبایا۔ ایک دنالے کی آواز ہوئی۔ گولی سینہ کے اندر تھی اور حمیدہ اور محمود کی لاشیں ایک دوسرے سے ہم آغوش بستر عروسی پر محو وصال جاودانی تھیں۔

محمد صادق حسین

[redacted]

جذباتِ عزیزؔ

(۱)

میں ہوں اب تصویرِ حیرانِ خیال
سرد ہے وہ محشرستانِ خیال

لٹ گیا عیشِ تصوّر، اب کہاں
دل، کہ تھا اک میر سامانِ خیال

یادِ عیشِ رفتہ ہے وجہِ طرب
خواب ہے اک زیرِ دامانِ خیال

جب وہ آئے سارے منصوبے غلط
جلوہ تھا یا شعلۂ بر جانِ خیال

اعتبارِ ہستیِ موہوم کیا ؟
ذرۂ ریگِ بیابانِ خیال

تاکجا قیدِ طلسمِ این و آن
آگہی اے خامکارانِ خیال

ہیں نظر میں جلوہ ہائے رنگ رنگ
یادِ رخ ہے صد گلستانِ خیال

انتظارِ صبحِ وحدت ہے مجھے
ختم ہو خوابِ پریشانِ خیال

یہ تنزّل ہو جو کہدوں ہوں عزیزؔ
آفتابِ مشرقستانِ خیال

(۲)

دورِ فصلِ گل ہے اور بے بس چمن سے دور ہے
کس مصیبت میں الٰہی بُلبل مجبور ہے

دِل خیالِ روئے روشن سے ہے رشکِ لامکاں
بادۂ رنگیں نمودِ ساغرِ پر نور ہے

جب وہی وہ ہے تو پھر کیا امتیازِ قرب و بعد
پاس کس کے ہے خُدا جانے وہ کس سے دُور ہے

سرکشی پیرِ فلک کی خاک میں مل جائیگی
میری نظروں میں بھی آخر اک بُتِ مغرور ہے

کیوں تصوّر ہے ترا وجہِ سکوں کچھ تو بتا
تو تو آشوبِ جہاں ہے فتنۂ مشہور ہے

یہ تلاشِ جرم کا آخر بہانہ کس لئے
جان لینا ہی اگر اے جانِ جاں منظور ہے

یاد ہے وُہ دن کہ اُٹھی تھی نقابِ روئے حسن
حیرتِ بے حد سے ابتک شش جہت معمور ہے

محشرِ "انی انا" اور نذرِ حیرانی عزیزؔ
ذرّہ ذرّہ کائناتِ دل کا رشکِ طور ہے

غم نصیب

مصنفہ گوئٹے ——— مترجمہ محمد ہادی حسین

حصہ دوم

۲۰۔ اکتوبر

کل ہم اس جگہ پہنچے اور کچھ مدت تک یہیں قیام کرینگے۔ کیونکہ سفیر صاحب کی طبیعت علیل ہے۔ اور وہ ہنوز اجرائے سفر کا ارادہ نہیں رکھتے۔ ان کے مزاج میں تند خوئی اور ترش روئی کا مادہ قدرے کم ہوتا تو میرا اُن کا نباہ کچھ مشکل نہ تھا۔ فی الحال تو میں ایک عذاب میں مبتلا ہوں مجھے صاف نظر آتا ہے۔ کہ ستم ایجاد آسمان نے مجھے اپنی مشق جفا کے لئے مخصوص کر رکھا ہے۔ مگر مجھے ہمت نہ ہارنا چاہیئے۔ بیفکری اور خوشدلی سے انسان کونسی مصیبت نہیں جھیل سکتا؟ بیفکری اور خوشدلی! میں اپنے قلم کو یہ الفاظ لکھتے دیکھ کر ایک اندازِ تمسخر سے مسکراتا ہوں چشم بد دور! میری خوشی کا بھی کوئی ٹھکانا ہے؟ میرے جیسے شادمان وشادکام لوگ دو ایک اور ہوتے، تو پھر دُنیا میں غم کا نام ونشان بھی کاہے کو رہتا! افسوس، کیا مجھے اپنی قابلیتوں اور صلاحیتوں کے باوجود اسی طرح مایوس و محروم رہنا ہے۔ جبکہ میری آنکھوں کے سامنے ایسے ایسے لوگ جن سے زیادہ اہلیت میں اپنے آپ میں پاتا ہوں محض اعتماد نفس کی بدولت میدانِ ترقی میں بڑھے چلے جاتے ہیں؟ پروردگارِ رحیم، تو جو سب کا سرچشمۂ فیضان ہے، تو نے جہاں مجھے اتنی برکتیں اور نعمتیں عطا کیں، وہاں ایک خود اعتمادی بھی دیدی ہوتی تو تیرے بھرے خزانوں میں کیا کمی ہوجاتی؟ خیر، جو مرضئ مولا۔ بندے کو ہر حال میں صبر کرنا چاہیئے اور اجرِ جمیل کا منتظر رہنا چاہیئے۔

ہاں اے میرے دوست، تم سچ کہتے تھے انسان جبتک دُنیا کو چل پھر کر نہ دیکھے اُسے اپنے حال پر قناعت نہیں ہوسکتی۔ میرا بھی یہی عالم تھا۔ لیکن اب چونکہ میں نے ہر طرح کے لوگوں کے ساتھ رہ سہ کر انہیں اچھی طرح دیکھ بھال لیا ہے۔ اس لئے میں پہلے کی طرح بیقرار نہیں بلکہ مطمئن ہوں۔ اور اپنے حال میں مست ہماری فطرت کا خاصہ ہے کہ ہم بلاضرورت دوسروں کے ساتھ اپنی حالت

کا موازنہ اور مقابلہ کرتے رہتے ہیں۔ اور ہماری خوشی یا ناخوشی کا دارومدار بہت حد تک ہمارے ماحول پر ہوتا ہے۔ اس بنا پر گوشہ نشینی سے زیادہ خطرناک کوئی شے نہیں ہو سکتی۔ تنہائی میں ہمارا تخیّل، جو فطرتاً آوارہ مزاج ہے اور وہم و تصوّر کے پر لگا کر ہر وقت فلک الافلاک سے پہلو مارتا رہتا ہے۔ ایسی فرضی ہستیاں ہمارے سامنے پیش کرتا ہے جن کے مقابلے میں ہم اپنے آپ کو بالکل ناکارہ اور ہیچ میرز محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ہر چیز اپنی اصلیت اور ماہیت پر فرضی عظمت کا ایک طرّہ مستزاد اضافہ کر کے ہمارے سامنے آتی ہے اور ہم مرعوب ہو جاتے ہیں۔ نفسِ انسانی کا یہ عمل بالکل مطابقِ قدرت ہے۔ یہ قاعدے کی بات ہے کہ ہماری عادتیں طبیعت میں جڑ پکڑ کر فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہیں۔ اس لئے جب ہم لگاتار اپنی خامیاں محسوس کرتے رہتے ہیں اور یہ سمجھتے رہتے ہیں۔ کہ دوسروں میں اُن خوبیوں کے علاوہ جو ہم میں ہیں وہ وہ محاسن و مناقب ہیں جو ہمیں خواب میں بھی نہیں نصیب ہو سکتے۔ تو اس مسلسل عمل کے زیرِ اثر غیر محسوس طور پر ایک کامل اور شاندار انسان کا نقش ہمارے دل میں بیٹھ جاتا ہے۔ حالانکہ ایسے انسان کی مثالیں واقعات نہیں پیش کر سکتے۔

بفرضِ محال اگر ایسے انسان کا وجود دُنیا میں ہو سکتا ہے تو ہم بھی تو ایسے بن سکتے ہیں۔ یہ اتفاقی ہوتی بات ہے کہ جب ہمارا طبعی میلان ارتقا۔ ہماری کمزوریوں اور ناکامیوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتا ہے اور ہم محنت و مشقت سے سرگرمِ پیکار ہو جاتے ہیں تو اس کا نتیجہ اکثر و بیشتر یہی ہوتا ہے کہ ہمیں چاہے کتنی ہی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑے ہم پھر بھی اُن لوگوں پر سبقت لے جاتے ہیں۔ جنہوں نے اپنی کشتی محض بادِ موافق اور مساعدتِ تقدیر پر ڈال دی ہو۔ اور سچ پوچھو تو اس سے زیادہ خوشی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم اپنے مدِّمقابل پر غلبہ پائیں۔ اس خوشی کے حصول کے لئے ہم کیا کچھ نہیں کرتے؟

۲۶۔ نومبر

اتنی دیر تک یہاں رہتے رہتے اب میرا جی بہل گیا ہے۔ وہ اگلی سی وحشت اور اجنبیّت نہیں رہی اور مجھے غم غلط کرنے کا کوئی نہ کوئی سامان مل ہی جاتا ہے کثرتِ کار میرے تفکّرات کا مجرب علاج ہے۔ اور یہاں تو یہ حالت ہے کہ سر کھجلانے کی فرصت نہیں ملتی، اس لئے افکار و آلام سے بچا رہتا ہوں۔ اس کے علاوہ مختلف لوگ جن سے گاہ بگاہ ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ میرے لئے دل بہلاؤ کے مختلف مشاغل بہم پہنچاتے ہیں چنانچہ انہی لوگوں میں سے ایک کلونرٹ ص صاحب ہیں جن کی وقعت میرے دل میں روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔

میں اُن کی ذکاوتِ فہم اور بیدار مغزی کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور اس سے زیادہ قابلِ تحسین اُن کی یہ صفت ہے کہ اگرچہ خدا نے انہیں ان اعلیٰ اوصاف سے متصف کیا ہے۔ وہ کسی سے سرد مہری اور نخوت فروشی کا سلوک نہیں کرتے، بلکہ خندہ پیشانی اور گرمجوشی سے پیش آتے ہیں۔ جس کے باعث لوگ بھی اُن کی راہ میں آنکھیں بچھاتے ہیں۔ پہلے پہل دفتر کے کسی معاملے میں مجھ سے اُن سے ملاقات ہوئی۔ اور پہلی ملاقات ہی میں اُن کی عظمت میرے دل میں بیٹھ گئی۔ اُنھوں نے بھی مجھے دیکھتے ہی اپنی پسند کے موافق پایا۔ اور پہلے ہی دن مجھ سے اُس بے تکلفی کے ساتھ گفتگو کرنے لگے۔ جیسے وہ اوروں کے ساتھ بات چیت کرنے میں روا نہیں رکھتے۔ میں اُن کی بندہ نوازی کی پوری تعریف سے کسی طرح عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ میری خوشی ہی اُن کی مہربانیوں کا خاموش شکریہ ہے۔ کسی بڑے آدمی کو اپنے ساتھ ہمدردی کرتے دیکھ کر ہمیں جو خوشی حاصل ہوتی ہے 'دنیا جہان کی تمام خوشیاں اس کے سامنے ہیچ ہیں۔

۲۴۔ دسمبر

آخر وہی ہُوا جس کا مجھے اوّل روز سے ڈر تھا۔ اس سفیر نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ اُس جیسا مین میخ نکالنے والا بیوقوف ساری دُنیا میں کہیں نہ ملیگا۔ وہ ہر کام میں ایک مضحکہ انگیز احتیاط سے پھُونک پھونک کر قدم رکھتا ہے۔ اور کسی مخبوط الحواس بڑھیا کی طرح بات بات میں بال کی کھال اُدھیڑتا ہے۔ اُسے خوش کرنا قطعاً نا ممکن ہے۔ کیونکہ وہ تو کبھی اپنے آپ سے بھی خوش نہیں ہُوا۔ میں یہ چاہتا ہوں۔ کہ کاروبار کو ہنسی خوشی اور باقاعدگی سے انجام دُوں اور جب وہ ختم ہو جائے تو حرفِ غلط کی طرح اُسے لوحِ دل سے مٹا دوں۔ لیکن وہ خدا کا بندہ ہے کہ لاکھ سر کھپاؤں اچھے بھلے لکھے لکھائے کاغذات کو خواہ مخواہ واپس کر دیگا۔ کہ "ٹھیک ہے۔ مگر ذرا نظرِ ثانی کر لو تو بہتر ہوگا۔ کیونکہ انسان کے کاموں کو ہر وقت اصلاح کی حاجت رہتی ہے۔ اور مکرّر دیکھنے سے کوئی نہ کوئی خوبی بڑھ ہی جاتی ہے۔" یہ سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ اور جی چاہتا ہے کہ اس کا سر توڑ ڈالوں۔ کہتا کیا ہے کہ کوئی حرفِ علّت کوئی متعلق فعل چھوٹنے نہ پائے۔ اور فقروں کی اُس تراش خراش سے جس کا مجھے اس قدر شوق ہے۔ اُس کی تو جان جاتی ہے۔ اگر کوئی جملہ دفتر کی ٹکسالی زبان میں نہ بولا جائے تو میرا خیال ہے کہ وہ کبھی اُس کا مفہوم نہ سمجھے۔ ایسے شخص کے پلے پڑنا انتہا سے کمبختی ہے۔

صرف کاؤنٹ س۔ ۔ ۔ ۔ کی دوستی ایک ایسی مرہم ہے جو میرے جلے ہوئے دل کو قدرے تسکین بخشتی ہے

ورنہ ابتک خاتمہ تھا۔کل ہی کی بات ہے کہ اُنھوں نے سفیر کی ان اُلٹی ریتوں کی نسبت بیحد ناراضگی کا اظہار فرمایا اور کہا کہ "ایسے شخص خود اپنی اور غیروں کی ترقی میں سدِراہ ہوتے ہیں۔مگر کیا کیا جائے؟ بندگی اور بیچارگی کے سوا چارہ ہی کیا ہے؟ تمہاری مثال تو عین اُس راہگیر کی ہے جس کی راہ کو ایک دشوار گذار پہاڑ روکے کھڑا ہو اگر پہاڑ نہ ہوتا تو راستہ مختصر اور آسان ہوتا۔لیکن اب چونکہ پہاڑ قضائے مبرم کی طرح وہاں موجود ہے۔اور کسی کے ہٹائے ہٹ نہیں سکتا۔اس لئے بیچارے مسافر کو چاروناچار اُس پر سے گذرنا ہی پڑیگا"

وہ پیرِ فرتوت مجھ پر کاؤنٹ صاحب کی مہربانیاں دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتا ہے۔اور اُن کو میری نظروں سے گرانے کی ہر امکانی کوشش عمل میں لاتا ہے۔میں دلی محبت کے تقاضے سے مجبور ہوکر اُن کی طرفداری کرتا ہوں۔اور وہ دانت پیس کر رہ جاتا ہے۔اس طرح آئے دن میری اُس کی جھپٹ ہوتی ہے۔کل کھلے الفاظ میں اُس نے اُن پر چوٹ کی۔کہنے لگا کہ "کاؤنٹ صاحب جہاندیدہ آدمی ہیں۔اور کاروبار میں مہارت تام رکھتے ہیں۔اُن کا طرزِ تحریر اچھا ہے۔اور وہ آسانی سے لکھ لیتے ہیں مگر جس طرح دوسرے جوہرِ قابل رکھنے والے لوگوں کو بہت وسیع علمیت کی چنداں حاجت نہیں ہوتی۔اسی طرح ان کا بھی تبحرِ علمی کوئی ایسا غیر معمولی نہیں" یہ کہہ کر اس نے اپنی چشمک کا اثر معلوم کرنے کے لئے میری طرف دیکھا۔ مگر یہاں اس کا مطلق اثر نہ ہوا تھا۔میں ایسا بیوقوف نہ تھا کہ ایک ایسے شخص کی مفوات وخرافات کو خاطر میں لاتا۔ تاہم میں نے اُس کا ترکی بہ ترکی جواب دینا مناسب سمجھا اور گرم ہوکر کہا۔"جناب من۔کاؤنٹ صاحب وہ شخص ہیں جن کے دل ودماغ کی قدر نہ کرنا انصاف کا خون ہے میری اتنی عمر ہونے کو آئی ہے۔لیکن میں نے کبھی کوئی ایسا آدمی نہیں دیکھا۔جس کے دماغ میں اس قدر مفید اور وسیع معلومات کا ذخیرہ ہو۔آپ ہی بتائیے۔ہے کوئی ایسا آدمی جس نے اس قدر مختلف ومتفرق علوم پر عبور حاصل کیا ہو اور پھر بھی اُس کا دماغ اس قابل ہو کہ اپنے کاروبار کو اس خوبی سے چلا سکے؟" مگر وہ جہلِ مرکب کا مجسمہ کسی طرح قائل نہ ہوا۔اور میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر رخصت ہونا بہتر سمجھا کہ مبادا اُس کی کوئی نئی حماقت میرے غصے کی آگ کو اور بھی بھڑکا دے۔اور میں آپے سے باہر ہوکر کچھ کر بیٹھوں۔

اور اس فساد کی جڑ تم ہو صرف تم کیونکہ تمہیں نے مجھے سکھا پڑھا کر یہ پھندا گلے میں ڈالنے پر آمادہ کیا تھا۔ تم مجھے اپنی زندگی کو فائدہ بخش بنانے کی تعلیم دیتے تھے۔ اب بتاؤ کیا وہ غریب کسان جو پھل ترکاری وغیرہ کی

کاشت کرتا ہے۔ اور بازار میں جاکر اپنی محنت کا ثمرہ بیچ آتا ہے مجھ سے زیادہ سودمند زندگی نہیں بسر کر رہا؟ اگر میری موجودہ زندگی اُس کسان کی زندگی سے کسی صورت میں بھی زیادہ مفید ہے۔ تو میں تیار ہوں کہ اپنی زندگی کے دن اسی زندانِ مصیبت میں بسر کر دوں، جس میں تم نے مجھے ایک قیدیِ بے زنجیر کی حیثیت سے گرفتار کر دیا ہے۔

مَیں کیا بیان کروں کہ کس عذاب میں مبتلا ہوں۔ مجھے تم نے جیتے جی جہنّم میں ڈال دیا۔ اُف، وہ ظاہرداریاں وہ ملمع سازیاں، وہ جی کو اُچاٹ کر دینے والے مشاغلِ تفریح وہ ہمیشہ تازہ رہنے والی افسردگی، یہ ہیں اُن لوگوں کی خصوصیات جن میں مجھے شامتِ اعمال نے لا پھنسایا ہے۔ بات بات میں اپنی عظمت کی نمائش، اور بڑا بننے کی کوشش، امتیاز پر جان دینا، شہرت پر مر مٹنا۔ مجھے تو بیان کرتے بھی شرم آتی ہے، ورنہ وہ کونسا کمینہ اور غیرت سوز فعل ہے۔ جو اس اشرف المخلوقات جماعت کے سربرآوردہ اراکین سے سرزد نہیں ہوتا؟ انسان جتنا اپنے عیوبِ برہنگی پر پردہ ڈالتا ہے، اُتنا ہی وہ نمایاں ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہاں ایک عورت ہے۔ جس کا اپنی بڑائیاں جتلاتے مُنہ نہیں تھکتا۔ جہاں دو چار آدمی مل بیٹھے، اُس نے اپنی لمبی چوڑی زمینوں اور اپنے باپ دادا کا ذکر چھیڑ دیا۔ کمبخت ایسی بے غیرت ہے کہ اُسے اتنا بھی خیال نہیں آتا کہ اپنے مُنہ سے میاں مٹھو بنتے دیکھ کر کوئی اُسے کیا سمجھے گا۔ ناواقف تو خیر اُسے ایک بیوقوف عورت خیال کرینگے، جس کا دماغ دولت کے گھمنڈ نے پھیر دیا ہے۔ مگر حقیقت میں وہ اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز ہے۔ یہ ڈینگیں اور یہ تعلّیاں اگر اصلیت پوچھو تو وہ ایک میجسٹریٹ کے کلرک کی بیٹی ہے۔ مَیں نہیں سمجھتا کہ انسان ایسا کمینہ پن کیونکر گوارا کر سکتا ہے۔

ہر روز مجھے اس بات کا نیا سبق حاصل ہوتا ہے کہ دوسروں کو ایک خود ساختہ معیار پر پرکھنا کس قدر حماقت کی دلیل ہے۔ دُنیا کو آزمانے سے پہلے مجھے اس سے کیا کیا امیدیں تھیں! لیکن اب تو جی بیزار ہو گیا ہے اور دُنیا کے تعلّقات میں طبیعت نہیں لگتی۔ مجھے پہلے ہی کیا کم مصیبتیں ہیں کہ ان دل کے کھوٹے لوگوں سے ربط و ضبط بڑھا کر مفت کا دردِ سر خرید لوں؟ اب مَیں اکیلا ہی اچھا ہوں، اور میری خوشی اسی میں ہے کہ لوگ مجھے اپنی دھن میں مست رہنے دیں۔ اور خود اپنی دھن میں مست رہیں۔

میرے لئے اس سے زیادہ روح فرسا کوئی صدمہ نہیں ہو سکتا کہ دُنیا میں عدمِ مساوات کی سی بے انصافی ہو۔ اور لوگ چھوٹے بڑے کے بے بنیاد امتیازات قائم

کریں میں بخوبی جانتا ہوں کہ تفریق مراتب کیسی ضروری چیز ہے۔ اور میں ان فوائد سے بھی آگاہ ہوں جو اس کی بدولت مجھے حاصل ہیں۔ لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ یہ تفریق اُس خوشی کو خاک میں ملا دے جس کے حصول کا موقع مجھے اپنی چند روزہ زندگی میں مل سکتا ہے۔

پچھلے دنوں میرے شناساؤں کے محدود حلقے میں ایک قابلِ ذکر اضافہ ہوا ہے۔ مجھے مس ب ... سے دلی عقیدت ہوگئی ہے۔ وہ ایک قبول صورت اور پاکیزہ سیرت لڑکی ہے۔ جس نے ایک مصنوعی معاشرت میں رہنے کے باوجود اپنے طور اطوار پر بناوٹ کا رنگ نہیں چڑھنے دیا۔ پہلی ہی ملاقات میں ہم دونوں کے درمیان ایک رشتہ اخوت قائم ہوگیا۔ اور میں نے اُس کے ہاں کسی دن آنے کی اجازت چاہی۔ اُس نے کچھ ایسی خوشی سے رضامندی کا اظہار کیا۔ کہ میں ملاقات کے مبارک لمحے کے انتظار میں ہمہ تن اضطراب رہا۔ یہ شہر اصل میں اُس کا وطن نہیں اور وہ اپنی پھوپھی کے ساتھ یہاں رہتی ہے۔ وہ سن رسیدہ خاتون بیچاری عقل و شکل کی سیدھی ہے۔ اور اپنے ہمعمروں کی طرح دُنیا اور دُنیا والوں سے ناخوش رہتی ہے۔ میں اس سے بڑے احترام کے ساتھ پیش آیا۔ اور تھوڑی دیر تک اُس سے ہمکلام رہنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ ضعیفی اور ہجومِ افکار نے بیچاری کے حواس مختل کر دیے ہیں۔ اور اُس کی تنہا تسکین یہ ہے۔ کہ جھونپڑی میں رہ کر محلوں کے خواب دیکھا کرے۔ وہ اپنے بزرگوں کا نام لے کر جیتی ہے یعنی گذشتہ کی یاد سے ایک مستعار خوشی حاصل کرتی ہے۔ اور اپنے بالاخانے سے غریبوں کے جھونپڑے دیکھ دیکھ کر ایک احساس برتری سے پھولی نہیں سماتی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ کسی زمانے میں بہت حسین و جمیل تھی۔ اور نوجوانوں کو اپنی تلوّن مزاجی کی کٹ پتلیاں بنانا اُس کا معمولی لہو و لعب تھا۔ آخر کار ایک دن ایسا آیا کہ وہ کھیل محبت کی بازی میں تبدیل ہوگیا۔ اور جیت ایک وظیفہ خوار فوجی افسر کی ہوئی جس کے ساتھ اُس نے اپنی زندگی کا معتد بہ حصہ گذارا کچھ مدت ہوئی کہ شوہر کا سایہ بدقسمت بیوی کے سر سے اُٹھ گیا ہے اور اب وہ ایک بیکس بیوہ ہے۔ کہ دُنیا سے الگ تھلگ گھر کے کونے میں پڑی رہتی ہے۔ وہ تو اس کی بھتیجی کی عین مہمان نوازی ہے۔ جس کی بدولت میں اس کے ہاں چلا گیا۔ ورنہ وہ اپنی تنہائی میں کسی کا دخل در معقولات گوارا نہیں کرتی۔

۸۔ جنوری ۱۸۷۰ء

یہ انسان بھی کیسی عجیب ہستیاں ہیں۔ کہ فہم و فراست کے باوجود بھی ظاہر داریوں اور رواجی نمائشوں کے سطحی دھوکوں

میں مبتلا ہیں! انہیں دن رات یہی کام ہے کہ سوسائٹی میں اپنا بول بالا کرنے کی تجویزیں سوچا کریں اور ان کی سمجھ پر مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ایک لمحے کی واہ وا کو مدت العمر کی کاوشوں کا کافی معاوضہ خیال کرتے ہیں۔ اگر انہیں اسکے سوا کوئی کام کاج نہ ہو پھر تو ایک بات بھی ہے لیکن رونا اس بات کا ہے کہ ظالم زندگی کے کئی اہم فرائض نظرانداز کر کے اس فعل عبث میں مصروف رہتے ہیں۔ گذشتہ ہفتے کا ذکر ہے کہ ایک محفل نشاط میں کسی بات پر دو اقتیار پرستوں کا مقابلہ ٹھن گیا اور سارا لطف جاتا رہا۔

یہ نادان لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ نام نہاد امتیاز حقیقی عظمت کا ضامن نہیں ہوتا کیونکہ وہ شخص جو بلحاظ مرتبت مسند نشین ہوتا ہے۔ بلحاظ اختیار شاذونادر ہی کوئی حیثیت رکھتا ہے اور اکثر دوسروں کی ہدایت و معاونت کا دست نگر ہوتا ہے کتنے بادشاہ ہیں جو انتظام سلطنت کے لئے وزیروں اور مشیروں کے محتاج نہیں ہوتے؟ کتنے وزیر ہیں، جو ارباب مشورت کی نیابت کے بغیر امور حکومت کو انجام دے سکتے ہیں؟ ان سب میں کون زیادہ صاحب اختیار ہے؟ میں تو یہی کہونگا کہ وہ شخص جو دوسروں کی طبیعت کی نبض پہچان لیتا ہے اور حکمت عملی سے اُن کے جذبات و میال کو اپنی مرضی کا بندۂ فرمان بنا لیتا ہے۔ (باقیدارد) محمد ہادی حسین

خوش کلامی

ان کو غرور ہو چلا حسن فسوں طراز کا
اب وہ خیال کر چکے عشق جگر گداز کا

آج فریب کھل گیا نرگسِ نیم باز کا
شوق ہے ارتکاب کا۔ رنگ ہے احتراز کا

یہ میری چارہ سازیاں عشوۂ التفات سے
ہاں یہ کوئی فریب ہے شوق ستم طراز کا

عرضِ جمال پر ہُنیں آپ سے لنترانیاں
اب تو میں رازدار ہوں پردگیانِ راز کا

ہم نے اگرچہ مدّتوں ناز ترے اُٹھائے ہیں
دور ہے سلسلہ ابھی پختگیٔ نیاز کا

خوب گذر گئے وہ دن راحتِ انتظار میں
آہ وہ لطف ہجر کے سلسلۂ دراز کا

راہِ جنوں میں ہم ابھی گامزن عمل نہیں
عقل بھی ہے نشیب کی ہوش بھی ہے فراز کا

جوشِ شباب نے انہیں خوئے ہوس سکھا ہی دی
اب مجھے مِل چکا صلہ الفتِ پاکباز کا

آئی حقیقتِ عیاں جلوہ گہ مجاز میں
اب تو حجاب اُٹھ گیا میری ہوس کے راز کا

ہائے جہانِ شوق میں حشر سا ہو گیا بپا
رنگ تو دیکھنا ذرا۔ غمزۂ دلنواز کا

دیدہ دلیریوں سے دل لے گئے چھین چھان کے
میں تو شہید ہوں اسی شیوۂ ترکتاز کا

عابدِ خوش کلام کا تم بھی کلام سن تو لو
نغمۂ غم فزا یہ ہے دل کے شکستہ ساز کا

عابد

مولیئر

مولیئر ۱۵ جنوری ۱۶۲۲ء کو پیرس میں پیدا ہوا۔ اس کے دادا کی طرح اس کا باپ بھی درزیوں کا کام کرتا تھا۔ نوجوان پوکلن ۱۴ سال کی عمر تک دھاگے کی اُلجھنوں میں پھنسا رہا۔ اتفاق سے اُس کے باپ کو بادشاہ کے خاصہ کے ملازموں میں بحیثیت ویلے کے جگہ مل گئی۔ اور پوکلن کو ڈرامے دیکھنے کا موقع ملا۔ اور وہ جذبات اُبھرنے شروع ہوئے۔ جو قدرت نے اس میں ودیعت کر رکھے تھے۔ اب اسے تعلیم کا شوق ہوا۔ اور اُس کے باپ نے اُسے ایک مدرسہ میں داخل کر دیا۔ پانچ سال مدرسہ میں نہایت جانکاہی سے کام کرنے کے بعد اتفاق حسنہ سے فرانس کے نامور فلاسفر گوسندی نے اُسے اپنے حلقہ درس میں داخل کر لیا۔ ہندوستان کا مشہور سیاح برنیر اُس کا ہم مکتب تھا۔

۱۶۴۲ء میں جب وہ فارغ التحصیل ہوا۔ تو شاہ لوئی سیزدہم کے ہمراہ بجائے اپنے باپ کے بطور ویلے خدمات بجا لانے کے لئے سفر پر جانا پڑا۔ اس سفر میں اُس نے درباریوں کی عادات کا خوب مطالعہ کیا۔ واپس آکر وہ قانون کے مطالعہ میں مصروف ہوا۔ مگر اس سے فارغ ہوا تو تھیٹر کا شوق بے محابا از سر نو اس کے دامنگیر ہوا۔ اور کچھ پس و پیش کے بعد وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے پیرس کی چھوٹی چھوٹی تھیٹریکل کمپنیوں سے راہ و رسم پیدا کی۔ جو ریشلو کی سرپرستی میں جا بجا قائم ہوتی تھیں۔ جب اس کے باپ کو یہ خبر پہنچی تو اُس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اور اُسکی تمام اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ کجا ایک معزز بیرسٹر ہونا اور کجا ایکٹری کا پیشہ اختیار کرنا جو اس وقت سب سے تبذل پیشہ خیال کیا جاتا تھا۔ اور جس پیشہ کو ذلیل قرار دینے میں سب سے زیادہ محنت پادریوں نے کی تھی جو ڈرامہ کو مذہب کی توہین کا آلہ سمجھتے تھے۔ باپ نے اپنے ایک دوست کو بھیجا کہ وہ سمجھا بجھا کر اُسے راہِ راست پر لے آئے۔ لیکن یہ صاحب جب پوکلن سے ملے۔ تو وہیں کے ہو رہے۔ اور جو کمپنی وہ بنا رہا تھا۔ اُس میں شریک ہو گئے گو بعد ازاں اس نے اس پیشہ کو قعرِ ذلت سے نکال کر معراج توقیر پر پہنچا دیا۔ اور سارا فرانس اُس کا کلمہ پڑھنے لگا۔ مگر اُس کے خاندان کے لوگوں نے اُسے اپنے ساتھ شامل نہ کرنا تھا اور نہ کیا۔ اور کبھی اس کے تھیٹر میں گئے اس کا سوانح نگار موسیو بریٹ راوی ہے۔ کہ اس نے پوکلن خاندان میں بچشم خود اُن کا شجرہ نسب دیکھا جس

میں سے مولیئر کا نام حذف کیا گیا تھا۔ اُس نے اہلِ خاندان کے انہیں جذبات کا پاس کر کے مولیئر کی کنیت اختیار کی تھی۔ اور اس نام سے وہ رُبعِ مسکون میں مشہور ہے۔ اور پوکلن صرف فرانسیسی ادبیات کی تاریخ تک ہی محدود ہے۔ تین سال تک وہ پیرس کے تھیٹروں میں پارٹ کرتا رہا۔ لیکن جب ملکہ این کی نائب السلطنتی کے زمانہ میں ڈرامہ کی جگہ خانہ جنگی نے لے لی۔ تو مولیئر جنوبی فرانس میں چلا گیا۔ اس عہد میں یعنی ۱۶۴۶ء سے ۱۶۵۶ء تک کوئی قابلِ بیان واقعہ نہیں ہوا۔ وہ جگہ بجگہ اپنی کمپنی کو لئے پھرا۔ اور اس عرصہ میں اُس نے چند نقلیں تیار کیں۔ جن کا اب نشان تک نہیں ملتا۔ اس زمانہ میں بھی وہ انسان اور اُس کی خصلتوں کے مطالعہ میں منہمک رہا۔ فرانس کے مشہور شہر پوزن میں ایک آرام کرسی بطور تبرک دکھائی جاتی ہے۔ جس کی نسبت مشہور ہے کہ مولیئر اُس پر بیٹھ کر گھنٹوں لوگوں کے حرکات و سکنات خاموشی سے دیکھتا رہتا تھا۔ اس مطالعہ کا گہرا اثر اس کی تصنیفات میں جا بجا پایا جاتا ہے۔ جنوبی فرانس کی سیاحت کے دوران میں اس کی ملاقات فرانس کے مشہور شہزادے پرنس کانٹی سے ہوئی۔ اور مولیئر اس کا پرائیویٹ سکرٹری ہو گیا۔ لیکن مولیئر نے اپنا تمام وقت ڈراموں کی تصنیف کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ اور اس عہدہ سے بدیں وجہ دست بردار ہو گیا۔ کہ سکرٹری کا کام میرے مذاق کے نقیض ہے۔ ممکن ہے۔ کہ میں بُرا بھلا مصنّف ہو جاؤں۔ لیکن میں بدترین سکرٹری ہونے کی بھی اہلیت نہیں رکھتا۔" شاید اس انکار کا باعث سابق سکرٹری کا حشر بھی ہو۔ جس کی کنپٹی پر اعلحضرت نے غُصّہ میں آ کر چھٹا رسید کیا۔ جس کے صدمہ سے بخار آنا شروع ہُوا۔ اور جو بالآخر مہلک ثابت ہُوا۔ خیر خواہ کچھ بھی ہو۔ اسی شہزادے کی وساطت سے اسے لوئی چہاردہم کے دربار میں بار ملا۔ اور ۱۶۵۸ء میں اس نے اپنی کمپنی کے ساتھ کارنیل کی ایک ٹریجڈی اور اپنی چند نقلیں بادشاہ کو دکھلائیں۔ اب اسے ایک تھیٹر مل گیا۔ جہاں اُس کی کمپنی نے ڈرامے کرنے شروع کئے یہاں اُس نے چند ہفتوں میں اپنی دو کومیڈیاں سٹیج کرنے کے لئے تیار کیں۔ جو اس کے زمانہ سیاحت کا نتیجہ تھیں۔ جب یہ سٹیج ہوئیں تو قبول عام نے ان پر صاد کیا۔ آئندہ سال اس نے ایک نئی کومیڈی سٹیج کی جس کی بے پناہ ہجو نے اہلِ فرانس کے ادبی مذاق میں انقلابِ عظیم پیدا کر دیا۔ مولیئر کی عظمت کا سنگِ بنیاد یہی کومیڈی ہے۔ جس نے اصلی کومیڈی کو فرانس میں مروّج کیا۔ اور ادبیات کے اُس عہد کا خاتمہ ہُوا۔ جو شاہ لوئی چہاردہم کی حکومت سے منسوب ہے۔ اس زمانہ میں فرانس

کی انشا پردازی مبالغہ، تصنع اور دیگر صنائع و بدائع بالخصوص لفظوں کے الٹ پھیر تک محدود تھی اور ادیب صرف بندش کی چستی اور محاورہ کی درستی کو سرمایۂ کمال سمجھتے تھے لیکن جب مولیئر نے اپنی ظرافت کے توپخانہ کا منہ اس طرف موڑا۔ تو اس کے دھوئیں اڑا دئے۔ ایک کومیڈی سٹیج کی جس میں دو رئیسوں کے نوکر دو خاتونوں پر رعب ڈالنے کے لئے اپنے مالکوں کے طرز کلام کا چربہ اتارتے ہیں۔ اسی کومیڈی نے اس طرز جدید کے حامیوں کو عرق ندامت میں غرق کر دیا۔ اور وہ اپنا سا منہ لیکر رہ گئے۔ ایک ضعیف العمر شخص نے اژدہام میں سے کھڑے ہو کر کہا۔ "مولیئر ہمت نہ ہارنا" حقیقی کومیڈی اسی کا نام ہے"۔ دوسری رات کو ٹکٹ المضاعف کیا گیا۔ مگر پھر تھیٹر میں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی

سنہ ۱۶۶۱ء میں اس نے دو اور کومیڈیاں سٹیج کیں جن کی تصنیف اور تیاری میں صرف پندرہ دن لگے۔ ان میں سے ایک خاص بادشاہ کی تفریح طبع کے لئے تھی۔ ان میں ان بارِ خاطر لوگوں کی مزاج پرسی کی گئی تھی۔ جو خواہ مخواہ محفل میں آکر سارا مزہ کرکرا کر دیتے ہیں جنہیں انگریزی میں بور کہتے ہیں۔ اس دن سے مولیئر شاہ لوئی چہاردہم کا منظور نظر ہو گیا

فروری سنہ ۱۶۶۲ء میں مولیئر نے اپنی کمپنی کی ایک نوجوان ایکٹرس سے شادی کر لی۔ جس کا اسے تمام عمر خمیازہ اٹھانا پڑا۔ اس ایکٹرس کو خود مولیئر نے تربیت کیا تھا۔ اور وہ حسین ہونے کے علاوہ اپنے فن میں کامل تھی۔ اس کی شادی کا عنوان ہی غلط تھا۔ اور کوئی وجہ نہ تھی کہ بے مزگی پیدا نہ ہوتی یعنی اس وقت مولیئر اپنی عمر کا چالیسواں سال ختم کر چکا تھا اور اس خاتون کی عمر سترہ سال تھی۔ عمروں میں یہ تفاوت زبانِ حال سے کہہ رہی تھی کہ یہ بیل منڈھے چڑھنے کی نہیں۔ اسی سال مولیئر نے اپنی ایک لطیف کومیڈی سٹیج کی جس میں یہ کہانی ہے کہ ایک بڈھا ایک نوخیز لڑکی کی اس امید پر پرورش کرتا اور اسے تعلیم دیتا ہے۔ کہ وہ جوان ہو کر اس سے شادی کریگی۔ یہ دور اندیشانہ تجویز آنِ واحد میں ملیامیٹ ہو جاتی ہے جب ایک نوجوان پانچ منٹ میں اس کی عمر بھر کی محنت پر پانی پھیر دیتا ہے اور لڑکی اس سے شادی کر لیتی ہے۔ اس کومیڈی کے اور خود مولیئر کے طریق عمل سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ قول کسقدر آسان اور فعل کس قدر مشکل ہے۔ گو یہ کومیڈی مقبول عام ہوئی۔ لیکن اعتراضوں، ہجوؤں بلکہ گالیوں کا طوفان برپا ہو گیا۔ ہر شخص مولیئر سے جلا ہوا تھا۔ اور سب کو اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا موقعہ ملا۔ اس کے جواب میں مولیئر نے ایک اور کومیڈی سٹیج کی۔ اور ہر ایک کو گن گن کر سنائیں۔ ان بیچاروں میں ایک رئیس تھا۔ کہ کندہ ناتراش ہونیکے باوجود علم و فضل کا دم بھرتا تھا۔ میدان ادب میں تاب مقابلہ نہ لا کر اس نے مولیئر کو جسمانی نقصان پہنچانے کی ٹھانی ایک

دن وہ مولیئر کو تفریح گاہ میں ملا۔ اور اس انداز سے اسکی طرف بڑھا۔ گویا معانقہ کرنا چاہتا ہے۔ جب مولیئر اس سے بغلگیر ہوا تو ذات شریف نے اس کا سر پکڑ کر اپنے کوٹ کے بٹنوں سے اس طرح رگڑا کہ مولیئر کے ہوش بجا نہ رہے جب بادشاہ کو خبر ملی تو اس نے رئیس کو بہت ڈانٹا ڈپٹا اور از حد ناخوشنودی کا اظہار کیا۔ اور مولیئر کو ایما کیا کہ وہ اپنے حریفوں سے انتقام لے۔ یہاں کیا دیر تھی ایک نئی کومیڈی تیار ہوئی۔ اور ایک رئیس کے بدلے سب رئیسوں کی خامیاں پبلک کے روبرو پیش کی گئیں۔

مولیئر کی آزادی کا حصر شاہی حمایت پر تھا جس کے بغیر جو کچھ اس نے کیا عمل میں آنا ناممکن تھا۔ شاہی عنایات کا سلسلہ اسقدر نامتناہی تھا کہ جب مولیئر کے گھر بچہ پیدا ہوا تو خود شاہ لوئی چہاردہم اس کا گاڈ فادر بنا۔ اور اسے ایک ہزار فرینک (فرانسیسی سکہ) سالانہ اور اس کی کمپنی کو سات ہزار سالانہ کی پنشن عطا ہوئی۔

ستمبر ۱۶۶۵ء میں اس کی وہ مشہور کومیڈی سٹیج ہوئی جس میں ڈاکٹروں کی تواضع کی گئی ہے۔ اس کی تصنیف اور تیاری میں صرف پانچ روز لگے۔ اگرچہ مولیئر دائم المریض تھا۔ مگر اس کی دوا صرف باقاعدہ خوراک تھی۔ وہ ڈاکٹروں پر چنداں اعتماد نہ رکھتا تھا۔ ایک دن بادشاہ نے اس سے دریافت کیا کہ وہ اپنے معالج سے کیا کام لیتا ہے۔ تو مولیئر نے کہا۔ "جہاں پناہ ہم دونوں مزے سے باتیں کرتے ہیں۔ وہ نسخہ دیکر چلا جاتا ہے۔ میں اسے پھاڑ کر پھینکدیتا ہوں۔ اور اسی لئے ابھی تک زندہ کھڑا ہوں"۔ ڈاکٹروں کے جاہلانہ تبحر کا جو نقشہ یہ کومیڈی پیش کرتی ہے وہ بظاہر غلط معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مولیئر کے وقت میں اس فرقہ کی جو حالت تھی اگر اسے مدِ نظر رکھا جائے۔ تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس سے بڑھ کر لے دے کے مستحق تھے۔ وہ فن طب کے اصولوں سے اپنی ناواقفیت کو ظاہری شان و شوکت میں چھپاتے تھے۔ یہ جادو عوام پر تو چل جاتا تھا لیکن پڑھے لکھے لوگ ان کے ہتھکنڈوں سے خوب واقف تھے۔ یہ لوگ لمبے لمبے جبے پہن، خچروں پر سوار ہو کر پیرس کی گلیوں کے چکر لگاتے تھے۔ اوّل تو ٹوٹی پھوٹی لاطینی میں گفتگو کرتے لیکن اگر مادری زبان میں باتیں کرنا ہی پڑتیں تو اس میں لاطینی اور یونانی کے اس قدر لفظ ٹھونس دیتے کہ عوام کچھ نہ سمجھ سکتے۔ کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ ان بیہودگیوں کے علاوہ سب سے بڑی مزے کی بات یہ تھی۔ کہ کسی مرض کی تشخیص کے متعلق دو طبیبوں کا کبھی اتفاق نہ ہوتا تھا۔ فرانس کا نامور دستورِ اعظم کارڈینل مازرن ایک دفعہ بیمار ہوا۔ تو چار طبیب اس کے علاج کے لئے مامور ہوئے۔ ایک نے جگر دوسرے نے پھیپھڑے تیسرے نے طحال اور چوتھے نے مثانہ میں نقص تشخیص کیا۔ مولیئر کی کومیڈی

کا اتنا تو اثر ہُوا کہ یہ لوگ مناسب لباس پہننے لگے۔ اور بندوں کی سی باتیں کرنے لگے۔ اب مولیئر کی زندگی کا وہ دور شروع ہُوا۔ جس کا آغاز "بگڑے دل" سے ہوتا ہے اس ڈرامے کو اُس کی بہترین تصنیف خیال کیا جاتا ہے اور موجودہ ڈراما میں اسے درجۂ امتیاز حاصل ہے فرانسیسی نقاد اس کی ادبی شان کے بہت معترف ہیں۔ "بگڑے دل" دُنیا' اہل دُنیا اور تمام تکلفات سے بیزار ہی نہیں بلکہ اُن کی اصلاح کے لئے اس قدر لڑنے مرنے پر تیار ہیں۔ کہ مضحکہ خیز ہو گئے ہیں۔ روسیو اس تصنیف پر بہت چین بجبیں ہوتے تھے۔ کہ ایک ایسے اعلےٰ اصول کے پابند شخص کا مذاق اُڑایا گیا ہے۔ ڈک ڈی موٹیاسر اس وقت اپنے اتقا اور پابندیِ اصول کیلئے بہت مشہور تھا۔ کسی نے اس سے کہا کہ بگڑے دل کے کیریکٹر سے آپ کی ذات مراد ہے۔ اسے بہت رنج ہُوا۔ اور اسے سٹیج پر دیکھنے کے لئے گیا۔ کھیل کے ختم ہونے پر چلا اُٹھا۔

. . . "میری اتنی قسمت کہاں کہ مولیئر مجھے اس عزت کے قابل خیال کرتا" روسیو کے اعتراض کا اس سے بہتر کیا جواب ہو سکتا ہے۔

اس کومیڈی کے سٹیج ہونے کے وقت مولیئر اور اُس کی بیوی کے تعلقات اسقدر کشیدہ تھے کہ نکتہ چینوں کو باتیں بنانے کا موقع ہاتھ آیا۔ اس خاتون کی آوارہ مزاجی اور فضول خرچی ان حدود سے تجاوز کر گئی تھی جنہیں اس زمانہ میں اہل فرانس ٹھنڈے دل سے برداشت کرتے تھے۔ مولیئر کے لئے اس کی بیوی کی حرکات ناقابلِ برداشت ہو گئی تھیں۔ اور وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح وہ سیدھے راستے پر آ جائے۔ ایک دوست نے اُسے مشورہ دیا۔ کہ بیوی کو سپرد زندان کرا دے۔ کہ اس زمانہ میں آوارہ بیویوں کے لئے یہی سزا مروّج تھی۔ مولیئر اس پر تو رضامند نہ ہُوا۔ لیکن یہ طے پایا۔ کہ وہ ایک ہی مکان میں رہیں لیکن تھیٹر کے بغیر کبھی آپس میں بات تک نہ کریں۔ چونکہ اس کومیڈی میں اُن کے پارٹ بالکل اُن کی اصلی حالت کے مطابق تھے۔ اس لئے لوگوں کو اصل اور نقل میں مطابقت پیدا کر کے شگوفے چھوڑنے کا اچھا موقع ہاتھ آیا۔

اب مولیئر نے مذہب کی طرف توجہ کی اور اپنی کومیڈی موسومہ "رنگے سیار" میں پادریوں کی ریاکاری کا تار پود بکھیر دیا۔ جب یہ کومیڈی سٹیج ہُوئی تو بادشاہ و دیگر اکابرِ ملک کے علاوہ پادری بھی تماشا دیکھ رہے تھے۔ وہ ازحد خفیف ہوئے۔ اور جیسے رات کے وقت اُلوّں کے سامنے روشنی آ جائے۔ تو وہ چیخ اُٹھتے ہیں۔ اس طرح پادریوں نے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ اور بادشاہ کو آئندہ کے لئے اس کومیڈی کی نمائش بند کرنا پڑی۔ مگر پھر بھی بادشاہ اُسے محل میں اور اُمرا اپنے مکانوں پر دیکھتے رہے۔ اس سے

پادری اور بھی بھڑک اُٹھے۔ اور حفظِ ایمان کے پردے میں گالی گلوچ پر اُتر آئے۔ سب سے زیادہ سرگرم پادری لینرڈ اس تھا۔ اُس نے مولیئر کی تکفیر کا فتوےٰ صادر کیا۔ اور اس میں اُسے شیطان کا قائم مقام ٹھیرا شمار کیا گیا نہ بنایا۔ اسی پر بس نہیں۔ بلکہ ایک پادری بادشاہ کے پاس حاضر ہو کر ملتجی ہوا۔ کہ مولیئر کو زندہ جلا دیا جائے۔ بالآخر پادریوں نے یہ فیصلہ کیا۔ کہ اسے برکاتِ کلیسا سے محروم رکھا جائے۔ خود پادریوں کو انکار نہ تھا کہ مولیئر کی ہر ایک کومیڈی ادبیات کے لحاظ سے بلند پایہ رکھتی ہے۔ اور اس کے نقطۂ نظر سے اصلاح تمدن مقصود ہے مگر تعصب کو کیا کیا جائے۔ کہ یہ حجاب اکبر ہے ۱۶۶۶ء میں مولیئر کومیڈی "بخیل" (انگریزی میں اور فارسی میں مردِ خسیس) اور اُردو میں جانِ ظرافت کے نام سے ترجمہ ہو چکی ہے) اسٹیج پر آئی اور پہلی مرتبہ شاہی محلات میں دکھائی گئی۔ لیکن بادشاہ خاموش بیٹھا دیکھا کیا۔ اُس کے لب تبسم تک سے آشنا نہ ہوئے۔ جب مولیئر بحیثیت اس کے ویلے کے خدمت میں حاضر ہوا۔ تو بادشاہ نے آنکھ اُٹھا کر بھی اس کی طرف نہ دیکھا۔ زمانہ پرور درباریوں نے نتیجہ نکالا کہ مولیئر بادشاہ کی نظروں سے گر گیا ہے۔ وہ اُس کے نکھول جلے بھنے تو تھے ہی سب نے بادشاہ کے کان بھرنے شروع کر دئے۔ اور ایک ڈیوک نے تو یہاں تک کہہ دیا۔ کہ مولیئر کے ایسے پیرِ فرتوت سے کومیڈی بنانی محال ہے۔ اور ضرورت ہے کہ کوئی اور مصنف اس کام کو سنبھالے۔ ورنہ فرانسیسی کومیڈی اطالوی نقلوں کے شکار ہو جائیگی۔ اس بیکسی کے عالم میں کوئی ہمدرد یا غمگسار نہ تھا مولیئر نے پانچ دن انگاروں پر کاٹے۔ جب چھٹے دن یہ کومیڈی پھر سٹیج نہ ہوئی۔ تو بادشاہ نے مولیئر سے کہا کہ اُس کی کوئی تصنیف کبھی اسقدر شاہ پسند نہیں ہوئی اور گذشتہ رات کو اُس نے اس لئے اظہار رائے نہ کیا۔ کہ اُسے اس بات کا اندیشہ تھا کہ شاید اس کومیڈی کے اسقدر پسند خاطر ہونے میں اس کی ایکٹری کا اثر بھی شامل ہو۔" یہ الفاظ بادشاہ کے مُنہ سے نکلنے تھے کہ درباریوں نے اُس کی تعریف کے پُل باندھ دئے۔ اور مذکورہ بالا ڈیوک نے کہا۔ مولیئر کے قلم سے جو نکلتا ہے اعجاز ہوتا ہے۔ دُنیا بھر میں اس کی نظیر ملنا محال ہے۔" درباریوں کی یہ حرکتیں مولیئر کی تصنیفات کا کیسا اچھا صِلا تھیں۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ ایکٹری کا پیشہ فرانس میں مذموم خیال کیا جاتا تھا۔ اور کچھ پادریوں کی نظرِ عنایت سے مولیئر کو بےحد جسمانی اور روحانی تکلیفات کا سامنا کرنا پڑا۔ اور ناموری اور شہرت کا تمام مزا کرکرا ہو گیا۔ ایک دفعہ جب شاہی محلات کے نوکروں نے اُس کے فرائض کی بجا آوری میں مدد دینے سے انکار کیا۔ تو ملک فرانس کے دربار کا ملک الشعرا پاس کھڑا تھا۔ اُس نے مولیئر کے ہا

اپنی خدمات پیش کیں۔ اس طرح جب ان نوکروں نے اس کے ساتھ میز پر بیٹھ کر کھانا کھانے سے انکار کیا۔ تو بادشاہ نے اسے اپنے میز پر مدعو کر لیا۔ اور درباریوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "میں نے مولیئر سے استدعا کی ہے۔ کہ وہ میرے ساتھ کھانے میں شریک ہو۔ کیونکہ وہ اس قابل نہیں۔ کہ میرے نوکر اُس کے ساتھ شریک اکل و شرب ہونے کی ذلت گوارا کریں۔" اس جھاڑ نے سب کی آنکھیں کھول دیں یہی تعصب اس کے اکیڈیمی (مجلس علماء و ادبا) کا ممبر ہونے کا مانع ہوا۔ حالانکہ اس کے ممبروں میں سے کوئی بھی ادبیات کی خدمت کے لحاظ سے مولیئر سے لگا نہیں کھا سکتا تھا۔ اسی بات سے متاثر ہو کر انہوں نے پیغام بھیجا کہ اگر وہ ایکٹری کا پیشہ ترک کر دے۔ اور صرف ادبیات سے واسطہ رکھے تو وہ اسے ممبر بنانے کو فخر سمجھیں گے۔ مولیئر نے جواب میں کہا۔ کہ اُس کی کمپنی کے بے شمار ملازم اس کی بدولت روٹی کھاتے ہیں۔ اس لئے اس پیشہ کے ترک کرنے کا خیال تک اسے نہیں آسکتا۔ اس ایثار اور ہمدردی کے سامنے اکیڈیمی کے ممبر ہونے کی عزت کیا حقیقت رکھتی ہے۔ اس جماعت کو مولیئر کی وفات کے ایک سو سال بعد ہوش آیا۔ اور اُس نے نہایت احترام کے ساتھ اُسکی تصویر اپنے ہال میں آویزاں کی۔ اور اُس کے نیچے یہ کتبہ لکھا۔ اُس کی شان کو کسی چیز کی ضرورت نہیں لیکن ہماری عزت نامکمل ہے۔ کہ اُس کا نام ہماری فہرست کا طغرائے امتیاز نہیں۔

افسوس کہ طوالت مانع ہے۔ ورنہ ہم اس کی تصنیفات کی زیادہ وضاحت سے تقریب کراتے جن کا ترجمہ ضخیم جلدوں میں ہمارے سامنے ہے اور ہم دل پر جبر کر کے آخری سین پر پہنچتے ہیں۔

مولیئر مدت سے سل کی قسم کے ایک عارضہ میں مبتلا تھا۔ اور انتہا درجہ کی پرہیز کے طفیل وہ معمولی درجہ کی صحت کو قائم رکھے جاتا تھا۔ ۱۶۷۳ء کے آغاز میں اس دیرینہ بیماری نے خطرناک صورت اختیار کر لی۔ مگر باوجود اس کے اس نے قلم ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اور ایک جانباز سپاہی کی طرح آخری دم تک میدانِ سخن میں ڈٹا رہا۔ ۱۷ فروری کو اس کی ایک کومیڈی کو سٹیج ہونا تھا۔ اُس دن اس کی طبیعت بہت بگڑ گئی۔ احباب نے لاکھ سر پٹکا مگر وہ باز نہ آیا۔ اور وہی پرانا جواب دیا۔ کہ پچاس سے زیادہ نفوس قوت لایموت کے لئے اس پر حصر رکھتے ہیں۔ اس طرح اس نے اپنی زندگی فیاضی پر نثار کر دی۔ پارٹ کرنے میں جو زحمت اُٹھانی پڑی۔ اس سے طبیعت بد سے بدتر ہو گئی۔ مگر یہ دھن کا پکا کام نہ جانے چلا جاتا۔ کہ یکایک ہوک اُٹھی۔ اور وہ بے بس ہو گیا۔ مگر اس نے اس اپنی جان لیوا تکلیف کو تبسم کے پردے میں چھپانے کی ناکام کوشش سے گریز نہ کیا۔

تماشہ بند ہوگیا اور اُسے ہاتھوں ہاتھ اُٹھا کر مکان پر لے گئے۔ جب وہاں پہنچے تو اُسے زور سے کھانسی آئی۔ اور ایک شریان پھٹ گئی۔ جب اُس نے سمجھا کہ آخری وقت آگیا تو پادری کو طلب کیا۔ مگر یہ جناب نہ آئے۔ اور جب تک کوئی اور مذہبی مقتدا پہنچتا طائر رُوح پرواز کر گیا۔ مولیئر نے ۵۱ سال کی عمر پائی۔ پیرس کے اُسقف اعظم ہاری ڈی چمپیٹ ولسن نے اُس کی نماز جنازہ پڑھنے سے انکار کر دیا۔ یہ حضرت اپنے زمانہ میں بھی عیاشی کے دیوتا مانے جاتے تھے۔ مگر ریاکاری کا یہ عالم ہے کہ ایک ایکٹر کا جنازہ پڑھنے کو اتقا کے خلاف خیال فرماتے ہیں۔ آخر لوئی چہاردہم کے حکم سے فادر گیلارڈ نامی ایک پادری نے بادل ناخواستہ یہ کام انجام دیا۔ اور مولیئر کی برکت سے اُس کا نام تاریخ میں موجود ہے۔ ورنہ ایسے ہزاروں پادری ہوئے۔ کوئی اُن کے نام تک سے آشنا نہیں۔ شام کے وقت ایک سو احباب اور مداحوں نے اُسے اوّل منزل پہنچایا۔ مگر دشمنوں نے اس کے مرنے کے بعد بھی اُس نعش کا پیچھا نہ چھوڑا۔

فرانسیسی لٹریچر میں مولیئر کا وہی درجہ ہے۔ جو انگریزی میں شیکسپیئر کا فارسی میں سعدی کا اور اُردو میں اکبر کا ہے اس نے پندرہ سال کے قلیل عرصہ میں تیس سے زیادہ کومیڈیاں لکھیں۔ اور ہر ایک میں خود پارٹ کیا۔ سٹیج کرنے سے پہلے وہ اپنی ہر ایک کومیڈی اپنی ایک بڑھی خادمہ کو سُنایا کرتا تھا۔ اور اکثر اسکے مشورہ اور صلاح پر کاربند ہوا کرتا تھا یا وہ بچّوں کو اکٹھا کر کے اُن کے سامنے پڑھتا تھا۔ اور دیکھتا تھا۔ کہ ان معصوموں کے دلوں پر کیا اثر ہوتا ہے۔ باوجودیکہ اس کی بیوی بلا کی فضول خرچ تھی۔ مگر مولیئر کے ہاں ہمیشہ ہُن برستا رہا۔ بے انتہا فیاضی کے باعث اُس نے کوئی ترکہ نہ چھوڑا۔ مولیئر طبعاً بہت کم سخن اور خاموشی پسند تھا۔ اور اسی لئے وہ لوگ جو اُس کی گفتگو میں بھی اس کے ڈرامہ کی ظرافت چاہتے تھے۔ مایوس چلے جاتے تھے۔ سچ یہ ہے کہ مولیئر سوسائٹی میں ناظر کی حیثیت سے نہ کہ رکن کے طور پر شامل ہوتا تھا۔

نور الٰہی
محمد عمر

تبصرۂ اشاعاتِ جدیدہ

درویش :۔ رسالہ اُسوۂ حسنہ کے طرز کا ایک پندرہ روزہ رسالہ "درویش" دہلی سے زیرِ ہدایت خواجہ حسن نظامی وزیرِ ادارت ملا محمد الواحدی شائع ہوتا ہے۔ مضامین ایک تنوّع خوشگوار کے باعث دلچسپ ہیں۔ اور عنوانات جاذبِ نظر۔ خواجہ صاحب کی "تجلیات" التزامی طور پر رسالے کا مطلعِ سخن ہوتی ہیں۔ ان میں حقائق و معارف کا ایک خزانہ پنہاں ہوتا ہے۔ اور معاشری، مجلسی، ادبی، مذہبی مضامین پر ضمناً بحث کی جاتی ہے۔ رفتارِ خیالات کے زیرِ عنوان خواجہ صاحب کے موصولہ خطوط کا اقتباس درج ہوتا ہے۔ انہی میں سے ایک خط میں "نانی باپ سجدہ" کے الفاظ دیکھ کر کاتبِ خط کے جسارت انگیز حسنِ اعتقاد پر یک گونہ حیرت ہوتی ہے۔ گاہے گاہے فلسفیانہ مقالات بھی شائع ہوتے ہیں قصص کا بھی ایک معتد بہ حصّہ چھپتا رہتا ہے۔ سیاسیات اور نسائیات کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔

ہم حیرت آمیز خوشی سے اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ گنجائشِ کتابت اور کثرتِ مواد کے باوجود چندہ بہت کم ہے۔ یعنے دو روپیہ سالانہ اور یہ خصوصیت خواجہ صاحب کی تمام اشاعات میں پائی جاتی ہے۔ حجم ۴۰ صفحات تقطیع $\frac{22 \times 18}{4}$ ملنے کا پتہ :۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۵ دہلی۔

حسین بیتی :۔ ایک ۴۶ صفحہ کا رسالہ ملا محمد عبدالواحدی صاحب نے دہلی سے شائع کیا ہے۔ جس کے مصنّف جناب مولوی حکیم ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی ہیں۔ آپ ایک مستند و مشہور انشاء پرداز ہیں۔ آپکی تحریر میں اُردوئے معلّٰے اپنی بہترین شان میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔ مگر اس کتاب کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ کو نظم میں بھی اُستادانہ قدرت حاصل ہے۔ اصنافِ سخن میں مثنوی ہی ایک ایسی صنف ہے۔ جس میں فن کے تمام رسوم و عوائد کو برقرار رکھ کر انشاپردازی کے پھول کھلانا بہت مشکل نظر آتا ہے۔ مولانا نے مضمون بھی آسان نہیں۔ انتخاب کیا۔ شہادت سیّدنا حسین ملّت کے لئے ہمیشہ شمعِ ہدایت کا کام دیتی رہی ہے۔ چنانچہ اسی سبق کو مدِ نظر فرما کر فراقؔ صاحب نے سحر البیان کی دلفریب لے میں ' واقعہ کربلا کو نظم فرمایا ہے۔ اس مختصر سی نظم میں شہادت کے غوامض و رموز کو صراحت سے بیان کرنا تو ناممکن تھا۔ بہر طور فراقؔ صاحب نے واقعات کو مختلف عنوانوں کے تحت میں ' بیان کرتے ہوئے۔ ان کی تمدنی۔ اخلاقی اور مذہبی حیثیات پر ایک ناقدانہ نگاہ ڈالی ہے۔ ہر ایک عنوان کے شروع میں ایک ساقی نامہ بھی موجود ہے۔ جو مولانا کی جدتِ گریز کا ایک روشن ثبوت ہے۔ خاصکر محرم کے ماہ میں موسمی میوہ ہے۔ قیمت ۸/ حجم ۴۶ صفحات تقطیع $\frac{22 \times 18}{8}$ شائقین درویش پریس دہلی سے طلب فرما سکتے ہیں

خادمِ کعبہ :۔ صوبہ بہار و بنگال میں بہی خواہانِ اُردو کی جو کوششیں پچھلے دنوں سے بروئے کار آ رہی ہیں اُنہی میں سے ایک کوشش رسالہ "خادمِ کعبہ" کی صورت میں رونما ہوئی ہے۔ بنگال میں اُردو کے عدمِ رواج کا خیال کرتے ہوئے ایسے رسائل کا وجود بسا غنیمت ہے۔ اگرچہ رسالے کا نام نوعیّتِ مضامین کو مختص کر دیتا ہے۔ تاہم اُس کی خدمت صرف خدمت کعبہ تک ہی محدود نہیں متفرقاتِ علم و ادب سے اُسے عام پسند بنانے کی کوشش کیگئی ہے۔ لکھائی چھپائی گوارا ہے حجم ۴۰ صفحے قیمت سالانہ عہ۔ ملنے کا پتہ۔ ہوڑہ نور لائبریری جلاپاڑہ لین۔ ہوڑہ

درگتشا آرٹ پریس لاہور میں باہتمام لالہ دھانچند پرو پرائٹر کے چھپا۔ اور دارالاشاعت ادب لطیف کے لئے سید اصغر علی حسنی پبلشر نے شائع کیا

(۵)

سوز تو اندر خرام ساز تو اندر زمام
بے خورش و تشنہ کام پا بسفر صبح و شام
خستہ شوی از مقام
تیز ترک گام زن منزلِ ما دور نیست

(۶)

شام تو اندر یمن صبح تو اندر قرن
ریگ درشت وطن پاسے ترا یاسمن
اے چو غزالِ ختن
تیز ترک گام زن منزلِ ما دور نیست

(۷)

مہ ز سفر پا کشید در پس تل آرمید
صبح ز مشرق دمید جامۂ شب بر درید
بادِ بیابان وزید
تیز ترک گام زن منزلِ ما دور نیست

(۸)

نغمۂ من دلکشاے زیر و بمش جانفزاے
قافلہ ہا را دراے فتنہ ربا فتنہ زاے
اے بحرم چہرہ ساے
تیز ترک گام زن منزلِ ما دور نیست

اقبال

بیسویں صدی

ایک معاشری معمہ

انیسویں صدی کے درمیانی حصہ میں جن بزرگوں نے مغربی تہذیب کو منتہائے نظر بنا کر ہندوستان کو مشرقی تمدن کی زنجیروں سے آزاد کرنا چاہا تھا۔ ان میں منصور کے والد بھی ایک نمایاں اہمیت رکھتے تھے۔ ان کی سرگرمیاں کانگریس کے ارباب حل وعقد کی نگاہوں میں قابل ستائش تھیں۔ اور علیگڈھ کالج کے بانیوں کی نظر میں لائق تحسین۔ مغربی تعلیم نے ان کے زاویۂ نگاہ کو ایک بڑی جدوجہد، ایک عظیم الشان کشاکش کے بعد تبدیل کر دیا تھا۔ اور وہ اب مغربی تہذیب ہی کو ہندوستان کی معاشری نجات کا واحد ذریعہ سمجھتے تھے۔

منصور نے ۱۸۹۳ء میں علیگڈھ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری لی۔ منصور کے والد کے لئے یہ دن روز عید سے بدرجہا خوشتر تھا۔

جس خواب شیریں کو ان کی مغربی تعلیم سے رنگی ہوئی آنکھیں دیکھ چکی تھیں۔ اس کی مجسم تعبیر کو دیکھنے کی ممکنات پیدا ہو گئیں۔ تشنگیٔ دیدار شاہد آرزو کو قریب پاکر اور بھڑکی۔ ناشکیبائی انتظار اس دلفریب نظارہ سے سرشار ہو کر اور تیز ہو گئی۔ وہ جانتے تھے کہ اس صدی کی تخلیق یعنی ان حسیات جذبات اور خیالات کی پیدائش جو اس صدی کے ساتھ ایک مخصوص علاقہ رکھتی ہیں مغربی اقوام کی لگاتار اور ان تھک کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اور کوئی شخص مغربی ممالک کی تہذیب ومعاشرت سے بیگانہ رہ کر مغربی تعلیم سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ انہوں نے تہیّہ کر لیا۔ کہ منصور اب ایک لمحہ کے لئے بھی ہندوستان میں نہ رہے گا۔ منصور کی ماں نے ہزار منتیں کیں منصور کی بہنوں نے لاکھ آہ وزاری کی۔ مگر منصور کے والد نے ایک نہ مانی۔ ہندوستانی رسوم کے مطابق منصور کی منگنی اس کے ماموں کی بیٹی سے بچپن ہی سے ہو چکی تھی جب اس کو منصور کے والد کے عزم کی خبر ملی۔ تو وہ آئے اور کہا۔ "اگر آپ کا ارادہ یہی ہے۔ تو چند روز اور صبر کیجئے۔ منصور کی شادی ہو جانے دیجئے۔" اس

سے زیادہ اور وہ کیا کہتے۔ مگر منصور کے والد کہاں سننے تھے۔ کہنے لگے۔

"بھائی یہ سب کچھ تمہاری بیٹی ہی کے لئے تو کر رہا ہوں۔ ولایت سے واپس آکر منصور میرا محتاج نہ ہوگا۔ اگر سول سروس کے امتحان میں کامیاب ہوگیا۔ تو تمہاری بیٹی ہی راج کریگی۔"

منصور کے ماموں بھی آنے والی خوشیوں کے نشے میں مست ہوکر بولے۔

"ہاں بھائی تم سچ کہتے ہو۔ بسم اللہ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

اسی ہفتہ میں منصور، ماں باپ بہن بھائیوں سے رخصت ہوکر اس سنہری سرزمین کی طرف روانہ ہوگیا۔ جس کی سحر آلود فضاؤں کو دیکھنے کی تمنا اسے دن رات بیچین رکھتی تھی۔

ایک دو سال کا کیا ذکر دس سال گزر گئے، اور منصور ولایت سے واپس آنے کا نام تک نہ لیتا تھا۔ وہ ہندوستان سے سول سروس کا امتحان دینے گیا تھا۔ مگر ولایت میں پہنچکر اور کیمبرج میں دو تین سال گزار کر اس کے ارادے بدل گئے۔ اس نے اپنے والد کو صاف صاف لکھ دیا۔ "نوکری خواہ کسی قسم کی ہو نوکری ہی ہے۔ درجے چیزوں کی نوعیت میں فرق پیدا نہیں کر سکتے۔ ہندوستان کی تعلیم انتہائی مدارج میں بھی نامکمل ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں مغربی تعلیم اور نئی تہذیب کی برکتوں سے بہرہ ور ہوں۔ تو مجھے اجازت دیجئے کہ میں وہ سب کچھ بھول جاؤں جو میں نے ہندوستان میں سیکھا ہے۔ اور از سرِ نو اس آزاد اور باکمال ملک کے چشمۂ فیضان سے اپنی پیاس کو بجھاؤں۔"

منصور کے والد اپنے نورِ نظر کی آزاد خیالی اور روشن دماغی پر بہت خوش ہوئے۔ اور لکھ بھیجا

"اس مقصد کی تکمیل کے لئے تمہارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ اگر میری تمام دولت اور تمہاری ساری عمر اس کوشش میں صرف ہو جائے تو مجھے دریغ نہ ہوگا۔"

منصور کے ماموں البتہ اس فیصلے سے پریشان تھے۔ ان کی بیوی دن رات وظیفے پڑھ پڑھ کر منصور کی واپسی کی دعائیں مانگتی۔ اور ہر پیر فقیر کی خدمت میں حاضر ہوکر منصور کے لئے گنڈا تعویذ بنواتی۔ شاید کسی اللہ والے ہی کی سنی جائے۔ اور منصور واپس آجائے۔ جوان بیٹی اسے مصیبت کا پہاڑ دکھائی دیتی تھی۔ اس کی زندگی اور موت منصور کے فیصلے پر منحصر تھی۔

منصور جستجوئے مغرب میں ایک عقیدتمند پجاری کی طرح تہذیب نو کے ہر خیالی بُت کی پرستش میں سرمست رہا۔ اور جب واپس آیا تو ان من موہنی مورتوں کو اپنے دل کے مندر میں متمکن کر کے لایا۔ جن کے آستانِ ناز پر وہ چاہتا تھا کہ ہندوستان کی تہذیبِ قدیم کے زاید المیعاد تمدن کا سر نیاز خم ہو جائے۔ ادھر نو عقیدتمندانہ خود فراموشی کا یہ عالم تھا۔ ادھر مشرقی وضعداری اور تنگ نظری اس کے استقبال کے لئے بازو پھیلائے ہوئی تھی۔ وہ بیسویں صدی کی ابتدا کو دُنیا کی ترقی و ارتقا کا پیغام سمجھتا تھا۔ مگر ہندوستان میں واپس آکر اُس نے جو کچھ دیکھا اُسے دیکھنے کی اسے کبھی امید نہ تھی۔ اسے معلوم ہوا۔ کہ یہ دس سال گویا گزرے ہی نہ تھے۔ اس کا وطن پُرانی تہذیب کی گرد آلود چادر میں لپٹا ہوا اسی خواب غفلت میں سرشار تھا۔ جس گہری نیند میں وہ اسے چھوڑ گیا تھا۔ آرزوؤں کے شگفتہ مرجھا گئے۔ نوخیز حسرتوں کا خون ہوگیا۔ اور اس کی مغرب پرست نگاہوں نے بیسویں صدی کے پیغامِ ارتقا کی بین السطور میں اپنی خوشی اور شادمانی کا مرثیہ پڑھا۔

مگر وہ آنکھیں جو خواب غفلت سے بیدار ہو چکی تھیں، وہ دل جس میں اب نئی بجلیاں بیقرار ہو چکی تھیں۔ اس استبداد سے گھبرایا۔ ناکامی اور مایوسی نتائج سے بے نیاز ہو کر قدامت پسندی کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ ہوگئی۔ اس کی فطری آزادی نے رسوم و قیود کی وہ زنجیریں توڑ ڈالیں۔ جسے اب نہ تو وہ پہننا چاہتی تھی۔ نہ پہن سکتی تھی۔ زندگی کی وسیع ممکنات اس کی نظر کے سامنے تھیں۔ وہ آسمانی جنّت سے زیادہ ایک ارضی جنّت کا خواہشمند تھا۔ وہ محنت، دولت اور علم کا انتہائی مقصد صرف اپنی شخصی آسودگی کو تصوّر کرتا تھا۔ اُس نے مغربی اقوام کی معاشرت میں اس مقصد کی تکمیل اور اس اصول کی کامیابی کو دیکھا تھا اور جانتا تھا۔ کہ رنگ اور ملک کا اختلاف اس مقصد اور اصول کے نتائج میں کوئی فرق پیدا نہیں کر سکتا تھا وہ سمجھ چکا تھا کہ محنت کے جائز ماحصل کو جائز آرزوؤں کی تکمیل کے لئے صرف کرنا مذہب اور اخلاق کو پامال نہیں کرتا۔ اور اگر یہ سچ ہے کہ راحت و اطمینان ہی انسانی تمدن کا سب سے اہم منتہائے نظر ہے تو اس منتہائے نظر کو حاصل کرنے کے لئے ہر مخالف عنصر سے برسرپیکار ہونا ہر سدراہ پر غالب آنا محض ایک فطری تقاضا ایک انسانی فرض ہے۔ اب کیا تھا۔ پاس ادب کی

بلند عمارت آن کی آن میں گر گئی۔ بزرگوں کی نازبرداری، اور رسوم کی پابندی، آزاد خیالی کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھا دی گئی۔ طعن وملامت سے بے خطر ہو کر اس کی نوعمر خود سری نے بزرگوں کی ضد کو مٹانے کے لئے آخری جدوجہد کی۔ جو آسائش صرف زر اور مذاق مہذب مہیا کر سکتا تھا۔ میسر آگئی۔ مگر لطف زندگی کا وہ واحد سرمایہ۔ بہار نشاط سے وہ مسطر پھول خداوند خالق کی وہ سب سے زیادہ حسین آفرینش جو "عورت" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کو اس کیفیت میں میسر نہ آئی۔ جس کیفیت دلنواز کا وہ متوالا تھا۔

وہ اپنے ہم مذاق دوستوں سے مل کر اس حسرت انگیز تنہائی اس جانگسل مایوسی کی لامتناہی ساعتوں کو کم ازکم ایک ذرا سے وقفہ راحت سے قابل برداشت بنانے کی کوشش کرتا تھا۔ مگر یہ دوست سب مرد تھے۔ انکی محبت کے اظہار، ان کی غمخواری کے انداز، ان کی گفتگو کے پیرائے میں وہ لطافت، وہ صداقت، وہ حسن نہ تھا۔ جو عورت کی خصوصی ملکیت ہے۔ اس کی زندگی اس لالہ صحرائی کے مانند تھی جو کسی قدر شناس نگاہ کے انتظار میں اپنی بہار کو خزاں سمجھ کر چاک چاک ہو جاتا ہے۔ اس کی تعلیم، اس کی تہذیب، اس کا ذوق کسی قدر نہ کرنے والی بیوی کے بغیر بیکار تھا۔ وہ بار بار اپنے دل کو سمجھاتا۔

"میں اب ہندوستان میں ہوں۔ اور عورت کی بے محابا صحبت اور محبت سے محروم، نہیں اس سوشی سے بھی محروم ہوں۔ کہ اپنی طبیعت کی پسند اور مذاق کی کسوٹی پر کم ازکم اس عورت کی صورت کو تو پرکھ سکوں۔ جس کی خود مختار حکومت کے ہاتھوں میں اپنی زندگی اور قسمت کی سنہری باگ دے رہا ہوں، پھر کیوں نہ میں بھی ان بے شمار قربانیوں میں ایک اضافہ کر دوں جن کا خون اس ملک کی تہذیب کی گردن پر ہے۔"

مگر اس کا دل اس کے دماغ کی فریب خوردگی پر ہنستا اور ان چھوٹی دلیلوں کے خلاف بغاوت کر کے کچھ ایسے اضطراب سے تڑپتا کہ وہ چلا اٹھتا۔

"آہ اگر میں نے اس معاملہ میں ذرا سی کمزوری دکھائی تو میں مر جاؤنگا۔"

اس کے بزرگوں نے جن میں اس کے روشن خیال والد بھی تھے۔ اس کی اس خواہش انتخاب اور آزادی رائے کو نفرت و حقارت سے دیکھا۔

منصور خوب جانتا تھا۔ کہ کم از کم اس کے والد اپنی تعلیم و تربیت کے لحاظ سے اس قدر تنگ نظر نہیں ہو سکتے۔ مگر اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس صدی کی سب سے بڑی کمی یہی ہے۔ کہ لوگ تبدیلی چاہتے ہیں۔ اور ترقی کے آرزو مند ہیں۔ مگر اپنے خیالات کے اظہار کی جرأت نہیں رکھتے۔ آخر ایک دن جب اس کے والد اپنے کتب خانے میں بیٹھے زیادہ تر اپنی علمیت کے اظہار کے لئے مختلف کتابوں کے ورق الٹ رہے تھے۔ منصور نے ان پر اپنی حالتِ دل ظاہر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ ان کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ اور ان کی فرصت کا انتظار کرنے لگا۔ باپ نے بیٹے کو آج ایک مدت کے بعد اپنی مرضی سے اپنے قریب بیٹھا دیکھ کر فتحمندی کے احساس سے طمانیت کی ایک گہری سانس لی۔ وہ اس طوفان سے بے خبر تھے۔ جو اٹھنے کو تھا۔ سمندر کی سطح طوفان سے پہلے ایسی ہی ساکن و ساکت ہوتی ہے۔ دل میں خود ہی کچھ سوچ کر بولے۔

"آخر کار منصور تم قائل ہو گئے ہو گے کہ جو کچھ میں تمہارے حق میں سوچ سکتا ہوں وہ واقعی تمہارے حق میں مفید ہے۔"

منصور نے اپنے اندرونی ہیجان کو دبا کر جواب دیا

"ابّا جان میں تو صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ آیا ان تمام کتابوں کا جو آپ نے اپنے کتب خانے میں جمع کر رکھی ہیں۔ آپ پر کچھ اثر بھی ہوا ہے یا نہیں۔ اور آج تنگ آکر آپ سے ایک سوال پوچھنے کے لئے آیا ہوں۔"

باپ نے کچھ حیران اور زیادہ تر خشمگین ہو کر کہا۔

"پوچھو"

منصور نے کہنا شروع کیا:۔

"میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ نے مجھے انگریزی تعلیم کیوں دلوائی۔ ولایت کیوں بھیجا وہاں اتنی مدّت تک رہنے کی اجازت کیوں دی۔ مغربی تہذیب و تمدن کے اثرات کو قبول کرنے میں میری حوصلہ افزائی کیوں کی۔ کیا یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ ایک درخت کو سرسبز و شاداب کر کے کاٹ دیا جائے۔ ایک زندگی کو ترقی اور آرزو کی روح سے معمور کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔"

باپ نے پہلے سے زیادہ حیران ہو کر دریافت کیا۔

"منصور میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

منصور نے ذرا بگڑ کر جواب دیا:۔

"میرا مطلب یہ ہے۔ کہ کیا آپ کو معلوم نہ تھا۔ کہ مغربی کالج تارک الدنیا راہب پیدا نہیں کرتے۔ یورپ

کے دارالعلوم ہندوستانی پاٹ شالا اور مکتب نہیں بن سکتے۔ تعلیم ایک ایسے ملمع کا نام نہیں جس کا رنگ مختلف ملکوں کی آب و ہوا کے اثر سے بدل جاتا ہے اگر آپ نے مجھے مغربی تعلیم دلوائی تھی تو آپ کیوں اس کے نتائج سے بے خبر تھے۔ میرا جسم یقیناً مشرقی ہے۔ مگر اس میں مغربی روح متحرک ہے۔ میں جس تعلیم اور تہذیب کی گود میں پلا ہوں۔ اس کے تاثرات سے متاثر ہو چکا ہوں۔ اور اب اپنی آئندہ زندگی اسی تہذیب کے مطامح نظر کے مطابق بسر کرنا چاہتا ہوں۔"

باپ نے شاید محض غلط بحث کی غرض سے یا بیٹے کے جوش کو فرو کرنے کی خاطر کہا۔ "مگر یہاں ہم ہندوستانی ہیں۔ مغربی تہذیب کے مطابق زندگی کیسے بسر کر سکتے ہیں؟"

منصور نے ایک فیصلہ کن لہجہ میں جواب دیا۔ "قبلہ یہ مغربی تہذیب نہیں۔ بیسویں صدی کی تہذیب ہے ہر صدی نئے خیالات نئے جذبات۔ نئے مطامح نظر نئی ممکنات کو اپنے ہمراہ لیکر پیدا ہوتی ہے۔ وہ ملک جو سب سے پہلے ان اثرات کو قبول کر لیتا ہے۔ ان جذبات کا محرک ان خیالات کا موجد ان مطامح نظر کا بانی مبانی تصور کر لیا جاتا ہے۔ دنیا مجبور ہو جاتی ہے کہ اس کی پیروی کر کے اپنے اقتدار و اعتبار کو بڑھائے مصر نے، یونان نے، ہندوستان نے اپنے اپنے دوران اقتدار میں دنیا بھر کے عالم خیال پر حکومت کی۔ اور دنیا کو مجبور ہو کر ان کے معیار تہذیب و تمدن کے سامنے جھکنا پڑا۔ مگر اب مصر اپنی تہذیب کے دفتر سمیٹ چکا۔ یونان کے تمدن کی داستان قصۂ پارینہ ہو گئی۔ ہندوستان اپنا فلسفہ زمانہ سلف کی خاک گمنامی میں دفن کر چکا۔ بیسویں صدی کے تاثرات کو سب سے پہلے مغربی اقوام نے قبول کیا اور اپنا لیا۔ کس قدر بے انصافی ہے اگر ہم اس صعودت بیزار ہو کر تنزل کی عمیق گہرائیوں کی طرف اترنا شروع کر دیں۔ اور اپنی دماغی قوتوں کو نئی فضاؤں میں پرواز کرنے سے روک دیں محض اس لئے کہ اس تہذیب کا نام مغربی تہذیب رکھ لیا گیا ہے۔"

باپ نے ذرا ترشروئی سے جواب دیا۔ "ہمارا مذہب اس مادی تہذیب کو کبھی گوارا نہیں کر سکتا۔"

معلوم ہوتا ہے کہ منصور اس جواب کے سننے کیلئے پہلے ہی سے تیار تھا۔ اس نے بڑے وثوق سے کہا۔ "مذہب کے قوانین اور اخلاق کے اصول معاشری تبدیلیوں سے پامال نہیں ہوتے۔ کوئی مذہب ترقی کا دشمن نہیں۔ کوئی اخلاقی اصول جائز خوشیوں کا مخالف نہیں۔ بلکہ مذہب، قانون اور اخلاق کی بندشوں کا

احساس ایک پرامن اور مطمئن زندگی بسر کرنے میں زیادہ یقین کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ انسان اطمینان و مسرت کی ممکنات سے مایوس ہو کر دلیر ہو جاتا ہے۔ اور ان خوفناک نتائج پر پہنچ جاتا ہے جو مذہب و اخلاق کی بلند عمارت کو ہلا دیتے ہیں۔ ناامیدی انسان کو نیکی بدی کی تمیز سے شرم و حیا کے پاس سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ ایسے انسان نیک لوگوں کو ہی نہیں بلکہ نیکی کے اصول کو بھی حقارت سے دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ آپ کا فرض ہے کہ مجھ کو اس کیفیتِ قلبی سے بچائیں۔"

باپ نے بیٹے کی فصاحت سے مرعوب ہو کر اس کے خیال کو کسی دوسری بحث کی طرف منعطف کرنے کی کوشش کی "ممکن ہے کہ تم جو کچھ کہتے ہو سچ ہو۔ لیکن تمہاری شادی کا مسئلہ اتنا اہم تو نہیں کہ اگر ہم اس بارے میں تمہاری رائے سے اتفاق نہ کر سکیں تو تم مذہب اور اخلاق ہی سے بیزار ہو جاؤ"

منصور نے ایک پُر درد لہجہ میں جواب دیا۔

" اگر شادی کا مسئلہ ہی اہم نہیں تو پھر اور کونسا مسئلہ اہم ہو سکتا ہے۔ اپنی مرضی کے خلاف شادی کر لینا انسانیت کی پستی اور حیوانیت کی فتحمندی ہے کسی دوسرے شخص کو یہ حق کبھی حاصل نہیں ہو سکتا کہ وہ میری زندگی کی رفیق کو اپنی پسند اور اپنے معیار کے مطابق انتخاب کرے۔ آخر مجھے کیوں مجبور کیا جاتا ہے۔ کہ میں ایک غریب عورت کی زندگی کو برباد کر دوں میں یہ صرف اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے نہیں کہتا۔ بلکہ وہ عورت جسے آپ میری بیوی بنانا چاہتے ہیں۔ حق رکھتی ہے کہ مجھے دیکھے۔ میرے مذاق طبیعت کا مطالعہ کرے۔ میری سیرت سے واقف ہو جائے اور اگر ہم دونوں اپنی ذمہ داریوں کے پورے احساس سے، ایک دوسرے کی خوبیوں اور عیبوں سے آشنا ہو کر فیصلہ کر لیں کہ ہم ایک دوسرے کے لئے مفید ہو سکتے ہیں تو یہ شادی ہے ورنہ میری بیوی ایک قضا سے مبرم ہوگی اور میرا گھر ایک زندہ جہنم۔"

باپ نے اپنے دل ہی دل میں کچھ فیصلہ کر کے جواب دیا۔ "خیر اب تم آرام کرو۔ میں ذرا غور کر کے جواب دونگا"

اس غور و فکر کا جو نتیجہ ہوا وہ یہ تھا کہ چند روز بعد منصور کی شادی ہو گئی۔ کسی انتخاب یا پسند کے بغیر۔ کسی اظہار رائے یا تبادلۂ خیالات کے بغیر، ماں کی منتوں، بہنوں کی زاریوں اور باپ کی ضد نے منصور کے فلسفیانہ دماغ پر فتح پالی۔ ایک انسانی زندگی خاندانی روایات اور مُلکی رسوم پر قربان کر دی گئی!

منصور نے اپنی بیوی کو دیکھا۔ اور اُسے ویسا ہی

پایا۔ جیسی اُسے توقع تھی۔

ہندوستانی شادی کی بساط پر کوئی خوش قسمت ہی من مانی بازی لے جاتا ہے۔ مگر وہ بے رحم نہ تھا۔ ناانصاف نہ تھا۔ اس نے مہینوں اس بات پر صرف کر دئے کہ وہ یا تو اپنی بیوی کو اپنی طبیعت کے رجحانات سے واقف کردے یا خود ہی اس کے میلان خاطر کے مطابق بن جائے مگر ایک چھوٹے سے چھوٹے کیڑے کو پیدا کرنے کے لئے بھی ایک خدا کی ضرورت ہے۔ یہ تو ایک انسان کی تخلیق کا سوال تھا۔ اسی کوشش میں دو تین سال گذر گئے۔ اب وہ اپنے دل کو انتخاب کی ممکنات سے بھی نہ گرما سکتا تھا۔ ایک ناموافق طبیعت عورت کو دیکھ کر اُسے عورت کی ذات سے نفرت ہوگئی۔ اور اُس نے تمام ملک کی عورتوں کو قابل نفرت تصوّر کرلیا۔ اس کی خوشی اب ایک سرابِ خیالی ہوگئی۔ اس کا اطمینان ایک ایسا خوابِ پریشاں جو شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ مگر جب درد حد سے بڑھ گیا۔ اور بےبسی دلیری سے تبدیل ہوگئی۔ تو وہ اپنی راحت و مسرت کو ہر قیمت پر خریدنے کے لئے تیار ہوگیا۔ اس نے اپنے مادی فلسفہ کی مدد سے فیصلہ کرلیا۔ کہ انسانی زندگی ایک غلطی پر قربان نہیں کی جاسکتی اور دوسروں کی خوشی اپنی خوشی کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

اب اس نے عورت کو محض ایک شغلۂ فرصت تصوّر کرلیا ہے۔ اب وہ بد اخلاقی کی عمیق گہرائیوں میں گرتا جاتا ہے۔ گھر سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ اس کے والد قبر کی تاریک تنہائی میں اس کی پریشانیوں سے بے خبر ہیں۔ اور اس کی بیوی اپنے خاوند کی دائمی مفارقت کے رنج سے زندہ درگور۔

افراد کی آسائش قوم و ملک کی آسائش ہے۔ زندگی ہے۔ ترقی ہے۔ افراد کی پریشانی قوم اور ملک کے شیرازے کی پریشانی ہے۔ تباہی ہے۔ موت ہے۔ وہ افراد جو اس ملک کی آئندہ ترقی و بہبودی میں حصّہ لینے والے ہیں زیادہ تر ان روحانی پریشانیوں ان معاشرتی مشکلات میں مبتلا ہیں۔ ایسے مضطرب دل و دماغ ملک و قوم کے لئے کبھی مفید نہیں ہوسکتے۔ مغربی تعلیم و تہذیب کی رو اب نہیں رک سکتی۔ وہ آوازیں جو اس تعلیم و تہذیب کے برخلاف بلند ہو رہی ہیں۔ اس دورِ ارتقاء کی شورش میں فنا ہو جائینگی۔ کیا منصور کی زندگی عبرت کا ایک روشن سبق نہیں؟ کیا ہندوستان بھر میں کوئی ایسا ذمہ دار شخص نہیں جو اس معاشرتی مسئلہ کی اہمیت کو سمجھے اور اپنے ملک کی بے شمار زندگیوں کو منصور کے انجام سے بچاتے؟

آنریری ایڈیٹر

سُنہرا پیار

وہ ان گیتوں کو گاتی تھی جو چڑیوں نے اسکو سکھائے تھے۔ لیکن وہ انہیں چڑیوں سے بھی زیادہ رسیلے طور پر گاتی تھی۔ وہ طنبورے کی آواز پر والہانہ انداز میں ناچتا۔ اس سے زیادہ بے تکلفی سے کسی خانہ بدوش سازندہ کے ہاتھ ساز پر نہ کھیل سکتے تھے۔ اور وہ دونوں اپنی موسیقی کی لے میں سست سڑکوں کے کنارے چلے جایا کرتے۔ وہ کون تھے؟ شاید یہ سوال انہیں بے انتہا پریشان کر دیتا انہیں صرف اتنا یاد تھا کہ انہیں بستر کبھی میسر نہیں آئے نہ کبھی دسترخوان پر کھانا کھانا نصیب ہوا۔ جو لوگ گھروں میں بستے اور دن میں کئی کئی مرتبہ لباس تبدیل کرتے ہیں۔ ان کے کنبے میں سے نہ تھے۔ ان کا کوئی کنبہ تھا ہی نہیں۔ جب وہ بہت چھوٹے تھے۔ اتنے چھوٹے کہ بمشکل بول سکتے تھے۔ تو ایک شاہراہ پر ان کی ملاقات ہوئی۔ وہ ایک گھنے جنگل میں سے آ رہی تھی اور وہ ایک کھائی میں سے نکل رہا تھا۔ نہ جانے اُن کی مائیں اُنہیں وہاں کیوں چھوڑ گئی تھیں؟

دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ لئے۔ اور وہ ہنس پڑے۔ اس روز کچھ مینہ برسا تھا لیکن دُور ایک کھلے میدان میں سُنہری پگڈنڈی نظر آ رہی تھی۔ وہ سُورج کی روشنی کی طرف چل پڑے۔ کیونکہ ان کے سفر کا رُخ صرف خوشگوار موسم پر منحصر تھا۔ اگر جنگلوں کی سرزمین میں ندیاں نہ بہا کرتیں۔ اور گاؤں کی بھلی عورتیں کبھی کبھار سوکھی روٹی کے ایسے ٹکڑے جو پرندوں کے کھانے کے قابل بھی نہ ہوتے تھے۔ انہیں نہ دیا کرتیں۔ تو وہ بھوک اور پیاس کے مارے مر جاتے۔ ان خانہ بدوش بچوں کی فلاکت اور میلی رنگت کو دیکھ کر جی اداس ہو جاتا تھا۔ پر ایک روز صبح کو —— اب وہ اچھے بڑے ہو گئے تھے —— کسی درخت کے نیچے گھاس پر سوتے سوتے وہ جاگے۔ تو یہ دیکھ کر بڑے حیران ہوئے۔ کہ وہ ہونٹوں سے ہونٹ ملائے سوتے رہے ہیں۔ ہونٹوں کے ملنے سے انہیں بڑی ٹھنڈک سی محسوس ہوئی۔ آنکھیں کھول کر انہوں نے اپنی نیند کے لطف کو جاری رکھا اس کے بعد انہوں نے اپنی فلاکت کی کبھی پروا نہ کی۔ وہ اگر ملول تھے تو پھر کیا تھا۔ وہ مسرور بھی تو تھے اتنی جگر خراش کوئی مصیبت نہیں جتنی رسیلی محبت ہے۔ ان کے کپڑے برائے نام اور پھٹے پرانے تھے۔ ان میں سورج ان کو جھلستا اور مینہ بھگوتا تھا لیکن وہ ان لوگوں پر رشک

نہ کرتے۔ جو گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچانے والے لباس اور سردیوں میں پوستینیں پہنتے تھے۔ تار تار کپڑے نا گوار نہیں گزرتے۔ اگر تم اپنے محبوب کو ان دھجیوں میں بھی خوشنما معلوم ہو۔ اور شاید کتنی بیگمات غریب فقیر لڑکی جیسی کھال پانے کے بدلے میں اپنے نفیس ترین لباس دے ڈالتیں۔ وہ تمام دن ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں چکر لگاتے۔ جوک میں یا متمول لوگوں کے عالیشان مکانوں کے سامنے جن کی کھڑکیاں کبھی کبھار کھلی ہوتیں۔ سراؤں میں جہاں خوش مزاج دیہاتیوں کا دستر خوان بچھا ہوتا تھا۔ رُک جاتے۔ وہ اپنے گیت گاتی۔ اور وہ اپنا طنبورہ بجاتا۔ اگر انہیں چند پیسے مل جاتے ــــ اور ایسا کئی مرتبہ ہوا کیونکہ انہیں دیکھ کر اور ان کی موسیقی سُن کر لوگوں کا دِل خوش ہوتا تھا ــــ تو وہ بہت مسرور ہوتے لیکن اگر کوئی انہیں کچھ نہ دیتا۔ تو انہیں کچھ قلق نہ ہوتا۔ دونوں راضی برضا ہو کر فاقے سے پڑ رہتے۔ دِل بھرا ہُوا ہو تو پھر پیٹ خالی ہونے میں کچھ مضائقہ نہیں۔ اس لاغر فاقہ زدہ کی حالت زیادہ رحم کے قابل نہیں جس کے سامنے رات کے وقت تاروں بھرے آسمان کے نیچے محبت بوسوں کا آسمانی دستر خوان بچھا دے۔

(۲)

لیکن پھر بھی وہ ایک مرتبہ بے حد اداس ہُوتے۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ اور پورے تین روز تک انہیں کہیں سے بھیک نہ ملی تھی۔ وہ لڑکھڑاتے ہُوتے پھر رہے تھے اتنی توانائی نہ رہی تھی کہ ایک دوسرے کو سہارا بھی دے سکتا۔ انہیں ایک ٹوٹے ہُوتے چھپر تلے جو ہوا کے تھپیڑوں سے انہیں پناہ نہ دے سکتا تھا۔ سر چھپانے کو جگہ ملی۔ وہ پورے زور سے ایک دوسرے کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے۔ لیکن بے طرح کانپ رہے تھے۔ بوسوں میں بھی ان کے منہ کو بار بار یاد آ جاتا تھا۔ کہ انہیں کھانے کو کچھ نہیں ملا۔ اف رے مصیبت کے مارو! آج کی یاس کے ساتھ کل کے متعلق بے اطمینانی آتی تھی۔ کریں تو کیا کریں۔ کسی سخی کا ہاتھ اُن کی امداد کو نہ بڑھا۔ تو انجام کیا ہوگا۔ ہائے یوں جوانی میں سب سے مایوس ہو کر سڑک کے کنارے ان پتھروں پر پڑے پڑے۔ جو انسان کے دل سے زیادہ سخت نہیں۔ دم توڑ دیں؟

وہ بولی‘ جو کچھ تمام دُنیا کو حاصل ہے۔ ہمیں کبھی نصیب نہ ہوگا؟ تھوڑی سی آگ جو ہمیں گرمی پہنچاتے۔ اور پیٹ پالنے کے لئے ایک ٹکڑا مانگنا بھی بہت ہے؟ یہ ظلم نہیں کہ اتنے لوگ عمدہ اور گرم گھروں میں مزے سے پڑے سو رہے ہیں۔ اور ہم سردی میں چڑیوں کے ان بچّوں کی طرح کانپ رہے ہیں۔ جن کے نہ پر ہوں۔ نہ کوئی آشیانہ ہو۔“

لیکن اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس وہ رو پڑا۔ یکلخت

یکلخت اتنی جلدی کہ انہیں معلوم ہوتا تھا۔ وہ مرکر جنت میں پہنچ چکے ہیں۔ انہیں ایک تجلی نے گھیر لیا۔ اور ایک خاتون ان کی طرف بڑھی۔ اس کا چہرہ روشن اور ملائک فریب تھا۔ اس نے زری کی ایک بھڑکیلی پشواز پہن رکھی تھی اور اس کے ہاتھ میں ایک طلائی چھڑی تھی۔

وہ بولی۔ "میرے بے بس بچو! تمہاری بے بسی سے مجھے بہت صدمہ ہوا۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں غریبوں سے غریب تر رہنے کے بعد اب تم امیروں کے امیر بن جاؤ گے بہت جلد تمہارے پاس اس قدر خزانہ ہوگا۔ کہ تمہیں دنیا میں اتنے صندوق نہ مل سکیں گے۔ جن میں تم اسے رکھ سکو۔"

یہ سنا تو انہیں ایسا معلوم ہوا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہے ہیں۔

"بیگم! بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"تم نہیں جانتے کہ میں پری ہوں اور میرے نزدیک کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ اب سے جب کبھی تم میں سے کوئی اپنا منہ کھولیگا۔ اس کے منہ سے سونا جھڑے گا۔ اور ہمیشہ جھڑتا رہیگا۔ جتنی دولت کا تم تصوّر کر سکتے ہو۔ اس کے حاصل کرنے میں کوئی تمہارا مزاحم نہیں ہو سکتا۔"

یہ کہہ کر پری غائب ہو گئی۔ چونکہ اس اچنبے پر وہ دم بخود تھے۔ اور ان کے منہ کھلے ہوتے تھے۔ ان کے منہ سے اشرفیاں اور طلائی سکے یوں جھڑنے لگے گویا سونے کی برکھا برس رہی ہے۔

(۳)

اس کے کچھ عرصے بعد لوگوں کا محبوب ترین موضوع گفتگو ایک نوّاب اور اس کی بیگم کا تذکرہ تھا۔ وہ ایک محل میں رہتے تھے۔ جو عظمت میں ایک شہر کا شہر اور درخشانی و تابانی میں تاروں بھرے آسمان کی مانند تھا۔ اس کی دیواریں نایاب ترین سنگ مرمر کی تھیں۔ جن میں نیلم اور پکھراج جڑے تھے مگر اس کے اندرونی سامان تعیش کے مقابلے میں اس کی بیرونی شوکت کچھ حقیقت نہ رکھتی تھی۔ اگر کوئی اس کے بیش قیمت سامانِ آرائش کا بیان شروع کر دے ان تمام طلائی مجسموں کا جو ایوان کی زینت تھے۔ ان تمام جڑاؤ جھاڑ فانوسوں کا جو چھت کے نیچے جگمگ جگمگ کرتے تھے۔ تو شاید یہ داستان کبھی تمام نہ ہو۔ ان عجائبات کو دیکھنے سے آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں۔ اور اس ایوان میں محل کا مالک وہ ضیافتیں کیا کرتا جنہیں تمام بے نظیر کہتے تھے۔ لمبے لمبے دسترخوانوں پر جن کے گرد بے شمار لوگ جمع ہوتے تھے۔ لذیذ ترین کھانے اور مشہور ترین شرابیں چنی جاتیں ملازم سونے کے طشتوں میں پرندوں کے کباب لگا کر لاتے تھے۔ ایک سے ہی بیش قیمت پتھر سے بنے ہوئے ساغروں میں مئے ارغوانی حاضر کرتے تھے۔ اگر کوئی مصیبت زدہ غریب جیسے ایک

روز کھانا نصیب نہ ہوا ہو۔ یکلخت اُس ضیافت کدے میں جانا۔ تو حیرت اور مسرت کے مارے دیوانہ ہو جانا۔ اس کے ساتھ ہی جو لوگ کھانا کھاتے تھے۔ وہ اپنے اس میزبان کی تعریف و توصیف میں جو ان سے یوں شاہانہ انداز سے پیش آتا تھا۔ کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے تھے۔ لوگوں کو سب سے زیادہ یہ امر خوش کرتا تھا۔ کہ نواب اور بیگم جب کبھی بولتے یا کھانا کھانے کو منہ کھولتے تو اس سے سونا برسنا شروع ہو جاتا تھا۔ اور ملازم سونے کو ٹوکریوں میں بھر لیتے۔ اور ان لوگوں میں جو نقل کرنے کے بعد بھی بیٹھے رہتے تھے۔ تقسیم کر دیتے تھے۔

اس قدر دولت اور سخاوت کا حال اتنا مشہور ہوا کہ پرستان تک جا پہنچا۔ اور ایک پری نے ۔۔ اسی نے جو زرتی کی پشواز پہنے اس شکستہ چھپر میں گئی تھی، جو انہیں ہوا کے تھپیڑوں سے پناہ نہ دے سکتا تھا۔ ارادہ کیا کہ اپنی آسامیوں سے ملنے کو جائے۔ تاکہ ان کو جو مسرت اُس نے بخشی تھی۔ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ اور ان کے شکریئے قبول کرے۔ لیکن جب جھٹپٹے کے وقت وہ اس پرتکلف حجرہ میں پہنچی جس میں نواب اور اس کی بیگم آرام کرنے آئے تھے تو وہ بہت حیران ہوئی۔ خوشی ظاہر کرنے یا اس کا شکریہ ادا کرنے کی بجائے وہ اس کے قدموں میں گر پڑے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو اُمڈے چلے آتے تھے۔ صدمے کے باعث وہ سسکیاں بھر رہے تھے۔

پری بولی "یہ کیا۔ میں کیا دیکھ رہی ہوں! تم اب بھی اپنی قسمت پر شاکر نہیں ہو!"

"آہ بیگم ہم اتنے تونگر ہیں کہ اگر آپ نے رحم نہ کیا۔ تو ہم غم کے مارے مر جائیں گے۔"

"کیوں! اپنے خیال میں تم کافی متمول نہیں ہو؟"

"ضرورت سے بہت زیادہ!"

"تو کیا تم اس وجہ سے پریشان ہو۔ کہ تمہارے منہ سے سونے کے سوا اور کچھ نہیں برستا؟ اور تنوع کا لطف لینا چاہتے ہو۔ تو میں سنگ بہشت کے انڈوں جتنے بڑے بڑے ہیرے اور نیلم برسنے کا انتظام کر دوں؟"

"آہ ہمیں اس سے بچاؤ!"

"نواب تم ہی بتاؤ تم کس چیز سے پریشان ہو کیونکہ سچ مچ میں نہیں بوجھ سکتی ہوں۔"

" پری۔ اس میں بڑا لطف ہے کہ سردی لگے تو گرم ہونے کا سامان موجود ہو۔ اور بھوک لگے تو کھانے کو مل جائے۔ لیکن ایک چیز ان دونوں سے بھی بہتر ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ جب محبت کی جائے تو ہونٹوں کو چوم لیا جائے۔ جب سے تم نے ہمیں متمول بنا دیا ہے۔ ہم اس خوشی سے نا آشنا ہیں۔ ہائے ہم جب کبھی ملانے کے لئے اپنے

ہونٹوں کو جدا کرتے ہیں۔ پلید اشرفیاں اور مہیب سکے ہمارے منہ سے نکلنے لگتے ہیں۔ اور ہم صرف سونے کو چوم سکتے ہیں"

پری بولی۔" افسوس مجھے اس تکلیف کا خیال نہ آیا تھا۔ لیکن اس کا کوئی علاج بھی نہیں۔ اسے برداشت کرنے کو تمہیں اپنے آپ کو تیار ہی کرنا پڑیگا"

"ہرگز نہیں ہم پر ترس کھائیے۔ جو خوفناک تحفہ آپ نے ہم کو بخشا ہے۔ آپ اسے واپس نہیں لے سکتیں؟"

"لیکن یہ سمجھ لو۔ کہ تمہاری نہ صرف سونا برسانے کی قوت جاتی رہیگی۔ بلکہ ساتھ ہی وہ تمام دولت جو تم نے حاصل کی ہے چھن جائیگی"

"پھر کیا ہے"

پری بولی۔" تو پھر تمہاری مرضی پوری ہوتی ہے"

پری کے چھڑی سے چھونے کی دیر تھی۔ کہ وہ ایک مرتبہ پھر اسی شکستہ چھپر میں جو ہوا کے تھپیڑوں سے پناہ نہ دے سکتا تھا۔ موجود تھے۔ اور کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ جو حالت پہلے ان کی تھی۔ وہی اب پھر تھی۔ فاقہ زدہ۔ نیم برہنہ۔ وہ سردی کے مارے کانپ رہے تھے۔ ان چڑیوں کے بچوں کی طرح جن کے نہ پر ہوں نہ کوئی آشیانہ ہو۔ لیکن وہ گلے شکووں سے باز رہے۔ اور اس وقت ان پر خوشی سے بھی لطیف تر ایک کیفیت طاری تھی۔ جب ان کے ہونٹ آپس میں مل رہے تھے۔

(از کنول منديرہ)

تاج

غزل

بتاؤں کیا کہ سوزش آہِ فرقت کی کہاں تک ہے　　یہ دل سے حلق تک اور حلق سے میری زباں تک ہے

قفس میں کاش آنکھیں بھی مری صیاد سی دیتا　　کہ پروازِ نگاہِ یاس صحن گلستاں تک ہے

کسی کے ہجر میں کیونکر نہ ہم جی کھول کر رو لیں　　طراوت کشتِ دل کی چشمہائے خونفشاں تک ہے

ہے دِل کے پار تیرِ ناز یا دل میں خدا جانے　　میں کہتا ہوں یہاں تک ہے وہ کہتے ہیں وہاں تک ہے

بہارِ ان عندلیبوں کے لئے ہے خانہ بربادی　　کہ جوشِ آتشِ گل آشیاں سے آشیاں تک ہے

اثر اس پر نہیں ہے ورنہ تاثیرِ فغاں میری　　اِدھر ساتوں زمیں تک ہے اُدھر نہ آسماں تک ہے

شراروں سے مرا ہر اک نفس ہے گلفشاں شاؔمی　　کہوں میں کیا رگوں میں جلتے خوں آتش کہاں تک ہے

گناہ کی قربانی

اُس نے سر کی ایک جنبش تمکنت سے اپنے سیاہ چمکتے ہوئے بالوں کو ماتھے پر سے ہٹا کر اپنی آنکھوں کی کشش کو ایک ناقدانہ نگاہ سے دیکھا اور پھر کہا "کون ہے جو مجھ سے محبت نہیں کریگا"

وہ آئینہ خانہ میں بیٹھی تھی۔ ایک قد آدم آئینہ اس کے روبرو تھا جس میں اُس کے حسن کی تمام رنگینیاں جذب ہو رہی تھیں۔ اس نے ایک ڈھیلا ڈھالا اسنجوابی کا لباس پہن رکھا تھا جس کی باریک تہیں اسکے صبیح جسم کو اس طرح نمایاں کر رہی تھیں جس طرح ایک بلوری کنٹر میں شراب چھلک رہی ہو۔ ہر چند کہ وہ ایک مصری ماں کی لڑکی تھی لیکن اس نے وہ کھلتا ہوا سانولا رنگ نہ پایا تھا۔ جو مصری عورتوں کے لئے مخصوص ہے اس کا حسن حُسنِ فرنگ کہلائے جانے کا مستحق تھا۔ وہی حُسنِ فرنگ جس کی تعریف میں ایران کے شاعروں نے دفتر کے دفتر سیاہ کئے ہیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اسکے ترچھے ترچھے نقش و نگار نے دمکتے ہوئے کندنی رنگ کے ساتھ ملکر اس شراب کو دوآتشہ کر دیا تھا۔

طاقت بنفسہ خطرناک ہے۔ مگر جب صاحبِ طاقت کو یہ بھی معلوم ہو جائے۔ کہ وہ طاقت رکھتا ہے تو اس کے بے پناہ اثرات کا کچھ ٹھکانا نہیں رہتا۔ عائشہ کو علم تھا کہ وہ حسین ہے۔ اور کونسی حسین عورت ہے جسے معلوم نہ ہو۔ کہ وہ حسین ہے۔ مگر عائشہ اپنے حسن سے کام لینا جانتی تھی۔ بچپن سے اس نے ایسے مدرسے میں تعلیم پائی جہاں حسن بیچا جاتا ہے۔ اور خریدا جاتا ہے۔ زندگی اس کے لئے خوابِ تعیش کی تعبیر تھی۔ پہلا سبق جو اسے اس مدرسہ میں دیا گیا یہ تھا کہ "دولت کو اپنے ہاتھ میں لاؤ" جس سرعت اور تن دہی سے اس نے اپنے فرض کو پورا کیا۔ اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ اس کے سیمیں پاؤں پر طلائی ٹکلیوں کے انبار لگ گئے۔ اُس نے اس روپیہ کا بہترین استعمال کیا۔ ہر وہ سامانِ عیش جو روپیہ دے کر خریدا جاسکتا تھا۔ مہیا کیا گیا۔ مشرق و مغرب کے نوادر دُنیا کے کونوں سے ڈھونڈ کر لائے گئے۔ اور یوں اُس کا دیوان خانہ ترتیب کیا گیا۔ وہ خوش تھی اور بہت خوش کیونکہ ابھی تک اس کی زندگی کا مقصد حصولِ زر تھا۔ روپیہ کے نشے اور حُسن کے غرور نے اس کو ہر ایک شے

سے بے نیاز کر دیا تھا۔ تھوڑا عرصہ اس پر یہی حالت طاری رہی۔ اس کے جذبات کی بے حسی تعریف اور خوشامد سے بھی بے نیاز تھی۔ مگر عمل کی اس کشاکش کا نتیجہ آخر کار ایک زبردست ردِّ عمل کی صورت میں نمودار ہوا۔ اگرچہ وہ احساس کرتی تھی کہ یہ سب کچھ اس کے حسن کی بدولت ہے۔ مگر اس بے مصرف حسن سے جو نہ ایک کے لئے تھا۔ اور پھر کسی کے لئے بھی نہ تھا۔ وہ تنگ آچکی تھی۔

عائشہ کی حسیات نے کروٹ بدلی۔ اس کے جذبات کی سوئی ہوئی دنیا جاگ اٹھی۔ وہ بے حسی جو اس پر مدت سے طاری تھی یکسر اضطراب ہو گئی۔ اس کے سینہ میں جذبات کا ایک سمندر موجیں مارنے لگا۔ اس کو احساس ہوا کہ اس کے شباب کی رعنائی ابھی تکمیل تک نہیں پہنچی۔ پہلے وہ دولت و حشمت کو حسن کا [illegible] تصور کرتی تھی۔ اب اسے حسن کی غربت پر [illegible] آنے لگا۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں خلا پیدا ہو گیا۔ اسے ایک ایسے وجود کی خواہش ہونے لگی۔ جو اس کی دولت سے بے نیاز ہو کر اسے چاہے۔ جو اس [illegible] سے چاہے جو اس کے حسن سے مغلوب ہو جانے کے بعد بھی اس پر غالب رہے۔ جس کی بے پروا مردانگی اس کی نسوانی خصوصیات کو زیادہ شوخ کر دے۔ زیادہ دلفریب بنا دے پہلے پہل جب اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا تو اسے غرور تھا کہ وہ جسے چاہیگی۔ اپنا بنا لیگی۔ اس نے اپنے مکان کو ایک عشرت کدہ بنا لیا جہاں ہر ایک شخص کے لئے دعوت عام تھی۔ اس تمام مجمع میں وہ اپنے مقصودِ نظر کو ڈھونڈتی۔ مگر اس کی حسیات کو جس میں دولت کا تکلف اور حسن کی نفاست تھی سخت صدمہ پہنچتا۔ جب وہ دیکھتی کہ ان تمام نام نہاد مردوں کے گروہ میں اظہار آرزو کے وہی عام طریقے رائج ہیں۔ جن میں اقدام گناہ کا شائبہ ہے۔ جن میں ابتذال کا عنصر ہے۔ وہ ان تمام باتوں سے تنگ آچکی تھی اس کا دل اس قسم کی زندگی پر ملامت کرنے لگ گیا۔ وہ رقص کرتی اور اپنے شباب کے تمام [illegible] کو اپنے حسن کی تمام [illegible] پاؤں کی لرزشوں میں چھپا دیتی۔ [illegible] گھنگروؤں کی جھنکار میں پنہاں کر دیتی۔ لیکن [illegible] کا سمجھنے والا کوئی نہ تھا۔ آہ کوئی نہ تھا۔ ہوس [illegible] دولت [illegible] تھے۔ وہ محبت چاہتی تھی وہ گاتی اور اپنے گانے میں ان تمام آرزوؤں کا اظہار کر دیتی۔ جن کے لئے اس کا بے چین دل تڑپ رہا تھا۔ ان گیتوں میں سوز ہوتا۔ درد ہوتا۔ اور لوگ حیران ہوتے کہ اس عشرت کی دیوی پر کیا مصیبت آپڑی ہے۔

آخر کار ناامیدی نے اسے مغموم کر دیا۔ اس کی نورانی پیشانی پر غم و اندوہ کے سیاہ بادل چھا گئے۔ اس

کے قدم آمادۂ لغزش تھے۔ مگر اس کا دل ہوس میں ڈوب جانے کے باوجود پاک تھا۔ آخر کار محبت کے اندھے دیوتے نے ایک تیر چلایا۔ اور وہ عائشہ کے مضطرب دل میں پیوست ہو گیا۔ مگر اس تیر کے لگتے ہی جہاں عائشہ زخمی ہوئی۔ وہیں اس کے غرور کے جذبات بھڑک اُٹھے۔

وہ اپنے محبوب کے خیال میں غرق بیٹھی تھی جس نے آئینے میں اپنے جسم کے تناسب کو غور سے دیکھا۔ اور پھر دل ہی دل میں کہا۔ "میں اسے کھینچ لاؤنگی جیسے میری زلفوں کے کالے ناگ ڈسیں۔ وہ نہیں بچ سکتا اُف میں خود آئینے کو دیکھ کر بیخود ہوئی جاتی ہوں۔ مجھ میں یہ تغیر کس نے پیدا کر دیا۔ جواد نے۔ نہیں میں پہلے بھی ایسی ہی تھی۔ مگر میرا دل اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ جب سے اس نے یہاں آنا شروع کیا ہے میری حالت کچھ بدل سی گئی ہے۔ مگر جواد تو صفیہ کی طرف زیادہ راغب معلوم ہوتا ہے۔ صفیہ سانولی صورت والی صفیہ۔ یاد رکھ۔ اگر تو میری راہ میں حارج ہوئی تو میں تجھے انہیں ہاتھوں سے اس طرح مسل دونگی جس طرح ایک گلاب کی پتی کو۔"

یہ کہہ کے اس نے میز پر سے ایک بلوریں گلدان میں سے گلاب کا ایک پھول نکالا۔ اور اُسے نوچ کر پھینک دیا۔ پھر اسے اپنے پاؤں سے مسلا۔ اور آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

(۲)

ملحقہ کمرے میں دو شخص باتیں کر رہے تھے۔ شام ہو چکی تھی۔ لیکن ابھی تک کمرے میں کوئی روشنی نہ کی گئی تھی۔ کمرے میں چاروں طرف سیاہ پردے لٹکے ہوئے تھے۔ جو تاریکی میں سایہ نما صورتوں کی طرح مبہم اور خوفناک نظر آتے۔ جا بجا انگریزی طرز کے صوفے ایک خوشنما ترتیب سے رکھے گئے تھے۔ زمین پر ایرانی غالیچوں کا ایک فرش تھا۔ چھوٹی چھوٹی میزیں بھی موجود تھیں۔ جن پر عجیب و غریب طرز کی منقش چادریں ڈال دی گئیں تھیں۔ دیواروں میں گہرے سبز رنگ کی الماریاں نصب تھیں۔ جن پر نہایت باریک کام کھدا ہوا تھا۔ ایک طرف ایشیائی طرز کے طاقچوں میں طرح طرح کے رنگین بلوریں گلاس اور طشتریاں سجائی گئیں تھیں۔

دونوں میں سے ایک نے جس کے لہجہ کی پستی جوان ہونے کا پتہ دیتی تھی۔ کہا۔ "سعید آج کمرے میں روشنی کیوں نہیں؟"

دوسرے نے جواب دیا۔ "تمہاری باتوں میں ایسا محو ہوا کہ کسی بات کا خیال نہیں رہا۔"

پہلے شخص نے گہری آواز میں کہا۔"گناہ ہمیشہ تاریکی کو پسند کرتا ہے۔"

سعید نے آگے بڑھ کر بجلی کا ایک بٹن دبایا۔ تمام کمرہ بقعۂ نور ہو گیا۔ اور دونوں کے چہرے روشنی میں چمکنے لگے۔ سعید اوسط قد کا آدمی تھا۔ بھرا بھرا چہرہ آنکھوں سے مکاری ظاہر ہوتی تھی۔ ٹھوڑی کی گولائی غیر مستقل مزاجی کو نمایاں کر رہی تھی۔ دوسرے شخص کی صورت زیادہ تفصیل کی محتاج ہے۔ وہ ایک بلند بالا نوجوان تھا۔ لمبے بازو، فراخ چھاتی۔ چہرے سے متضاد جذبات پیدا تھے۔ تنگ پیشانی۔ لمبی ناک۔ رخسار ابھرے ہوئے۔ آنکھوں سے ایک بے نیازی کی شان ٹپکتی تھی۔ مگر ہونٹوں کا ایک خاص خم عشرت پسندی پر دلالت کرتا تھا۔ داہنے ہاتھ کی چھنگلی میں انگوٹھی کا ایک قیمتی نگینہ چمک رہا تھا۔ اس نے سگرٹ کا ایک کش لیا۔ اور پھر کمرے کے سامان کو بغور دیکھ کر کہا۔

"بیوقوف آدمی میں آج اپنا سب سے بڑا شکار پھنسانا چاہتا ہوں۔ اور کمرے کی یہ حالت۔"

دوسرے شخص نے کچھ گھبرا کر کہا۔"میں اب تمہارے کسی کام میں شرکت گوارا نہیں کر سکتا۔ آج سے اس کمرے میں جوئے کی میزیں نہ بچھائی جائینگی۔"

جواد نے قہقہہ لگایا۔"سات سال کا عرصہ ہونا ہے۔ کہ ہم گناہ میں شریکِ کار ہیں۔ عین اسوقت جب زندگی خوشگوار ہوتی چلی جا رہی ہے تم گھبرا رہے ہو۔ مردِ خدا خیال تو کرو۔ کہ میں تمام ہمت کو اس آخری پانسے پر لگا رہا ہوں۔ اگر قسمت نے یاوری کی۔ اور تم نے بزدلی نہ دکھائی تو ہم لکھ پتی ہو جائیں گے۔ لکھ پتی! سنتے ہو۔"

سعید نے جو اس تقریر سے مرعوب ہوتا چلا جا رہا تھا۔ سنبھلنے کی ایک ناکام کوشش کی۔

"زیادہ طمع نہ کرو۔ ہم کافی روپیہ کما چکے ہیں۔ ایسا نہ ہو۔ کہ یہ ہوس ہمیں قانون کے پنجہ میں پھنسا دے۔"

دوسرے نے گویا اس بزدلی پر جھنجھلا کر کہا۔"عمر نے تمہارا سر پھرا دیا ہے۔ اب تمہاری رگوں میں وہ خون حرکت نہیں کرتا جس کی وجہ سے سات سال پہلے میں تمہارا ساتھی بن گیا تھا۔"

سعید نے اس زمانہ کی نسبت خیال دوڑاتے ہوئے کہا۔"آہ وہ کیسا وقت تھا۔ جب میں تمہارے پھندے میں آگیا۔"

"پھندے میں آگیا۔ میں نے تمہیں بنا دیا۔ تم شہر کے رئیس گنے جاتے ہو۔ اس سودے میں نقصان تو مجھے ہی رہا۔ میں وہی جواد ہوں۔ بدمعاشوں کا بدمعاش غنڈوں کا غنڈا۔ میں نے تمہارے لئے اتنا کچھ کیا تم

میرے لئے ذرا سی قربانی نہیں کر سکتے"۔

سعید خاموش رہا۔

"سعید احسان فراموش نہ کہلاؤ"۔

"مجھے احسان فراموشی کا الزام نہ دو۔ تم جانتے ہو کہ میں اپنی دولت سے ہمیشہ تمہاری مدد کرتا رہا ہوں"۔

جواد کے چہرے پر ایک حقارت آمیز تبسم پیدا ہوا۔

"وہی دولت جو میری وجہ سے کمائی گئی تھی"۔

سعید نے تنگ آکر کہا "میری تمام دولت لے لو مگر مجھے اپنے معیب کاموں میں شامل نہ کرو"۔

"یہ دولت میرے لئے ناکافی ہے۔ تمہیں آج میری مدد کرنا ہوگی۔ یاد رکھو۔ اگر میرے حکم کی تعمیل نہ ہوئی تو کل تمام دنیا پر روشن ہو جائیگا۔ کہ سعید جیسے دولتمند کے مکان پر کیا ہوتا رہا ہے۔ عائشہ اور صفیہ قاہرہ کی عدالت عالیہ میں گھسیٹی جائینگی۔ اور میں سرکاری گواہ بن کر تمام رموز کو طشت از بام کر دونگا۔ آہ۔ کیا اچھا منظر ہوگا۔ تمہارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں عائشہ اور صفیہ کے گداز بدن سپاہیوں کی کرخت گرفت میں اور اس عالیشان مکان پر حکومت کا قبضہ ہوگا"۔

سعید نے کہا "خاموش۔ دیوار ہم گوش دارد"۔

یہ کہکر وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ گویا کمرے میں سے کوئی سپاہی نکلکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیگا۔

جواد نے اور زیادہ تندی سے کہا۔ مجھے مجبور نہ کرو۔ اگر آج مجھے کافی روپیہ حاصل ہوگیا۔ تو میں اپنی زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دونگا۔ اور تم جواد کو پہچان نہ پاؤ گے"۔

سعید نے دل ہی دل میں کچھ فیصلہ کرکے جواب دیا "اچھا آج آخری بار ایک جلسۂ عیش منعقد کیا جائیگا۔ جو گذشتہ تمام جلسوں کو مات کر دیگا۔ ضیافت نظر کیلئے صفیہ اور عائشہ کو موجود کیا جائیگا۔ اور عائشہ آج آخری دفعہ اپنا مشہور ناچ "رقص شباب" ناچے گی وہ اپنے تمام انداز و ادا کو صرف کر دیگی۔ کہ تمہیں اس قسمت کی بازی میں کامیابی نصیب ہو۔ مگر یاد رکھو۔ اگر تم اس دفعہ ناکامیاب رہے تو پھر میرے مکان کے دروازے تمہارے لئے کبھی نہ کھلینگے"۔

جواد نے خود اعتمادی کے انداز سے کہا۔ جواد جس کام کو کرنے کی ٹھان لے۔ اسے ضرور پورا کریگا۔ اور یہ کہکر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

(۳)

جواد سر جھکائے ہوئے چلا جا رہا تھا۔ کہ اسے اپنے پیچھے پاؤں کی آہٹ محسوس ہوئی۔ پھر یکایک کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ جواد نے مڑکر دیکھا عائشہ کھڑی ہنس رہی تھی۔ اس نے ایک سفید گون پہن رکھا

تھا جس کی سیاہ پٹی سفیدی کے مقابلہ میں بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ جوّاد کی پیشانی پر شکن پڑ گئی۔

"تم یہاں کہاں"

عائشہ نے آہستہ سے جواب دیا "کیا میری موجودگی تمہیں ناخوش کر دیتی ہے۔"

"تمہاری موجودگی مجھے ناخوش کیوں کرنے لگی۔

"تو کیا میرا آنا تمہارے لئے خوشگوار ہے"

جوّاد نے سوال کو ٹال کر کہا "صفیہ کہاں ہے"

عائشہ نے جھنجلا کر کہا "صفیہ۔ ہر وقت صفیہ۔ تم اُسے مجھ پر ترجیح کیوں دیتے ہو"

یکایک جوّاد پر حقیقت روشن ہو گئی۔ عائشہ کی اس بے معنی جھنجلاہٹ نے جوّاد کو وہ کچھ سمجھا دیا۔ جو کوئی عورت دفتروں میں نہیں سمجھا سکتی

اب اس نے بہت نرمی سے کہا "اے عائشہ تم میں ابھی تک بچپن ہے"

وہ ضبط نہ کر سکی۔ اس نے سر جھکا لیا۔ مگر آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ جوّاد سمجھتا تھا کہ اُس وقت اُس کو تسلی دینا یا ہاتھ لگانا ہلاکت ہے۔ وہ مغلوب تھی لیکن ذرا سی کمزوری اسے غالب بنا دیتی۔

پھر جوّاد نے اُس کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ اور اس کی آنکھوں کے آگے ایک اور تصویر آ گئی اسے اپنی محبت کا زمانہ یاد آیا۔ وہ نوجوان تھا۔ اور ناتجربہ کار ہوس نے اس کی آنکھوں پر پردے ڈال دیے۔ ایک بھولی بھولی بہار کے موسم میں اُس موسم میں جب پھول کھلتے ہیں اور سبزہ لہلہاتا ہے۔ اس نے بھی ایک لڑکی سے محبت کی تھی۔ مگر وہ ناپاک محبت تھی۔ اس لڑکی نے اپنے شوہر کی امانت کو جوّاد کے قدموں پر نثار کر دیا۔ آہ وہ کس قدر ایثار کرنے والی عورت تھی۔ بلند بالا۔ کنول کی سی آنکھیں رکھنے والی۔ بالکل بھولی۔ مگر جوّاد نے اس کی محبت کی قدر نہ کی۔ وہ جلد اس فرسودگی سے گھبرا گیا۔ اب اسکی التجائیں جن میں پشیمانی اور ندامت بھی شریک تھی جوّاد کے دل پر کارگر نہ ہوتی تھیں۔ وہ ہمیشہ کہا کرتی تھی۔ "جوّاد مجھے چھوڑ کر نہ چلے جانا" آخر کار وہی ہوا جس کا اسے خوف تھا۔ خزاں آ گئی۔ اور پھول مرجھانا شروع ہوا۔ جوّاد کی محبت بھی ایک دن مرجھا کر رہ گئی۔ ایک دن وہ ناگہاں غائب ہو گیا۔ اور فریب خوردہ معصوم نے خودکشی کر لی۔ وہ انہیں خیالات میں غرق تھا۔ عائشہ نے اس کے شانہ پر سر رکھ دیا۔ جوّاد نے سختی سے اُسے پیچھے ہٹا دیا۔ مگر پھر لجاجت سے کہا۔ عائشہ میں تمہاری محبت کے قابل نہیں۔

"اُس نے بپھری ہوئی ہیرنی کی طرح کہا۔

"کیا تمہیں صفیہ سے محبت ہے۔"

جواد نے پرسکون آواز میں کہا۔ "میں اب کسی سے محبت نہیں کر سکتا۔"

عائشہ نے جواب دیا "میں محبت کی طالب نہیں میرے لیے یہی کافی ہے کہ تم میری محبت سے واقف ہو گئے۔ مگر یاد رکھنا۔ تم نے عائشہ کی محبت کو ٹھکرایا ہے۔ میری محبت رقابت کو گوارا نہیں کر سکتی۔ یا تو تم اپنی باقیماندہ زندگی بغیر محبت کے بسر کرو گے یا مجھ سے محبت کرو گے۔

وہ جھپٹ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اب اس کے دل میں صرف ایک خیال تھا۔ اس ہستی کا پتہ لگانا جو جواد کی محبوب تھی وہ اپنے فن کی ماہر تھی۔ اسکے سامنے لاکھوں دفعہ اظہار آرزو کیا گیا تھا۔ اسے کھوٹے اور کھرے میں تمیز کرنا معلوم ہو چکا تھا۔ گفتگو سے تمام دل کے بھیدوں کو پا لینا اس کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ تھا اس کے تجربے نے گواہی دی کہ جواد یا تو کسی اور سے محبت کرتا ہے یا ایسی محبت میں مبتلا رہ چکا ہے۔ جس کی یاد اس کے دل سے ابھی نہیں مٹ سکتی۔ اس کا مستقل ارادہ تھا کہ دونوں صورتوں میں وہ جواد کے محبوب کو ڈھونڈ نکالیگی اور پھر ۔ ۔ ۔ ۔

اس نے اپنی ریشمی پیٹی کی طرف دیکھا۔ جس میں ایک ننھا خنجر کا دستہ نکلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ یہ دستہ ہاتھی دانت کا تھا۔ جسے خوبصورت نقش و نگار سے مزین کیا گیا تھا۔

اس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک پیدا ہو گئی۔

یکایک اسے سامنے کے دروازے پر دستک سنائی دی۔ اس نے اپنی حبشی خادمہ کو آواز دی۔ مگر وہ موجود نہ تھی۔ اس نے خود بڑھ کر دروازہ کھولا۔ اور اپنے آپ کو ایک اجنبی کے مقابل پایا۔

"کیا میں عائشہ خانم سے مخاطب ہو رہا ہوں"

اس نے اجنبی کی طرف تعجب سے دیکھا۔ اس کا لباس ہندوستانیوں کا سا تھا۔ گھیرے دار شلوار، سر پر ایک سفید عمامہ رکھے ہوئے۔

عائشہ نے ایک نیم تبسم میں اپنی تمام حیرت کو چھپاتے ہوئے پوچھا۔ "آپ مجھے کس طرح جانتے ہیں"

وہ جھک کر آداب بجا لایا۔ "کون ہے جو قاہرہ میں آپ کو نہیں جانتا"

عائشہ نے احساس غرور سے متاثر ہو کر کہا۔ "آپ کو تعریف کرنے میں کمال حاصل ہے ۔۔ مگر اندر آ جائیے"

وہ چپ چاپ اس کے پیچھے چل دیا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر عائشہ نے اسے کرسی پیش کرتے ہوئے کہا۔ "کہئے۔ کیسے آنا ہوا"

اجنبی نے عائشہ کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھا "خانم صاحبہ جو کچھ میں کہونگا۔ یہ صیغہ راز رہیگا"

عائشہ کا نسوانی اشتیاق بھڑک اُٹھا۔" آپ بلاتکلف کہیئے۔ یہاں لوگوں کے راز پوشیدہ رکھے جاتے ہیں۔"

اجنبی کچھ عرصہ سوچتا رہا۔ وہ اپنی آنکھوں کو سامنے کی دیوار پر گاڑے خیالات میں غرق تھا۔ عائشہ اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کہ کرخت سے نقش ونگار پر عمر نے اپنا نقش ثبت کیا تھا اس کے ہاتھ کسی اندرونی جذبے سے کانپ رہے تھے۔

یکایک وہ بولا۔" کیا میں آپ پر بھروسہ کر سکتا ہوں" اور یہ کہکر اس نے اپنی تیز آنکھیں جن میں پاگلوں کی سی خونی چمک پیدا ہو گئی تھی۔ عائشہ کی طرف پھرائیں۔ وہ جھجک گئی۔ اور خوف سے لبریز آواز میں جواب دیا۔" کس بات کی نسبت"

اجنبی نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔" یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ میری رسوائی کی داستان۔ مگر لو سنو۔ عرصہ ہوتا ہے۔ کہ میں جوان تھا۔ ابھی ناکامیوں نے میرے چہرے کو ایسا مکروہ نہیں بنایا تھا۔ جیسا تم دیکھتی ہو۔ لوگ مجھے دولتمند کہتے تھے۔ مگر میں اپنی بیوی کو اپنی تنہا دولت سمجھتا تھا۔ بہت عرصہ میں اس فریب میں مبتلا رہا۔ اور میری زندگی شہنشاہوں کی سی زندگی رہی۔ پھر ایک دن قسمت کی ستلون دیوی مجھ سے بگڑ گئی۔ بُری طرح بگڑ گئی۔ مجھے بے زر ہو کر روزگار کی تلاش میں باہر جانا پڑا غریب الوطنی میں میرا سہارا صرف بیوی کا خیال تھا جس نے مجھے زندہ رکھا۔ آخرکار زمانے نے ایک اور نیا ورق بدلا میں پھر امیر بن گیا۔ ایک جذبہ مسرت سے لبریز۔ ایک احساس امید سے مملو میں گھر جا پہنچا۔ مگر مجھے معلوم ہُوا۔ کہ میری بیوی مر چکی۔"

وفور جذبات سے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے مگر اس نے اپنے آپ کو روک کر زیادہ پر زور آواز میں کہنا شروع کیا۔" اس نے خودکشی کر لی تھی مجھ پر مصیبت کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ بہت عرصہ مجھے اس بات کی تلاش رہی۔ کہ اس کی خودکشی کا باعث کیا تھا۔ مگر مجھے کچھ پتہ نہ ملا۔ ایک دن اتفاق سے میں اپنے ردّی خطوط کو پھاڑ رہا تھا۔ کہ ان میں سے چند مجھے اپنی بیوی کے نام ملے جن کا سواد تحریر میرے خط سے بالکل مختلف تھا۔ میں نے انہیں کھول لیا۔ وہ عاشقانہ خط تھے۔ اُن خطوں سے مجھ پر تمام حقیقت آشکارا ہو گئی۔ انہیں خطوں کا لکھنے والا میری بیوی کا قاتل تھا۔ وہ ان ذلیل ہستیوں میں سے تھا۔ جو محبت کے نام کو بدنام کرتی ہیں۔ بُزدل۔ کمزور۔ ناتواں ہستی۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ جبتک اسے نہ ڈھونڈ نکالوں گا چین سے نہیں بیٹھونگا۔ میں مارا مارا پھرتا رہا۔ تمام ملکوں کو چھان مارا۔ مگر میرے راجپوتی خون کا جوش فرو نہ ہُوا۔ آخر مجھے پتہ مل گیا۔

عائشہ جو اس کے ہر ایک لفظ کو بڑے غور سے سن رہی تھی۔ چونک اٹھی۔

"وہ کون شخص ہے؟"

اجنبی نے سوال کو ٹال کر پوچھا۔" بیگم صاحبہ۔ اگر آپ کے ملک میں کوئی ایسی حرکت کرے۔ تو اسے کیا سزا دی جاتی ہے؟"

عائشہ نے چھوٹتے ہی جواب دیا۔" موت"

"ہاں ہاں موت۔ وہ شخص آپ کے ہاں ہے۔ آپ خود اس کی زندگی کی نسبت حکم لگا چکی ہیں"

کمرے کی فضا ایک دردناک چیخ سے گونج اٹھی" وہ سب کچھ سمجھ گئی۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا تمہارا مطلب جوّاد سے ہے؟"

"جوّاد۔ ان دنوں اس کا نام کچھ اور تھا"

عائشہ نے پہلو بدلا" کیا تم نہیں سمجھتے۔ کہ جو کچھ تم نے کہا ہے۔ میں تمہیں اس کی بنا پر پولیس کے حوالے کر سکتی ہوں"

اب اجنبی کے پریشان ہونے کی باری تھی۔ کچھ عرصہ وہ خاموش رہا۔ پھر اس کے لبوں پر ایک حقارت آمیز تبسم نمودار ہوا۔

"قاہرہ کی حسین ترین عورت نے اپنا محبوب اچھا نہیں انتخاب کیا۔"

اس نے تن کر جواب دیا۔" انتخاب میرا ہے۔ آپ کا نہیں"

اجنبی نے ایک بے پناہ تیر چلایا" مگر آپ کے محبوب کا انتخاب اچھا تھا"

عائشہ نے رقابت سے جل کر کہا۔" خاموش"

اجنبی ہنسا" بیگم صاحبہ۔ اس نے ہم سب کو الّو بنایا ہے۔ اس کا زندہ رہنا ٹھیک نہیں۔ کیا آپ نہیں سمجھتیں کہ وہ آپ کو دھوکہ دے رہا ہے۔ مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے۔ کہ اسے صفیہ سے محبت ہے"

اس آخری جملے نے عائشہ کی تمام قوتوں کو شکست دیدی۔ اس نے اپنا سر میز پر رکھ لیا۔ مگر معاً اس کے دل میں ایک اور خیال پیدا ہوا۔ اس نے اچھل کر پوچھا" تمہیں یہ کیسے معلوم ہے؟"

غیور راجپوت نے غرور سے جواب دیا" میں جوّاد کی نسبت کیا نہیں جانتا۔ کیا اب آپ میری مدد کرینگی"

اس نے ایک اضطراری فیصلے سے مجبور ہو کر جواب دیا" بیشک۔ بتاؤ میں تمہاری کس طرح مدد کر سکتی ہوں"

اس نے کہا میری تجویز مکمل ہے۔ آپ کا صرف اتنا کام ہوگا۔ کہ آپ مجھے جوّاد کے کمرے میں کہیں چھپا دیں۔ میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں۔ کہ آج تک میں نے جوّاد کو اس کی اصلی صورت میں نہیں دیکھا۔ اس لئے

کہ وہ پولیس کے خوف سے باہر لباس تبدیل کر کے جاتا ہے۔ وہاں اور بھی لوگ موجود ہونگے۔ آج اُس نے ایک اور شخص کو یہاں آنے کی دعوت دی ہے۔ میں اُن سب میں سے اُسے پہچان نہ پاؤنگا۔ آپ اپنے ہاتھ میں ایک گلاب کا پھول رکھیں۔ اور رقص کرتے کرتے وہ پھول جوّاد کی گود میں ڈال دیں۔ آگے میرا کام ہے۔"

(۵)

ملحقہ کمرے میں تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ چھت سے صرف ایک لمپ لٹکا ہوا تھا جس کی روشنی تاریکی کو اور نمایاں کر رہی تھی۔ ایک چھوٹی سی میز کے اردگرد تین چار آدمی جوا کھیل رہے تھے۔ جوّاد نشے میں بدمست تھا۔ اس کی آنکھیں خونِ کبوتر کی طرح سُرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے شراب کا ایک جام اُٹھایا۔ اور سعید کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔

"تم نہیں پیتے حد کرتے ہو۔"

یہ کہہ کر غٹا غٹ چڑھا گیا۔

کمرے کے ایک گوشے میں عائشہ اور صفیہ ناچ رہی تھیں۔ اندھیرے میں اُن کے ارغوانی لباس آگ کے شعلوں کی طرح چمکتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ ناچتے ناچتے عائشہ میز کے قریب آ گئی۔ اس کے پیازی لبوں پر ایک خوشگوار تبسم تھا۔ مگر یہ تبسم کرب کی انتہائی شدتوں کو چھپائے ہوئے تھا۔ غور سے دیکھنے سے معلوم ہو سکتا تھا کہ اس کی پیشانی پر ہلکے سے شکن پڑے ہوئے ہیں۔ نرگسی آنکھوں سے وحشت برس رہی ہے۔ کان کی لویں تمتمائی ہوئی ہیں۔ وہ جوّاد کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ جو میز پر سے روپوں کا ایک انبار سمیٹ کر اپنے آگے رکھ رہا تھا۔

اس نے عائشہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ "آج میری قسمت کا ستارا عروج پر ہے۔"

اس نے اپنے جذبات کو چھپا کر جواب دیا۔ "نظر تو یہی آتا ہے۔"

وہ بہت عرصہ کھیلتی رہی۔ حتےٰ کہ جوّاد کے آگے روپوں اور نوٹوں کا انبار لگ گیا۔ اب اس کی بدمستی انتہا تک پہنچ چکی تھی۔ اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔

زہرا پھر رقص کرنے لگی۔ اس کے ہاتھ میں ایک گلاب کا پھول تھا۔ اس نے ایک پتی نوچی۔ اور فرش پر پھینک دی۔

بیداغ سفید غالیچے کے مقابلہ میں وہ پتی تازہ خون کا ایک داغ معلوم ہونے لگی۔ عائشہ اور آگے بڑھی اور بڑھ کر پھول سعید کی گود میں ڈال دیا۔ ایک خوفناک دھماکا ہوا۔ اور سعید نے اپنی چھاتی کو دونوں ہاتھوں سے

تھام لیا۔ اس کی قمیص پر خون کا ایک داغ نمودار ہوا۔ اور حیرت انگیز سرعت سے بڑھتا گیا۔ اس نے چیخنے کی کوشش کی۔ مگر چیخ اس کی لبوں تک آکر رہ گئی اور وہ کرسی سے نیچے گر پڑا۔

ایک بے حس و حرکت لاش۔

اسی اثنا میں تاریک پردوں کے پیچھے سے ایک سایہ نما صورت بجلی کی سی تیزی کے ساتھ نکل کر غائب ہوگئی جواد کا نشہ ہرن ہوگیا۔ وہ کرسی پر سے چونک کر اٹھا۔ اور لرزتی ہوئی آواز میں زہرا کو مخاطب کرکے کہا

"ناپاک عورت تو نے ایک اور گناہ کا بوجھ اپنے سر پر لیا۔ میں جانتا تھا۔ کہ سعید نے تجھے اس ذلت آمیز زندگی کے بسر کرنے پر مجبور کیا ہے۔ مگر مجھے یہ خبر نہ تھی کہ تو اس سے اس طرح انتقام لیگی۔" اور یہ کہکر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ باقی تمام لوگ بھی اسکے تعاقب میں چل دئے۔

عائشہ کمرے میں اکیلی رہ گئی۔ اسکا لباس بے ترتیب ہو رہا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ سرمگیں آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ چہرے پر انتہائی اذیت کی علامات نمودار تھیں۔ اس نے وفور جذبات سے مجبور ہوکر باواز بلند کہا۔

"یہ ہے گناہ کی قربانی کا نتیجہ۔ آہ۔ جواد نے کیا سمجھا" اور بیہوش ہوکر کمرے میں گر پڑی۔

سید عابد علی عابد

کلام شاد

تیرے ہجر میں زندگی جاں گسل ہے
توقف نہ کر جام بھرنے میں ساقی
حسینوں میں یہ دلبری شان تیری!
جو ہیں اہل دل وہ کہیں حال دل کا
شب غم میں دشوار ہے آہ کرنا
لگائی جو تھی عشق نے روز اوّل

یہی بھول سا دل لیجئے یہ سہل ہے
کہ پیمانۂ عمر پیماں گسل ہے
یہی استخواں ہے یہی آب و گل ہے
یہاں مدتوں سے جگر ہے نہ دل ہے
کچھ اندر سے دل خود بخود مضمحل ہے
وہی آگ اس وقت تک مشتعل ہے

نہ کہہ شاد احوال خلوت کا دل کی
جہاں غیر تو غیر خود تو مخل ہے

خودسر صاحبزادہ

"مکرمی ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

یہ آخری خط ہے۔ جو مَیں اس بارے میں لکھ رہا ہوں۔ مَیں قطعی فیصلہ کر چکا۔ آپ قبلہ پیر صاحب سے ذکر کر دیجیئے گا۔ افسوس ہے کہ مجھے آپ کی مرضی کے خلاف کرنا پڑا۔ مگر مَیں مجبور ہوں۔ "یہ سارا رشتہ قسمت سے میسر آتا ہے۔ وہ اگلے زمانہ کے بزرگ ہیں۔ اس وقت کے حالات کو نہیں سمجھتے۔ مناسب تو یہی تھا کہ میری خواہش کو مدِّنظر رکھتے ہوئے انکار نہ کرتے۔ مگر خدا جانے وہ کیا سوچتے ہیں۔ اگر اب بھی مان جائیں تو خیر۔ ورنہ مَیں تو وہی کرونگا۔ جس کا مَیں ارادہ کر چکا۔ اُمید ہے آپ بخیریت ہونگے۔

آپ کا نیاز مند صادق"

یہ اس خط کی نقل ہے۔ جو میر عابد علی صاحب کے صاحبزادہ صادق نے اپنے والد کے ایک ہمنشین کو علیگڈھ کالج سے لکھا۔ میر صاحب نے سُنا۔ اور بیٹے کی خود رائی پر سر پیٹ لیا۔ وہ گذشتہ سال سے اُس کی شادی کی فکر میں تھے۔ ایک شریف گھرانے میں انتظام بھی ہو چکا تھا۔ اور قریب تھا۔ کہ منگنی کی رسم ادا ہو جاتی۔ کہ صادق نے بطور خود مختلف ذرائع سے ٹوہ لینی شروع کی۔ اپنے ایک بے تکلف دوست کو اس کام پر مامور کیا۔ اُس نے اپنی ایک قریبی رشتہ دار سے اعانت چاہی۔ اور اس تمام کوشش کا نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ صادق نے ایک گمنام چٹھی کے ذریعے سے میر عابد علی صاحب پر واضح کر دیا۔ کہ وہ لڑکی کو پسند نہیں کرتا میر صاحب بیچارے سخت پریشان ہوئے جھٹ علیگڈھ پہنچے۔ صاحبزادہ سے کچھ کہا سُنا۔ مگر اُس نے ایک نہ مانی وہ یہی کہے گیا۔ "مجھے لڑکی پسند نہیں۔ میر صاحب لڑکے کی گستاخی پر بہت سٹ پٹائے۔ بہتیرا بُرا بھلا کہا۔ مگر اُس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا۔ یہ میرا کام ہے۔ اور مجھے اپنی رفیقِ زندگی کے انتخاب میں پورا حق حاصل ہے۔" میر صاحب مایوس ہو گئے۔ لڑکی کے باپ سے بہت گہرے تعلقات تھے۔ وہ ہمیشہ کے لئے جلتے رہے۔ اور بہت خفت اُٹھانی پڑی۔ جتنے مُنہ اُتنی باتیں۔ جو کسی کے مُنہ میں آیا کہہ گیا۔ یہ بیچارے شریف آدمی۔ لوگوں میں مُنہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ صاحبزادے نے اس پر ہی بس نہیں کی۔ اپنے دوستوں میں غریب معصوم لڑکی کا

مضحکہ اڑایا۔ اور اس کی صورت شکل کے متعلق اس قسم کی بے سروپا باتیں کیں۔ جو ایک تعلیم یافتہ گریجویٹ کی شان کے شایاں نہ تھیں۔ ادھر میر صاحب کو ذلیل کیا۔ اور اُدھر لڑکی والوں کو مفت میں بدنام کر دیا۔ وہ اچھے گھرانے کے لوگ تھے۔ سُن کر خاموش ہو رہے۔ میر صاحب کو بڑا رنج ہُوا۔ اُنہیں خیال تھا۔ کہ لڑکی شریف خاندان کی ہے۔ عادت و اطوار بھلے مانسوں کی اولاد کے سے ہیں۔ بیاہی آئیگی۔ تو گھر آباد کر دیگی۔ مگر دل کی دل ہی میں رہی۔ صاحبزادے نے معزز باپ کی مرضی کو شباب کے فوری جذبات پر قربان کر دیا۔ اور محض اپنے دوستوں کی غیر یقینی اطلاعوں پر اعتبار کر کے برسوں کے تعلقات پر خاک ڈلوا دی۔ میر صاحب کچھ دن تو بہت غمگین رہے۔ صاحبزادہ کو بے دردی سے کوساکئے۔ اور یہانتک آمادہ و تیار تھے۔ کہ اس سے قطع تعلق کر لیں۔ مگر پدرانہ محبت غالب آگئی۔ جلدی سب کچھ بھول گئے اور از سر نو رشتہ کی تلاش ہونے لگی۔ اُدھر صادق نے ایک روز صاف صاف مُنہ پر کہہ دیا۔ کہ میں اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کرونگا۔ میر صاحب نے ڈانٹا ڈپٹا۔ اس کی گستاخی پر لعنت ملامت کی۔ بے حیائی پر سخت سُست کہا۔ مگر اُس نے ایک نہ سُنی۔ اور یہی کہے گیا۔ کہ والدین کا کوئی حق نہیں۔ کہ شادی اور مذہب کے بارے میں دخل اندازی کریں۔

صادق کی تربیت صحیح طریقے پر نہیں ہُوئی تھی۔ ابھی دو ہی برس کا تھا۔ جو ماں کو اپنے خاوند کی بیرُخی کی شکایت پیدا ہوئی۔ اور وہ غریب اپنے جھمیلوں میں پڑ گئی۔ ہر شام جب میر صاحب کچہری کے کام سے فارغ ہو کر گھر آتے تو جھگڑا شروع ہو جاتا۔ بیوی تھی بدسلیقہ۔ معمولی سی بات بڑھتے بڑھتے بتنگڑ بن گئی۔ تمیز دار ہوتی تو ہار مان کر خاوند کو اپنا کر لیتی۔ مگر اُس نے بدقسمتی سے ضد سے کام لیا۔ میر صاحب نے بھی روز کے جھگڑوں سے تنگ آکر اپنا دل پتھر کا کر لیا۔ اور یوں میاں بیوی کے درمیان اجنبیت کا پردہ پڑ گیا۔ رفتہ رفتہ میر صاحب نے گھر آنا جانا ہی چھوڑ دیا۔ باہر ایک مکان تھا۔ بالکل علیحدہ۔ اُس میں ڈیرا جما دیا اور گھر اور اولاد کی جانب سے بالکل لاپرواہ ہو گئے۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ صادق کی کیا تربیت ہو سکتی تھی جب ذرا ہوش سنبھالا۔ تو دن بھر آوارہ گرد لڑکوں سے گلی کوچے میں کھیلتا پھرتا تھا۔ کوئی خبر لینے والا تو تھا نہیں۔ سب قسم کی بیہودگیاں سیکھ گیا۔ مدرسہ میں داخل ہُوا تو طبیعت میں شوخی اور گستاخی تھی۔ اُستاد بھی اُس کی بدزبانی سے تنگ آگیا۔ ہر روز پیٹتا۔ روز کی سزا نے اُسے ڈھیٹ بنا دیا۔ اور گھر کی روزانہ تُو تُو میں میں نے اُس کا دل سخت کر دیا۔ جوان ہُوا تو اول درجہ کا خود غرض نکلا۔ روپیہ پیسہ کی ضرورت ہوتی۔ تو باپ کے پاس جاتا

اور جب غرض پوری ہو جاتی تو پروا نہ کرتا۔ ماں سے بھی اُس کا کچھ یونہی سا تعلق تھا۔ اُسے صرف خیال تھا تو یہ کہ میر صاحب اُس کی والدہ سے اچھا سلوک نہیں کرتے اُس میں اتنی تمیز تو تھی نہیں کہ اپنی ماں کی خطاؤں پر بھی غور کرتا۔ اسے سراسر میر صاحب کا قصور معلوم ہوتا تھا اور میر صاحب ہی کو وہ گھر کی بے رونقی اور کس مپرسی کا ذمہ دار ٹھیراتا تھا۔ انٹرنس تک پہنچتے پہنچتے کئی سال لگ گئے مگر طبیعت میں ضد تھی۔ لگا رہا۔ اور انٹرنس میں کامیاب ہو گیا۔ اب میر صاحب کی طبیعت نے بھی پلٹا کھایا۔ گھر والی سے تو کوئی سروکار نہ تھا۔ البتہ صادق سے کچھ اُنس سا ہو گیا۔ اور اس خیال سے کہ لڑکا کچھ بن جائے۔ اُنہوں نے اسے علیگڈھ بھیج دیا۔ وہاں پہنچکر اُس نے خوب ہاتھ پاؤں نکالے۔ اور اس قدر خرچ کیا کہ میر صاحب جو کسی زمانہ میں بڑے متدین اور ایماندار خیال کئے جاتے تھے۔ پکے رشوت خوار بن گئے۔ صادق خدا خدا کر کے چار سال کی بجائے چھ سال میں گریجوایٹ ہو گیا اور اس کے بعد وکالت کی سند حاصل کرنے کے لئے علیگڈھ کالج میں ہی داخل ہو گیا۔ وہاں اتفاق سے اُسے چند ایک دوست ایسے مل گئے جو شادی کے بارے میں وہی رائے رکھتے تھے۔ جو صادق کی تھی۔ ایک صاحب بشیر نامی اُس کے ہم جماعت تھے۔ اُن کا خیال تھا۔ کہ مسلمان والدین اپنے لڑکوں کی شادی کے بارے میں بہت بے احتیاطی سے کام لیتے ہیں۔ اور اُن سے مشورہ نہیں کرتے یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کا تمدن روز بروز زوال پذیر ہوتا چلا جاتا ہے وہ کہتے تھے۔ "انگریزوں کی طرف دیکھو۔ کس قدر خوش زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہر ایک کو اختیار ہے کہ جس لڑکی کو اپنی طبیعت کے مطابق پاتے۔ اُس سے شادی کر لے۔ یہاں کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ سب کچھ والدین کی مرضی پر موقوف ہے۔ اگر اتفاق سے کوئی رشتہ ایسا میسر آگیا جو صاحبزادے کی پسند کا ہو۔ تو خیر۔ ورنہ زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔" صادق کو یہ منطق بہت پسند آتی تھی۔ وہ جب اپنے والدین کے بگڑے ہوئے تعلقات پر غور کرتا۔ تو بشیر کی رائے کو ہر طرح سے وزنی اور باوقعت پاتا۔ وہ کہتا۔ یہ کیا ظلم ہے کہ شباب کی اُمنگوں کو والدین کے ہاتھ میں دیدیا جائے۔ اور اختیار رکھتے ہوئے بھی انسان اپنے آپ کو اس قدر بے بس کر لے۔ کہ بیوی کے انتخاب کا حق اُن لوگوں کے سپرد کر دے۔ جن کے جذبات کی تیزی مفقود ہو۔ جن کی آرزوئیں قریباً مر چکی ہوں۔ اور جن کی قوت فیصلہ درماندہ ہو چکی ہو۔ ہوتے ہوتے اُس کے خیالات یقین میں تبدیل ہو گئے۔ اور اُس نے مصمم ارادہ کر لیا۔ کہ وہ شادی کے معاملہ میں والدین کی مرضی کی کوئی پروا نہیں کریگا۔ چنانچہ اُس نے بطور خود جستجو شروع کی۔ اور کامیاب ہوا۔ بشیر کی شادی

ایک امیر خاندان میں ہو چکی تھی۔ اُس کے خسر عبدالقیوم خاں بڑے متمول زمیندار اور خان بہادر تھے۔ سرکار دربار میں اُن کی بڑی عزت تھی۔ اور اُن کے تمام رشتہ دار اچھے اچھے عہدوں پر ممتاز تھے۔ اُن کی چار لڑکیاں تھیں چاروں ہی چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ دو کی شادی ہو چکی تھی اور دو ابھی کنواری ہی تھیں۔ خان بہادر عبدالقیوم خاں صاحب کو ایسے لڑکوں کی تلاش تھی۔ جو نوجوان ہوں تندرست ہوں تعلیم یافتہ ہوں۔ اور اچھے خاندان سے تعلق رکھتے ہوں۔ انہیں دولت اور ملازمت کی پروا نہیں تھی۔ وہ خود اس قدر با اثر اور با رسوخ تھے کہ معقول روزگار دلا سکتے تھے۔ بشیر سے بھی اس بارے میں کئی بار تذکرہ ہو چکا تھا۔ اور وہ اس ٹوہ میں تھا۔ کہ کوئی ڈھب کا آدمی مل جائے۔ تو اس سے اس معاملہ میں بات چیت کرے۔ صادق سے بشیر کو بہت اُنس ہو گیا تھا۔ سوچا کہ اس سے بہتر آدمی ملنا محال ہے۔ سسرال گیا۔ تو سب کچھ کہہ سنایا۔ اُنہوں نے پسند کیا اور اُسے تاکید کی کہ اب کے بار آئے۔ تو صادق کو بھی ساتھ لیتا آئے۔ چنانچہ جب چند دنوں کے لئے کالج بند ہوا تو بشیر صادق کو ہمراہ لیکر دہلی آیا۔ خان بہادر بڑے تپاک سے ملے۔ خوب خاطر و مدارات کی۔ عورتوں نے بھی صادق کو دیکھا اور پسند کیا۔ کالج میں واپس آنے کے بعد بشیر نے شادی

کے مسئلے کا سلسلہ چھیڑ دیا۔ اور کہنے لگا۔ "صادق کیا خوب ہو۔ کہ جہاں میری شادی ہوئی ہے۔ وہاں تمہارا بھی انتظام ہو جائے۔ اگر تمہارے والد اس معاملہ کو چھیڑیں تو میں مقدور بھر کوشش کرونگا۔" صادق نے جواب دیا۔ "بھائی تم امیر ہو تمہارے سسرال والے امیر ہیں۔ ہم غریبوں کی کیا حیثیت ہے۔ خان بہادر کب ماننے والے ہیں۔ ہتک خیال کرینگے۔ اور صاف انکار کر دینگے۔"

بشیر۔ "تم خان بہادر سے ملے۔ اور ان کے اخلاق کا تجربہ کیا۔ تعجب ہے کہ اس پر بھی تمہیں خیال ہے کہ وہ انکار کر دیں گے۔ بندہ خدا میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ انہیں دولت کی پروا نہیں۔ تم کوشش کر کے تو دیکھو۔"

صادق۔ "والد کو لکھنے سے کیا حاصل میں خود ہی کیوں نہ خان بہادر کی خدمت میں درخواست کر دوں۔"

بشیر۔ "یہ نامناسب ہوگا۔ تم والد کو لکھو تو سہی۔ اگر اُنہوں نے نہ مانا تو دیکھا جائیگا۔"

چنانچہ صادق نے ایک مفصل خط میر صاحب کو اس بارے میں لکھا۔ اور استدعا کی۔ کہ خان بہادر صاحب سے ملیں۔ میر صاحب لڑکے کی جرأت پر بے اختیار ہنس دئے۔ انہیں بھی خیال آیا۔ کہ ایک امیر آدمی کب گوارا کر سکتا ہے۔ کہ اپنی لڑکی کنگالوں کے حوالے کر دے۔

خاموش ہو رہے۔ اُدھر صادق اکثر بشیر کی ہمراہی میں دہلی
جاتا رہا۔ خان بہادر صاحب کے ساتھ تعلقات بڑھتے
گئے۔ اور آخر ایک روز جرأت کر کے درخواست کر ہی دی
اُنہوں نے جواب دیا۔ کہ وہ آمادہ ہیں۔ مگر بہتر ہوگا کہ یہ
درخواست اُس کے والد کی جانب سے ہو۔ صادق خوشی
سے پھولا نہ سمایا۔ فوراً میر صاحب کو تار دیا۔ میر صاحب
بیچارے بمصداق مرتا کیا نہ کرتا۔ علیگڈھ پہنچے اور وہاں
سے صادق اور بشیر کو لے کر دہلی آئے۔ ڈرتے ڈرتے
خان بہادر صاحب کی خدمت میں اپنا مطلب بیان کیا۔
اور اپنے افلاس او تنگدستی کی داستان کہہ سنائی۔ اور
کہا کہ میری تمام جائداد لے دے کر یہ لڑکا ہی ہے۔ مجھ
سے کسی اور امر کی توقع رکھنا محال بلکہ ناممکن ہے۔" خان بہادر
صاحب نے جوابدیا۔ "میں صاف کہے دیتا ہوں کہ مجھے
کسی اور شئے کی حاجت نہیں۔ آپ شرائط سُن لیں۔
اُن کے منظور کر لینے کے بعد نکاح کے لئے کوئی سی تاریخ
مقرر کر دیں۔ مجھے کچھ اعتراض نہ ہوگا۔" پھر اُنہوں نے
شرائط کا ذکر کیا۔ خان بہادر ایک لاکھ روپیہ حق مہر چاہتے
تھے۔ اور سو روپیہ ماہوار جیب خرچ لڑکی کے لئے۔
میر صاحب دم بخود ہو گئے۔ اور کہنے لگے۔ کہ میری اس
قدر حیثیت نہیں۔" خان بہادر نے فرمایا۔ "میں مجبور ہوں
ہمارے خاندان میں دیر سے یہ رسم چلی آتی ہے۔ اسکے
بغیر افسوس ہے۔ کہ میں آپ کی خواہش پوری نہیں کر سکتا"
میر صاحب مایوس واپس لوٹے۔ صادق سے ذکر کیا وہ
اس معاملہ کو اپنی خواہش کی روشنی میں دیکھتا تھا۔ کہنے
لگا۔ "آپ نے مان کیوں نہ لیا۔ یہ بوجھ مجھے اٹھانا ہے
نہ کہ آپ کو۔" میر صاحب ناراض ہو گئے۔ کہنے لگے "اگر
یہ بات ہے تو مجھے ذلیل کیوں کراتے ہو۔ جاؤ۔ جو جی
چاہے کرو۔ میں ان جھگڑوں میں پڑنا نہیں چاہتا۔"
صادق کو بھی غصہ آگیا۔ مُنہ بنا کر بولا "آپ کی مرضی۔
میں کہے دیتا ہوں کہ میں اگر شادی کرونگا تو یہیں کرونگا
ورنہ تمام عمر کنوارا ہی رہونگا۔" میر صاحب خاموش ہو گئے۔
کیا جواب دیتے۔ واپس چلے آئے۔ اور گھر پہنچکر ایک
لمبا چوڑا خط صادق کو لکھا۔ اپنے حقوق جتائے۔ اولاد
کے فرائض پر بحث کی۔ آیاتِ قرآنی اور احادیث سے
ثابت کیا۔ کہ والدین کی اطاعت اولاد پر فرض ہے۔
اخیر میں لکھا۔ "میں اس مسئلہ پر غور کر رہا ہوں خان بہادر
صاحب سے بھی خط و کتابت کرونگا۔ تمہیں جلدی نہیں
کرنی چاہئے۔ چندے صبر سے کام لو۔ انشاءاللہ سب کچھ
ٹھیک ہو جائیگا۔" صادق نے یہ خط بشیر کو دکھایا اور
آپس کے مشورے کے بعد صلاح ٹھیری کہ انتظار کرنا
چاہئے۔ اب صادق نے خطوں کا تانتا باندھ دیا۔ ادھر
میر صاحب کی جان عذاب میں آگئی۔ سوچتے تھے۔ تو

مستقبل تاریک نظر آتا تھا۔ نہ جانے رفتن نہ پائے ماندن
انکار کرتے ہیں۔ تو لڑکا ہاتھ سے جاتا ہے۔ اور اگر لڑکے کی
مانتے ہیں۔ تو اس قدر حیثیت نہیں۔ کہ امیر بہو کی ضروریات
کو پورا کر سکیں۔ دونوں صورتوں میں مشکل کا سامنا تھا۔
ادھر صادق نے جب میر صاحب کی طرف سے خاموشی
پائی تو ان کے ہمنشینوں کو لکھنا شروع کر دیا۔ اور آخر
اپنے قطعی فیصلہ کی خبر باپ تک پہنچا دی۔ میر صاحب علیگڑھ
پہنچے۔ بہتیرا کہا سنا۔ مگر اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ دہلی گئے۔
خان بہادر صاحب سے ملے۔ بہت باتیں ہوئیں مگر
خان بہادر صاحب نے حق مہر اور ماہواری جیب خرچ
کے متعلق صاف صاف کہہ دیا۔ کہ کسی قسم کی رعایت ناممکن
ہے۔ تنگ آکر صادق سے کہہ دیا۔ "بھائی میری تو مرضی
نہیں۔ آگے جو تم چاہو۔ کرو"۔ صادق کے سر پر عشق کا
جن سوار تھا۔ خان بہادر صاحب کی منتیں کیں اور انہیں
منا لیا۔ بس پھر کیا تھا نکاح ہو گیا۔ اور صادق کی دلی
آرزو بر آئی۔ جہیز اس قدر ملا۔ کہ غریب لڑکے کی آنکھیں
کھل گئیں۔ دو عالیشان مکان تھے۔ سو ایکڑ زمین تھی۔
اور کپڑے۔ برتن اور دیگر ضروریات کا سامان جو ایک
امیر گھر کے لئے کافی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ تھا۔
جب میر صاحب کو پتہ چلا۔ کہ صادق نے وہی کیا۔ جو وہ
ٹھان چکا تھا۔ تو انہیں سخت صدمہ ہوا۔ جی ہی جی میں
کڑھتے تھے مگر کیا کر سکتے تھے۔ صادق خوشی سے پھولا
نہ سماتا تھا۔ وہ کہتا تھا۔ "میں بڑا خوش قسمت ہوں۔
رضیہ تعلیم یافتہ ہے۔ حسین ہے۔ اس نے میری زندگی
کو روشن کر دیا"۔ زمانہ گذرتا گیا۔ صادق امتحان میں کامیاب
ہو گیا۔ دہلی ہی میں وکالت شروع کر دی۔ اور اپنی والدہ
کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔ رضیہ امیر گھر کی لڑکی تھی اور
مغربی تمدن کی دلدادہ۔ صادق کی ماہوار آمدنی گھر کے
لئے کافی نہ تھی۔ زمین کی پیداوار اور مکان اور ملحقہ
دوکانوں کا کرایہ مل ملا کر اتنی رقم ہو جاتی تھی۔ کہ عزت
سے گذارہ ہو جاتے۔ بس اندازہ کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔
گھر کا تمام انتظام صادق کی والدہ کے ہاتھ میں تھا۔
اور روز کوئی نہ کوئی ایسی بات نکل ہی آتی تھی جس سے
ساس اور بہو کی شکر رنجی ہو جاتی۔ رفتہ رفتہ ان شکر رنجیوں
نے جھگڑے کی صورت اختیار کر لی۔ اور رضیہ اپنی ساس
سے نفرت کرنے لگی۔ وہ اسے حقارت سے دیکھتی اور
اکثر اس کا دل دکھانے کے لئے طعنوں سے کام لیتی۔
صادق سب کچھ سنتا اور دیکھتا۔ مگر رضیہ کو کچھ کہہ نہیں
سکتا تھا۔ آخر ایک دن رضیہ نے اپنی ساس کو گھر سے
باہر نکال دیا۔ اور صادق خون کا گھونٹ پی کر خاموش
ہو گیا۔ وہ بیچاری روتی پیٹتی تن تنہا واپس آگئی۔ اس کا
کم از کم یہ فایدہ تو ضرور ہوا۔ کہ میر صاحب نے سنا تو اپنی

بیوی کی حالت پر رحم آیا۔ گھر گئے اُس کو تسلی دی۔ اور برسوں کی کدورت آنسوؤں کے راستے سے نکل گئی۔ جوں جوں دن گذرتے گئے۔ صادق کو محسوس ہوتا گیا۔ کہ وہ رضیہ کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا اس پر تجربہ نے ظاہر کر دیا۔ کہ وہ غلام ہے اور رضیہ مالک مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ زندگی تلخ ہو رہی تھی۔ مگر وہ اُسے بسر کرنے پر مجبور تھا۔

امیر حسن ناز

سرگرانِ برشگال

آہ! یہ کالی گھٹائیں رُوح پرور، دل کشا
اُڑتی پھرتی ہیں فضا میں چارسو دیوانہ وار
یہ بہار کیف آگیں، یہ ترشح، یہ ہوا
یہ فضا میں بادلوں کا جھومنا مستانہ وار

منظرِ حیرت فزا ہے آسماں کی سطح پر
رعد نالاں ہے اُدھر، بجلی ادھر ہے بیقرار
مست ہیں کیفِ اثر سے اہلِ دل، اہلِ نظر
مستیاں برسا رہا ہے آج ابرِ نوبہار

وائے ناکامی! کہ مَیں خوکردۂ آلام ہوں
وائے قسمت! آج بھی ہے میرے دل کو اضطراب
وائے بربادی! کہ مَیں ناشاد ہوں، ناکام ہوں
وائے محرومی! کہ ہوں حسرت کشِ جامِ شراب

یاد آیا ہے، مقدر اوج پر تھا جب مرا
یاد آیا ہے، کہ جب تھا کامیابِ آرزو
حُسن کی عشوہ طرازی سے تھا لذّت آشنا
دل مرا رہتا تھا وقفِ اضطرابِ آرزو

لاتی تھی برسات میرے واسطے سامانِ عیش
دیتی تھی آکر نسیمِ صبح پیغامِ نشاط

شوق کی سرگرمیاں میرے لئے تھیں جانِ عیش | خود بخود آتا تھا ہونٹوں تک مرے جامِ نشاط

لوٹتا تھا میں بہاریں عالمِ ایجاد کی | زینتِ آغوش رہتا تھا کوئی مستِ شباب
دید نی تھیں مستیاں میرے دلِ ناشاد کی | رہتا تھا اُس رت میں وہ لذت کش جامِ شراب

آہ! سیرِ باغ کو جانا کسی کے ساتھ ساتھ | جھولنا وہ آم کی ڈالی میں جھولا ڈال کر
ہاتھ اک جھولے پہ اور اک ہاتھ میں تھا اس کا ہاتھ | دیکھتا تھا اُس کو میں اور اس کی تھی مجھ پر نظر

حسرتیں برباد، یوں کب تھیں دلِ برباد میں | بخت تھا بیدار میرا اور قسمت اوج پر
جب پپیہا "پی کہاں" کہتا تھا "پی" کی یاد میں | مُسکرا دیتا تھا کوئی میری جانب دیکھ کر

باغ میں پھرتے تھے ہم باہیں گلے میں ڈال کر | چھیڑتے تھے ہم کبھی افسانۂ راز و نیاز
ترجمانِ شوق بن جاتی تھی جب میری نظر | دل نوازی کرتی تھی اس کی نگاہِ دلنواز

وائے قسمت! آج میں ہوں اور دل ناشاد ہے | وہ کہاں پہلو میں جس کا حسن تھا جانِ بہار
حسرتِ دل نکہتِ گل کی طرح برباد ہے | ہیچ ہیں میرے لئے یہ ساز و سامانِ بہار

مضطرب ہے روح میری، دل ہے میرا بیقرار | کاش پیغامِ اجل لائی ہو فصلِ برشگال
آرزو اب یہ ہے میری اے خداوندِ بہار | حسرتوں کے ساتھ ہی ہو جاؤں میں بھی پائمال

سید راز چاندپوری

پیراک

آفتاب اُفق کے قریب پارہ ہائے سیماب میں سے گذرتا ہُوا آہستہ آہستہ غروب ہو رہا ہے۔ ابر کے ٹکڑے اور سمندر کی موجیں اپنی خونیں روشنی کے باقیماندہ حصّہ کو فضائے آسمان، اور سطح آب پر کھینچتی ہُوئی اُفق کی طرف لیجا رہی ہیں۔

کنارے کے درخت پانی پر جُھکے ہُوئے ہیں۔ اور اُن کی شاخیں مستانہ وار جُھوم جُھوم کر سطح آب کا بوسہ لے رہی ہیں۔ یکایک ایک نازک دستِ سیمین نے کنارے کی شاخوں کو ہٹایا، زرین بالوں کا تاج پہنے ہُوئے ایک خوبصورت اور نوجوان نازنین کنارہ پر آئی۔

موجیں اُس کے قدموں پر مشق پرستش کر رہی تھیں۔ آسمان کی سطح لاجوردی پر خون آسا ابر کے ٹکڑے تیر رہے تھے، اور آفتاب الوداعی نگاہوں سے زمین کو دیکھ رہا تھا۔ اور وہ ایک عاشق فطرت کی طرح ان تمام مناظر قدرت کا تماشا دیکھ رہی تھی۔

ہلکی ہلکی نسیم اس کے نازک جسم کو چھو رہی تھی۔ اور بدائع فطرت کے سامنے اپنی لطافت کو پیش کرنے والے اس حسن عریاں کے بوسے لے رہی تھی۔

وہ ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ اور اپنے پیر لٹکا کر پانی سے کھیلنے لگی۔ اُس وقت اس کے جسم پر ایک لطیف رعشہ طاری تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک پانی سے کھیلتی رہی۔ پھر یکایک اُس نے آنکھیں بند کیں۔ دونوں بازو پھیلائے۔ اور موجوں نے اس وجودِ سیمیں کو اپنے آغوش میں لے لیا۔

اُس کی نظریں آسمان کی طرف تھیں۔ لیکن وہ کسی دوسرے عالم کے خیال میں محو تھی۔ اُس نے اپنے جسم کو دریا کی روانی کے سپرد کر دیا۔ جو نہایت لطیف رفتار سے بہ رہا تھا۔ موجیں اس وجود سیمیں کو ایک دوسرے کے آغوش میں دیتی ہوئی لئے جا رہی تھیں۔

(ماخوذ از ترکی)

ابوالمحاسن محمود علی

مالا

ریاض اور میں بچپن سے اکٹھے رہتے تھے۔ ہمیشہ ہم جماعت رہنے اور کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہونے کی وجہ سے ہم میں بہت محبت ہو گئی تھی ہم دونوں سیر و شکار کے دلدادہ اور اپنی جان جوکھوں میں ڈالنے کے عادی تھے۔ موت کا لفظ ہمارے لئے محض ایک لایعنی کلمہ تھا اور ہم کبھی اس سے خائف نہ ہوتے تھے۔

گذشتہ سال ہم دونوں نے گرمی کی تعطیلات کسولی پہاڑ پر گذارنے کا ارادہ کیا۔ مجھے چند ضروری امور کے متعلق انتظام کرنا تھا۔ ریاض کو کسولی سے کما حقہ واقفیت تھی۔ اس لئے میرے بجائے وہ خود مکان تلاش کرنے کے لئے چل دیا۔ اور ایک ہفتہ کے اندر بندوبست کر کے واپس آگیا۔ وہ بظاہر بہت خوش تھا۔ کیونکہ وہ بنگلہ جو اُس نے لیا تھا۔ ایک مقام تنہائی میں واقع تھا۔ اور ہم دونوں کی طبائع کے عین مطابق لیکن کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا۔ کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ مگر الفاظ اس کی زبان پر آکر رک جاتے ہیں۔

کالکا پہنچتے ہی ہم گھوڑوں پر سوار ہوئے اور کسولی پہنچے مالک مکان کو ہمراہ لیا۔ اور بنگلہ کی طرف روانہ ہوتے بنگلے کو دیکھ کر ریاض کے دل میں نہ معلوم کیا خیال پیدا ہوا کہ اُس نے مجھے مخاطب کر کے پوچھا " بھئی یہ بنگلہ آسیب زدہ تو نہیں ہے "

میں نے جواب دیا " بظاہر تو ایسا نہیں معلوم ہوتا پھر میں نے جلدی سے مالک مکان کی طرف دیکھا۔ اور اس سے پوچھا " تمہاری کیا رائے ہے؟ "

مالک مکان نے چالاکی سے اندرونی جذبات کو چھپا کر کہا " میں سیاح آدمی ہوں۔ اس واقعہ کے وقت کسولی میں نہیں تھا۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ شہر کے لوگ کیا کہتے ہیں " آخری فقرہ اس نے ریاض سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔

ریاض نے ذرا کرختگی سے پوچھا " تو کیا تمہیں اس کہانی پر یقین نہیں؟ "

مالک مکان نے گھبراہٹ سے جواب دیا " میری تو سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ میں اسے مانوں یا نہ مانوں۔ خداوند تعالے نے زمین و آسمان میں عجیب و غریب چیزیں بنائی ہیں۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ اس مکان سے کرایہ اچھا خاصہ وصول ہو جاتا ہے "

ریاض نے مکان کی طرف نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

" اس بات میں تو میں تم سے متفق ہوں "

یہ مکان چٹان کی طرح مضبوط تھا۔ اور مستطیل واقع ہوا تھا۔ اس کی ایک طرف ایک بیل اُگی ہوئی تھی۔ جو عجیب انداز سے بل کھاتی ہوئی کھڑکی کے پاس سے گذرتی تھی۔ اس کے پتے نہایت شوخ قرمزی رنگ کے تھے۔

ریاض بولا "یہاں بہت بڑا پریت [illegible] میں تو نہیں رہونگا کیونکہ [illegible]"

میں نے اطمینان سے [illegible] اپنی رائے دینے سے پہلے [illegible] تمام حالات سننا چاہتا ہوں لیکن مجھے اس [illegible] بیل سے عجیب سا [illegible] دیوار کی طرف اشارہ کیا جس پر اس [illegible] کی طرح چمک رہے تھے۔

ریاض نے کہا "پیارے دوست۔ یہی بیل بھوت ہے اسی وجہ سے [illegible] لوگ [illegible] کے پاس [illegible] کبھی اس کے نزدیک نہیں پھٹکینگے۔ مختصر واقعہ یہ ہے۔ چار سال کا عرصہ ہوا کہ جرمنی کے ایک باشندے نے اس مکان کو طویل میعاد کے لئے ٹھیکے پر لیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک خوبصورت عورت تھی۔ جو عمر میں اس سے بہت چھوٹی تھی۔ اس کے بال سیاہ تھے اور کمر تک پہنچتے تھے۔ ان کا باہمی رشتہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ نہ انہوں نے کبھی کسی سے اس کا تذکرہ ہی کیا۔ وہ ہمیشہ تنہا اور خاموش زندگی بسر کرتے تھے۔ تقریباً چھ ماہ کے بعد ایک صبح وہ اپنے ساز و سامان سمیت یکایک غائب ہو گئے۔ خدا جانے انہیں زمین کھا گئی یا آسمان نے کھینچ لیا۔ غرض ان کا کچھ پتہ نہ ملا۔ البتہ اس دن سے یہ سرخ بیل اس مکان کی دیوار کے پہلو میں پیدا ہو گئی ہے۔ دیکھنا وہ کس طرح بل کھاتی ہوئی اور رسّی کی طرح باہم لپٹی ہوئی کھڑکی تک گئی ہے۔ اب لوگوں میں یہ افواہ پھیلی ہوئی ہے کہ رات کے وقت ایک شخص کا سر کھڑکی سے باہر نمودار ہوتا ہے اس نے گلے میں اس بیل کے پتوں کی مالا پہنی ہوتی ہے۔ لیکن مجھے تو یہ کہانی توہم پرست لوگوں کے تخیل کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔"

مالک مکان بولا "جناب ایک نہیں بلکہ کئی بار یہ بیل جڑ سے کاٹ دی گئی ہے۔ لیکن پھر اُگ آتی ہے۔"

میں نے حیرانی سے پوچھا "یہ بات کیا ہے؟"

مالک مکان نے کھانستے ہوئے جواب دیا۔ "یہ تمام بات بیہودہ معلوم ہوتی ہے لیکن شہر میں مشہور ہے کہ اُس اجنبی نے عورت کو قتل کر دیا تھا۔ اور یہ بیل اس کی روح ہے۔"

ریاض نے جھنجھلا کر کہا۔ "یہ تمام لغو ہے۔ اس کی کوئی اصلیت نہیں۔"

میں نے سر ہلا کر جواب دیا۔ "سنو بھئی اگر تمہاری جگہ میں ہوتا۔ تو کبھی اس بنگلہ میں نہ ٹھہرتا۔ مجھے تو یہ بنگلہ منحوس سا معلوم ہوتا ہے۔ جب سے میں نے اسے دیکھا ہے۔ مجھے یہ بیل ڈرا رہی ہے۔ اس کا رنگ اس قدر سرخ کیوں ہے؟"

ریاض خدا بخشے ہمیشہ سے پرلے درجے کا ہٹ دھرم تھا۔ اور اپنی بات پر کسی کا اعتراض نہیں سن سکتا تھا اس نے غصہ سے جواب دیا۔ "تم تو بزدل ہو۔ بندہ خدا مرد ہو کر عورتوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ تمہیں مرد کس نے بنایا تھا۔ مجھے تو یہ رنگ بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔ دیکھو تو بقہ دل کے رنگ کے ساتھ اس قدر ملتا جلتا ہے۔ میں تو ضرور اس بنگلہ میں ٹھہرونگا۔ مجھے کسی روح کے قریب رہنے میں مطلقاً تامل نہیں خصوصاً جب وہ جوان اور خوبصورت ہو۔"

وہ مجھے ان باتوں پر رنجیدہ ہوتے ہوئے دیکھکر زور سے قہقہہ لگا کر ہنسا۔ اس وقت باد نسیم کے سرد جھونکوں نے اس بیل کے پتّوں کو حرکت دی۔ اور ان میں سے سائیں سائیں کی ایک عجیب سی آواز نکلی۔ ریاض ایک قدم آگے بڑھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے بیل کے پتوں کو چھوا اور بولا

"بھئی واللہ۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کسی کا نرم ہاتھ مجھ سے مصافحہ کر رہا ہے۔"

. . . .

ہم اس بنگلہ میں ٹھہر گئے۔ شاید بے حد جرأت کے اظہار کے لئے یا اس خیال سے کہ وہ کمرہ بہترین جگہ پر واقع تھا۔ ریاض نے اپنے لئے وہی کمرہ پسند کیا جس کی طرف کی کھڑکی کے ساتھ بیل اگی ہوئی تھی۔ پہلی رات تو ریاض آرام سے گہری نیند سویا جیسے چھوٹا بچہ تمام دن کے کھیل کود کے بعد تھک کر سو جاتا ہے یا ایک نوجوان اپنی دولہن کے نشے میں مسرت روح افزا سے غافل بستر پر دراز ہو جاتا ہے۔ صبح صبح وہ مجھ سے کہتا تھا "بھئی مجھے تو یہاں بڑی خوشی ہے۔ کیونکہ وہ نازک اندام روح میری محبت سے ... ہے"

ایک دن مجھے ایک ضروری کام آ جانے کی وجہ سے مجھے دہلی جانا پڑا لیکن مجھے ریاض کی حالت کے متعلق تشویش تھی کہ کہیں وہ اس روح کے ہمراہ بستر ہی نہ ہو جائے۔ میں اسے خط لکھنے کے متعلق تاکید کر گیا تھا۔ لیکن قریباً ایک ہفتہ کے عرصہ میں ایک خط بھی نہ آیا۔ آخر میں نے کسولی واپس آنے کی ٹھانی۔ اور اپنے آنے کی اطلاع بذریعہ تار برقی ریاض کو دی۔ لیکن کالکا کے سٹیشن پر ریاض کو نہ دیکھ کر تشویش پیدا ہوئی۔ کیونکہ وہ ہمیشہ صبح سویرے اُٹھ کر سیر کے لئے نکلنے کا عادی تھا۔

اور اسے موقع کا وہ منتظر رہا کرتا تھا۔ میں یہ سمجھ کر خاموش ہو گیا کہ سردی اور بارش کی وجہ سے وہ نہیں آ سکا۔ غرض جب میں بنگلہ پر پہنچا۔ تو ملازم سے معلوم ہوا۔ کہ حضرت ابھی تک پلنگ پر ہیں۔ میں نے اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ معاً میرے ہاتھ کانپنے لگے۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوا۔ کہ کوئی شخص میرے دل کو مٹھی میں لے کر مسل رہا ہے۔ جب میں کواڑ توڑ کر کمرے میں داخل ہوا۔ تو مجھے اس کا بچھونا خالی نظر آیا۔ آخر میں نے دیکھا کہ ریاض کھڑکی کے نزدیک سا دوزانو پڑا ہے۔ اس کی گردن کو بیل کی نرم شاخوں نے جو مالا سے مشابہ تھیں۔ اس طرح جکڑا ہوا تھا۔ جیسے کسی نازک بدن کے دو بازو کسی کے گلے کا ہار ہو جاتیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ریاض بے حس و بے جان پڑا تھا!

بستر پر مجھے ایک خط نظر پڑا۔ جو میرے نام لکھا ہوا تھا۔ اس کا مضمون یہ تھا۔

پیارے دوست،

جس دن تم گئے۔ اس دن میں رات کو سو رہا تھا کہ یکایک نہایت اضطراب کی حالت میں اُٹھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے کوئی میرا گلا دبا رہا ہے۔ میں نے سرعت کے ساتھ بستر سے اچھل کر بجلی کا بٹن دبایا۔ کمرہ بقعہ نور ہو گیا۔ ایک دراز قد پتلی دبلی عورت میرے پلنگ کے پاس کھڑی تھی۔ اس کے لمبے لمبے سیاہ چمکیلے بال اس کے کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اور اس نے سُرخ رنگ کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ جو گردن پر سے کھلا تھا۔ لیکن جونہی میں نے اس کی طرف دیکھا وہ غائب ہو گئی۔ اس وقت بیل ہی سے خوشبو چھن چھن کر کمرے کو معطر کر رہی تھی۔

میں نے دل میں کہا۔ "یہ بیشک ایک خواب تھا۔ آہ! وہ عورت کس قدر خوبصورت تھی اس کے بال کس ادا سے اس کے کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کا سفید جسم سنگ مرمر کی طرح چمکتا تھا۔ اور نیلی آنکھیں غضب ڈھا رہی تھیں۔ اے کاش! وہ بجائے خیالی تصویر کے پوست و استخواں کا ایک مجسمہ ہوتی۔ جسے میں گلے سے لگا سکتا۔"

جب میں صبح بیدار ہوا تو چند مرجھائے ہوئے پتے میرے بستر کے نزدیک پڑے ہوئے تھے میں پتوں کو اٹھا رہا تھا۔ اور میری انگلیاں کانپ رہی تھیں ایک لمحہ کے بعد میرا جسم زور سے تھرتھرایا۔ جونہی میں نے پتوں کو چھوا۔ مجھے پھر ایسا معلوم ہوا کہ کسی عورت کے نازک ہاتھ میرے ہاتھوں کو دبا رہے ہیں۔

جب میں چاء پینے کے لئے کھانے کے کمرے میں آیا۔ اس وقت بشیر بھی آ گیا۔ جو تمہارے جانے کے بعد

اکثر آیا کرتا تھا۔ اس نے میرے چہرے پر پریشانی کے آثار پاتے۔ اور ہنس کر کسی قدر بے پروائی سے پُوچھا۔ "کہو ریاض آج کہیں آسیب سے تو ملاقات نہیں ہُوئی"

ایک لمحہ کے لئے مَیں رُکا۔ آخر بناوٹی لاپروائی سے بولا "نہیں تو" بشیر مجھے خلافِ معمول بدمزہ پاکر خاموش ہوگیا۔ کچھ دن پھر گذر گئے۔

کل شام کو کھانے کے بعد مَیں اور بشیر باغ میں بیٹھے اِدھر اُدھر کی گپّیں ہانک رہے تھے۔ کہ یکایک مَیں نے اس سرخ پوش عورت کو دیکھا۔ وہ میرے سونے کے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھی ہُوئی تھی۔ اور اپنا سفید چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھامے ہُوئے تھی۔ چونکہ پورے چاند کی روشنی چاروں طرف خوب پھیل رہی تھی۔ اس لئے مَیں اُس کو اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ اس کے سیاہ آبنوسی بال کندھے کے ایک طرف لٹکے ہُوئے تھے۔ اور اس کے سُرخ نازک ہونٹ اس کے سفید چہرے کے مقابلے میں غیر معمولی طور پر سرخ نظر آرہے تھے۔ اس کے چہرہ پر تبسّم تھا۔ جس نے اس کی دلاویزی کو دوبالا کر رکھا تھا

مَیں بشیر کی آواز سے یکایک چونک اُٹھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "لاحول ولاقوۃ۔ ریاض ذرا دیکھنا وہ بیل مہتاب کی روشنی میں کس قدر خوفناک معلوم ہوتی ہے" مَیں نے ٹکٹکی لگائے اس کھڑکی کی طرف دیکھتے ہُوئے کہا۔

"نہیں معلوم نہیں کہ

بشیر خاموش ہو رہا۔ مَیں نے سگرٹ کے تین چار کش لیئے۔ جب رات زیادہ آگئی۔ تو ہم دونوں اُٹھے بشیر نے کہا۔ "ریاض تم اس خیال کو اپنے سے نکال دو۔ کہیں تمہاری طبیعت نہ بگڑ جائے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میرے منہ سے تو اس سعج کو دیکھ کر خجالت کی وجہ سے بات تک نہ نکلے۔ ایک عورت جس کو ایک مرد نے قتل کر دیا ہو۔ کس طرح ایک اور مرد سے محبت کرسکتی ہے؟"

مَیں نے جواب دیا۔ "تمام آدمی یکساں نہیں ہوتے۔" اور خاموش ہوگیا۔ پھر مَیں نے ایک زور کا قہقہہ لگایا۔ اور اپنے کمرے کی طرف تیز قدم اُٹھاتا ہُوا چلا گیا۔

جب مَیں اپنے کمرے میں گیا۔ تو مَیں نے دیکھا کہ ہوا نے اس بیل کے چند پتّے اُڑا کر میرے تکیے پر پھینک دیتے ہیں۔ اور وہ برقی روشنی میں چمک رہے ہیں۔ مَیں نے ان کو لبوں سے لگالیا اور پھر زور سے ہنسا۔ کیونکہ میرا دل کہہ رہا تھا۔ کہ وہ آج ضرور آئیگی۔ مَیں بستر پر لیٹ گیا۔ لیکن بہت عرصے تک نیند نہ آئی۔ آخر مَیں اُٹھا۔ اور وقت گذارنے کے خیال سے یہ خط تمہیں لکھنے لگا۔ مَیں خط لکھ رہا تھا اور

بار بار کھڑکی کی طرف دیکھتا جاتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ بیل کی شاخیں ہوا کے زور سے کھڑکی کے اندر آتی ہیں۔ ایں . . . . یہ کیا . . اوہ . ہو۔ ہا ہا یا اللہ ....."

یہاں پر خط ختم ہوگیا۔ اور میں اپنے مُردہ دوست کی نعش سے لپٹ کر چیخیں مار کر رونے لگا۔

محمد فضل حق معتصم

رشحات آزاد

خاکِ پا بن کے دربار پہ جانا ہے مجھے
مٹ کے ہستی کو ٹھکانے سے لگانا ہے مجھے

عشق کا کھیل خطرناک سہی، کھیلوں گا
مر کے نام اپنا زمانے میں جلانا ہے مجھے

داغِ دل، روشنی برقِ تجلی دکھلا
اک چراغ اور سرِ طور جلانا ہے مجھے

قسمتِ خسرو پرویز نہیں مدِ نظر
صفِ فرہاد میں نام اپنا لکھانا ہے مجھے

دشت میں آیا ہوں صحرا کے بگولو! دوڑو
سر بسر خاکِ جنوں سر پہ اُڑانا ہے مجھے

تا کہ پابندیٔ مصلحت اسے فتویٔ عقل
مُنہ آخر کو قیامت میں دکھانا ہے مجھے

تا دمِ مرگ نہ آئے کہ کہیں جی نہ اُٹھوں
ہاں اب آئینگے کہ مٹی میں ملانا ہے مجھے

سُن لو آزاد ہوں اور رہبرِ آزادی ہوں
راہ آزادی کی دُنیا کو دکھانا ہے مجھے

آزاد سبحانی

غم نصیب

مصنفہ گوئٹے   مترجمہ محمد ہادی حسین

(گذشتہ سے پیوستہ)

۲۰ جنوری

اس وقت جبکہ ایک شدید طوفان نے قیامت برپا کر رکھی ہے۔ اور میں اس سے بچنے کے لئے ایک سرائے میں تنہا بیٹھا ہوں، پیاری چارلوٹی تم عالمِ خیال میں میرے سامنے ہو۔ اور میرا دل عرضِ حال کے لئے بیتاب ہے۔ کتنے مہینے ہوئے کہ میں تم سے جدا ہو کر شہر بشہر پھر رہا ہوں اور ایسے لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کر رہا ہوں جنکی جھوٹی غمگساریاں میرے غمدیدہ دل کے لئے وجہ تسلی نہیں بن سکتیں۔ اس عرصے میں مجھے کبھی اس بات کا خیال نہیں آیا۔ کہ تمہیں اپنے حال سے آگاہ کروں۔ آہ میری بیدلی نے مجھے تمہاری یاد کی تنہا عشرت سے بھی محروم کر دیا تھا لیکن آج کہ مجھے اطمینان کا ایک لمحہ نصیب ہوا ہے۔ اور میں اس گوشۂ عافیت میں بیٹھا ہوں۔ جہاں تنہائی ہے، خاموشی ہے، اور برف و باراں کی منظر آرائیوں نے ایک دلفریب سماں باندھ رکھا ہے۔ میرے تصوّر نے دوری و مہجوری کے سب پردے یکبار نگاہوں کے سامنے سے اٹھا دئے ہیں۔ اور میرے دل میں ان افتخارِ روزگار لمحوں کی یاد تازہ ہو گئی ہے۔ جبکہ میں تمہارے حضور میں زندگی کی تمام عزتوں سے بہرہ اندوز ہوتا تھا۔ یا الٰہی پھر وہی زمانہ لا، پھر اسی بابِ عیش کی تمہید اٹھا دے، پھر وہی ہم ہوں، وہی آغازِ الفت کی معصوم خوشیاں!

کاش، پیاری چارلوٹی، تم اپنی آنکھوں سے دیکھتیں کہ میں کس خراب و خستہ حالت میں مبتلا ہوں۔ میرا احساس مردہ ہو گیا ہے۔ میرے آنسو خشک ہو گئے ہیں۔ میری ہنسی میں وہ شگفتگی نہیں رہی۔ اور میرے سینے میں دل کی بجائے ایک پتھر کا ٹکڑا ہے۔ نہ میں ہنستا ہوں نہ میں روتا ہوں۔ خوشی کا کوئی لمحہ نہیں کہ مجھے نصیب ہوتا ہو، دنیا کی کوئی چیز نہیں کہ مجھ پر اثر کر سکے یوں سمجھ لو کہ گویا میں تماشاگاہِ عالم میں گم سم کھڑا پتلیوں کا ناچ دیکھ رہا ہوں۔ اور حیران ہو ہو کر اپنے سے پوچھتا ہوں۔ کہ کہیں میری نگاہیں مجھے دھوکا تو نہیں دے رہیں میں خود اس رقصِ مجبور میں شامل ہوں۔ لیکن نہیں جانتا کہ اس

تمام گڑبڑاہٹ کا مطلب کیا ہے؟ اور جب میرا ہاتھ اپنے کسی ساتھی کے ہاتھ پر جا پڑتا ہے۔ تو اُس کے غیر فطری مس سے کانپ اٹھتا ہوں۔ اور اپنا ہاتھ ہٹا لیتا ہوں۔ مجھے کسی طرح یقین نہیں آتا کہ میں اور میرے ساتھی درحقیقت زندہ ہیں۔

ہر چیز مجھے مصنوعی نظر آتی ہے۔ اور اس لئے کوئی چیز طبیعت کو نہیں بھاتی۔ اب وہ اگلی سی دلچسپیاں خواب و خیال ہوگئیں۔ دُنیا کی رُت یکسر بدل گئی طبیعت کی کایا یکلم پلٹ گئی۔ وہ گلگشتِ سحر کی لذتیں، وہ چاندنی رات کی سیریں نہ رہیں۔ اب تو یہ حال ہے۔ کہ اول تو کبھی بھول کر بھی لطف و راحت کا خیال نہیں آتا۔ اور اگر کبھی قضا کار زندہ دل بننے کی کوشش کرتا ہوں تو طبیعت اس کا اثر قبول نہیں کرتی۔ جس طرح کہ ایک بجھا ہوا چراغ آفتاب سے کسب نور نہیں کرسکتا۔ شام کو سوچتا ہوں کہ صبح طلوعِ آفتاب کے منظر سے لطف اندوز ہونگا لیکن جب صبح ہوتی ہے تو بستر سے اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا دن کو ارادے کرتا ہوں کہ رات کو چاندنی کی سیر کروں گا۔ لیکن جب رات ہوتی ہے تو کہاں کے ارادے اور کیسی سیر؟

وہ جوشِ مسرت جو میری رگ رگ میں خونِ زندگی بن کر جاری و ساری تھا۔ افسردہ ہوگیا ہے۔ اور وہ روحانی راحت جو رات کو میری لذتِ خواب کا سرمایہ ہوتی تھی اور ہر صبح میرے لئے عشرت کا پیغام لاتی تھی۔ مجھے خیرباد کہہ چکی ہے۔ اب تو مجھے سوتے جاگتے میں کبھی آرام نہیں ملتا، اور میری زندگی بے حد بدمزگی میں کٹتی ہے۔

یہاں آکر مجھے جتنے لوگوں سے سابقہ پڑا اُن میں صرف ایک مس ب . . . . . مجھے طبیعت کے موافق رہی ہے۔ سچ جاننا، پیاری چارلوٹی، بالکل تم ہو۔ اگر دُنیا میں تمہاری کوئی نظیر ہوسکتی ہے، تو وہ صرف مس ب ہے۔ تم یہ پڑھ کر ہنسوگی اور کہوگی "چہ خوش! اب یہ چرب زبانی بھی سیکھ لی!" اور تمہارا یہ کہنا کسی حد تک بجا ہوگا۔ کیونکہ یہاں کے لوگوں نے آخر مجھے اپنے رنگ میں رنگ ہی لیا ہے۔ اُن کے ساتھ رہتے رہتے مجھے بھی اپنے کو خوش مذاق ثابت کرنے کی عادت ہوگئی ہے اور اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا؟ بدمذاق لوگوں کو تو وہ اپنی صحبتوں سے بارہ پتھر باہر کر دیتے ہیں! اس صفتِ حمیدہ کے علاوہ مجھ میں ایک اور خوبی پیدا ہوگئی ہے یعنی میں نے مزاج آفرینی میں اچھا خاصہ ملکہ بہم پہنچا لیا ہے۔ اور اکثر اربابِ رائے نے میری تعریف میں کہا ہے کہ خوشامد کرنے میں مجھ سے زیادہ رطب اللسان کوئی نہیں رطب اللسان تو خیر میں کیا ہونگا۔ البتہ طبیعت پر ظلم کرکے جھوٹ بولنے کی رسم ادا کرلیتا ہوں۔ ہاں میں مس ب

کاذکر کررہا تھا۔ اس مسموم فضا میں صرف وہ ایک ایسی ہستی ہے۔ جس کے ضمیر نے اس قسم کی تذلیلِ نفس گوارا نہیں کی۔ اُس کی نیلگوں آنکھوں کے عمق میں روحانیت کا نور جھلکتا ہے اور اُس کی پاکیزہ طبیعت کے لئے معاشرت کی یہ مصنوعی بزم آرائیاں سراسر صحبت ناجنس ہیں۔ اس نمائشی چہل پہل میں اُس کا جی نہیں لگتا۔ اور وہ میری طرح اس سے متنفر ہے۔ ہم کبھی کبھی مل بیٹھتے ہیں۔ تو سوچا کرتے ہیں کہ کیا ہی اچھا ہو اگر ہم دیہات کی پُرامن تنہائیوں میں جاکر چھاؤنی چھائیں اور سچی خوشی کی ایک ایسی دُنیا آباد کریں۔ جہاں ہنگامہ ہستی کا شور وشر ہمارے سکون و آرام میں مخل نہ ہوسکے ایسے لمحوں میں پیاری چارلوٹی، مجھے وہ جانِ راحت ایام رہ رہ کر یاد آتے ہیں۔ جو میں نے تمہاری مہر و اُلفت کے سایے میں گذارے اور تمہارا نام ہمارے وردِ زبان ہوتا ہے۔ وہ کسی ذریعے سے تمہیں جانتی ہے۔ اور تمہاری نادیدہ مشتاق ہے۔ تمہاری تعریف کرتے اُس کی زبان نہیں تھکتی، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ تمہارے نام کا کلمہ پڑھتی ہے۔ اور اُس کی زبان سے تمہاری تعریف سن کر مجھے بیحد خوشی ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ تعریف دکھاوے کی تعریف نہیں ہوتی بلکہ تہ دل سے نکلنے والی تعریف۔

آج میری محرومی کا یہ حال ہے۔ کہ میں تمہارا نام لے لے کر اپنے مجبور دل کو تسلّیاں دیتا ہوں۔ لیکن ایک زمانہ تھا کہ کبھی فرقت کا خیال تک میرے دل میں نہ آیا تھا۔ وہ بھی کیا دن تھے جب میں تمہارے اُس مرغوب طرزِ ملاقات میں تمہارے پاس بیٹھا کرتا تھا۔ اور بچے ہمارے اردگرد کھیل کود میں مصروف ہوتے تھے۔ وہ اودھم مچاتے اور نہیں دق کرتے، تو میں انہیں کوئی دلاویز کہانی سُناتا اور وہ اپنی شرارتیں بھول کر ایک خاموش توجہ سے میرے پاس کھڑے ہوجاتے۔ وہ باتیں اب کہاں! اب میں ہوں اور رنجِ تنہائی۔ اور تمہاری یاد کے سوا کوئی میرا غمخوار نہیں۔

لو وہ شام ہوگئی۔ اور آفتاب غروب ہوچلا۔ اُس کی آخری شعاعیں پہاڑوں کی برفانی چوٹیوں پر سونا بکھیر رہی ہیں۔ بادل برس کر کھل گئے ہیں۔ طوفان ختم ہوچکا ہے۔ اور اب مجھے اپنے گھر کے قید خانے میں واپس جانا چاہیئے خداحافظ۔ ہاں البرٹ اب کہاں ہے۔ اور اُس کا مجھ سے کیا رشتہ ہے؟ خُدا مجھے اس سوال کی معافی دے۔

۸۔ فروری

پچھلے دنوں سے یہاں کا موسم نہایت خراب ہے، لیکن میں اُسے اپنے حق میں ایک نعمتِ عظمیٰ سمجھتا ہوں۔ کیونکہ میں آزما چکا ہوں۔ کہ جس دن موسم اچھا ہو۔ کوئی نہ کوئی ناخواندہ مہمان ضرور آدھمکے گا۔ اور اپنی ناگوار مداخلت سے میرے سارے لطف کو خاک میں ملادیگا۔ جس دن مینہ موسلادھار برسے، اولوں کی بوچھاڑ پڑے۔ گھنگھور گھٹا ٹوپ چھا

جاتے، اور طوفانی ہوا کے جھکڑ چلیں۔ اُس دن کو میں ایک روزِ سعید شمار کرتا ہوں۔ اور اپنے کو مبارکباد دیتا ہوں۔ کہ "چلو آج تو ان بار خاطر ملاقاتیوں سے چھٹکارا ہوا"۔ برخلاف اس کے جس دن مطلع صاف ہو اور صبح سویرے آفتاب نکل آئے تو میں بے اختیار پکار اُٹھتا ہوں۔" لو آج پھر شامت آئی"۔ ایک نعمت ان نا اہلوں کو عطا ہوتی ہے۔ اور وہ یقیناً اسے لچر باتوں میں گنوا دینگے۔ ان کا تو کام ہی ہے کہ ہر چیز کو ضائع کر دیں۔ صحت، نیکنامی، خوشی، کوئی چیز ان کے تباہ کن تصرف سے نہیں بچتی۔ اور یہ سب کچھ وہ اپنی بیوقوفی، جہالت اور کمزوری کے باعث کرتے ہیں۔ اُن سے اس کی وجہ پوچھو تو ضرور کسی نیک ارادے کا نام لیں گے۔ کوئی پوچھے کہ خدا کے بندو۔ وہ نیک ارادے کس کام کے، جن کا انجام ایسا بُرا ہو"! میری مانیں، تو میں یقیناً اُن سے دست بستہ عرض کروں۔ کہ للہ اپنی تباہی سے باز آؤ۔" مگر وہ اپنی دُھن میں کس کی سُنتے ہیں، افسوس!

۱۷۔ فروری

مجھے خوف ہے کہ میرا اور سفیر صاحب کا رشتہ ارتباط منقطع ہوا چاہتا ہے۔ کیونکہ میں اُن کی خوئے حکومت کی نازبرداریاں کرتے کرتے تنگ آگیا ہوں۔ اور اب مجھ سے یہ ذلت نہیں اُٹھائی جاتی۔ وہ اپنے کاروبار کو ایسے بیڈھب انداز سے انجام دیتے ہیں کہ مجھے چاروناچار اُن کی مخالفت کرنا پڑتی ہے۔ اور پھر جب میں اپنی پسند کے موافق کام کرتا ہوں تو وہ اپنی عادت کے ہاتھوں مجبور ہو کر خواہ مخواہ رخنے نکالنا شروع کر دیتے ہیں۔ چند روز ہوئے آپ نے دربار میں جاکر بے وجہ میری شکایت کر دی اور اُس وقت تک آپ کو تسلی نہ ہوئی جب تک کہ وزیر صاحب نے مجھے بلا کر سرزنش نہ کی۔ نرمی سے ہو کہ سختی سے، آخر تھی تو سرزنش؟ اس بنا پر میں نے ملازمت سے دست بردار ہونے کی ٹھان لی، اور میں ضرور اپنے ارادے کو عمل میں لاتا۔ اگر اس اثنا میں مجھے وزیر صاحب کا ایک خط نہ ملتا، جس میں اُنہوں نے بکمالِ شفقت میری دلجوئی کی تھی۔ وزیر صاحب کے ارشاد کی تعمیل کو میں ازروئے ادب اپنا فرض سمجھتا ہوں، اور پھر اس خط کی ملائمت اور ملاطفت ایسی نہ تھی کہ مجھے چون وچرا کی جرأت ہوتی۔ اُنہوں نے میرے احساس فرض، میری کارگذاریوں، اور میری سلامت روی کی داد دیتے ہوئے میرے اُس جوشِ طبع کی طرف اشارہ کیا تھا، جو جوانی کا خاصہ ہے۔ اور جو ایک مبارک جذبہ ہے۔ بشرطیکہ وہ اعتدال کے حدود سے متجاوز ہو کر انسان کو ناعاقبت اندیش نہ بنا دے اس خط کا مجھ پر اتنا اثر ہوا کہ میں جو دوسروں سے ناراض ہونے کے باعث اپنے آپ سے بھی ناخوش تھا۔ مطمئن ہو گیا۔ کہ ابھی دُنیا میں ہمدردی کا نام ونشان باقی ہے۔ اطمینانِ قلب حقیقت

میں ایک بیش بہا دولت ہے کاش میرے دوست! یہ دولت اس قدر ارزانی نہ ہوتی!

۲۰- فروری

خدا تمہیں خوش رکھے، میرے عزیز! اور تمہیں وہ حقیقی راحت عطا کرے، جو اُسے میرے نصیبوں میں نہیں تھی۔

البرٹ، میں تمہارا ممنون ہوں کہ تم نے مجھے دھوکہ دیا اور مجھے بے خبری میں مبتلا رہنے دیا۔ میں منتظر تھا کہ تمہارے بیاہ کی خبر سنوں۔ کیونکہ میرا ارادہ تھا۔ کہ اُس دن چارلوٹی کی تصویر دیوار سے اُتار دونگا۔ اور اُسے ہمیشہ کیلئے مدفنِ فراموشی کر دونگا۔ اب وہ دن گذر چکا ہے۔ اور تم ایک دوسرے کے شریکِ زندگی بن گئے ہو۔ تاہم وہ تصویر وہیں ہے جہاں تھی۔ اور میں اُسے وہیں رہنے دونگا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں، کہ ہمارے تعلقات اب بھی وہی ہیں جو اس سے پہلے تھے میں اُسی طرح تمہارا ایک عزیز دوست ہوں۔ اُسی طرح چارلوٹی کے دل میں میری جگہ ہے۔ ہاں وہ اسی طرح مجھے تمہارے بعد سب سے عزیز رکھتی ہے۔ اور میں اس نعمت سے محروم ہونے کو ہرگز تیار نہیں۔ اُف! میں دیوانہ ہو جاؤں اگر وہ مجھے بھول جاتے۔ البرٹ، یہ خیال میرے لئے عذابِ جہنم سے کم نہیں۔ خدا حافظ البرٹ — میرے پاک طینت فرشتہ، خدا حافظ — پیاری چارلوٹی خدا حافظ!

۱۵- مارچ

آج مجھے ایک ایسا ناخوشگوار واقعہ پیش آیا ہے کہ جی چاہتا ہے ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔ میں یہاں نہیں رہوں گا۔ کہو میں کہاں تک صبر کرتا جاؤں؟ میری مصیبت تو ایک لاعلاج مرض ہے۔ اور مجھے اس مصیبت میں پھنسانے کا الزام تم پر آتا ہے۔ کیونکہ تمہیں نے مجھے اکسا کر یہ عذاب جان خریدنے پر آمادہ کیا تھا۔ اب تو تمہیں تسلی ہو گئی ہوگی۔ اور تم حقیقتِ حال سے واقف ہو گئے ہو گے؟ تاہم اس خوف سے کہ مبادا آئندہ کسی موقعہ پر تم اس حادثہ کو میری شعلہ مزاجی سے منسوب کرو۔ میں تمہیں آج کا واقعہ سیدھے سادے الفاظ میں بتاتا ہوں جس طرح کہ ایک غیر متعصب واقعہ نگار اسے بیان کریگا۔

کاونٹ ص . کو مجھ سے طبعی لگاؤ ہے۔ اور وہ اپنے دوستوں کے حلقے میں میری تعریف کرتے رہتے ہیں اس کا ذکر میں تم سے بیسیوں مرتبہ کر چکا ہوں۔ کل کا واقعہ ہے کہ اُنہوں نے مجھے کسی تقریب پر اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ اس تقریب میں شہر کے تمام اُمرا و رؤسا مدعو تھے۔ مجھے کیا معلوم تھا۔ کہ یہ فرعونِ بے سامان ہم متوسط الحال لوگوں کو اپنے سے ذلیل گنتے ہیں۔ اور اپنی صحبتوں میں

ہماری شرکت گوارا نہیں کرتے؟ میں گیا اور بغیر کسی قیل و غدغے کے دعوت میں شریک ہوگیا۔ خورد و نوش سے فارغ ہوکر ہم اُٹھے اور ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ وہاں میں اور وہ اور ایک صاحب کرنل ب' بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اور مہمانوں کی آمد کے منتظر رہے۔ اسی شغل میں وقت گذر گیا۔ اور مہمان آنا شروع ہوئے۔ سب سے پہلے جو مہمان آیا' وہ لیڈی س تھی۔ جو اپنے باوقار خاوند اور اپنی نازک کمر اور فربہ گردن صاحبزادی کی معیت میں بصد شان تمکنت و بہزار انداز تبختر مجھ پر نفرت کی نگاہیں ڈالتی ہوئی میرے پاس سے گذر گئی مجھے نسب فروشوں کی اس تمام نسل سے دِلی نفرت ہے اس لئے میں نے ارادہ کیا کہ اُٹھ کر چلا جاؤں مجھے صرف کاؤنٹ صاحب کا انتظار تھا۔ کہ وہ ان کی خرافات سے فارغ ہوکر ادھر آئیں تو میں سلام کرکے رخصت ہوں اتنے میں مس ب . . . آگئی۔

اُس کی ملاقات میرے لئے ایک ذہنی عشرت ہے' چنانچہ میں نے اپنا ارادہ ملتوی کردیا۔ اور اُس کی کرسی کے پیچھے کھڑے ہوکر اُس سے باتوں میں مصروف ہوگیا۔ کچھ دیر تک اسی حالت میں کھڑا رہنے کے بعد مجھے محسوس ہوا۔ کہ وہ کچھ کھنچی کھنچی سی تھی۔ اور مجھ سے اپنی معمولی بے تکلفی کے ساتھ باتیں نہیں کررہی تھی۔ یہ دیکھتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا۔ "ہیں' کیا یہ بھی اپنے ان بھائی بندوں کے

ایسی ہی ہے؟ کیا یہ سب ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں؟" میری طبیعت اچاٹ ہوگئی۔ اور میرا جی چاہا کہ اس محفل سے چلا جاؤں۔ لیکن معلوم نہیں میں کیوں وہیں کھڑا رہا۔ اور طرح طرح کی تاویلوں سے اُس کی سرد مہری کا شک دِل سے رفع کرتا رہا۔ کہ نہیں مجھے مغالطہ ہوا ہے وہ ایسی بدمزاج نہیں' اور مجھے امید تھی کہ وہ جلد ہی اپنے حسنِ سلوک سے تلافیٔ مافات کرے گی۔ اب تمام مہمان آچکے تھے۔ اور میرے سوا جو کہ اس محفل میں ننگ وجود تھا۔ باقی سب معزّزین تھے۔ ان میں کے چند ایک گرامی نفوس قابلِ ذکر ہیں۔ ایک طرف عالیجناب بیرن ف . . ایک ایسا ملبوسِ فاخرہ زیب تن کئے ہوئے تشریف فرما تھے جس کا سلسلۂ قدامت فرانسس اوّل کی تاجپوشی سے جا ملتا تھا۔ تو دوسری طرف چانسلر ن . . . . صاحب اپنی گراں گوش اہلیۂ محترمہ کی معیت میں رونق افروز انجمن تھے۔ نیز ایک کرسی پر جناب ل . . . جن کا دقیانوسی کوٹ اس بات کا شاہد تھا۔ کہ اس کی سالخوردگی پر رفوگر کا ہاتھ کئی مرتبہ دست درازیاں کرچکا ہے۔ بڑے چم خم سے جلوہ فرما تھے۔ موصوف الصدر صاحبان' کہنا چاہئے' کہ اس دائرۂ شرفا کے سرحلقہ تھے۔ اور محفل کی گرمی بہت کچھ اُن کے دم قدم سے وابستہ تھی۔ ان میں سے بعض اصحاب سے مجھے صاحب سلامت کا فخر حاصل تھا۔ میں نے اُن

سے ہمکلام ہونے کی مجرمانہ جرأت کی، جس کی سزا اُنھوں نے مجھے ایک پُر ثقاہت اختصارِ کلام کی صورت میں دی۔ یہ سزا پاکر میں اس سب ... کی طرف رجوع ہُوا لیکن اس کے رعبِ متانت نے بھی مجھے لب کشائی کی اجازت نہ دی، اور میں اس کا مُنہ دیکھتا رہ گیا۔ اس عالم میں مجھے خبر نہ ہوئی کہ محفل میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ مجھے بعد میں اس سب کی زبانی معلوم ہُوا۔ کہ اُس وقت تمام معزز خواتین میرے خلاف سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ یہ سرگوشیاں ہوتے ہوتے مردوں کے کانوں تک پہنچیں۔ اور آخرکار بیچارے کو دعوت کا محفل کا رنگ دگرگوں ہوتے دیکھ کر میری طرف آنا پڑا۔ کہ مجھے کوئی بہانہ بنا کر یہاں سے رخصت کر دے۔ وہ مجھے ایک طرف لے گیا۔ اور مجھے سمجھانے لگا۔ کہ "تم ہماری اُلٹی ریتوں سے واقف ہو۔ میں دیکھتا ہوں کہ تمہاری موجودگی بعض لوگوں کو کھٹک رہی ہے۔ اور میں نہیں چاہتا کہ۔۔" میں نے قطع کلام کر کے کہا۔ "میں معافی چاہتا ہوں کہ میں اس بدمزگی کا باعث بنا۔ مجھے پہلے ہی سوچ لینا چاہئے تھا۔ امید ہے آپ میری گستاخی سے درگذر کرینگے۔" میں نے دبی زبان سے یہ بھی کہہ دیا کہ "میں تو پہلے ہی جانے کے ارادے کر رہا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے میں نہ گیا۔" اور میں ایک کھسیانی ہنسی ہنسا، اور سلام کر کے رخصت ہُوا۔ اُنہوں نے مجھ سے ایسے انداز میں مصافحہ کیا کہ جس سے سب کچھ مجھ پر ظاہر ہو گیا۔ میں اپنے احساسِ رسوائی کو چھپانے کے لئے سر جھکائے ہوئے اس محفل سے نکلا۔ ایک گاڑی میں سوار ہو لیا۔ اور سیدھا گھر جا کر دم لیا۔ میں نے پہاڑ کی چوٹی پر سے غروب ہوتے ہوئے آفتاب کو دیکھا، اور ہومر کی وہ عبارت پڑھی جہاں مہمان نواز دہقان یولیسیز کی خاطر و مدارات کرتے ہیں۔ یہ جزاک اللہ، وہ بھی کیا لوگ تھے!

شام کو میں کھانے کے کمرے میں پہنچا۔ تو چند ایک لوگ بیٹھے شطرنج کھیل رہے تھے۔ میں جا کر اُن کے پاس بیٹھ گیا۔ اتنے میں میرا ایک بے تکلف دوست کمرے میں داخل ہُوا۔ مجھے دیکھ کر وہ میری طرف آیا۔ اور نہایت آہستہ لہجہ میں مجھ سے بولا۔ "سُنا ہے آج آپ کو ایک بہت ناگوار واقعہ پیش آیا ہے۔" میں نے تجاہلِ عارفانہ کرتے ہُوئے کہا۔ "واہ۔ میں ایسی محفلوں کی کیا پروا کرتا ہوں؟ میں تو بڑی خوشی سے اُٹھ آیا تھا۔" اُس نے جواب دیا "اچھا کیا، آپ نے اس کا رنج نہیں کیا۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ لوگوں میں اس کا بڑا چرچا ہو رہا ہے۔" اب تک میں نے اس واقعہ سے دل کو رنجیدہ نہ ہونے دیا تھا۔ لیکن اُس کی زبان سے یہ سن کر میں پھر اپنے رنج کو لاپروائی کے پردے میں نہ چھپا سکا۔ مجھے یہی محسوس ہوتا تھا کہ جو شخص میرے آس پاس بیٹھے ہیں۔ ضرور اس واقعہ کا خیال

کر رہے ہیں۔ اور اس خیال سے میں شرم کے مارے پانی پانی ہوجاتا تھا۔

میرے جی میں آتی ہے کہ سینے میں خنجر بھونک لوں جب میں دیکھتا ہوں کہ میرا تذکرہ ہر کس و ناکس کی زبان پر ہے۔ اور میرے دشمن ہنس ہنس کر مجھے سناتے ہیں۔ کہ جو شخص مدعی ہوتے ہیں۔ جن کا دماغ بھرا ہوتا ہے۔ اور جو اپنے بڑوں کی ہمسری کے دعوے کرتے ہیں ان کا یہی حشر ہوا کرتا ہے۔

تم صبر و تحمل کے متعلق جو چاہو کہو، لیکن مجھے بتاؤ کہ وہ کون شخص ہے۔ جو احمقوں کی ہنسی برداشت کرسکے؟ خصوصاً اُس وقت جب اُنہیں ہنسی کا کوئی بہانہ ہاتھ آجائے کوئی بلا وجہ ہنسے تو ہم اُسے سڑی یا پاگل کہہ کر رد کرسکتے ہیں، لیکن جب ہنسی کی کوئی وجہ بھی ہو تو ہمارے غصے کی کوئی حد نہیں رہتی۔

(باقیدارد)

محمد ہادی حسین قریشی صدیقی

حسیات عرش

دیکھے گا کیا بھلا کوئی اس پردہ پوش کو
واعظ زباں کو روک سنبھال اپنے ہوش کو
دیدار کی خوشی نہ بیامی کا انتظار
آئے ہیں پھول لے کے وہ میرے مزار پر
محشر ہے نام وعدۂ دیدار کا فقط
تھیں حضرتِ کلیم عبث لنترانیاں

موسےٰ بھی ڈھونڈھتے ہیں یہاں اپنے ہوش کو
مدت ہوئی ہے ترک کئے ناؤ نوش کو
گذری ہے عمر بند کئے چشم و گوش کو
دینا پڑیں دعائیں کفِ گل فروش کو
کیا جانیں ہم معانیِ فردا و دوش کو
بھولے جناب دعویٔ تمکین و ہوش کو

عرش

جدید ترقی کا اثر زبان پر

عجیب وغریب انیسویں صدی نے دنیائے علوم کی کایا پلٹ دی۔ ایجاد و انکشاف کے سنگلاخ و دشوار گذار راستے ہموار اور سرسبز درختوں سے سایہ دار کر دئے جن کی بدولت مدتوں کے تھکے ہوئے حقیقت کی جستجو میں پھرنے والے جو قدم قدم پر بیٹھ جاتے تھے۔ تازہ دم ہوکر چلنے لگے۔ ان کو اپنی منزلِ مقصود کے نشان نظر آنے لگے۔ بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی ان کی رفتار میں تیزی پیدا ہوگئی۔ اور اب اہل عالم رواں دواں ترقی کے منتہائے کمال کی طرف بڑھے چلے جاتے ہیں۔

زبان اور علم طیارہ اور طیارچی کی مانند ایک دوسرے کی مدد سے چلتے ہیں۔ ایک نظریے کا کلیہ بننے میں بیسیوں جدید الفاظ خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ علوم و فنون کی جدید اصطلاحوں، علمی تشبیہوں، و استعاروں کی بھرمار نے زبانوں میں وہ طوفان برپا کر دیا ہے۔ کہ ہماری لغات کے بند اور پشتے جو پہلے سو ڈیڑھ سو برس اس رو کا مقابلہ کرتے تھے آج بہے چلے جاتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک نے اس سیلاب کو قبضہ میں لانے کا ایک حد تک انتظام کیا ہے۔ وہاں زبان کے ہر شعبہ کے متعلق بڑی بڑی جامع و مانع لغات تیار ہوتی ہیں۔ اور ان کی طباعت کے دوسرے ہی دن سے جدید الفاظ و اصطلاحات کی دیکھ بھال اور ترتیب شروع ہو جاتی ہے۔ اور چند سال بعد یہ نئی پیداوار لغات کی جلدوں میں بطور ضمیمہ شامل ہو جاتی ہے۔ یہ حال ان ممالک کا ہے جہاں روپے والے بہت ہیں۔ اور وہ اس کا استعمال بھی جانتے ہیں۔ ہندوستان یا دیگر ممالک ہیں جن سے دولت کی دیوی روٹھی ہوئی ہے ابھی اس قسم کی لغات تیار نہیں ہوئیں۔ البتہ اہل ملک میں اس ضرورت کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔ اس مقصد کے لئے انجمنیں قائم ہیں جنمیں ایک جماعت کی جماعت مل کر کام کرتی ہے۔ سینکڑوں الفاظ گھڑے جاتے ہیں۔ اور وہ اخبار اور رسالوں میں منجھ منجھا کر ٹکسالی اور تقریروں اور کتابوں میں گھس پس کر پرانے بھی ہو جاتے ہیں۔ گویا ہر سال الفاظ کے ذخیرہ میں ایک معتد بہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں، کہ زندگی موت کا پیغام لاتی ہے۔ اور بہت سے الفاظ متروک بھی ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن الفاظ شیر خواری یا جوانی میں بہت کم مرتے ہیں۔ یہ اکثر اپنی عمر طبعی کو پہنچتے

ہیں۔ جو انسان کی عمر سے کئی گنی زیادہ ہے۔ بہرحال متروکات کو خارج کرنے کے بعد ایک بڑی تعداد باقی رہتی ہے۔ اس افزائش سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر الفاظ کی پیدائش اور کثرت کا یہی حال رہا۔ اور یقیناً رہیگا۔ تو آج سے سو دو سو برس بعد ہماری لغتیں کتنی جلدوں میں ختم ہونگی؟ اور اس وقت اہلِ قلم کسی کتاب کی تصنیف میں کسقدر الفاظ استعمال کیا کرینگے بحافظہ کی نسبت کہا جا سکتا ہے۔ کہ اب بھی دنیا میں کسی ادیب کو اپنی زبان کے تمام الفاظ یاد نہیں ہیں۔ رہا استعمالِ الفاظ سو اس بارہ میں بعض حضرات کا خیال ہے کہ آج کل استعمالِ الفاظ کے مواقع کم ہوتے جاتے ہیں اظہارِ خیالات وجذبات، ادائے مطالب، مسائلِ علمیہ کی افہام تفہیم اور واقعات کو ان کے اصلی ہیکل میں دکھانے کیلئے الفاظ سے زیادہ دلنشین اور سہل تر بیں ذرائع اختیار و ایجاد کرنے میں انسانی دماغ اور عقلیں صرف ہو رہی ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ زبان و الفاظ کے بجائے یہ ذرائع زیادہ مفید و کامیاب ثابت ہو رہے ہیں جس کی تفصیل و تمثیل آگے آتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں جو اسباب کسی چیز کی ترقی کے معاون ہوتے ہیں بعض اوقات وہی موجب زوال بھی بن جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جدید ترقی سے علم ادب مالامال ہو گیا۔ لیکن اب یہی اس کی جڑ کاٹنے لگی۔

اگر ہم زمانہ حال کے اخباروں اور رسالوں کا مقابلہ پچاس برس قبل کے اخبارات و رسائل سے کریں تو دونوں میں نمایاں فرق نظر آئیگا۔ قدیم رسالے حروف سے پُر ہوتے ہیں۔ اور جدید رسالے تصویروں سے۔ ایک میں جہاں لمبی چوڑی عبارت ہوتی ہے۔ دوسرے میں وہاں ایک چھوٹی سی تصویر مزاحی (کارٹون) نظر آتی ہے خیال کیا گیا ہے کہ اظہار خیال کے لئے تصویریں الفاظ کی بہ نسبت زیادہ کارآمد ہوتی ہیں۔ اسی لئے آجکل کے اخبار و رسائل اپنی قبولیت کیلئے تصویروں، کارٹونوں اور نقشوں کے محتاج ہو گئے ہیں۔ اور بعض اخبارات اور رسالے تو محض تصویروں کے بل پر چلتے ہیں۔

کتاب میں تصویر سے جان پڑ جاتی ہے۔ پس اخباروں کی طرح کتابیں بھی تصویروں سے سجائی جاتی ہیں۔ نفسیات کا ایک مسئلہ ہے کہ جوان اور سن رسیدہ لوگوں کی بہ نسبت بچوں کی تفہیم و تعلیم کے لئے تصویریں زیادہ کارآمد ہیں۔ اور اسی لئے بچوں کی کتابوں میں تصویریں لازمی خیال کی جاتی ہیں۔ اگر یہ اصول صحیح ہے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ کہ ہم زمانہ طفولیت کی طرف واپس جا رہے ہیں۔

یورپ اور امریکہ کے واقعات چند ہفتہ بعد ہی، ہم

سنیما میں دیکھتے ہیں۔ اور وہ قلم کے ذریعہ اس خوبی سے دکھائے جاتے ہیں۔ کہ لائق سے لائق انشا پرداز ان کو اپنی نثر یا نظم میں اس طرح بیان نہیں کر سکتا۔ اہلِ تحقیق کا خیال ہے کہ عہدِ قدیم میں اظہارِ خیالات تصویروں کے ذریعہ ہوتا تھا۔ حروف بہت بعد کی ایجاد ہیں۔ اگر یہ واقعہ ہے تو شاید پھر وہی "تصویروں کا زمانہ" آرہا ہے۔

عام مجالس میں دیکھا جاتا ہے۔ کہ ہمارے مقررین زبان کے زور میں متقدمین کو نہیں پہنچتے۔ وہ الفاظ کی بجائے نقشے تصویریں یا اسی قبیل کی دوسری چیزیں استعمال کرتے ہیں۔ مشکل مضامین مثلاً طبعیات یا کیمیا کے لکچر صرف الفاظ کے ذریعہ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ ان کی کامیابی کے لئے اشیا اور تجارب کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ ہمارے ملک کے مشہور عالم سائنسدان ڈاکٹر بوس جب اپنی مایۂ ناز تحقیق یورپ کے سامنے پیش کرنے چلے۔ تو ان کو اس دور دراز سفر میں اپنے آلات کا صندوقچہ ساتھ اٹھائے پھرنا پڑا۔ یہی حال دیگر علوم کا ہے۔ جغرافیہ اور ہیئت کی تعلیم خاکوں، نقشوں، کرّوں اور تصاویر کے بغیر محال ہے۔ تاریخ اور معاشیات کی تقریروں میں بڑے بڑے اعداد و شمار کو یاد رکھنا بہت مشکل کام ہے۔ زمانۂ حال کے مقررین ان کا کام نقشہ جات مخطط (گرافس) سے لیتے ہیں۔ نفسیات کے اوق مسائل یعنی ذہن و حافظہ کی پیمائش کی کوشش ہو رہی ہے۔ اور ان قوتوں کو بھی حتی الامکان اشکال کی مدد سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ حرارت کا تغیر، ممالک کی آبادی اور تجارت، ذہنی ترقی، اجرام فلکی کی ہیبتناک جسامتیں اور ان کے باہمی فیصلے گرافس (نقشہ جات مخطط) کے ذریعہ اچھی طرح سمجھ میں آتے ہیں۔ غرضکہ علمی تقریروں میں نقشے، گرافس، میجک لینٹرن اور دیگر آلات بہت کچھ زبان کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔

غالباً یہ کہا جائیگا۔ کہ ادب ان جھمیلوں سے بری ہے۔ یہ ایک حد تک صحیح ہے۔ لیکن اگر ہم غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا۔ کہ ادب کے حسن و جمال میں بھی فرق آگیا ہے۔ اور اس کے نقش و نگار کی بہترین شے نظم ضرور اس عالمگیر تحریک سے متاثر ہوئی ہے۔ اس کا فیصلہ قدیم اور زمانہ حال کے شعراء کا کلام کر سکتا ہے۔

یہ درست ہے کہ مصوّر شاعر کا کام نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ شاعری مصوّری سے بے نیاز نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ زبان دراصل خیالات کو پوشیدہ رکھنے کے لئے دی گئی ہے۔ خیالات کو ظاہر کرنے کے لئے نہیں عطا کی گئی۔ انسان کی صحیح کیفیات قلبی اس کی حرکات و سکنات یا اشاروں سے معلوم ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل اعلےٰ درجہ کے ضخیم ناول مختصر ڈراموں

کی صورت میں منتقل ہو رہے ہیں۔ مشرق اور مغرب کے ڈرامہ نگاروں کا اس بارہ میں اتفاق ہے۔ کہ اعلیٰ ڈرامہ وہ ہے جس میں الفاظ کم ہوں اور اثر زیادہ' الفاظ کی کمی حرکات و سکنات سے پوری کی جاتی ہے۔ چنانچہ ترقی یافتہ ممالک میں ایک ڈرامہ کی دو نقلیں تیار ہوتی ہیں۔ ایک میں الفاظ ہوتے ہیں۔ اور دوسری میں ایکٹر کے لئے ہدایات۔ کیونکہ الفاظ میں چاہے کتنا ہی زور قلم دکھایا گیا ہو۔ اگر ایکٹر کو سلیقہ نہیں تو کچھ اثر نہ ہوگا۔

زبان کتنی ہی مکمل اور مہذب ہو صحیح اظہار خیالات کے لئے نامکمل ہوتی ہے۔ یہ کام چہرہ' آنکھ' ہاتھ پاؤں سے بدرجہ اتم پورا ہوتا ہے۔ ایک جملہ کو مختلف لہجوں میں ادا کیا جائے تو مختلف مطالب پیدا ہو جاتے ہیں۔ لہجے اور اشاروں کی کارگذاری کا تجربہ ہر شخص روزمرہ کے معاملات میں کر سکتا ہے۔ جب دو دوستوں میں تعلقات گہرے اور بے تکلفی زیادہ ہوتی ہے تو وہ گفتگو کرتے وقت پورے ایکٹر بن جاتے ہیں۔

واردات قلبیہ صرف مظاہر جسمانی ہی سے سمجھے جاتے ہیں۔ شرگیں آنکھیں' خمیدہ گردن' چین جبیں' زہر خند' زیر لب مسکراہٹ وہ وہ باتیں کہتی ہیں جو الفاظ بیان نہیں کر سکتے۔ اداؤں کے لئے بہت سے الفاظ پیدا ہوتے مثلاً عشوہ' ناز' ادا' غمزہ' کم نگاہی لیکن ایک شاعر کو اس پر بھی تسلی نہیں ہوتی۔ اس کو بہت سی ادائیں ایسی نظر آتی ہیں۔ جن کے لئے الفاظ نہیں ملتے اور مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ ؎

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست
بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

نعرہ ہائے تحسین و تعجب جو کام دیتے ہیں وہ طول طویل جملوں کے بس کا نہیں۔ الغرض اظہار خیالات کے لئے آواز اور چہرہ الفاظ کی نسبت زیادہ کارآمد ہیں۔ ایک بڑے ادیب کا قول ہے کہ "حروف سے الفاظ کے معنی سمجھے جاتے ہیں۔ اور آواز سے انسان کا مافی الضمیر معلوم ہوتا ہے۔"

واقعات عالم کو سنیما میں پیش کیا جاتا ہے لیکن فلم میں کسی قدر تخئیل کو بھی دخل ہوتا ہے۔ حال میں واشنگٹن کے ایک کامیاب موجد مسٹر سی ایف جنکنس نے ایک آلہ تیار کیا ہے۔ جس کے ذریعہ عکسی تصاویر (فوٹو) لاسلکی پیام کی طرح دوسرے مقام پر منتقل کی جا سکتی ہیں۔ اس آلہ کی مدد سے تصویریں چند میل کے فاصلہ پر منتقل ہوتی ہیں۔ لیکن مسٹر جنکنس کا دعوےٰ ہے کہ طاقتور آلہ کی مدد سے فاصلہ کی کمی دور کی جا سکتی ہے' اگر اس ایجاد میں کامیابی ہو گئی۔ تو ہم لندن اور پیرس کے کرکٹ بازوں اور ایکٹروں کا حال اخباروں

ایڈیٹر کی محبت

"کندن" نامی ماہوار رسالہ کے ایڈیٹر سوشیل چندر سے میری عرصہ سے ملاقات ہے۔ میں اُنہیں عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ اُن کے حسن اخلاق، اعلیٰ تعلیم، خاندانی وقار اور قابلیت کا اسقدر معترف ہوں کہ بغیر اُن کے ملے طبیعت کو چین نہیں آتا۔ اکثر وقت اُنہیں کی صحبت میں کٹتا ہے۔ بڑے پاکیزہ مذاق کے آدمی ہیں۔ دن رات سوائے علمی چرچوں کے اور کوئی تذکرہ اُنہیں پسند نہیں آتا اُن کی قابلیت کا بڑا بھاری ثبوت یہ ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں اُنہوں نے "کندن" کو اسقدر ہر دلعزیز اور دلچسپ بنا دیا ہے کہ ہر طبقے کے آدمی اُسے بے حد شوق سے پڑھتے ہیں۔

ایک دن میں حسب معمول سوشیل چندر سے ملنے گیا۔ کمرہ نہایت قیمتی سامان سے آراستہ تھا۔ دیوار پر مختلف اقسام کی تصویریں لٹک رہی تھیں۔ میں کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ میری نظر دیوار کے ایک فریم پر پڑی جو گنگا جمنی نفیس نقش کاری کی وجہ سے بہت خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ اچھی چیز ہر ایک کو مرغوب ہوتی ہے۔ میرا دل یکایک اُس کی طرف کھنچ گیا۔ میں حیران تھا کہ اس قیمتی فریم میں کس کی تصویر ہوگی۔ بہت دیر دیکھنے کے بعد میں نے پوچھا "یہ تصویر کس کی ہے؟"

سوشیل چندر نے شرمندہ ہوکر جواب دیا۔ "تصویر نہیں" "پھر کیا ہے؟"

اُس نے آہ سرد بھرتے ہوئے کہا "میری بیوقوفی ہے اور کچھ نہیں!"

میں نے نزدیک جاکر دیکھا۔ فریم میں تصویر نہ تھی بلکہ ایک پوسٹ کارڈ تھا۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کارڈ پر کوئی خاص بات نہ تھی۔ صرف دو چار الفاظ تھے وہ بھی محبت سے خالی مضمون یہ تھا

"شریمان جی نمستے"

اگست کا "کندن" ملا۔ مگر افسوس ہے کہ ۳۷ سے ۴۸ صفحات نہیں ہیں۔ ان کے نہ ہونے سے "آرسی درشن" نامی قصہ نامکمل رہ گیا ہے۔ اگر ہوسکے تو رسالہ دوبارہ بھیجکر مشکور فرمائیں۔

راقمہ

کندن بالا۔ خریدار نمبر ۶۱۸

معرفت بابو اندرسین ڈپٹی مجسٹریٹ

میں نے حیران ہو کر پوچھا کہ اتنے خریدار [illegible]
باوجود اس نمبر کے خریدار پر تمہاری اتنی مہربانی
کیوں ہے۔ سچ کہنا۔
سوشیل چندر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "یہ
محض تمہارا خیال ہے"۔
میں نے کہا "تم مجھ سے چھپاتے ہو صاف صاف
کیوں نہیں کہتے کہ اس سے تمہارا کوئی تعلق ہے"
سوشیل چندر کچھ دیر تو سر نیچا کئے سوچتے رہے
پھر اپنی رقت آمیز کہانی یوں سنانا شروع کی!
"کندن ہمارے گاؤں میں سب سے خوبصورت
لڑکی تھی۔ بچپن میں ہم اور وہ برسوں ساتھ کھیلا
کئے ہیں۔ کیسے عجیب دن تھے۔ میں صرف اُسے
دیکھ دیکھ کر ہی اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتا تھا
میری عمر اُن دنوں بہت تھوڑی تھی مگر کندن میں
مجھے ایک پُرسحر کشش معلوم ہوتی تھی۔ انسان
کا دل فطرتاً محبت کا خوگر واقع ہوا ہے۔ اس
میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ میں نے اُسے
اور اُس نے مجھے ہمنشینی کے لئے انتخاب کر لیا
تھا۔ اگر بچپن میں عشق کا ادعا قابلِ اعتراض نہ
سمجھا جائے تو میں بلا پس و پیش کہہ دوں گا کہ مجھے
اُس سے ناقابلِ فہم عشق تھا۔ میں اُس کے پیاری

[illegible]
صرف مجھ ہی کو حاصل [illegible]
گذر گئے اُن کی حفظ [illegible]
زیادہ نہیں مگر [illegible] بھی [illegible]
اُس سنہرے [illegible] کی طرح [illegible]
بازوؤں سے جھڑ گیا ہو [illegible]
دلاتا ہے۔

میں ابھی کمسن ہی تھا کہ مہرِ مادری سے محروم
ہو گیا۔ انٹرنس پاس کرنے سے پیشتر ہی والد کا
سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ میں اب اکیلا اپنی بہن کے
ساتھ مکان میں رہا کرتا تھا۔ کندن صبح شام میرے
پاس آیا کرتی تھی اور گھنٹوں میرے پاس بیٹھی رہا
کرتی تھی۔ میں اُسے کہانیاں سنایا کرتا تھا اور
وہ بے حد شوق کے ساتھ سنا کرتی تھی۔ وہ میری
کتاب کے حرفوں کو کنول کے سفید پھولوں سے
چھپا کر مجھے پڑھنے سے باز رکھتی تھی۔ ایک دن
میں تاروں کی چھاؤں میں اپنے جھونپڑے سے
نکل کر باہر پتھروں پر بیٹھا ہوا تھا اور اکیلا اپنی قسمت
کو بیٹھا رو رہا تھا۔ مجھے مطلق خیال نہ تھا کہ میرا
کوئی رشتہ دار زندہ بھی ہے۔ اتنے میں پیچھے
پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ کسی نے میرے گلے میں

پھولوں کا ہار ڈال دیا اور پھر جھٹ آنکھیں بند کرلیں۔ [illegible] نے پلٹ کر دیکھا تو کندن کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اور [illegible] دیکھو کیسے ٹھگے گئے۔ اسی طرح [illegible] دھوکا کھاتا تھا۔ [illegible] میں کسی [illegible] نہیں ہوئی۔

(۲)

کئی سال گذر گئے میں نے انٹرنس کا امتحان پاس کر لیا۔ اور کالج داخل ہونے کے لئے گھر سے چلا گیا۔ ہر چند مجھے یقین تھا کہ میری محبت کامیاب ہوگی۔ لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ میں مسرور تھا؟ خدا ہی جان سکتا ہے جو ساتھ رہکر اکیلا ہوجائے خواہ کتنا ہی خوش کیوں نہ ہو حقیقی مسرت اس کا حصہ نہیں ہوسکتی۔ میرا درد ایک تلخ درد تھا۔ اور محبت نے۔ اس کی محبت کی برکت نے اس درد کو شدید تر بنا دیا تھا۔ اس حالت کرب و نزع میں۔ اس دردناک مصیبت میں میری روح کے لئے جو چیز راحت و پناہ ہوسکتی تھی وہ یہ آرزو تھی کہ میں اپنی بچپن کی ہم جلیس کو اپنی آغوش میں بیٹھا دیکھوں۔ میں چاہتا تھا کہ مجھے پر لگ جائیں اور میں اُڑ کر وہاں پہنچ جاؤں۔ اور اُسے سینے کے کسی گوشے میں چھپا لوں۔ مگر وائے مجبوری! رسم دنیا کی بندشیں کب اس کی اجازت دیتی تھیں میں بی۔ اے میں پڑھتا تھا کہ میں نے سنا کندن کی شادی کی بات چیت ہو رہی ہے۔ میرے دل [illegible] دھکا سا لگا۔ سوچتا تھا کہ کندن کی شادی کے [illegible] اس قدر جلد کیوں پڑ گئی ہے۔ [illegible] خیال آتا کہ اب کیا ہوگا۔ اور اُس کی جدائی کے خیال سے دنیا میری نگاہوں میں تاریک ہو جاتی تھی۔ میں نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اُس کے بغیر کیونکر رہ سکونگا۔ اکثر سوچتا تھا کندن کو تو میرا خیال ہے اُسے خط لکھ دوں تو یقیناً گھر بار چھوڑ کر میرے ساتھ چل کھڑی ہوگی۔ مگر یہ جرأت کسے ہوسکتی تھی۔ آخر کار رو دھو کر چپ ہو رہتا اور دعا مانگتا تھا" پرماتما میری مراد پوری کر"۔ بے بسوں کا اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔

بارے گرمی کی چھٹیاں آئیں۔ میں گھر چلا۔ اس وقت میرے سینہ میں جذبات کا طوفان اُٹھ رہا تھا۔ مگر گاؤں پہنچکر دل بیٹھ گیا۔ کندن اب پہلے کی طرح مجھ پر پھولوں کی بارش نہیں کرتی تھی۔ اب وہ چپ چاپ آکر پیچھے سے آنکھیں بند نہیں کرتی تھی وہی کندن اب شادی کے خیال سے بےحد سنجیدہ ہوگئی تھی۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ اس صدمہ کو میں نے کس طرح برداشت کیا۔ مگر اتنا یاد ہے کہ میرے سر پر مہینوں ایک قسم کا جنون سوار رہا۔ طبیعت ہر وقت افسردہ رہنے لگی۔ کسی کام میں جی نہ لگتا تھا۔ رات کو نیند نہ آتی تھی۔ کندن کی حالت مجھ سے بالکل مختلف تھی۔ شادی کے بعد وہ مجھے بھول سی گئی اور روح کی پوری قوت سے شوہر کی خدمت میں مصروف ہوگئی۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے ایک خط لکھ ڈالا۔ ایسی کاوش سے کہ کوئی طالب علم سالانہ امتحان کے موقع پر بھی نہ کرتا ہوگا۔ کئی دن گذر گئے مگر جواب نہ آیا۔ کیا اتنی جلدی ہوا کا رُخ بدل گیا؟ ایک دن دوپہر کے وقت مراری بابو نے نوکر بھیجکر مجھے بُلوایا۔ میں حیران تھا کہ آج ایسی کیا ضرورت پڑی ہوگی کہ مجھے اس وقت بُلوایا ہے۔ چارو ناچار وہاں پہنچا۔ دیکھا تو میرے خط کے ساتھ ہی پن کیا ہوا خط مراری بابو کی میز پر رکھا ہے۔ میرے ہوش جاتے رہے۔ مراری بابو نے خط میرے ہاتھ میں دیکر کہا۔ لو اسے پڑھ لو۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دیکھنا شروع کیا۔ یہ خط کندن کے شوہر کی طرف سے تھا۔ مضمون یہ تھا:۔

مسٹر رمان جی

ایک شخص سوشیل چندر نامی نے میری بیوی کو یہ خط لکھا ہے۔ اب تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ یہ آپ کا ایک نوعمر پڑوسی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی شخص اس طرح میری بیوی کو خط لکھے آپ بُلا کر اُسے تنبیہ کر دیجئے گا۔

اندرسین

مراری بابو نے خط کو پھاڑتے ہوئے کہا سوشیل چندر یہ تم نے بہت بُرا کیا ہے۔ دیکھو آئندہ کوئی ایسی حرکت نہ کرنا جو کندن کے شوہر کو ناگوار ہو ندامت سے میری گردن جھک گئی۔ میں نے اپنی صفائی میں بہت کچھ کہنے کی کوشش کی مگر بیفائدہ چہرے کا رنگ میرے دل کی حالت کا مکمل اظہار تھا۔ اس کے بعد میں نے بی اے۔ ایم اے پاس کیا۔ اپنے بہنوئی کے اصرار کے باوجود بھی وکالت کا خیال ترک کر دیا۔ اب نو سال سے "کندن" نکال رہا ہوں۔ اپنا علم و عقل، مال و دولت سب کچھ اس کی نذر کر چکا ہوں۔ اور ہر طرح سے اسے بہترین بنانے کی کوشش کر رہا ہوں میری مراد پوری ہو چکی ہے۔ کندن میرے رسالہ کی خریدار ہے۔ ایک دن میں اپنی بہن سے ملنے گیا۔ باتوں باتوں میں کندن کا ذکر آیا۔ میں نے پوچھا

کندن کا کوئی خط بھی آتا ہے

"معلوم نہیں وہ کہاں ہے۔"

مگر میں تو جانتا تھا وہ کہاں ہے۔ ہر ہفتہ گزٹ پڑھنا اور اُس کے شوہر کی تبدیلی کی خبر رکھنا میرا فرض تھا۔ میں نے کہا آجکل وہ بانکی پور میں ہے اُسے خط تو لکھو۔

دیوکی کا چہرہ ڈوبتے ہوئے آفتاب کی طرح سرخ ہوگیا۔ غصہ سے بولی "مجھے ایسی کیا ضرورت پڑی ہے کہ اُسے خط لکھوں۔ جب اُس کا دل نہیں چاہتا تو ہم کیوں خوشامد کریں؟

میرے منہ سے کچھ نہ نکلا۔ وہ خبر لے یا نہ لے مگر میرا تو فرض ہے کہ اُس کا خیال رکھوں۔ دیوکی کو کیسے سمجھاؤں۔

دوسرے دن جونہی میں دفتر پہنچا۔ میرے مینیجر نے مجھے ایک خط دکھایا اور دفتری کی شکایت کی۔ اور میرے پاس فائل کا جو فارم تھا اُسے مانگا تاکہ اُس سے کندن کی شکایت رفع کرے۔

میں نے خط دیکھا۔ تھوڑی دیر کے لئے دم بخود ہوگیا یہ خط کندن کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ مجھے میری محنت کا پھل مل گیا۔ میں نے مینیجر سے کہا۔ فارم بھیجنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کندن کی ایک جلد جو ہر طرح سے اچھی ہو میرے پاس لاؤ۔ میں پتہ خود لکھونگا۔ اُسی دن پتہ میں نے خود لکھا اور اپنے ہی ہاتھ سے ڈاک میں ڈالا۔ یہ وہ خط ہے جو ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے ہے میں کیا کہوں کہ میرے دل میں اس کی کتنی قدر ہے۔

(ماخوذ) افتخار الرسول بدر

نغمہ سنجیٔ فرقت

سامانِ صد نوائے پریشاں کئے ہوئے
بیٹھا ہوں ضبطِ سوزشِ پنہاں کئے ہوئے

مشقِ خرامِ ناز وہ فرمائیں شوق سے
لیکن خیالِ گورِ غریباں کئے ہوئے

جاتا ہوں اپنے سر پہ لئے خاکپائے دوست
نقشِ جبیں کو مہرِ درخشاں کئے ہوئے

پھر نامۂ فراق رقم کر رہا ہوں میں
خونِ جگر کو زینتِ عنواں کئے ہوئے

جاتا ہوں داغِ عشق چھپائے حرم کو میں
سینے میں اک چراغِ فروزاں کئے ہوئے

عابد ہوا ہے پھر تری فرقت میں نغمہ سنج
ہر ایک داغِ دل کو نمایاں کئے ہوئے

"گورا"

مصنفہ رابندرا ناتھ ٹیگور مترجمہ عبدالستار خاں

باب سوم

بی نئے اور گورا بالاخانہ سے اُترنا ہی چاہتے تھے کہ گورا کی والدہ آن پہنچیں۔ بی نئے نے اُنکے قدموں کی خاک پیشانی سے مل لی اور آداب بجالایا

انند امائی کو دیکھکر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ گورا کی والدہ ہیں۔ وہ چھریرے بدن کی اور میانہ قد تھیں۔ سر کے چند بال سفید ہوگئے تھے لیکن معلوم نہ ہوتے تھے۔ دیکھنے میں چالیس سے کم کی معلوم ہوتی تھیں۔ چہرہ نازک تھا اور خط وخال موزوں۔ اُن کے چہرے سے متانت اور ذہانت کے آثار نمایاں تھے۔ رنگ سانولا تھا جس کو گورا کے رنگ سے کچھ مناسبت نہ تھی۔ اُن سے ملنے والوں کو جو بات سب سے پہلے انوکھی معلوم ہوتی تھی وہ یہ تھی کہ وہ ساری کے ساتھ قمیص بھی پہنتی تھیں۔ یہ اُس زمانہ کا ذکر ہے جب نئی عمر کی عورتوں میں قمیص پہننے کا رواج تو ہو چلا تھا

لیکن پُرانے خیال کی خواتین اُسے عیسائیت کی علامت سمجھتی تھیں۔ انند امائی کے شوہر کرشن دیال کمسریٹ میں ملازم تھے۔ انند امائی نے اُن کے ہمراہ اپنی زندگی کا ایک بڑا حصّہ بنگال کے باہر گذارا تھا۔ بچپن سے وہ باہر رہیں۔ اور وہ یہ نہ جانتی تھیں کہ جسم کو اچھی طرح چھپانا مضحکہ خیز ہے اُن کو امور خانہ داری میں بڑا دسترس تھا۔ اور گھر کے کام بڑی دلچسپی سے کیا کرتی تھیں۔ معمولی جھاڑو دینا اور برتن وغیرہ دھونے کا کام اپنے ہاتھ سے اس دلچسپی سے کرتی تھیں جس دلچسپی سے سیتی پرُتی اور خانگی حساب وکتاب رکھتی تھیں۔ وہ اپنے گھر والوں کی بذات خود خبرگیری کرتیں اور پڑوسیوں سے حسنِ سلوک سے پیش آتی تھیں۔ انند امائی نے بی نئے کے آداب کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ گورا کی آواز جب نیچے پہنچتی ہے تو ہم سمجھ جاتے

ہیں کہ یقیناً بی ننئے آئے ہوئے ہیں کئی دنوں سے ۔ مکان سُونا سُونا معلوم ہوتا تھا ۔ تم کیوں نہ آئے ۔ مجھکو بڑی فکر تھی ۔ بیٹا ! کہیں تمہاری طبیعت خراب تو نہیں ہوگئی تھی ۔

بی ننئے (رُکتے ہوئے) جی نہیں ، اماجان بیمار تو نہیں تھا ۔ بارش کی وجہ سے حاضر نہ ہو سکا ۔

گورا ۔ بیشک ! آجکل بارش کا بہانہ ہے ۔ پھر دھوپ کا ہونے لگے گا ۔ عناصر کے دیوتاؤں پر الزام لگاکر اپنی بریت اس لئے کی جاتی ہے کہ وہ تو کچھ جواب دے نہیں سکتے ۔ اصلی سبب کا علم تو خدا ہی کو ہے ۔

بی ننئے ۔ گورا تم ایسی فضول باتیں کیوں کیا کرتے ہو ؟

انندامائی ۔ ہاں یہ ٹھیک ہے ۔ لیکن گورا کو یہ نہ کہنا چاہئے ۔ انسان کی طبیعت ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی کبھی تو انسان خوش رہتا ہے اور کبھی پریشان ۔ اس لئے اس کے متعلق کچھ گفتگو نہ کرنا چاہئے ۔ بی ننئے آؤ میرے کمرے میں چل کر کچھ ناشتہ کر لو میں نے کچھ ایسی مٹھائیاں تمہارے لئے بنائی ہیں جنہیں تم رغبت سے کھاتے ہو ۔

گورا نے سر ہلاکر کہا اماجان یہ آپ کے کمرے میں نہیں کھا سکتے ۔ میں ان کو وہاں کھانا نہ کھانے دونگا ۔

انندامائی ۔ گورا تم ایسی بیہودہ باتیں نہ کرو ۔ اسی لئے تو میں تم سے کبھی نہیں کہتی ۔ تمہارے والد تو اتنے متعصب ہو رہے ہیں کہ وہ تو صرف اپنے ہی ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھاتے ہیں ۔ لیکن بی ننئے تم جیسا نہ ہٹ دھرم ہے اور نہ متعصب ۔ وہ سیدھا سادا لڑکا ہے ۔ تم اس کو زبردستی روکنا چاہتے ہو

گورا ۔ جی ہاں میں ان کو ضرور روکونگا ہم لوگ آپ کے کمرے میں اُس وقت تک کھانا نہ کھائینگے جبتک کہ آپ لچھمینا کو نکال نہ دیں ۔

انندامائی نے کبیدہ خاطر ہوکر کہا " مجھکو امید نہ تھی کہ تم اپنے منہ سے ایسے الفاظ نکالو گے ۔ تمنے یہ کہنے کی کیسے ہمت کی ۔ کیا تم نے کبھی اُس کے ہاتھ کا کھانا نہیں کھایا ہے ؟ تم کو اُس نے پال کر اتنا بڑا کیا ۔ کل تک بغیر اُس کے ہاتھ کی چٹنی کے تم کو کھانے میں مزہ نہ آتا تھا اور آج یہ کہتے ہو ۔ بھلا میں اس کی خدمتوں اور جاں نثاریوں کو بھول سکتی ہوں ۔ مجھکو وہ وقت خوب یاد ہے جب تم کو چیچک نکلی تھی تو اُس نے کس محبت اور جانفشانی سے تمہاری خدمت کی تھی ۔ تمہاری خبرگیری میں اُسنے

رات کو رات اور دن کو دن نہ سمجھا۔

گورا۔ اب اُسے پنشن دے دیجئے۔ تھوڑی سی زمین خرید دیجئے۔ اور ایک مکان بنوا دیجئے۔ لیکن اب اماں جان اُسے گھر میں نہ رکھئے۔

انند امائی۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ہر خدمت کا معاوضہ زر یا زمین ہی ہو سکتا ہے۔ اُس کو تو اب صرف اتنی تمنّا ہے، کہ وہ تمکو دیکھتی رہے اور تمہارے ہی یہاں مر جائے۔

گورا نے مجبور ہو کر کہا۔ آئندہ آپ کی مرضی۔ مگر بی نئے آپ کے یہاں کھانا نہیں کھا سکتے۔ مذہبی قواعد کی پابندیاں ہر حالت میں لازمی ہیں۔ مجھکو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ آپ ایک بڑے پنڈت کی صاحبزادی ہو کر مذہبی پابندیوں کا کچھ خیال نہیں رکھتیں۔

انند امائی نے مسکرا کر کہا۔ سُنو بیٹا! پہلے میں ہر رسم و رواج کی سخت پابند تھی۔ اسی پابندی نے اکثر مجھکو رُلایا ہے۔ اُس وقت تو تم پیدا بھی نہ ہوئے تھے۔ میں ہر روز اپنے ہاتھ سے شیو جی کی مورت بنا کر پوجا کرتی تھی۔ اور تمہارے والد اس مورت کو میرے سامنے سے اُٹھا کر پھینک دیا کرتے تھے۔ اُس زمانہ میں میں کسی اچھے برہمن کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھانا بھی عار سمجھتی تھی۔ اُن وقتوں میں ریل اتنی نہ پھیلی تھی۔ اکثر بیل گاڑیوں، اونٹ گاڑیوں یا پالکی میں سفر کرنا پڑتا تھا۔ راستہ میں میں کچھ نہ کھاتی۔ اکثر ایک ایک دن اور ایک ایک رات بھوکی رہ جاتی تھی۔ تمہارے والد مجھکو پرانی وضع کے خلاف ساتھ لئے لئے پھرتے تھے۔ اس لئے اُن کے انگریز افسر اُن سے بہت خوش تھے۔ اور اُن کی برابر ترقی ہوتی گئی۔ اسی وجہ سے اُن کو بجائے زیادہ دورے پر رکھنے کے ہیڈ کوارٹر رکھا جاتا تھا۔ ان باتوں کے ہوتے ہوئے کیا تم سمجھتے ہو کہ میری متعصبانہ پابندیوں کو وہ آسانی سے توڑ سکے ہونگے؟ اپنے بڑھاپے میں اُنہوں نے کافی سرمایہ جمع کرنے کے بعد پنشن لے لی ہے اور یکایک ایسے زبردست پابند اور متعصب بن بیٹھے ہیں۔ لیکن اب میں اُن کی اس رجعت قہقری میں اُن کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ میری سات پشتوں کی روایات کو یکے بعد دیگرے جڑ سے اُکھاڑ ڈالا گیا کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ محض تمہارے الفاظ سے دوبارہ وہ جڑ پکڑ سکیں گی۔

گورا۔ آپ اپنی سات پشت کا ذکر چھوڑئیے وہ تو اب آپ کے کسی کام پر اعتراض نہیں کرتے۔

لیکن ہم لوگوں کی خاطر آپ کو چند باتوں کی پابندیاں کرنی چاہئیں۔ اگر آپ مذہبی کتابوں کی توقیر نہیں کرتی ہیں تو محبت کا واسطہ نبھاییے۔

انندامائی نے رنجیدہ ہو کر کہا "تم محبت کا واسطہ دیکر مجھکو سمجھانا چاہتے ہو۔ میں ان باتوں کو خوب اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ کیا مجھکو ہر قدم پر اپنے شوہر اور اپنے لڑکے سے الجھنے میں آرام نصیب ہو سکتا ہے؟ لیکن تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ میں نے اُسی دن سے ان پابندیوں کو خیرباد کہدیا جس دن تم میری گود میں آئے جس وقت تمہارے کوئی بچہ ہوگا تو معلوم ہو جائے گا کہ بچے اس دنیا میں ذات پات لیکر نہیں آتے بس اُسی دن سے میری سمجھ میں یہ بات آگئی اگر میں نے کسی سے صرف اس وجہ سے نفرت کی کہ وہ کوئی نیچی ذات کا عیسائی ہے تو خدا بھی تمکو مجھ سے چھین لے گا۔ میں نے رات دن یہی دعائیں مانگیں کہ خدا میری گود بھری رکھے اور تم زندہ و سلامت ہو اور میں دنیا میں سب کے ہاتھ کا پانی پیونگی۔

انندامائی کے منہ سے آج پہلی مرتبہ یہ باتیں سُنکر بی نئے کے دل میں کچھ شبہات پیدا ہوئے اور وہ گورا کی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن فوراً ہی تمام شکوک رفع ہو گئے۔

گورا بھی کچھ پریشان سا ہوا اور کہنے لگا "اماجان میں اچھی طرح آپ کی باتیں نہ سمجھ سکا۔ کیا ان لوگوں کے یہاں جو مذہب کے سخت پابند ہیں بچے زندہ نہیں رہتے۔ یہ بات آپ کے دلمیں کیسے پیدا ہوگئی کہ خدا نے خاص آپ ہی کے لئے ایک نیا قانون بنایا ہے۔

انندامائی۔ جس نے مجھے تم جیسی نعمت دی اُسی نے میرے دل میں یہ بات بھی ڈال دی ہے مجھے اس پر کچھ اختیار نہیں۔ اے میرے ناسمجھ بچے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ تیری حماقتوں کو کیا کروں خیر اب تم یہ بتاؤ کہ تم بی نئے کو میرے کمرے میں کھانا کھانے دوگے یا نہیں؟

گورا۔ اگر ان کو ابھی موقع مل گیا تو وہ دوڑکر آپ کے کمرے میں کھا آئینگے اُن کا جی یہی چاہتا ہے۔ مگر میں اُنہیں نہ جانے دونگا۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اُنہیں محض چند مٹھائی کے قتلوں کے لئے اُن کی ذمہ داریاں یاد نہ دلاؤں؟ اُنہیں اپنے کو اپنی باعث افتخار پیدائش کے مستحق ثابت کرنے کے لئے بڑی بڑی قربانیوں۔ بہت ایثار اور اپنی طبیعت پر قابو حاصل کرنے کی ضرورت ہو۔

اماجان آپ، خفا نہ ہوں۔

انتہ امائی۔ خوب۔ تم کیسی باتیں کرتے ہو بھلا میں کیوں ناراض ہونے لگی۔ مجھکو افسوس تو صرف اس بات کا ہے کہ تم جو کچھ کرتے ہو سمجھ بوجھ کر نہیں کرتے۔ جس طرح بھی ہوا میں نے تم کو پال کر اتنا بڑا کیا۔ لیکن جسے تم مذہب کہتے ہو اُسے قبول نہیں کر سکتی۔ چاہے تم میرے گھر میں کھانا کھاؤ یا نہ کھاؤ۔ میں اتنے ہی میں خوش ہوں کہ تم کو دونوں وقت دیکھ لوں۔ بیٹا بی سنئے تم کیوں اتنے رنجیدہ ہوتے ہو۔ تمہارا دل بڑا نرم ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ مجھے رنج ہوا لیکن سچ جاننا مجھکو بالکل رنج نہیں۔ میاں پریشان نہ ہو میں کسی دن تمہاری دعوت کرونگی۔ اور تمہارا کھانا کسی برہمن سے پکواؤنگی۔ لیکن یہ میں تم سے کہے دیتی ہوں کہ میں برابر لچھمیا کے ہاتھ کا پانی پیونگی۔

اس کے بعد وہ نیچے چلی گئیں۔ بی سنئے چند لمحے تک ساکت کھڑا رہا۔ اس کے بعد گورا سے مخاطب ہو کر آہستہ سے کہا "گورا کیا یہ زیادتی نہیں؟"

گورا۔ کس کی زیادتی ہے؟

بی سنئے۔ آپ کی اور کس کی۔

گورا۔ جی نہیں میری بالکل زیادتی نہیں ہے۔ سب کو اپنی اپنی حد کے اندر رہنا چاہئے کسی موقع پر اگر ہم ذرا بھی جھکے تو پھر ہماری کمزوری کی کوئی حد باقی نہیں رہ سکتی پھر خدا جانے کہاں جائیں۔

بی سنئے۔ بہرحال وہ آپ کی والدہ ہیں۔

گورا۔ آپ کیا فرماتے ہیں۔ میں بھی جانتا ہوں کہ وہ میری والدہ ہیں۔ اور سب کی مائیں ہوا کرتی ہیں۔ لیکن اگر آج محض اُن کی خاطر سے مذہبی پابندیوں کو ترک کردوں تو غالباً کل میں اُن کی توقیر بھی نہ کرونگا۔

بی سنئے۔ آج آپ کی والدہ کی باتیں سُنکر میری طبیعت میں کچھ اُلجھن سی پیدا ہوگئی ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے دل میں کوئی بات ایسی ضرور ہے جسے وہ سمجھا نہیں سکتی ہیں۔ اور جس سے اُن کو تکلیف ہوتی ہے۔

گورا نے بے صبری سے جواب دیا "آپ اپنے دماغ پر اتنا زور نہ ڈالئے۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ مفت میں آپکا وقت ضایع ہوگا"

بی سنئے۔ آپ میں یہ بُری بات ہے کہ آپ کسی چیز پر غور نہیں کرتے۔ اور جو بات آپکی

سمجھ میں نہیں آتی اُس کو محض خیالی وسوسہ سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اُن کے دل میں کوئی ایسا راز پنہاں ہے جو خاص ہے اور اسی کی وجہ سے اُن کی زندگی تلخ سی ہو رہی ہے۔

آپ ان کی باتیں غور سے سُنا کیجئے۔

گورا۔ میں جو کچھ سنتا ہوں غور سے سنتا ہوں۔ لیکن میں اس سے زیادہ توجہ کرنا نہیں کرتا کہ میں اس خیالی وہم میں خواہ مخواہ پڑ جاؤں۔

باب چوتھا

راستہ اور دقیق خیالات میں کچھ فرق نہیں لیکن جب انسانی تعلقات میں اُن کو عملی جامہ پہنایا جاتا ہے تو ان میں وہ یقینی قوت باقی نہیں رہ جاتی جو پہلے ہوتی ہے۔ بی نئے کی حالت تو کم از کم ایسی ہی تھی۔ چنانچہ مباحثہ کے وقت کسی اصول کا خواہ وہ کتنا ہی زبردست موید کیوں نہ ہو لیکن جب اس اصول کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آتا تو اس پر مروت غالب آجاتی تھی۔ لہذا اس کا اندازہ لگانا سخت دشوار ہے کہ گورا جن اصولوں کی تلقین کیا کرتا تھا اُن کو بی نئے نے محض اُن کی خوبیوں کی وجہ سے کہاں تک قبول کیا تھا۔ اور گورا کے دوستوں کی وجہ سے اُنہیں کس حد تک ماننے لگا تھا۔

اُس دن شام کو بارش ہو رہی تھی۔ سڑک پر کیچڑ ہو گئی تھی۔ بی نئے گورا کے مکان سے نکلکر آہستہ آہستہ اپنے گھر جا رہا تھا۔ لیکن اُس کے دل میں اصول اور ذاتی محسوسات کی ایک سخت کشمکش ہو رہی تھی۔

جب گورا نے یہ کہا تھا کہ آجکل سوسائٹی کو اُن تمام حملوں سے بچانے کے لئے جو اس پر ہر طرف سے کئے جاتے ہیں یہ نہایت ضروری ہے کہ ذات پات اور کھانے پینے کے معاملات پر زیادہ توجہ کی جائے۔ تو بی نئے نے اُسے منظور کر لیا تھا بلکہ اُن لوگوں سے جو اُس کے مخالف تھے سخت مباحثہ کیا۔ اور اُس نے اس مسئلہ کی تائید کرتے ہوئے کہا تھا کہ جب غنیم نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا ہو تو اُس کی ہر ایک راہ۔ ہر گلی۔ ہر دروازہ۔ ہر کھڑکی۔ بلکہ ہر سرنگ کو بند کر کے جان پر کھیل کر اُس کی حفاظت کرنا ہی مناسب ہے۔

لیکن جب گورا نے اُس کو انندا مائی کے

کمرے میں کھانا کھانے سے روک دیا تو اُس کے دل پر بڑی ٹھیس لگی۔

بی سنئے یتیم تو تھا ہی لیکن صغرسنی ہی میں اُسکی والدہ بھی انتقال کر چکی تھیں۔ اُس کا چچا کسی گاؤں میں رہتا تھا۔ بی سنئے کلکتہ میں طالبعلمانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ جس دن سے اُس سے اور انندا مائی سے گورا کے توسط سے ملاقات ہوئی تھی۔ اسی دن سے اُن کو وہ ماں کہا کرتا تھا۔

اکثر وہ اُن کے کمرے میں جاتا اور جبتک وہ اُسے مٹھائیاں نہ کھلاتیں جو اُسے بہت مرغوب تھیں اُنہیں دق کیا کرتا تھا۔ کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا تھا کہ کھانے کے وقت گورا سے برادرانہ رقابت کرتا اور انندا مائی سے کہتا کہ اماں جان تم گورا کی طرفداری کر کے اُسے زیادہ دیتی ہو۔ بی سنئے یہ بھی جانتا تھا کہ اگر وہ اُن سے دو تین دن نہ ملتا تھا تو اُنہیں سخت انتظار رہتا اور بےچینی رہتی۔ جب وہ اُن کے ہاں جاتا تو وہ اُس سے ملنے کے لئے اور لوگوں کے اُٹھنے کا بے صبری سے انتظار کیا کرتی تھیں۔ اور آج اُسے سوسائٹی کے نام سے اُن کے کمرے میں کھانا کھانے سے روکا جاتا ہو یہ ایسی بات تھی جو دونوں برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

بی سنئے نے اپنے مکان پر پہنچتے ہی سوچا کہ جس وقت انندا مائی نے ہنسکر یہ کہا کہ آج سو میں تمہارے کھانے کو ہاتھ نہ لگاؤں گی اور جب تمہاری دعوت کرونگی تو کسی برہمن سے کھانا پکواؤنگی، اُس وقت اُن کو کیسا کچھ صدمہ نہ ہوا ہوگا۔

بی سنئے کا مکان سونا تھا۔ کمرہ میں اندھیرا تھا۔ کاغذ اور کتابیں بے ترتیبی سے پھیلی ہوئی تھیں۔ اُس نے دیا سلائی جلا کر لیمپ روشن کیا۔ اس لیمپ پر ملازم کی اُنگلیوں کے دو تین داغ پڑگئے تھے۔ میز پر جو سفید کپڑا بچھا ہوا تھا۔ اُس پر کہیں سیاہی اور کہیں تیل کے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ اس کمرے میں اُسے وحشت ہونے لگی عالم تنہائی اور صحبت کے اثرات نے اُسے افسردہ کر دیا تھا۔ اس وقت ملک کو آزاد کرانیکی جدوجہد اور اپنی جماعت کی محافظت جیسے اہم فرائض بھی اُس کو موہوم اور بے معنی معلوم ہوتے تھے۔ صرف اُسے اُسی چڑیا میں اصلیت اور حقیقت کی جھلک دکھلائی دیتی تھی جو جولائی (ساون) کے مہینے میں ایک دن صبح کو اُس کے پنجرے کے دروازہ تک آئی تھی اور پھر اُڑ گئی۔ مگر اُس نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ اُس کے خیالات اُس 'نامعلوم چڑیا' پر نہ جم جائیں۔

اس لئے اُسنے انند امائی کے اس کمرے کا خاکہ اپنے دماغ میں کھینچنے کی کوشش کی جہاں گورلانے اُسے جانے سے روکا تھا۔

سیمنٹ کا صاف وستھرا فرش ہے۔ کمرے کے ایک جانب پلنگ بچھا ہوا ہے۔ اور اس پر سفید چادر بچھی ہوئی ہے۔ جو ایسی معلوم ہوتی ہے کہ گویا ہنس پر پھیلائے ہوئے بیٹھا ہے۔ پلنگ کے قریب ہی ایک چھوٹا سا اسٹول ہے۔ جس پر لیمپ رکھا ہوا جل رہا ہے۔ وہیں انندامائی سر جھکائے ہوئے بیٹھی ہے اور رنگ برنگ کے دھاگوں سے کشیدہ کاڑھ رہی ہے۔ وہیں نیچے جھمینا قریب بیٹھی ہوئی عجیب قسم کی بنگالی میں اس سے باتیں کر رہی ہے۔ جب کبھی انندامائی کو کسی قسم کی دلی کاوش ہوتی تو وہ اسی قسم کے کاموں میں مصروف ہو جاتی۔ بی نئے نے اُس کے متین اور سنجیدہ چہرہ پر اپنا خیال جمانا چاہا اور دل میں یہ دعا مانگنے لگا "خدایا اُس کے چہرے کی ضیاء محبت مجھکو لغزشوں سے بچالے اور وہ مادر وطن کا انعکاس بنکر اپنے فرائض کے انجام دینے میں مجھکو استقامت بخشے"

اسی عالم استغراق میں اُس نے اس سے مخاطب ہو کر کہا " آماں جان دنیا کی کوئی مذہبی کتاب میرے نزدیک یہ ثابت نہیں کر سکتی کہ آپ کے ہاتھ کا کھانا میرے لئے آب حیات نہیں"

کمرے میں سناٹا چھایا ہوا تھا سی خاموشی کے عالم میں صرف گھڑی کی کھٹ کھٹ ہی سنائی دیتی تھی جو بی نئے کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ لیمپ کے قریب ایک چھپکلی کیڑے پکڑ پکڑ کر کھا رہی تھی۔ بی نئے تھوڑی دیر تک اُس کا تماشہ دیکھتا رہا۔ آخرکار اُٹھا اُٹھا اور ہاتھ میں چھتری لیکر باہر نکلا۔

وہ کسی خاص جگہ کا ارادہ کرکے تو نہ نکلا تھا شاید انندامائی کے یہاں جانے کے ارادہ سے نکلا ہو۔ اتنے میں اُسے یاد آگیا کہ آج اتوار ہے اور وہ برہمو سماج مندر میں جاکر کیشب بابو کا وعظ سننے کو تیار ہو گیا۔ باوجودیکہ وہ یہ جانتا تھا کہ دیر ہو چکی ہے اور وعظ ختم ہو رہا ہو گا۔ تاہم اُس کے ارادہ میں تزلزل نہ آیا۔

جب وہ وہاں پہنچا تو لوگ واپس ہو رہے تھے۔ وہیں وہ سڑک کے کنارے چھتری لگاکر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے دیکھا کہ ہریش بابو اپنے خاندان کے تین چار آدمیوں کے ساتھ باہر نکل رہے تھے اُن کے چہرے سے اطمینان اور حلم ٹپکا پڑتا تھا۔

لیکن بی نئے کی نظریں صرف ایک نوجوان چہرے پر جمی ہوئی تھیں جس پر سڑک کے لیمپ کی تنہی گذرتے وقت ایک منٹ کے لئے پڑی تھی اس کے بعد ہی گاڑی کے پہیوں کی آواز سنائی دی اور وہ بھی تاریکی کے ناپید اکنار سمندر میں مثل حباب کے غائب ہوگئی۔

اس شب کو بی نئے گورا کے یہاں نہیں گیا بلکہ انہیں خیالات میں غرق وہ اپنے مکان کو واپس آیا۔ دوسرے دن سہ پہر کو ایسے وقت گورا کے ہاں پہنچا جب بادل گھر آیا تھا اور تاریکی پھیل چکی تھی۔

گورا اپنا لیمپ جلا کر لکھنے کو بیٹھا ہی تھا کہ بی نئے پہنچا۔ اُسے دیکھکر گورا نے کہا "کہو بی نئے آج کدھر کا چاند نکلا ہے"۔

اس سوال کا جواب نہ دیتے ہوئے بی نئے نے کہا "گورا! میں آپ سے ایک سوال کرتا ہوں کیا آپ کو اس کا صحیح علم ہے کہ حقیقی معنوں میں بھی کوئی ہندوستان ہے؟ رات دن ہندوستان ہی ہندوستان آپ کے خیال میں لبا رہتا ہے لیکن آپ اس کو کیسے سمجھے ہوئے ہیں اور کس طرح اس کو سوچتے ہیں؟"

گورا نے لکھنا بند کر دیا اور غور سے بی نئے کی طرف دیکھا۔ پھر اُس نے اپنا قلم رکھدیا اور کرسی کی پشت سے ٹیک کر کہا "جس طرح سطح سمندر پر جہاز کے کپتان کے دل میں عالم مصروفیت و سکون میں سمندر پار کی اُس بندرگاہ کا خیال رہتا ہے جہاں اُسے جانا ہے۔ اسی طرح میرے دل میں بھی رات دن ہندوستان ہی کا خیال رہا کرتا ہے۔

بی نئے۔ لیکن آپ کا یہ ہندوستان ہے کہاں؟

گورا نے اپنے دل پر ہاتھ رکھکر کہا "جس طرف میرے اس قطب نما کی سوئی رات دن اپنا رُخ کئے ہوئے ہے بس وہیں آپ کے اُس غلط بیان مورخ مارش مین کی تاریخ ہند میں نہیں۔

بی نئے۔ جس طرف آپ کے قطب نما کی سوئی کا رُخ ہے کیا ادھر کوئی خاص بندرگاہ بھی ہے؟

گورا نے تیقن کے ساتھ کہا "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ نہیں ہے؟ یہ ممکن ہے کہ میں اپنے فرائض سے غافل ہو جاؤں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میں ڈوب جاؤں لیکن منزل مقصود کی بندرگاہ ہمیشہ اپنی جگہ پر قایم رہیگی۔ میرا ہندوستان یہ نہیں ہے جو آپ

دیکھ رہے ہیں۔ بلکہ وہ ہے جو تمام خوبیوں کا منبع اور مخزن ہو۔ جہاں دولت کی ندیاں بہتی ہوں علم و ہنر کے چشمے اُبلتے ہوں اور نیک کرداری کا دریا موجزن ہو۔ غالباً آپ کا خیال ہو کہ ایسا ہندوستان کہیں نہیں ہے اور یہ عالم بجز فریب ہستی کے اور کچھ بھی نہیں۔ یہ آپ کا کلکتہ یہ دفاتر یہ عدالتیں یہ پُل، عشرت کے مکانات صرف خواب ہیں اور کچھ نہیں۔"

یہاں گورا رک گیا اور بی سنئے کو جو خیالات میں مستغرق خاموش کھڑا تھا دیکھنے لگا۔ اور پھر اُس نے کہنا شروع کیا۔

"دیکھئے یہ جو ہم پڑھتے لکھتے ہیں غلامی کو قابلِ فخر سمجھکر ملازمت کی تلاش میں رات دن سرگردان پھرا کرتے ہیں۔ اور خدا جانے کیسی کیسی مصیبتیں اُٹھاتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ طلسم کو سچی چیز اور اس طلسم نما ہندوستان کو حقیقی ہندوستان سمجھے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تیس کروڑ نفوس جھوٹی عزت کو اصلی عزت اور دھوکے کو حقیقت سمجھے ہوئے ہیں۔ اور اسی خیال میں سرشار ہو رہے ہیں۔ بھلا اس سراب سے ہماری جدِ حیات کو کونسی تقویت پہنچ سکتی ہے؟

ہمارے تنزل اور فنا کا خاص سبب یہی اور صرف یہی ہے۔ لیکن حقیقی معنوں میں ہندوستان موجود ہے اور وہ ایسا ہندوستان ہے جہاں مال و دولت بھی ہے۔ علم و عمل بھی ہے اور حیات کے قایم رکھنے کے تمام اسباب بافراط ہیں۔ جب تک ہم وہاں نہ پہنچ جائیں اُس وقت تک ہمارے ذہنی قلبی اور دوسرے قویٰ کو قایم رکھنے کے لئے مادۂ حیات میسر نہیں ہو سکتا۔ فی الحقیقت اُسی ہندوستان کی صحیح اور مکمل تصویر میری آنکھوں میں پھرا کرتی ہے۔"

بی سنئے "کیا یہ سب محض فوری جوش کا اثر ہے یا اس میں کچھ صداقت اور استقلال بھی ہے؟"

گورا۔ (گرج کر) "سرتاپا صداقت ہے"

بی سنئے۔ (نرمی سے) بھلا ان لوگوں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے جو ہندوستان کو ان معنوں میں نہیں دیکھ سکتے۔

گورا نے مٹھی باندھ کر زور سے کہا "ہمارا یہی فرض ہے کہ ہم ایسے لوگوں کو وہی مکمل تصویر دکھائیں محض لاعلمی کی وجہ سے لوگ بے بود اشیاء کو اصلی چیز سمجھنے لگتے ہیں۔ اور اُن کے آگے اپنے سر کو خم کر دیتے ہیں۔ اب آپ کا کام یہ ہے کہ آپ اُس ہندوستان کے سالم و حقیقی مجسمہ کو شاہراہ پر

نصب کئے رہتے۔ صداقت کا اثر خود بخود پڑتا ہے۔ تھوڑے ہی دنوں میں وہ وقت آ جائیگا کہ آپ دربدر چندہ وصول کرنے کی زحمت سے بچ جائینگے اور جوق جوق لوگ اس پر اپنی جانیں نثار کرنے کے لئے پروانہ وار دوڑیں گے۔

بی نئے۔ بہتر ہے کہ آپ مجھے وہ مکمل تصویر دکھلائیں یا اجازت دیں کہ میں بھی دوسروں میں جا ملوں۔

گورا۔ آپ خود کوشش کیجئے۔ اور سمجھئے۔ اگر آپ کو یقین کامل ہے تو آپ کو اپنے تصور میں حظ آئیگا۔ ہمارے یہاں کے نیشن کے دلدادہ محبان وطن کو صداقت پر اعتماد نہیں اسی لئے نہ تو وہ اپنے میں خلوص پاتے ہیں اور نہ دوسروں پر اپنا اثر ڈال سکتے ہیں۔ اگر دولت کی دیوی بھی ان پر اپنی رحمت کا نزول کرے تو بھی مجھکو یقین ہے کہ انکو ایسراے کی اردلی کی چپراس سے زیادہ کی تمنا کی جرأت نہ ہوگی۔ چونکہ ان کا اعتقاد متزلزل ہے اس لئے امید بھی نہیں ہے۔

بی نئے نے معترضانہ لہجہ میں کہا۔ سب کی طبیعت یکساں نہیں۔ آپ کو اپنی قوت پر بھروسہ ہے۔ اور آپ اس بھروسے کی بنا پر دوسروں کی حالت کا اندازہ کرنے سے قاصر ہیں۔ میں آپسے صاف صاف کہے دیتا ہوں کہ مجھے کسی کام میں لگا دیئے۔ اور ایسا لگا دیئے کہ رات دن فرصت نہ ہو میں جبتک آپ کے پاس رہتا ہوں اُس وقت تک تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ ضرور اس میں اصلیت ہے اور جہاں آپ سے علیحدہ ہوا۔ تو مجھے کوئی چیز ایسی نہیں ملتی کہ جس کا سہارا لوں۔

گورا۔ آپ کام کے متعلق دریافت فرماتے ہیں۔ اس وقت سب سے پہلے ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اُن لوگوں میں جو تذبذب اور لاعلمی کا شکار ہو رہے ہیں۔ اپنے مقصد کے متعلق اسی یقین اور استقلال کی روح پھونکدیں جو ہم میں جاری وساری ہے۔ ہم میں یہ عادت استمراری ہو رہی ہے کہ اپنے وطن کے تعلق کو عار سمجھتے ہیں۔ اسی سبب سے غلامی کا زہر ہمارے رگ وریشہ میں سرایت کر گیا ہے اس وقت اس کی ضرورت ہے کہ ہم میں سے ہر شخص خاص اپنی مثال پیش کرکے اس زہریلے اثر کو زائل کرے۔ اسی حالت میں ہم کو میدان عمل ہاتھ آسکتا ہے۔ ابتک جو کچھ ہم نے کیا اور کرتے ہیں وہ صرف اُن قوموں کی نقل ہے جن کا تذکرہ ہم نے تاریخ کی کتابوں میں دیکھا ہے۔ اس نقل سے ہمکو کیا فائدہ

حاصل ہو سکتا ہے۔ بلکہ وہ تو اُلٹا ہمارے تنزل
کا سبب ہے۔

ٹھیک اسی وقت "مہم" اپنے ہاتھ میں حقّہ
لئے ہوئے آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا کمرے میں
داخل ہوا۔ اُس وقت وہ دفتر سے واپس ہو کر
ناشتہ کرتا اور دروازہ پر بیٹھکر حقّہ پیا کرتا تھا۔ وہیں
ایک ایک کرکے اُس کے دوست جمع ہوتے اور
اور پھر سب بیٹھک خانہ میں جاکر تاش کھیلنے لگتے۔

مہم کے کمرے میں داخل ہوتے ہی گورا
ادب سے کھڑا ہو گیا۔ مہم نے اپنے حقہ کا کش کھینچکر
کہا "ہمارے دفتر میں جو بڑا صاحب نیا آیا ہوا ہو
وہ بڑا بدمعاش ہے۔ اُس کا سر ایک بڑے
(سکتے) کی طرح ہے اور بنگالی بابوؤں کو لنگور کہا کرتا
ہے۔ خدانخواستہ کسی کے یہاں کوئی غمی ہو جاتی ہو
تو وہ چھٹی نہیں دیتا۔ کوئی بھی ایسا بنگالی کلرک نہیں
جسے مہینے میں پوری تنخواہ ملتی ہو۔ سب کی تنخواہیں
جرمانوں میں کٹ جایا کرتی ہیں۔ آجکل اخباروں
میں اُس کے متعلق ایک گمنام خط شایع ہوا ہے۔
اور وہ کمبخت یہ سمجھے ہوئے ہے کہ یہ کام میرا ہے
اگر میں نے اپنے نام سے اس کی تردید نہ شایع کی تو
کہتا ہے کہ تمہیں برخواست کردونگا۔ تم دونوں جو
ہماری یونیورسٹی کے گوہر آبدار ہو مجھے اس خط کے
لکھنے میں مدد دو۔ اس خط میں جا بجا ایسے الفاظ استعمال
کئے جائیں جن میں اُس کی ایسی مبالغہ آمیز تعریف و
توصیف ہو کہ خط پڑھتے ہی خوشی سے اسکی باچھیں
کھل جائیں مثلاً "بے لاگ انصاف" "فیاضی بے پایاں"
"مخزن کرم" "منبع اخلاق" وغیرہ۔

گورا تو خاموش ہی کھڑا رہا لیکن بی نے بے ساختہ
ہنس پڑا اور کہا "بھائی جان بھلا کوئی اتنا جھوٹ
ایک سانس میں کیسے بول سکتا ہے؟

مہم۔ جواب تو ترکی بہ ترکی ہونا چاہئے۔
مجھکو ان انگریزوں کا بڑا تجربہ ہے۔ ان کے متعلق
کوئی ایسی بات نہیں جو میں نہ جانتا ہوں۔ ان لوگوں
کا جھوٹ فراہم کرنا محتاج تعریف نہیں۔ ان میں سے
اگر کسی نے بھی جھوٹ بولا تو یہ سب "برادران شغال"
مگر ویسا ہی شور مچانے لگتے ہیں۔ یہ ہم لوگوں کی
طرح نہیں ہیں۔ اقبالِ جرم بھی ان کے نزدیک قابل
فخر ہے۔ چنانچہ ان کو دھوکہ دینا کوئی گناہ بھی نہیں۔

یہ کہکر مہم نے زور سے قہقہہ لگایا۔ بی نے
بھی خاموش نہ رہ سکا۔ مہم نے پھر کہنا شروع "تم
شاید سمجھتے ہو کہ ان کے روبرو سچی بات کہکر انہیں
شرمندہ کردوگے، اگر خدا نے تم کو ایسی عقل دی

ہوتی تو ہندوستان پر اتنی مصیبتیں کیوں نازل ہوئیں یقین رکھو تم ان کو نقب زنی ہی کرتے ہوئے کیوں نہ پکڑ لو ۔ مگر وہ شرمانے والے نہیں ۔ بلکہ اپنے کو بے گناہ ثابت کرنے کی غرض سے اُلٹا تم ہی کو ڈانٹنے لگیں گے ۔ سُنا نہیں ہے ۔ اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے ۔

بی نئے ۔ آپ درست فرماتے ہیں ۔

مہم ۔ ایسی حالت میں اگر ہم دروغگوئی کے کارخانہ سے تھوڑا سا روغن قاز ملیں تو کیا ہرج ہے ہم کہیں " اے نیک کردار ۔ اے پاک باطن دلیو ۔ ایک نظر ادھر بھی ۔ خواہ وہ تمہاری ہتھیلیوں کی خاک ہی کیوں نہ ہو " تب کہیں ہمارے ہی میں سے ہم کو تھوڑا سا مل جاتا ہے ۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ہم امن عامہ میں خلل انداز ہونے کے الزام سے بچ جاتے ہیں ۔ اگر سچ پوچھو تو حب الوطنی اسی کا نام ہے ۔ لیکن گو ۔ امیری باتوں سے ناراض ہوتا ہوگا ۔ جب سے وہ راسخ الاعتقاد ہوگیا ہے ۔ اُس وقت سے میری بڑی عزت کرنے لگا ہے ۔ مگر میری آج کی باتیں بڑے بھائی کی باتوں سی معلوم ہوتی ہونگی ۔ اے میرے عزیز بھائی میں کروں تو کیا کروں ۔ خیر جو کچھ بھی ہو ۔ بی نئے مجھے وہ خط تو لکھ دو ۔ ذرا ٹھیرو میں اپنا مسودہ لائے دیتا ہوں ۔ یہ کہہ کر مہم حقہ پیتا ہوا وہاں سے چلا گیا ۔

گورا نے بی نئے سے مخاطب ہوکر کہا ' آپ بھائی صاحب کے کمرے میں تشریف لیجئے اور وہیں اُن کو رکھئے جب تک میں اپنا کام ختم نہ کرلوں ۔

(باقی دارد)

عبدالستّار خاں خاک نشیں

اِختلافِ جذبات باتّحاد قوافی

آ نغمہ گر ہو چرخ میں لا آسمان کو شیفتہ ؛ آ رقص کر زمین کو ڈال اضطراب میں

میں اور حظِّ وصل خدا ساز بات ہے غالب ؛ جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

نیا چاند

مصنفہ رابندرا ناتھ ٹیگور

مترجمہ سالک بٹالوی

(منتخبات)

آغاز

ننھے نے اپنی ماں سے پوچھا "اماں! میں کہاں سے آیا ہوں؟ تم نے مجھے کہاں پڑا پایا؟" ماں نے کچھ روتے ہوئے اور کچھ ہنستے ہوئے، ننھے کو اپنی چھاتی سے چمٹا کر جواب دیا۔

"میرے پیارے تم میرے دل میں میرے دل کی آرزو کی طرح پوشیدہ تھے میری بچپن کی گڑیوں میں بھی تمہیں تھے۔ اور جب میں ہر صبح مٹی گوندھ کر اپنے دیوتا کی مورتی بناتی تھی۔ اس وقت میں تمہیں ہی بناتی اور تمہیں ہی توڑتی تھی۔

تم ہمارے گھر میں ہمارے دیوتا بن کر رہتے تھے۔ اور میں اپنی پوجا میں بھی تمہیں ہی پوجتی تھی۔

میری تمام امیدوں میں۔ میری تمام محبتوں میں میری زندگی میں میری ماں کی زندگی میں تم نے ہمیشہ اپنا بسیرا رکھا ہے۔

اس غیر فانی روح کی گود میں جو ہمارے گھر بھر پر حکمران ہے۔ تم مدتوں تک پالے گئے ہو۔

جب میرے لڑکپن میں میرا دل اپنی پتیاں کھول رہا تھا۔ تم اس کے گرد خوشبو کی طرح گھوم رہے تھے۔

جب میں جوان ہوئی۔ تو تمہاری نرمی و نازکی میرے تمام اعضا میں شگفتہ ہو رہی تھی۔ جس طرح سورج نکلنے سے پہلے آسمان کا چہرہ تمتما اٹھتا ہے۔

اے آسمان کے پہلے محبوب! اے نور صبح کے توام بھائی۔ تو دنیا کی زندگی کی ندی میں بہتا ہوا آیا۔ اور آخر کار میرے دل کے کنارے آ لگا۔

جب میں تمہارے چہرے پر نگاہ ڈالتی ہوں۔ تو ایک راز کا احساس مجھ پر غلبہ پا لیتا ہے۔ تم جو سب کے ہو۔ اب میرے ہی ہو گئے۔

میں تمہیں کھو دینے کے ڈر سے تم کو اپنی چھاتی سے خوب چمٹائے رہتی ہوں۔ آہ وہ کونسا جادو تھا جس کے زور سے دنیا کا خزانہ میرے ان نازک بازوؤں کے قابو میں آگیا۔"

جوتشی

میں نے صرف اتنا کہا تھا کہ

"جب شام کو گول اور پورا چاند اُس "گدم" کے درخت کی شاخوں میں اُلجھ جاتا ہے۔ تو کیا اُس کو کوئی پکڑ نہیں سکتا؟"

لیکن آکا بھائی میری بات پر ہنس دئے۔ اور کہنے لگے :-

"ننھے۔ میں نے تم جیسا سادہ لوح بچہ کبھی نہیں دیکھا چاند تو ہم سے بہت دُور فاصلے پر واقع ہے۔ اس کو کون پکڑ سکتا ہے :-"

میں نے کہا :-

"آکا بھائی۔ تم بھی کتنے بے وقوف ہو جب اماں کھڑکی میں سے جھانک کر ہمیں کھیلتے دیکھ کر مسکراتی ہیں تو کیا اُس وقت وہ بہت دُور فاصلے پر ہوتی ہیں؟"

پھر بھی آکا نے یہی کہا :-

"تم تو احمق ہو۔ لیکن ننھے! یہ تو بتاؤ۔ اتنا بڑا جال کہاں سے آئیگا۔ جس سے تم چاند کو پکڑ سکو؟"

میں نے کہا "تم تو یقیناً چاند کو اپنے ہاتھوں ہی سے پکڑ سکتے ہو"

لیکن آکا بھائی پھر ہنس دئے اور بولے :-

"میں نے تم جیسا سادہ لوح بچہ کبھی نہیں دیکھا۔ اگر چاند نزدیک آجاتے۔ تو تم کو معلوم ہو جاتے۔ کہ وہ کتنا بڑا ہے"

میں نے کہا :- آکا بھائی تمہیں اسکول میں کیا بے معنی باتیں سکھائی جاتی ہیں۔ میں یہ پوچھتا ہوں۔ کہ جب اماں ہمارا مُنہ چومنے کے لئے اپنا چہرہ ہماری طرف جُھکاتی ہیں۔ تو کیا اُن کا چہرہ بہت بڑا دکھائی دیتا ہے؟

لیکن آکا بھائی جب بھی یہی کہتے ہیں "ننھے۔ تم بڑے ہی بیوقوف ہو"

چمپا کا پھول

اماں۔ فرض کرو۔ میں صرف دل لگی کے لئے چمپا کا پھول بن جاؤں۔ اور اُس درخت کی اونچی سی شاخ پر لگ جاؤں۔ پھر ہوا کے جھونکوں سے جھوموں اور ہنسوں۔ اور ہری ہری نئی کونپلوں پر ناچوں۔ تو تم مجھے پہچان لوگی؟

پھر تم مجھے پکارو "ننھے تو کہاں ہے"؟ اور میں آپ ہی آپ ہنسوں۔ اور چپ چاپ بیٹھا رہوں۔

پھر میں شرارت سے اپنی پتیاں کھول دوں اور تمہیں گھر کا کام کاج کرتے ہوئے دیکھتا رہوں۔ جب تم غسل کے بعد اپنے بھیگے ہوئے بال اپنے شانوں پر بکھیرے ہوئے، چمپا کے درخت کی چھاؤں میں سے گذر کر اس چھوٹے سے آنگن میں آنکلو۔ جہاں تم پوجا پاٹ کیا کرتی ہو۔ تو تمہارے دماغ میں پھول کی خوشبو آئے لیکن تم یہ نہ جانو۔ کہ وہ خوشبو مجھ میں سے آرہی ہے۔

جب دوپہر کے کھانے کے بعد تم کھڑکی میں رامائن

[redacted]

پڑھنے بیٹھو۔ اور درخت کی چھاؤں تمہارے بالوں اور تمہاری گود پر پڑے۔ تو مَیں بھی اپنا ننھا سا سایہ تمہاری کتاب کے صفحے پر عین اس جگہ ڈالوں۔ جہاں تمہاری نگاہ مطالعہ کر رہی ہو۔

لیکن کیا تم یہ قیاس کرسکو گی۔ کہ وہ تمہارے ہی ننھے سے بچے کا سایہ ہے؟ جب تم شام کے وقت چراغ ہاتھ میں لیکر گائے بھینسوں کے چھپر میں جاؤ۔ تو مَیں اچانک پھر زمین پر آن پڑوں۔ اور پھر تمہارا ننھا بن جاؤں۔ اور پھر تم سے کہانی سُنانے کی فرمائش کروں۔ پھر اس وقت میری تمہاری یہ باتیں ہوں:-

"ننھے تم بڑے شریر ہو۔ اب تک کہاں تھے؟"
امّاں۔ "ہم تمہیں نہیں بتائینگے"

پرستان

اگر کہیں لوگوں کو معلوم ہوجائے۔ کہ میرے بادشاہ کا محل کہاں ہے۔ تو وہ محل ہوا میں اُڑ کر غائب ہوجائے۔

اس کی دیواریں سفید چاندی کی ہیں۔ اور چھت چمکتے ہوئے سونے کی ہے۔

بادشاہ کی ملکہ ایک ایسے محل میں رہتی ہے جس کے گرد سات صحن ہیں۔ اس ملکہ نے ایک ایسا زیور پہن رکھا ہے۔ جس کی قیمت سات بادشاہتوں کی دولت کے برابر ہے۔

لیکن امّاں آؤ میں تمہیں کان میں بتاؤں۔ کہ میرے بادشاہ کا محل کہاں ہے۔ وہ ہمارے چبوترے کے کونے میں ہے۔ جہاں تلسی کے پودے کا گملا رکھا ہے۔

شہزادی سات سمندر پار دُور ایک ساحل پر سو رہی ہے

دُنیا میں میرے سوا اُسے کوئی نہیں پا سکتا۔

وہ ہاتھوں میں کنگن اور کانوں میں موتی پہنے ہوئے ہے اس کے لمبے لمبے بال زمین پر لوٹتے ہیں

جب میں اسے اپنی جادو کی چھڑی سے چھوؤنگا تو وہ جاگ اُٹھے گی اور جب وہ مسکرائے گی تو اس کے ہونٹوں سے موتی گر پڑینگے۔

لیکن امّاں۔ آؤ میں تمہیں کان میں بتاؤں۔ وہ ہمارے چبوترے کے کونے میں ہے۔ جہاں تلسی کے پودے کا گملا رکھا ہے۔

---(۵)---

جب نہانے کے لئے دریا پر جانے کا وقت آئے تو بیشک اس چبوترے تک ضرور جانا۔ میں اُس کونے میں بیٹھتا ہوں۔ جہاں دونوں دیواروں کے سائے آپس میں ملتے ہیں صرف بلّی کو میرے ساتھ آنے کی اجازت ہے۔ کیونکہ وہ جانتی ہے۔ کہانی والا نائی کہاں رہتا ہے۔

لیکن اماں آؤ میں تمہیں کان میں بتاؤں۔ کہ کہانی والا نانی کہاں رہتا ہے۔ وہ ہمارے چبوترے کے کونے میں رہتا ہے۔ جہاں تلسی کے پودے کا گملا رکھا ہے۔

بہادر

اماں۔ ذرا تصور تو کرو۔ ہم سفر کر رہے ہیں۔ اور ایک عجیب اور خطرناک ملک میں سے گزر رہے ہیں۔

تم ایک ڈولی میں بیٹھی جا رہی ہو۔ اور میں تمہارے ساتھ ایک سرخ گھوڑے پر سوار اُسے دُلکی چلا رہا ہوں

شام کا وقت ہے۔ سورج ڈوب رہا ہے۔ "جورا دگھی" کی بنجر زمین ہمارے سامنے زرد اور اُداس نظر آ رہی ہے۔

تم خوفزدہ ہو۔ اور سوچ رہی ہو۔ کہ "خدا جانے ہم کہاں آ گئے ہیں۔" اور میں تم سے کہہ رہا ہوں۔ "اماں۔ تم بالکل نہ ڈرو۔"

چراگاہ نیلی گھاس سے پرخار ہو رہی ہے۔ اور اس میں سے ایک تنگ سا ٹوٹا پھوٹا راستہ گزر رہا ہے۔

وسیع چراگاہ میں کوئی چوپایہ نظر نہیں آتا۔ وہ سب گاؤں میں اپنے اپنے چھپروں کے اندر پہنچ گئے۔

زمین اور آسمان پر تاریکی اور دھند چھا رہی ہے۔ اور ہم کہہ نہیں سکتے کہ کہاں جا رہے ہیں۔

اچانک تم مجھے بلاتی ہو۔ اور مجھ سے کان میں پوچھتی ہو۔ کہ وہ کنارے پر روشنی کیسی نظر آ رہی ہے؟"

عین اُس وقت ایک خوفناک چیخ کی آواز سنائی دیتی ہے اور عجیب شکلیں ہماری طرف بھاگتی ہوئی آ رہی ہیں۔

تم اپنی ڈولی میں اکڑوں بیٹھی ہوئی دعائیں مانگتی ہو۔ اور بار بار خدا کا نام لے رہی ہو۔

ڈولی کے کہار خوف اور دہشت سے تھرتھر کانپتے ہوتے خار دار جھاڑی میں چھپ جاتے ہیں۔

میں پکار کر تم سے کہتا ہوں۔ "اماں تم بالکل نہ ڈرنا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں"

وہ لوگ لمبی لمبی لکڑیاں ہاتھوں میں اٹھاتے۔ اور سروں پر بال پریشان کئے ہوئے نزدیک آتے جاتے ہیں۔

میں پکار کر کہتا ہوں۔ "خبردار! بدمعاشو۔ جہاں تم نے قدم اٹھایا۔ وہیں مار ڈالے جاؤ گے۔"

وہ ایک اور خوفناک چیخ مارتے ہیں۔ اور بڑھتے چلے آتے ہیں۔

تم میرے ہاتھ کو مضبوط پکڑ کر کہتی ہو "میرے بچے۔ خدا کے لئے ان کے نزدیک نہ جانا۔"

میں کہتا ہوں۔" اماں تم دیکھتی رہو میں کیا کرتا ہوں۔"
پھر میں اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑانے کیلئے ایڑ لگاتا ہوں۔ اور میری ڈھال اور تلوار دونوں آپس میں ٹکرا رہی ہیں پھر۔ اماں۔ لڑائی اس قدر خوفناک ہو جاتی ہے کہ اگر تم ڈولی میں سے جھانک کر دیکھتیں۔ تو تھر تھر کانپنے لگتیں! ان میں سے بہت سے لوگ بھاگ جاتے ہیں۔ اور بہت سے میری تلوار سے پارہ پارہ ہو جاتے ہیں میں جانتا ہوں کہ تم اکیلی بیٹھی ہوئی یہی سوچ رہی ہو۔ کہ تمہارا ننھا کبھی کا مر چکا ہے۔

لیکن میں اپنے تمام جسم پر خون کے دھبے لئے ہوئے آتا ہوں۔ اور کہتا ہوں۔" اماں۔ لو۔ اب لڑائی ختم ہو چکی"۔

تم باہر نکل کے مجھے چومتی ہو۔ اپنے سینے سے لگاتی ہو۔ اور دل میں کہتی ہو کہ "اگر میرا بچہ میرا محافظ نہ ہوتا۔ تو نہیں معلوم میں کیا کرتی"۔

جب روز روز ہزاروں فضول واقعات ظاہر ہوتے ہیں۔ تو پھر ایسا واقعہ اتفاق سے سچ مچ کیوں نہیں ہو سکتا۔ یہ تو بالکل ایک کتاب کی کہانی ہو جائیگی۔

میرے بھائی کہیں گے:۔ "کیا یہ ممکن ہے؟ ہم تو اس بچے کو بہت نازک سمجھتے تھے؟" ہمارے گاؤں کے سب لوگ متحیر ہو کر کہیں گے:۔ "کیا یہ خوش قسمتی کی بات نہیں کہ لڑکا اپنی ماں کے سامنے موجود تھا؟"

بارہ بجے

اماں۔ اب میں چاہتا ہوں کہ اپنا پڑھنا لکھنا چھوڑ دوں میں صبح سے برابر کتاب دیکھتا رہا ہوں۔ تم کہتی ہو کہ ابھی صرف بارہ ہی بجے ہیں۔ فرض کرو اب تک بارہ سے زیادہ نہیں ہوئے۔ لیکن کیا تم یہ خیال نہیں کر سکتیں کہ بارہ ہی بجے تیسرا پہر بھی ہو سکتا ہے۔

میں تو آسانی سے تصور کر سکتا ہوں۔ کہ اب سورج دھانوں کے کھیت کے کنارے پہنچ چکا ہے۔ اور بوڑھی ماہی گیر عورت تالاب کے کنارے اپنے شام کے کھانے کے لئے ترکاریاں جمع کر رہی ہے۔

میں ابھی اپنی آنکھیں بند کر کے سوچ سکتا ہوں۔ کہ مدار کے درخت کے نیچے سایہ تاریک ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور جوہڑ کا پانی چمکیلا سیاہ دکھائی دیتا ہے

جب بارہ بجے کا وقت رات کو بھی آ سکتا ہے۔ تو پھر بارہ بجے رات کیوں نہیں آ سکتی؟

(مرکنٹائل پریس لاہور میں باہتمام لالہ دیوانچند پروپرائیٹر چھپا۔ اور دار الاشاعت ادب لطیف کیلئے ایم محمد اسمعیل لکھیسر پبلشر و پروپرائیٹر نے چیمبرلین روڈ لاہور سے شائع کیا)

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۴۱۴

۷۸۶

قیمت سالانہ چھ روپیہ ششماہی ۳ روپیہ فی پرچہ ۱۰/

ہزار داستان

آنریری ایڈیٹر: حکیم احمد شجاع بی اے (علیگ)

جائنٹ ایڈیٹرز:

سید عابد علی عابد بی اے . . . محمد ہادی حسین قریشی صدیقی

جلد ۳ | اشاعت ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۲۳ء | نمبر ۴

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	خامۂ اثر	نمبر صفحہ	نمبر شمار	مضمون	خامۂ اثر	نمبر صفحہ
۱	عورت	جناب تماشائی	۲	۹	غزل	جناب جبیل	۳۴
۲	غزل	جناب بشیر	۸	۱۰	عارف	جناب محمد ہادی حسین قریشی صدیقی	۳۵
۳	شریک زندگی	جناب سید ابو محمد ثاقب	۹	۱۱	چندن ہار	جناب سید امتیاز علی تاج بی اے	۴۰
۴	مے قدیم	جناب عبد اللطیف تپش	۱۹	۱۲	لالۂ صحرا	حضرت عابد	۶۲
۵	کلام شاد	حضرت شاد عظیم آبادی	۲۳	۱۳	مست شباب	جناب ابو المحاسن محمود علی	۶۴
۶	کلام رفیق	جناب رفیق	”	۱۴	غزل	جناب اثر صہبائی	”
۷	غزل	جناب شارق ایرانی	”	۱۵	گورا	جناب عبد الستار خاں	۶۵
۸	نفسیات اکبر	جناب سید عابد علی عابد بی اے	۲۴	۱۶	باغبان	جناب انور شید عبد المجید خاں سالک	۷۵

(مقام اشاعت: دفتر رسالہ ہزار داستان جمنا لین، روڈ، لاہور)

عورت

(ان اجزائے پریشان کو اُس بلبل سدرہ کے نام نامی پر معنون کرنا چاہتا ہوں جو فانی نظروں سے اوجھل ہو کر فضائے آسمانی کو اپنے دلکش نغموں سے معمور کر رہی ہے! تماشائی)

صنفِ نازک کی بہترین خصوصیات سے وہ مایۂ ناز ہستیاں کسقدر لبریز ہونگی۔ جن کی آغوشِ اُلفت میں سکندرِ اعظم و رچرڈ شیر دِل نے اپنا اولین درسِ ہدایت حاصل کیا۔ اور اُس فیضِ یزدانی سے بہرہ اندوز ہوئے جس کی مالک صرف ایک عورت ہو سکتی ہے۔ جُرأت و ہمّت، جانبازی و قادر اندازی کے دل ہلا دینے والے کارنامے جوان عدیم المثال شاہنشاہوں نے دُنیا کے سامنے پیش کئے۔ اور جو باوجود استدادِ زمانہ صفحاتِ تاریخ میں گوہرِ شب چراغ کی طرح چمکتے ہیں۔ اسی "گہوارۂ تمدن" اور اسی "اُستادِ اولیں" کی چابکدستی کا ادنیٰ نمونہ ہیں وُہ کیسی سلیقہ مند اور ہنرور مائیں ہونگی۔ جن کے سایۂ عاطفت میں ارسطو و غالب نے دماغی و ذہنی نشو نما حدِ تکمیل تک پہنچایا۔ اور وہ خلعت دوامی و طغرائے فخر و امتیاز حاصل کیا۔ جو زمانہ کا مٹانے والا ہاتھ کبھی نہیں مٹا سکتا۔ دُنیا خواہ کتنے ہی رنگ بدلے، اور وقت خواہ کتنا ہی برسرِ پرخاش ہو جائے لیکن اخلاقیات میں جو ارسطو نے ایک گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ اور غالب نے اُردو شعر و شاعری کو چار چاند لگائے ہیں۔ ان احسانات سے دُنیا کبھی سر نہیں اُٹھا سکتی۔ دُنیا کے ہر شعبہ میں، کائنات کے ہر گوشہ میں فطرت کی اس لطیف مجموعۂ عطر و رنگ کا خوشگوار اثر موجود ہے۔

جسمانی نشو و نما میں عورت مرد سے کمتر ہے۔ اور اسی لئے ایک عرصۂ دراز تک ہر مُلک اور ہر سلطنت میں ظلم و تشدد کا شکار رہی ہے۔ لیکن علم و حکمت کی روز افزوں ترقی نے دُنیا کو آگاہ کر دیا ہے۔ کہ وہ نازک ہستی جو کہیں ایک زر خرید غلام سے زیادہ وقعت نہ رکھتی تھی۔ جو کہیں ایک کم مایہ ملازم کی حیثیت کی مالک تھی۔ جس کو بعض اربابِ حل و عقد نادانی و جہالت، بدکرداری و نجاست کا مجسمہ تصوّر کرتے تھے۔ اور جو ایک سرزمین میں اپنی دیدہ زیبی کے باوجود ایک بے زبان محکوم اور ایک کج فہم انسان کا جسد خاکی سمجھی جاتی تھی۔ درا صل دماغی و روحانی، عقلی و ذہنی ارتقا میں مرد سے برتر اور بدرجہا افضل ہے اور ذہانت و فراست میں مرد کے دوش بدوش ہو کر کشمکشِ حیات میں کامیابی کے ساتھ شریک ہو سکتی ہے

وہ کارزار دہر میں پشت دکھانے والی نہیں۔ وہ ہمت و جسارت سے بالکل معرا نہیں ہے۔ بلکہ اگر روحانی تکمیل کا اُس کو موقع حاصل ہو جائے۔ تو وہ نگار خانۂ فطرت کو اپنی طلعت ریزیوں سے جگمگا سکتی ہے۔ اور اگر چاہے تو آنِ واحد میں صفحۂ دہر سے کل رنگ و بو جذب کر لے۔ اور اس کو محض ایک سادہ ورق بنا دے۔

گلشنِ فطرت کی عطر بیز نسیم اسی کی کاکل مشکیں کی منت پذیر ہے۔ اور یہی وہ وجود ہے۔ جس کی وجہ سے مادیت کے قیامت خیز طوفان کے باوجود آج تک یورپ و امریکہ میں رحم و محبت، ہمدردی و الفت کے کرشمے نظر آجاتے ہیں۔ اور گاہ بگاہ روحانیت مادیت پر غالب آجاتی ہے۔

ہم کو یقین ہے۔ کہ عورت اپنے انتہائی ابتذال کے ساتھ بھی کچھ مقدس اور پاک شے محفوظ رکھتی ہے یعنی اپنے اعلےٰ و ارفع اخلاق کا کچھ جزو کمتر

اُس گوہرِ آبدار کے مانند جو تاریکی میں بھی اپنی آسمانی ضیا منتشر کرتا رہتا ہے۔ عفت و عصمت، انکسار و صداقت اس کے حسین اخلاق کا جزو لاینفک ہیں اور وہ فطرتاً ان خصوصیات کی مالک پیدا کی گئی ہے۔

وہ صرف خود غرض و مکار مرد کے ناپاک اثر سے ابتذال کی جانب راغب ہوتی ہے۔

تاریخ | زمانۂ سلف کی تاریخ عورت کے نقطۂ نظر سے ایک سیاہ ورق ہے۔ جس پر ظلم و تشدد، جور و ستم و محکومیت و معصیت کے الفاظ جلی قلم سے لکھے ہوئے ہیں۔ صرف سرزمینِ مصر جو "زلیخا" کی عشوہ طرازیوں سے یوسف زار نبی بجا طور سے فخر کر سکتی ہے۔ کہ اُس ریتیلے خطہ میں عہدِ قدیم میں بھی عورتوں کے حقوق کا احترام کیا جاتا تھا۔ اور اُس کو تعلیم کی آزادی دیکر حکومت و سلطنت کی اہم ذمہ داریوں میں شریک بنایا جاتا تھا۔ اس کو اگر ایک استثنا فرض کر لیں تو کوئی ملک اور کوئی برّاعظم ایسا نہ ملیگا۔ جہاں کی فضا صنفِ لطیف کی گریہ وزاری فریاد و شیون سے معمور نہ ہو، اور جہاں خونخوار مرد نے اس معصوم طبقہ کو اپنی ناپاک خواہشات و جذبات کا تختۂ مشق نہ بنایا ہو!

یونان و روم کے لٹریچر اور روایات میں عورت مرد سے بہت زیادہ حقیر و کمتر شمار کی جاتی تھی۔ اور جابجا اس سے نہایت مبتذل سلوک کیا گیا ہے۔ یوفریڈس کو "عورت کا دشمن" صرف اس لئے کہا جاتا تھا کہ اُس نے صنفِ لطیف کو اپنے ملفوظات میں نہایت بدطینت، بدباطن، ریاکار، جفاکار کے نام سے یاد کیا ہے۔ اور ہر موقعہ پر اس کی حرکات کو نہایت بیرحمانہ نگاہوں سے دیکھا ہے۔ یونان میں لڑکیوں

کی شادی اوائلِ عمر ہی میں کر دی جاتی تھی۔ اور تمام عمر وہ ایک اطاعت شعار، کم گو، خاموش "شاگرد" کی زندگی بسر کرتی تھیں حتیٰ کہ وہ اپنے شوہروں کی ملکیت تصور کی جاتی تھیں، ورنہ مرتے وقت اپنے اعزاواسباب کو سپرد کر دیتے تھے! سینیکا جو روم کا ایک زبردست فلسفی اور اہلِ قلم تھا لکھتا ہے کہ اگر فطرت بنی نوعِ انسان کی بقا کو عورت کا محتاج نہ کرتی تو انسان کو ایک تکلیف دہ عدم سے نجات مل جاتی۔ اور دُنیا ریاکاری سے پاک و صاف ہو جاتی!

فطرت — عورتوں کے ایثار و وفاشعاری کی مثال مردوں میں نہیں ملسکتی جنہوں نے صدیوں سے لاانتہا جور و ستم سہے۔ تشدد و مظالم برداشت کئے۔ اور بعض ممالک میں آجتک کر رہی ہیں۔ مشرقی ممالک میں صنف نازک پر ایک پُرخلوص گرویدگی اور عقیدت کا جذبہ طاری ہے اور وہ نہ صرف اپنے شوہر بلکہ اپنے ہر بزرگ کی سچے دل سے عزت کرتی ہیں۔ اور ایک فطری انکسار کی بنا پر کسی حالت میں سرکشی و مطلق العنانی پر آمادہ نہیں ہوتیں، شوہر کی پرستش ہند کی عورتوں کے اخلاق کا ایک جزوِ اعظم ہے۔ وہ محیر العقول ایثار سے کام لیتی ہیں اپنے اُبھرے ہوئے جذبات کی پامالی پر کمربستہ ہو جاتی ہیں۔ لیکن شوہر کی اطاعت شعاری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتیں

مغربی ممالک میں عورتوں نے سب سے قبل علمِ بغاوت بلند کیا۔ اور اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے دل و جان سے تیار ہو گئیں۔ چنانچہ ارتقا کے زیرِ اثر ہر قدم پر ان کی مشکلیں آسان ہوتی گئیں۔ اور اُن کو تفوق حاصل ہوتے گئے۔ عورت اپنے شوہر کی مرضی کی پابند تھی۔ اُس کی خواہشات کے آماجگاہ اور اُس کے کبر و نخوت کے ممد و معاون، لیکن صدیوں کی مسلسل کوششوں کے بعد آج وہ سوسائٹی کے اعلےٰ طبقہ میں اپنے شوہر کی ہمدم و ہمراز، ہمدرد و غمگسار اور حقیقی معنوں میں شریکِ حیات ہے!

عورت کو غلامی اور محکومیت کی آہنی زنجیروں سے باہر نکالنا انسان کا اولین فرض ہے۔ لیکن ہمیں اُن لوگوں سے کوئی ہمدردی نہیں۔ جو اس صنف کو مردوں کے ہم پلہ اور ہم رتبہ تصور کرتے ہیں۔ اور اس کی بادہ ریز نگاہوں سے متوالے ہو کر واقعات کی منطق سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ تعلیم عورت میں خواہ کتنی ہی تبدیلیاں پیدا کر دے لیکن اس کی سرشت، اور اسکی وجہ تخلیق کو مبدل نہیں کر سکتی، تعلیم کا مقصد دماغ میں روشنی، خیالات میں رفعت، جذبات میں عفت پیدا کرتا ہے۔ لیکن دُنیا کی کوئی تعلیمی اسکیم صنفِ نازک کی خصوصیات امتیازی پر حملہ آور نہیں ہو سکتی۔ کائنات کے نظام و ترتیب

میں ایک تلاطم برپا ہو جاتے۔ اگر عورت بجائے ایک "روحانی مسرت و شادمانی" کے صرف فہم و فراست کا مجسمہ بن جائے۔ اور اس کی تمام دلآویز رعنائیاں تعلیم کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھ جائیں۔ ایسا کرنا فطرت کے خلاف جنگ کرنا ہوگا۔ اور اس سے خطرات سے علاوہ مغربی ممالک کی وہ اعلےٰ تعلیم یافتہ لڑکیاں جن کی تمام حرکات و سکنات، رفتار و گفتار پر جدید علوم کا رنگ چڑھا ہوتا ہے۔ اور جن کو قدم قدم پر نیوٹن کے انکشافات اور نیٹشے کے فلسفہ سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ دراصل فطرت سے دور ہیں۔ اور ان کو گلشن عالم کے ان پھولوں سے تعبیر کرنا بیجا نہ ہوگا۔ جن میں رنگ و بو نہیں اور جو باد سموم کی گستاخ دستیوں سے مرجھا چکے ہیں۔ عورت کی مخصوص بردباری و وفاشعاری، اور اس کا جبلی حلم و انکسار وہ خصوصیات ہیں۔ جن سے وہ کائنات پر حکمرانی کر سکتی ہے۔ اور غنیم کے لشکر جرار کو ایک مٹا دینے والی شکست دے سکتی ہے۔

یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ گو مرد اور عورت کے جسمانی و دماغی ساخت میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ لیکن ان کے فرائض جدا جدا ہیں۔ اور ان کا فرض ہے۔ کہ وہ اپنے مخصوص دائرۂ عمل میں سرگرم کار رہیں۔ تہذیب و تمدن عورت کو بلندی پر پہنچانا چاہتا ہے لیکن اس کے دائرہ سے جدا کرنا اس کو ہلاکت میں ڈال لینے سے کم نہیں، عورت کی "قوت" اس کی فہم سے دور، اس کی محبت و الفت میں مضمر ہے۔ اور وہ نہ تجارتی مرکزوں میں، نہ قانونی مجالس میں، نہ ایوان حکومت میں، نہ میدان کارزار میں ضیا بار ہو سکتی ہے۔ بلکہ گھر کی چاردیواری کے اندر —— اسی معدود و محبوب گوشہ عافیت میں جہاں ہر کس و ناکس کشمکش حیات سے چور ہو کر آرام و آسائش، ہمدردی و غمگساری کا طالب ہوتا ہے۔ یہ ملکہ حسن و شباب ایک آفتاب کی طرح چمکتی ہے۔ اور اپنی غم سوز نورانی شعاعوں سے دلوں میں گرمی، خیالات میں انس، اخلاق میں پاکیزگی، اور جذبات میں لطافت پیدا کرتی رہتی ہے۔ "گھر" میں صداقت و نفاست، محبت و الفت پیدا کرنا ایک وسیع سلطنت کے انتظام و انصرام سے مشکل تر ہے۔ اور اس دلکش فرض کو انجام دینے میں "عورت" اپنی تمام قوت اور تمام عمر صرف کر دیتی ہے

گولڈ اسمتھ کا ایک مشہور و معروف مقولہ ہے "وہ عورتیں جو اپنی شجاعت و مردانگی کی بدولت دنیا میں ممتاز ہو جاتی ہیں۔ اور رموز مملکت میں دخل دینے لگتی ہیں۔ دراصل مردوں کے حقوق غصب کرنا چاہتی ہیں۔ عورت ایک پاکباز اور مسکین دوشیزہ، ایک

دانا اور ہوشمند بیوی اور ایک غمگسار و عقلمند ماں کی حیثیت سے زیادہ کارآمد اور مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ وہ عورت جو اپنے شوہر اور بچوں کو شادکام اور خوش رکھ سکے، اور برائی سے بچا کر ان کے دلوں میں نیکی اور خوش خلقی کے بیج بو سکے۔ اُس عورت سے بدرجہا بہتر ہے جو بنی نوع انسان پر تیرہائے نظر کی بارش کرتی ہے۔ اور جس کی رنگین اور ولولہ خیز داستانیں ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں۔ عورت کی وسیع دُنیا صرف گھر ہے۔ جس میں وہ حکومت کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اور یہ اُس کا فرض ہے کہ وہ اپنے ہوشربا حسن و جمال، فہم و فراست، خوش خلقی، نیک کرداری سے اُس چار دیواری کو رشکِ ارم بنا دے۔ مکان خواہ کتنا ہی بوسیدہ ہو، افلاس اور قلاکت خواہ کس قدر ہی یاس افزا ہو۔ لیکن ایک "عورت" اس کھنڈر کو ان سنگِ مرمر کی عالیشان عمارتوں سے افضل اور خوشتر بنا سکتی ہے جہاں دولت اور امارت نے ہر ممکن الحصول زیبائش و آرائش کے سامان مہیا کر دیئے ہوں۔ صرف یہی نہیں۔ بلکہ مکان کی بھی ضرورت نہیں، آسمان کی سقف نیلگوں ہی اُس کا سایہ ہو، جگنو کی جلد فنا ہونے والی ضو اُس کی تنہا روشنی، عورت میں وہ سحر سامری مخفی ہے۔ جو ان حالات کو بھی شیریں اور خوشگوار بنا سکتا ہے۔

"عورت! حسین عورت!! فطرت نے تجھے، مردوں کو انسان بنانے کے لئے پیدا کیا۔ اور بغیر تیرے ہم وحشی درندے ہوتے!

تجھ کو فطرت نے وہ تمام خوبیاں عطا کی ہیں جو جنت میں موجود ہیں۔

ایک خیرہ کر دینے والی روشنی، عصمت اور صداقت،
سچی خوشی اور ابدی محبت"

خصوصیات | عورت مرد سے زیادہ کمزور، نازک اور لطیف ہوتی ہے۔ مرد نسبتاً سرکش، سخت مزاج اور سنگدل ہوتے ہیں۔ مرد اپنا ایثار اور قربانیاں پوشیدہ نہیں رکھ سکتا، لیکن عورت کا سینہ ایک دفینہ ہے جس میں ایسی ہزاروں داستانیں مقفل رہتی ہیں۔ اور جن کو وہ کبھی اشارتاً یا کنایتاً بھی زبان پر نہیں لاتی۔ عورت نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ اپنے بیوفا اور ظالم شوہر کے لئے اپنی بہترین خواہشات اور جذبات کی قربانی اکثر کرتی رہتی ہے۔ لیکن اس کی زبان اور کسی کے کان اس خونین افسانے سے آشنا نہیں ہوتے۔ ایسی ہزاروں کیا بلکہ لاکھوں مثالیں مل سکتی ہیں۔ جہاں عورتوں نے مدتوں جور و ستم برداشت کئے۔ بیوفائی اور جفا شعاری کی شکار بنی رہیں۔ اور داستانِ درد دل میں محفوظ رکھے ہوئے پیوندِ خاک ہو گئیں۔ اور دُنیا مطلق نہ معلوم کر سکی کہ اُس غنچہ ناشگفتہ کے جذبات اور احساسات کیا تھے؟

عورت رقیق القلب ہوتی ہے اس لئے اُس کے دل
میں ہمدردی و اُنس کا ایک گرانبہا خزانہ موجود ہوتا ہے۔
وہ فطرتاً دوسروں کی رنج و محن، مسرت و فرحت میں جلد
شریک ہو جاتی ہے۔ دوسروں کے چہرے، حرکت،
رفتار و گفتار، آہ حسرت سے اُن کے دلوں کی حالت
معلوم کر لیتی ہے۔ اور اُس پوشیدہ اور سربستہ گوشۂ قلب
میں پہنچ جاتی ہے۔ جہاں کسی امید کی جھلک یا حسرت
کلفت کی تاریکی چھائی ہوئی ہے!

وہ ہماری آنکھوں سے، ہماری آواز سے ہمارے
پنہاں حسیات کا صحیح اندازہ کرنے پر قادر ہے۔ اور
"مصر دل" اُس زلیخاوش کی دلربائیوں سے ہمیشہ اُس
کا زیر نگیں رہتا ہے۔ بچپن ہی سے ہم عورتوں کے آغوش
الفت میں پہنچ کر ہمدردی کے جویا ہوتے ہیں۔ اور مرتے
وقت تک یہ عادت ہم میں موجود رہتی ہے۔ ایک ہونہار
طالب علم جو اپنی محنت و ذہانت پر نازاں ہو۔ اُسے
قضا و قدر کامیابی سے محروم کر دیتی ہے۔ تو وہ فطرتاً
جنس لطیف کی جانب متوجہ ہوتا ہے۔ ایک پختہ کار
سن رسیدہ سوداگر جو کسی مالی نقصان کے صدمے سے
ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ عورت ہی کی معیت رنگیں میں
ہمت و جرات حاصل کر سکتا ہے۔ اور جنس لطیف
کی رعنائی و برنائی سے مخمور ہو کر مطمئن ہو سکتا ہے۔ وہ
نوجوان مفلس شاعر جس نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ کسی تصنیف
کی ترتیب و تالیف میں صرف کیا، راتوں کا آرام اور
دل کا چین کھویا۔ اور موسم برشگال کی سحر آگین راتوں
میں بھی اسی دُھن میں لگا رہا۔ اپنی محنت کو پبلک کے
سامنے پیش کرتا ہے۔ اس امید میں کہ دولت و عزت
مسرت و عظمت کا ایک نہ ختم ہونے والا خزانہ اُس کو ملنے
والا ہے۔ لیکن دفعتاً اس عرق ریزی و جگر کاوی کو مسترد کر
دیا جاتا ہے۔ اور اس صدمۂ ناکامی سے اُس کا آبگینۂ دل
چور چور ہو جاتا ہے، ایسے نازک موقعہ پر بھی ایک ہمدرد
و ہمنوا عورت ہی اس کو ہمت دلا سکتی ہے۔ اور اس کے
لئے کاروانِ آرزو میں رُوح پھونک سکتی ہے۔ عورت
کا دل محبت و اُلفت کا سرچشمہ ہے۔ اور اسی لئے اسکے
مزاج میں نرمی اور مہربانی، ترحم و بردباری نمایاں ہوتی
ہے۔ ایک ظالم و بیرحم شوہر جس نے مدتوں تک اپنی
بیوی کو گوناگوں شدائد کا مرکز بنایا ہو، ایک سکنڈ میں
معصومیت کے درجہ تک پہنچ سکتا ہے۔ اگر اُس کی
کسی خفیف سے خفیف انفعالی حرکت سے عورت کا
جذبہ ترحم مستقل ہو جائے۔ ہزاروں روز افزوں جفاکاریوں
کے بعد بھی آپ کی شریکِ حیات ایک اور صرف ایک
نگاہِ ترحم سے متاثر ہو کر تمام داستانِ رنج و محن فراموش
کر دیگی۔ اور آپ کی سچی وفا شعار کنیز بن جائیگی۔ ان

اوصاف سے اگر عورت متصف نہ ہو تو ہم بچپن میں شیریں امداد عنفوان شباب میں حقیقی مسرت اور عالمِ ضعیفی میں خوشگوار ہمدردی سے محروم رہ جائیں۔

عورتیں بے زبان جانوروں بیکس بچّوں اور قابلِ رحم بیماروں کو ایک خاص ہمدردی کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ اور دُنیا کو اُس انس و محبت کا عملی درس دیتی ہیں۔

عورت کی زبردست قربانیاں اور بہادرانہ خدمت و پرستش جس کی وہ فطرتاً خوگر ہے۔ اگر قلمبند کی جائیں تو ایک دفتر طویل تیار ہو سکتا ہے۔ عورت میں وہ بہادری اور جرأت موجود ہے جس سے مرد کی سرشت بالکل ناآشنا ہے۔ تاریخ کی ضخیم کتابوں میں مرد اپنی بہادری و جرأت و ہمت و شجاعت کی داستانیں بڑے شدومد کے ساتھ قلمبند کرتے ہیں۔ اور فخریہ خودنمائی کے ترانے گاتے ہیں۔ مثلاً گولیوں کی بارش میں انھوں نے پیشقدمی کی اور دشمن کے مورچہ پر قبضہ پاکر اُس کا پرچم اقبال سرنگوں کر دیا۔ یا طوفان خیز سمندر کی غضبناک موجوں میں کود پڑے۔ اور سمندر کے اُس کنارہ پر دُشمن کے قلعہ پر جا چڑھے۔ اور ہزاروں اعدا کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ لیکن اربابِ نظر جانتے ہیں۔ کہ دُنیا کا سب سے مستحکم اور سنگین "قلعہ" وہ چاردیواری ہے۔ جہاں ہم رہتے اور بستے ہیں۔ اور جس کی آب و ہوا میں ہم سانس لیتے ہیں۔ اس قلعہ کے اندر عورت اُس جانبازی اور مردانگی کا ثبوت دیتی ہے۔ اور وہ وہ کارہائے نمایاں کرتی ہے جس کا تذکرہ بڑے سے بڑے اور نامور سے نامور سپہ سالار کے نظامِ عصبی میں ہیجان پیدا کر سکتا ہے۔

تماشائی

غزل

دلِ اندوہ افزا دیکھتا ہوں
محبّت کا نتیجہ دیکھتا ہوں

ہر اِک اعلےٰ کو ادنےٰ دیکھتا ہوں
ہر اِک ادنےٰ کو اعلےٰ دیکھتا ہوں

انہیں آنکھوں سے جو دُنیا دیکھتا تھا
انہیں کو رُوح فرسا دیکھتا ہوں

دلِ روشن ہے اور تاریکیٔ ہجر
اندھیرے میں اُجالا دیکھتا ہوں

جسے موسیٰ نے پنہاں بھی نہ دیکھا
اسی کو تجھ میں پیدا دیکھتا ہوں

زمانہ میری آنکھیں دیکھتا ہے
کسی کا روئے زیبا دیکھتا ہوں

بشیرِ خستہ جاں کی کچھ نہ پوچھو
جسے محوِ تمنا دیکھتا ہوں

"بشیر"

شریکِ زندگی

سمندر کا بے شمار ۔ نشین خزانہ اس قدر قیمتی نہیں جتنا کہ انسان کا وہ مخفی سکون جو صنفِ لطیف کی محبت میں مقفل ہے۔

میں راحت کی نعمت انگیز خوشبو اس وقت محسوس کرتا ہوں جب میں گھر کے قریب جاتا ہوں۔

متاہل زندگی ایسی خوشگوار ہوا چلاتی ہے جس کے سامنے بنفشے کے کھلے ہوئے پھولوں کا عنبر بیز تختہ کوئی چیز نہیں۔

"ملٹن"

(۱)

مجھے اکثر اس ہمت و جرأت پر غور و فکر کا موقعہ ملا ہے جس کے ہوتے ہوئے عورتیں اس دورِ حیات کی تباہ کن مصیبتوں کو صبر و سکون کے ساتھ برداشت کر لیتی ہیں۔ مصائب کے وہ سکون سوز شعلے جو مردوں کے عزم و استقلال کو جلا کر خاکستر بنا دیتے ہیں۔ وہی جنسِ جمیل کی اُن تمام قوتوں کو مشتعل کر دیتے ہیں۔ جن کے ہوتے ہوئے مصیبت مصیبت نہیں رہتی۔ اور جن کو عرفِ عام میں صنفہ "سکون" "جرأت و ہمت" کہتے ہیں۔

عموماً سختیاں جھیلنے کے بعد مردوں میں ضبط و صبر کا پیمانہ چھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن عورتوں کے حوصلے بلند اور اخلاق اس قدر جمیل ہو جاتے ہیں کہ وہ رفتہ رفتہ عظمت و وفا کی خوبصورت دیویاں معلوم ہونے لگتی ہیں۔

یہ سراپا ناز مہتاباں، فارغ البالی میں شوہر کیلئے سرمایۂ زندگی ہوتی ہیں۔ اور جب ان کے سروں پر نکبت و فلاکت کی گھٹائیں چھا جاتی ہیں۔ اور زمانہ اپنی پوری طاقت سے ان پر تیر برسانے لگتا ہے تو یہی نرم و نازک پنکھڑیاں جو خلشِ خار سے بھی آشنا نہیں ہوتیں اپنے شوہروں کے لئے مضبوط سپر اور پہلے سے بھی زیادہ خوشگوار بن جاتی ہیں جس طرح انگور کی نازک بیل، ایامِ بہار میں اپنی خوشنما پتیوں سے شاخِ بلوط کی شاخوں کو آغوشِ محبت میں لے لیتی ہے۔ اور خزاں کے ولولہ سوز موسم میں بھی سوکھے ہوئے ہار کی طرح اس کے گلے سے جدا نہیں ہوتی اور اپنی منتشر اور پھیلی ہوئی پتیوں اور شاخوں کو سمیٹ کر اُسے اپنے

دامن میں چھپا لیتی ہے، بالکل اسی طرح فطرت کی کار فرمائیوں نے عورتوں کو بھی یہ لطیف جوہر ودیعت کیا ہے۔ کہ وہ خوش نصیبی کے زمانے میں مردوں کے لئے سرور و انبساط کی فرمانبرداریاں اور اُن کے گھروں کی زینت ثابت ہوں لیکن جب ان کے عزیز شوہروں پر غم کے بادل منڈلاتے ہوں تو پیکر تسکین و تشفی بن جائیں۔ اپنی کمزوریوں اور فطری ضعف کا جامہ اُتار ڈالیں۔ اپنے غمزدہ شوہروں کے تفکرات سے جھکے ہوئے سروں کا سہارا بن جائیں اور اُن کے ٹوٹے ہوئے دل کو اپنی محبت و ہمدردی سے جوڑنے کی کوشش کریں۔ دُنیا اُنہیں کمزور سمجھتی ہے لیکن جب سخت سے سخت امتحان کا موقعہ آتا ہے تو معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ ان پھولوں میں بادِ خزاں سے مقابلہ کرنے کی کتنی حیرت انگیز قوت موجود ہے۔

(۲)

مَیں ایک مرتبہ اپنے مخلص دوست "لزلی" کو . . . مبارکباد دینے کے لئے گیا۔ جس نے ابھی کچھ عرصہ ہوا شادی کی تھی۔ اور میاں بیوی دونوں محبت و انبساط کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اُس نے میری مبارکباد کے جواب میں نہایت محبت آمیز لہجے میں کہا۔

"میرے پیارے دوست، کاش تم بھی متاہل زندگی بسر کرتے۔ تمہاری بھی ایک حسین بیوی ہوتی۔ اور اُسکے بھولے بھولے خوبصورت بچے ہوتے۔ اور جب تم باہر سے خوش خوش آتے، تو وہ تمہیں دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے، اور اگر خدانخواستہ تمہیں کوئی صدمہ پہنچتا۔ تو یہ نو خیز غنچے مُسکرا کر تمہیں ہنسا دیتے۔"

حقیقت یہ ہے کہ ایک متاہل آدمی بخلاف ایک مجرد شخص کے اپنی حالت بہتر بنانے کے لئے زیادہ جدوجہد کرتا ہے۔ کیونکہ اُس کے چھوٹے سے خاندان کی عزیز و بیکس ہستیوں کی زندگی و معاشرت کا انحصار صرف اسی کی قوتِ بازو پر ہوتا ہے۔ جو اسے سخت سے سخت محنت کی طرف مائل کر دیتی ہے۔ اور جب کبھی وہ اپنی سخت محنت سے مضمحل اور ہمت ہار کر گھر آتا ہے تو اپنے معصوم بچوں کے متبسّم چہرے دیکھ کر اس کی ساری افسردگی دُور ہو جاتی ہے۔ اُن کی پیاری پیاری باتیں ٹوٹی ہوئی ہمت میں ایک رُوح پھونک دیتی ہیں۔ اور بُجھی ہوئی طبیعت پھر آمادہ کار ہو جاتی ہے۔ وہ دُنیا و غم دُنیا کو بھول کر کل کے لئے اس سے بھی زیادہ محنت کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اس کی مُردہ عزتِ نفس میں جان آجاتی ہے۔ اور وہ سمجھتا ہے۔ کہ اگرچہ میرے لئے دُنیا میں ہر طرف مصیبت ہی مصیبت ہے لیکن پھر بھی میں اپنی اس چھوٹی سی دُنیائے محبت کا تنہا بادشاہ ہوں۔

بخلاف اس کے ایک غیر متاہل زندگی بسر کرنیوالا

جب اپنے وجود کو دُنیا کی نظروں میں ذلیل و بے مایہ سمجھنے لگے۔ تو بہت ممکن ہے کہ وہ گھبرا کر موت کا دروازہ کھٹکھٹاتے اور اس کا دِل اس طرح ویران ہو جائے، جس طرح ایک عالیشان قصر کسی انسان کے نہ رہنے سے ایک نہ ایک دن برباد و منہدم ہو جاتا ہے۔

(۳)

میرے دوست لزلی کی بیوی نے ایک شریف و متمول خاندان میں پرورش پائی تھی۔ اگرچہ وہ خود کسی بڑی دولت کی مالک نہ تھی۔ مگر میرا دوست ایک دولتمند اور فیاض شخص تھا۔ جس کے گھر میں دولت کی دیوی آنکھ بند کر کے رہا کرتی تھی۔ جس کے متبسم چہرے کو دیکھ دیکھ کر گھر کے در و دیوار مُسکراتے تھے۔

وہ دن رات اپنی عزیز بیوی کی مسرتوں میں اضافہ کرنے کی تدبیریں سوچا کرتا تھا۔ وہ خوش تھا کہ اُسے اپنی بیوی کو راحت پہنچانے کا موقع حاصل ہے اُسے اس سے زیادہ کسی بات میں خوشی نہ ہوتی تھی کہ وہ اپنی بیوی کے مسرور کرنے کا کوئی نیا طریقہ نکالے۔ اس لئے کہ اس کے دل و دماغ میں پہلے ہی سے صنعت جمیل میں فریفتگی پیدا کرنے والے نہایت لطیف و نازک تخیلات موجود تھے۔ وہ اکثر جوش میں آکر کہہ اُٹھتا کہ "اس کی زندگی خوبصورت پریوں کا افسانہ ہوگی"

لزلی ایک متین و سنجیدہ شخص تھا۔ جس کا دماغ لطیف و نازک تخیلات کی فضا میں اُڑتا رہتا تھا۔ اسی طرح اُس کی بیوی بھی حسنِ فطرت کی ایک ایسی مُسکراتی ہوئی کلی تھی۔ جو خزاں کی ستم آرائیوں سے بے نیاز تھی اس کا دل مسرتوں سے لبریز تھا۔ اُس کے ہلکے ہلکے گلابی رخساروں پر ہر وقت مسرت کی سُرخی جھلکتی نظر آیا کرتی۔

میں نے اکثر صحبتوں میں لزلی کی وہ گہری خاموشی اور بیخودانہ انداز دیکھا ہے۔ جبکہ وہ اپنی بیوی میری کے چہرے پر نظر جمائے دیکھا کرتا تھا۔ اور میری کی جھکی ہوئی نظریں ایک رُوح پرور انداز سے شفقت و محبت کی متلاشی رہا کرتی تھیں۔

اگر میری حسن کی تصویر اور نزاکت کی دیوی تھی تو لزلی اپنی مردانہ خوبصورتی میں یکتا تھا جس کی بلند پیشانی سے سطوت اور بہادری کے آثار نمایاں تھے۔ جب میری اپنی خاص شانِ حسن اور محبوبانہ انداز سے لزلی کی طرف دیکھتی تو اس کا چہرہ صبحِ بہار کی طرح مُسکرانے لگتا۔

(۴)

شادی کو ابھی پُورا ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ دولتمند لزلی نے ایک کثیر نفع کی امید پر اپنی ساری دولت تجارت میں لگادی۔ مگر خُدا کی مشیّت کو کون جانتا ہے۔ تقدیر کی نامعلوم سرنوشت کس نے پڑھی ہے، زمانے کی رفتار

کی کس کو خبر ہے۔ آخر کار وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ صبح بہار شامِ خزاں سے بدلنے لگی۔ اور اسے معلوم ہو گیا کہ اُس کی دولت تباہی و افلاس کے شدید گرداب میں چکر کھا رہی ہے۔ پیہم نقصانات کی خبریں آنے لگیں اور آہ وہ لنزلی جس کی کامیاب زندگی ناکامی سے ناآشنا تھی۔ بہت جلد کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گیا۔ آہ وہ جو کبھی امیر تھا، دولتمند تھا اور سوسائٹی میں امیر سمجھا جاتا تھا۔ اب فقیر تھا، محتاج تھا۔ اور اپنی روٹیوں کے لئے دوسروں کا دستِ نگر۔

غریب لنزلی افلاس کی ان گھٹاؤں کو اپنے سر پر چکر کھاتے ہوئے دیکھ کر گھبرا گیا۔ اور بحرِ غم کی طوفان خیز موجوں نے اس کے دل کو جو آبگینۂ محبت تھا پاش پاش کر دیا۔ اب اُس کی ہر سانس ایک نالۂ خاموش تھی اور اُس کی ہر بیکسانہ جنبش دردمندوں کے لئے ایک تیرِ جگر دوز۔ مگر سب سے زیادہ روح فرسا لنزلی کے غمگین دل کے لئے وہ نمائشی ہنسی اور ظاہری مسکراہٹ تھی۔ جو اُسے اپنی بیوی کے سامنے اُسے اپنے غم سے بے خبر رکھنے کے لئے ظاہر کرنا پڑتی تھی۔ اس لئے کہ غیرتمند لنزلی اسے کبھی گوارا نہ کر سکتا تھا۔ کہ وہ اپنی غم کی کہانی سنا کر اُس کے دل کو بھی اپنے دل کی طرح غمگین بنا دے۔

لیکن معصوم لنزلی کو یہ نہیں معلوم کہ اس کی دبی ہوئی آہوں اور پریشانی میں سکون راحت ڈھونڈنے والی نگاہوں نے وہ سارے راز طشت از بام کر دیئے ہیں۔ جن کے چھپانے کی کوشش میں وہ سرگرم ہے۔ اور اس محبت کی دیوی نے اپنی روشن آنکھوں سے اُس کے دل کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی کلفت کو دیکھ لیا ہے۔

میری نے اُس کے دل بہلانے اور تسکین و تشفی دینے کے لئے اپنے حسن کی ساری عشوہ فروشیوں کو ختم کر دیا۔ مگر آہ وہ جسقدر اس تیرِ غم کو اس کے سینے سے نکالنے کی کوشش کرتی تھی۔ اُسی قدر وہ اور بھی پیوست ہوتا جاتا تھا۔

ایک حسن سراپا کی ان محبت بھری کوششوں پر چاہیے تو یہ تھا کہ لنزلی اپنی جانِ عزیز کو اُس کے قدموں پر قربان کر دیتا۔ مگر اس کے غیور دل کے لئے یہ خیال بھی موت سے زیادہ سخت تھا۔ کہ گو اس وقت "پریم کی پینگیں" بڑھ رہی ہیں۔ لیکن وہ وقت قریب آ رہا ہے۔ جب مسرت کی جگہ کلفت اور عزت کی جگہ ذلت لے لیگی اور ان نرم و نازک رخساروں پر غم کی زردی چھا جائیگی۔ ان ترنم ریز لبوں سے مسکراہٹ کوسوں دور ہو جائیگی۔ اس کی آنکھوں کی دلفریب چمک غربت کی تاریکی میں فنا ہو جائیگی۔ اور جوشِ محبت سے لبریز دل جو فرطِ انبساط سے اس کے ننھے سے سینے میں اچھلا کرتا ہے میری

ان پریشانیوں کو دیکھ کر خاموش ہو جائیگا۔

ایک روز لزلی میرے پاس آیا۔ اور اپنے ان جذبات کو جن کی تہ میں آنسو جھلک رہے تھے۔ ضبط کرتے ہوئے نہایت رقت آمیز لہجے میں پاگلوں کی طرح دیر تک اپنی مصیبت کی کہانی سناتا رہا' جب وہ خاموش ہو گیا۔ تو میں نے اس سے پوچھا۔ کیا تمہاری بیوی تمہاری زندگی کے اس انقلاب سے واقف ہے؟" ابھی یہ جملہ اچھی طرح ختم بھی نہ ہوا تھا کہ اس نے یکایک چلا کر کہا۔ " خدا کیلئے میری حالت پر ترس کھاؤ۔ رحم کرو' خدا کے لئے رحم کرو۔ اور میری کا نام لیکر میرے زخموں پر نمک نہ چھڑکو جس کی آئندہ تکلیف کے خیال نے مجھے پاگل بنا دیا ہے۔"

" بھولے لزلی' تمہاری یہ اخفاے راز کی کوشش لاحاصل ہے۔ آخر گھاس کے گرد و پودوں کے نیچے سونا کب تک چھپ سکتا ہے۔ وہ ضرور ایک نہ ایک دن حقیقتِ حال سے واقف ہو جائیگی۔ اور اس کا اس طریقے سے واقف ہونا بہت زیادہ رنج دہ ہوگا۔ اس لئے تم خود اپنی حالت کا اظہار اس سے صاف صاف کہہ دو۔ ورنہ یاد رکھو کہ تم اس رشتہ محبت و یگانگت کو خطرے میں ڈال رہے ہو۔ جو دو الگ الگ دلوں کو ایک کر دیتا ہے۔ کیونکہ ایک پرستارِ محبت کبھی اس کو برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کا محبوب اس سے اپنا کسی قسم کا راز چھپانے کی کوشش کرے۔ اس لئے لزلی تم اس راز کو چھپا کر جو ہرگز نہیں چھپ سکتا۔ اپنے آپ کو اس کی ہمدردی سے محروم نہ کرو۔ اور اس رشتہ محبت کو نہ قطع کرو۔ جس نے دو محبت بھرے دلوں کو ایک کر دیا ہے۔ تم چاہتے ہو کہ وہ راز جسے تمہاری آنکھیں کہہ رہی ہیں۔ میری سے پوشیدہ رہے۔ حالانکہ تمہاری یہ کوشش محض ایک مجروح دکمزور کوشش ہے۔ جو کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی اور وہ ضرور ایک نہ ایک دن جان لیگی۔ کہ تمہارا دل مصائب و آلام کا شکار ہو چکا ہے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ تم اس کے واقف ہونے سے پہلے اس سے اپنے کل واقعات کہہ دو۔"

" لیکن آہ اے میرے محترم دوست! اگر میں تمہاری نصیحت پر عمل کروں تو تم ہی بتاؤ کہ میں اس کے دل کو کس قدر صدمہ پہنچاؤنگا۔ گویا میں ایک ایسا ظالم ہاتھ ہونگا جو اس خوشنما کلی کو برباد کرنے کے لئے بڑھایا جاتے۔ جو ابھی پورے طور پر کھلی بھی نہ تھی۔ اور جس کی عطر بیز خوشبو نے ابھی فضا کو معطر بھی نہ کیا تھا۔ اسی طرح میری کا دل بھی ایک نو شگفتہ پھول ہے۔ جو عین موسم بہار میں کھلا ہے۔ بس میں کسی طرح اس کے معصوم دل کو یہ کہہ کر چور نہیں کر سکتا۔ کہ تمہارا شوہر اب مفلس ہے' فقیر ہے اور اپنی اور تمہاری روٹیوں کے لئے متفکر' اس لئے تم اپنی اس راحت کو چھوڑ کر جس میں تمہارے حسن کا آفتاب آسمان شہرت پر چمک رہا تھا۔

مصیبت کی زندگی بسر کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

بتاؤ، بتاؤ میرے دوست، مجھے خدا کے لئے بتاؤ۔ کہ اگر میں اس سے یہ کہہ بھی دوں۔ تو اُس کا نازک دل اسے کس طرح برداشت کر سکیگا۔ کیا وہ اپنے موجودہ لمحات مسرت کو فراموش کر دیگی۔ کیا وہ اپنے حسن کی اُن عشوہ فروشیوں کو بھلا دیگی جن کی پرستش کے لئے آج بھی کائنات کی ہر چیز میں کشمکش ہے، نہیں، ہرگز نہیں، میں اپنے غم سے میری کی مسرت کو برباد نہ کرونگا۔ میں میری کے چراغ حسن کو اپنے دل میں غم کی اُٹھنے والی آندھیوں سے گل نہ کروں گا۔ ہاں میں اپنے دل کو کبھی رخصتِ فریاد نہ دونگا۔ کہ وہ میری کی محفل عشرت کو درہم برہم کر سکے۔ اس لئے کہ یہ انقلاب اس کے نازک دل کو پاش پاش کر دیگا۔ اور اس کا تنفس لطیف اس خوفناک تاریکی میں گھٹنے لگے گا"۔

(۵)

میں نے اس کے سینے میں غم کی متلاطم موجیں دیکھیں۔ اور خاموش ہو کر اُسے اس بات کا موقعہ دیا۔ کہ وہ اپنے تمام حالات بیان کر دے۔ تاکہ اُس کا غم و الم سکون سے بدل جائے،

جب لزلی کا دل کچھ ٹھیرا اور اُس پر غمناک خاموشی چھا گئی تو میں نے نہایت مطمئن لہجے میں اپنی گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔ جس میں اس بات پر زور دیا۔ کہ وہ جہانتک جلد ہو سکے اس انقلاب کا حال اپنی بیوی سے کہہ دے۔ جس پر اس نے اپنی رضامندی ظاہر کرنے کے لئے سر کا ایک خفیف اشارہ کیا جس سے مجھے اپنی کامیابی کا یقین ہو گیا۔ اور میں نے اپنا انداز گفتگو بدل کر کہا۔ "لزلی کیا تمہیں اس کی امید ہے۔ کہ تم اپنی اس حالت کو ہمیشہ کے لئے ایک راز بنائے رہوگے لیکن یاد رکھو کہ اس اُبلتے ہوئے چشمے کو کمزور زمین زیادہ دیر تک نہیں روک سکتی۔ اس لئے آج مجھ سے وعدہ کرو کہ تم اپنی بیوی سے یہ تمام حالات بیان کر کے اپنا معیار زندگی بدل دوگے۔ تم نے اُن باتوں کو جن سے اس کا واقف ہونا ضروری تھا چھپا کر ایک ایسی بیوفائی اور ایک ایسا ظلم کیا ہے جس کی تلافی نہیں ہو سکتی"۔

یہ سُنتے ہی لزلی کی پیشانی پر غم کا پسینہ چمکنے لگا۔ جسے دیکھتے ہی میں نے فوراً گفتگو کا پہلو بدل کر کہا۔ "پیارے لزلی اس سے دل گرفتہ نہ ہو تمہارا ولولہ مسرت کبھی کبر و نخوت کی حد تک نہیں پہنچا ہے۔ تمہاری عشرت میں قومی درد بھی شامل رہا ہے۔ اگر کبھی تمہاری آنکھیں مسرت سے چمکی ہیں۔ تو کبھی اُنہوں نے قوم کے غم میں قیمتی آنسو بھی بہاتے ہیں۔ جن کی قدر تم سے زیادہ تمہارے احباب کے دلوں میں ہے وہ کبھی تمہارے اس یکایک تغیر پر سرگوشیاں نہیں کر سکتے اور تمہیں اس درماندہ حالت میں دیکھ کر بجائے اس کے کہ وہ حقیر سمجھیں اُن کا جذبہ محبت اور بھی مشتعل ہو جائیگا۔

رہی تمہاری بیوی اس کے متعلق مجھے یقین ہے کہ وہ وفا کی دیوی محبت کی جوہری ہے۔ اُس کے لئے کسی عالیشان محل کی ہرگز ضرورت نہیں۔"

لزلی نے کسی قدر دردناک اور پُرجوش لہجے میں کہا۔

"نہیں، نہیں، مَیں اس کے ساتھ ایک مختصر سے مختصر جھونپڑے میں مسرتوں سے لبریز زندگی بسر کر سکتا ہوں اُس کی موجودگی میں دُنیا کی کوئی مصیبت اور افلاس و تنگدستی کی بیکسی مجھے رنجیدہ نہیں کر سکتی۔"

مَیں نے فرطِ جوش سے اس کا بازو پکڑ کر کہا "میرے سادہ دل دوست، تمہاری یہ حالت میری کے لئے اپنی محبت کا ثبوت دینے کے لئے ایک بہترین موقع ہے۔ اُس کی وہ تمام دلنوازیاں جو ایّام عشرت میں معطّل تھیں۔ اور جن کے اظہار کا اسے کبھی موقع نہ ملتا تھا۔ اب اُنکے اظہار کے لئے نہایت فخر و امتیاز کے ساتھ کوشش کریگی اور اسے ثابت کر دیگی کہ وہ تمہاری دولت کو نہیں۔ بلکہ تمہیں صرف تمہارے لئے چاہتی ہے۔ ہر وفا شعار عورت کے سینے میں محبّت و دلسوزی کی تیز چنگاریاں چھپی ہوئی ہیں۔ جو اگرچہ لمحات مسرت میں سرد رہتی ہیں۔ مگر مصیبت کے غمناک دنوں میں بھڑک کر یہی چنگاریاں دہکتے ہوئے شعلے بن جاتے ہیں۔ دُنیا کی حسّاس سے حسّاس طبیعتیں اور تیز سے تیز دماغ بھی یہ نہیں سمجھ سکتے کہ عورت کا دِل کن عمیق جذبات کا مرکز ہے۔ اور اُس میں شوہر پرستی کی کتنی اور کونسی تڑپ موجود ہے۔"

خدا جانے میری اس گفتگو میں کیا اثر تھا۔ جس نے لزلی کی بدگمانی اور غیر مطمئن خیالات کا انسداد کر دیا۔ مَیں نے اُسے خاموش دیکھکر اس بات پر زور دیا۔ کہ وہ امکانی عجلت کے ساتھ اس انقلاب کا سارا قصّہ اپنی بیوی سے کہہ کر مطمئن ہو جائے۔

لیکن یہ کہنے کے بعد ہی مَیں اس خیال سے بے چین ہونے لگا کہ کہیں میری کی نسوانی عقل میرے اس مشورے کی تردید نہ کر دے۔ کبھی خیال کرتا تھا کہ وہ ایک ناز و نعم میں پلی ہوئی مصائب زندگی سے بیخبر لڑکی ہے جسکی محدود دُنیا ہمیشہ خوشیوں سے معمور رہی ہے۔ کبھی یہ خیال آتا تھا کہ کہیں اُس کا ارمان بھرا دل مصیبت کی اس موسلادھار بارش سے گھبرا نہ جائے۔ کبھی یہ سوچتا کہ اُس کے نرم و نازک پاؤں غربت کی اس دشوار گذار منزل کو کس طرح طے کرینگے اور اس کی خودداری اس طعن و تشنیع کی کیسے متحمل ہو گی۔ جو آج کل کی مہذب لیکن انتہائی وحشی سوسائٹی زوال دولت پر کیا کرتی ہے۔ یہ خیالات تھے جو میری سکون خاطر کو کھوئے دیتے تھے۔ جب شام کو لزلی سے میری ملاقات ہوئی تو مَیں بہت پریشان تھا۔ مَیں نے اس سے ڈرتے ہوتے پُوچھا کہ تمام حالات سُننے کے بعد تمہاری بیوی

مستقل مزاج قانع اور باہمت ثابت ہوتی یا نہیں؛ لزلی نے جوش کے ساتھ کہا کہ "بیشک وہ ایک قدسی صفات عورت ہے۔ جب اس نے اس فوری تغیر کا حال سُنا تو اس کا چہرہ طمانیت سے چمکنے لگا۔ اور میری گردن میں ہاتھ ڈال کر محبت سے کہنے لگی: کیا یہی وجہ تھی کہ تم اتنے دنوں سے رنجیدہ رہا کرتے تھے؟"

میرے دوست شاید غریب میری ابھی اس انقلاب کے تہلکہ کن اثرات سے بے خبر ہے۔ اُس نے افلاس و غربت کے دردناک مناظر صرف نظموں ہی میں دیکھے ہیں۔ جہاں محبت و غربت لازم و ملزوم ہیں۔ اس لئے ابھی یہ ٹھیک ٹھیک نہیں کہا جا سکتا۔ کہ وہ اس آزمائش و ابتلا میں بھی مستقل مزاج ثابت ہوگی۔ کیونکہ ابھی اس انقلاب کا اثر ہماری معاشرت پر ایسا نہیں پڑا۔ جس سے کسی قسم کی فلاکت کا اظہار ہوتا ہو۔ البتہ اُس کی آزمائش کا حقیقی وقت وہ ہوگا جب ہم پر غربت پورے طور پر چھا جائیگی۔

مَیں نے کہا "تم ایک دشوار گزار منزل سے گزر چکے ہو اب صرف اپنی امیرانہ زندگی کو خیرباد کہنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ ورنہ اس وحشی سوسائٹی کی طرف سے جس کے دماغ کبر و نخوت سے پُر ہیں۔ ایسے تلخ آوازے کسے جائینگے جو تمہارے مجروح دل کے لئے ایسے جگردوز تیر ہونگے جنھیں یقیناً تم نہ برداشت کر سکو گے۔" میری یہ تقریر سُنکر لزلی جو پہلے سے بھی تیار تھا۔ اور فطرۃً منکسر المزاج واقع ہوا تھا۔ اس کے لئے مستعد ہو گیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ میری اس سے دل برداشتہ ہوگی۔ لیکن حقیقت اس کے خلاف تھی۔ اور میری کا دل اپنی وفا پرستی کا ثبوت دینے کے لئے بیچین نظر آتا تھا۔

(۶)

کچھ دن کے بعد جب لزلی مجھ سے ملا۔ تو وہ اپنا پہلا مکان بیچ چکا تھا۔ اور شہر سے باہر دیہات میں ایک چھوٹے سے جھونپڑے میں رہنا شروع کر دیا تھا۔

آج صبح سے شام تک لزلی نے اپنا وہ باقیماندہ اسباب جو بہت معمولی تھا۔ اور فروخت کرنے سے بچ گیا تھا۔ تنہا اس جھونپڑے میں لا لا کر رکھا تھا۔ اگر ان تمام چیزوں میں کوئی غیر معمولی چیز تھی تو وہ ایک باجا تھا۔ جس کے نغمے ان کی ابتدائی محبت کے شاہد تھے۔

اُس وقت لزلی اُس جھونپڑے کی طرف یہ خیال کرتا ہوا جا رہا تھا کہ آج میری سامان قرینے سے رکھتے رکھتے بہت تھک گئی ہوگی۔ اگر مَیں اس وقت لزلی کے ساتھ اس کے نئے مکان نہ جاتا تو شاید میرا یہ افسانہ بے نتیجہ رہ جاتا۔ اس لئے ہم دونوں جھونپڑے کی طرف چل دئے مگر لزلی اس قدر تھکا ہوا تھا۔ کہ بمشکل قدم اُٹھا سکتا تھا۔

آخرکار میری کی مضمحل آواز نے اس خاموشی کو توڑا۔

[redacted]

اور میں نے متعجبانہ لہجے میں پوچھا کہ کیا میری کچھ رنجیدہ ہے۔ کوئی نیا واقعہ تو پیش نہیں آیا؟ اس جملے سے لڑکی کے مغموم دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ اور بیتاب ہوکر کہنے لگا۔ "آہ! کیا ایک عالیشان محل کو چھوڑکر ایک ذلیل وکم مایہ جھونپڑے میں زندگی بسر کرنا اور ادنے سی ادنے ضرورتوں کے لئے پریشان ہو جانا کیا غمناک سانحہ نہیں؟"

"تو کیا میری نے اس غربت پر تم سے اپنی تکالیف کی کچھ شکایت کی؟"

"شکایت! نہیں! نہیں! اس لفظ سے اس کے صبر وقناعت کی توہین ہوتی ہے۔ مجھے اس کے ضبط و تحمل کا یقین نہ تھا۔ لیکن اب مجھے معلوم ہو گیا۔ کہ وہ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں میرے لئے ایک شمع ہدایت ہے۔"

"بیشک میری ایک قابل رشک عورت ہے۔ اور تمہاری تنگدستی کی شکایت فضول ہے۔ شکر کرو۔ کہ تمہیں ایک ایسی بیوی ملی۔ جس کی موجودگی میں تم کبھی غریب نہیں ہو سکتے۔"

کاش جھونپڑے کی ملاقات کا یہ مرحلہ اس سے پہلے ختم ہو گیا ہوتا۔ اس لئے کہ آج کا دن میری کے امتحان وآزمائش کا پہلا دن ہے۔ اور میرا دل دھڑک رہا ہے کہ وہ اپنی اس آزمائش میں کس طرح پوری اترے گی۔ آہ اُسے اپنے اس نئے گھر کی آرائش کے لئے سامان کی ضرورت ہوتی ہوگی لیکن وہ بیکسانہ ضبط کے ساتھ اِدھر اُدھر دیکھ کر چپ ہو جاتی ہوگی۔ اور اس وقت کچھ اپنی محنت اور کچھ غم سے تھکی ہوئی اپنی اس مصیبت بھری زندگی پر غور کر رہی ہوگی۔"

(۷)

اس گفتگو کے اثر نے مجھے ایک گہرے شک میں ڈال دیا اور دل میں بار بار یہ خیال آنے لگا۔ کہ ضرور ناز ونعم میں پلی ہوئی میری اپنی اس غمناک بربادی پر آنسو بہا رہی ہوگی۔ میں اپنے اس خیال میں ڈوبا ہوا لڑکی کے ساتھ خاموشی سے چلا جا رہا تھا۔ کہ یکایک وہ بڑی سڑک کو چھوڑکر ایک تنگ گلی میں داخل ہوئی جسے دونوں طرف کے خودرو درختوں کی شاخوں نے اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ اور دُور دُور تک سناٹے میں کوئی آواز نہ سُنائی دیتی تھی۔ تھوڑی دُور چلنے کے بعد وہ کچھ کھٹکا اب اُس کا دیہاتی وضع کا مختصر سا جھونپڑا صاف دکھائی دے رہا تھا جسے انگور کی گھنی بیل اپنی سبز پتیوں سے چھپائے ہوئے تھی۔ اور آس پاس کے درخت مستانہ وار جھوم جھوم کر اس سے لپٹے جاتے تھے۔ خوشنما پھولوں کے گملے دروازے پر رکھے ہوئے تھے۔ اور سامنے کے میدان

میں دُور تک شاداب گھاس اُگی ہوئی تھی۔ کھڑکی کی طرف سبز و دلکش جھاڑیاں کثرت سے تھیں۔

دفعتاً نزلی نے میرا ہاتھ دبا کر کہا۔ سنو جھونپڑی سے کیسے شیریں اور دلکش نغمے نکل کر فضا میں گونج رہے ہیں۔ کیا میری کی فطری شگفتگیاں اس ویرانے میں بھی محروم مسرت نہیں؟ جب وہ یہ کہہ رہا تھا تو میں نے اپنے شانوں پر اُس کے ہاتھ کو کانپتا ہوا محسوس کیا۔ گویا اُسے ابھی ان نغموں پر شک تھا۔ اس لئے وہ آواز کو صاف سننے کے لئے آگے بڑھا لیکن کنکریوں نے پاؤں کے نیچے آکر اس راز کو فاش کر دیا۔ اور میری اپنے مسکراتے ہوئے خوبصورت چہرے کو کھڑکی سے نکال کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اور ہم لوگوں کو اپنی طرف آتا ہوا دیکھ کر عجیب شانِ حسن کے ساتھ استقبال کے لئے نیچے اُتر آئی۔ اس وقت وہ حسن کی دلاویزی اور سادگی کا مرقع تھی۔ اس کے سفید معمولی لباس نے اور بھی چار چاند لگا دئے۔ اس کے لانبے لانبے سیاہ بالوں میں گلاب کے پھول لگے ہوئے تھے۔ چہرہ جوشِ مسرت سے چمک رہا تھا۔ اور خفیف مسکراہٹ اس کے نازک لبوں سے کھیل رہی تھی۔ میں نے اس سے پہلے ایسی حیرت فروش رعنائیاں کبھی نہ دیکھی تھیں۔ اُس نے نہایت ہی مطمئن لہجے میں کہا:۔

"پیارے جارج، میں تمہارا اس گلی میں ٹہل ٹہل کر بہت دیر سے انتظار کر رہی تھی۔ شکر ہے کہ تم آ گئے۔ چلو اُس خوبصورت درخت کے نیچے کھانے کی میز لگی ہوئی ہے۔ آج میں خاص تمہارے لئے جنگل سے جھربیریاں چن کر لائی ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ ان کے بہت شائق ہو۔ اس کے علاوہ دسترخوان پر نہایت نفیس بالائی بھی ہے۔ جسے غالباً تم پسند کرو گے۔ جارج میں اپنی اس آزاد اور خوشیوں سے معمور زندگی پر بہت مسرور ہوں"

لزلی جو میری کی یہ گفتگو سن رہا تھا۔ اب اپنے جوش کو ضبط نہ کر سکا۔ اور فرطِ مسرت سے دوڑ کر میری کو سینے سے لگا لیا۔ اس وقت اگرچہ دونوں خاموش تھے۔ مگر زبانِ خاموشی، محبت و وفا کی وہ طویل داستان کہہ رہی تھی جس سے دُنیا والے ہمیشہ درس وفا لیتے رہینگے۔

اس کو مدتیں گزر گئیں لیکن لزلی نے ثابت کر دیا کہ اگرچہ اُس کا گھر اس سے پہلے دولت و عزت اور دُنیا کی عیش و عشرت کا مرکز تھا۔ مگر پھر بھی وہ اس حقیقی مسرت اور اصلی سکونِ قلب سے ناواقف تھا جو آج اس غریب اور سامانِ عشرت سے محروم زندگی میں حاصل ہے۔

ابو محمد ثاقب

مئے قدیم

دلِ دردآشنا اے ہم نشیں وقفِ فغاں پھر ہے — خیالِ بندشِ مضموں بیانِ داستاں پھر ہے
گلستانِ سخن میں کلکِ میری گلفشاں پھر ہے — بہار افزائے باغِ نظمِ طبعِ نکتہ داں پھر ہے
چمن سرسبز گُل خنداں شگفتہ ہے کلی ایسی
زمینِ نظم مدّت سے نہیں پھولی پھلی ایسی

ہُوتی ہے ناظمِ ملکِ سخن پھر طبعِ فرزانہ — تکلّم سے ہُوتے ہیں آشنا لب نغمے جو بیگانہ
چراغِ فکر سے ہر بیت کا روشن ہے کاشانہ — پریزادانِ معنی گرتے ہیں بن بن کے پروانہ
نہیں کچھ حاجتِ آوردِ مضموں فکرِ کامل کو
کہ پھولوں کی کشش خود کھینچ لاتی ہے عنادل کو

ثمر آتے ہیں پھر اس باغ میں میری ریاضت سے — مری فکرِ رسا لائی ہے یہ اثمار جنّت سے
نہیں محسوس ہو سکتے یہ پھل فرطِ لطافت سے — مزا لینا جو چاہے کام لے اپنی بصارت سے
بہت نازک ہیں گلزارِ سخن میں بیل بوٹے پھل
خبردار او ثمر چیں! پنجۂ مژگاں سے ٹوٹے پھل

ریاضِ دہر میں یہ نظمِ رنگیں برگزیدہ ہے — معانی منتخب اس کے ہیں ہر ہر لفظ چیدہ ہے
مثالِ سرو ہر مصراعِ مضموں سرکشیدہ ہے — ہر اک بیت آبرو میں رشکِ ابروئے خمیدہ ہے
حسینوں کو کرے پابندِ حسرت جوڑ بند اس کا
رُخِ پُر نور روشن چاند سے بھی ہے دوچند اس کا

کشش حرفوں کی ایسی کھینچ لے جو دل کو پہلو سے — وہ سطروں کی روش ملتی ہے جو زنجیرِ گیسو سے
بیاضِ نظم رنگیں ہے مشابہ روے نیکو سے — سوادِ خط کو چشمک ہے سوادِ چشمِ آہو سے
اُلٹ کر حرف کا پردہ فرحِ افزائے دل کہیئے
اِک اِک نقطے کو اس کے چہرۂ گلگوں کا تل کہیئے

کہاں ہے روشنیِ طبع ایسی دُرِّ مکنوں میں — روانی اس بلا کی خاک ہوگی آبِ جیحوں میں
غضب کی سلسلہ جنبانیاں ہیں طبعِ موزوں میں — کیا ہے رشتہ برپا اس نے گوہرہائے مضموں میں
مرتب کی جو ہے یہ نظم روشن میں نے کاوش سے
مضامیں سلکِ گوہر بن گئے ہیں میری بندش سے

اُڑے مضموں ہزاروں کوس زیرِ چرخ پر بستہ — برائے صید گیریِ فکر ہے میری کمر بستہ
ہُوا فکرِ ہمایوں سے کوئی مضموں اگر بستہ — نہ نکلا دام سے میرے برنگِ مرغِ پر بستہ
کہاں جاتے نکل کر طائرِ مضموں مرے بس سے
حدودِ شش جہت مسدود ہے میرے مسدس سے

مری طبعِ رواں سے بند دریا کی روانی ہے — گہر کو اس سے کیا نسبت کہ بستہ اس کا پانی ہے
نگاریں جا بجا پھولوں سے یوں لوحِ معانی ہے — کہ نقاشی میں فن دانی میرے مانی نے مانی ہے
مری گلکاریاں ہیں خندہ زن ارژنگِ چینی پر
جہاں ہے آفریں خواں میری مضموں آفرینی پر

بس اے طبعِ رواں بیہودہ ہے یہ خامہ فرسائی — فلاحِ قوم بھی ملحوظ رکھ کب تک خود آرائی

بہت دلکش ہے باغِ دہر میں پھولوں کی رعنائی　　بہارِ رنگ و بو پر محو ہیں یارانِ سودائی
پھنسے کب تک رہینگے گلشنوں میں گلعذاروں میں
لگا دے اک لگن اے نالۂ دلسوز یاروں میں

سماں دُنیا کا کیسا نزہتِ باغِ جہاں کیسی　　کھٹکتی ہے نگاہوں میں بہارِ بوستاں کیسی
تن آسانی کی اے دل! چاہِ زیرِ آسماں کیسی　　سراب دہر سے سیرابیٔ تشنہ لباں کیسی!
سوا کانٹوں کے آخر کس نے پھل پایا ببولوں سے
شگفتہ کب ہوا بلبل کو دل کاغذ کے پھولوں سے

غرورِ کامرانی کیا ہو زیرِ چرخِ زنگاری　　کہ ہر دم آسماں کو ہے یہاں لیلِ دل آزاری
بسا ہے جامِ مُل سے کیفِ بہجت کی طلبگاری　　بھرا ہے تلخ کامی سے مذاقِ بزمِ مے خواری
نہ ہوگی سرخوشی یاروں کو دورِ چرخِ اخضر میں
کہ ہے آمیزشِ سم اس کے مینا رنگ ساغر میں

فلک کی بات کب کوئی خطاکاری سے خالی ہے　　ہر اک شے دامنِ گردوں میں آفت ڈھانے والی ہے
عیاں اس پردۂ زنگار سے شانِ جلالی ہے　　شعاعی خط ہیں نیر سے ماہِ نو تیغِ ہلالی ہے
خطوطِ قوس کیا ہیں یوں جو گردوں پر نکلتے ہیں
کمانیں ہیں یہی تیرِ حوادث جن سے چلتے ہیں

بلائے جاں طلسماتِ جہاں کا کارخانہ ہے　　دو رنگی میں ہے یکتا فتنہ خیزی میں یگانہ ہے
نہاں ہر رنگ میں دُنیا کے نیرنگِ زمانہ ہے　　ہر اک موجودیاں تیرِ حوادث کا نشانہ ہے

حباب آسا جو دورِ آسماں میں سر اٹھاتے ہیں
تھپیڑوں سے وہ سیلابِ فنا کے ٹوٹ جاتے ہیں

وہ گل رو دیکھ کر جن کو نہ دیکھے کوئی سوئے گل ۔ بنا دے دلفریبی جن کی بلبل کو عدوئے گل
وہ پیاری صورتیں رنگت میں ہیں جو رشکِ روئے گل ۔ اُڑایا ہے خزاں نے رنگ اُن کا مثلِ بوئے گل
وہ چہرے گل کی صورت جن کو برسوں پھولتے دیکھا
اُنہیں پر ایک دن آنکھوں سے سرسوں پھولتے دیکھا

بہارِ گلشنِ ایجاد کی کیا کم وقاری ہے ۔ نہ گل کا رنگ ثابت ہے نہ بو میں پائداری ہے
چمن میں کوئی دم کی میہماں فصلِ بہاری ہے! ۔ تماشائی! تجھے بیہودہ چشم کامگاری ہے
نظر بازی سے پھولوں کی خوشی حاصل ہوئی کس کو
اسی منظر نے آخر کر دیا بیمار نرگس کو

نہ یوں دل کو پریشاں کر اُلجھ کر زلفِ سنبل میں ۔ نہ کر برباد عمر اپنی ہوائے لالہ و گل میں
یہاں کے پھول ہیں ڈوبے ہوئے رنگِ تغافل میں ۔ الٰہی ڈال دے نورِ حقیقت چشمِ بلبل میں
نظر ڈالے جو منظر پر گلوں کے چشمِ حق بیں سے
کرے قطعِ نظر یہ مشتِ پر گلہائے رنگیں سے

(باقی آئندہ)

تپش

کلامِ شاد

تجھے اے دل بتوں نے خوب تاکا | مثل سچّی ہے کہ سیدھا گھر خدا کا
کہا جو آپ نے سب عذر مانا | نہ کیجے تذکرہ "قالو بلیٰ" کا
ہماری انتہا ایسی نہ ہوتی | جو قصّہ یاد رہتا ابتدا کا
گرہ میں باندھ لائی بوئے گیسو | بگڑتا اس میں کیا اے گل صبا کا
جہاں بیٹھے وہیں گھر ہو گیا شاؔد | ٹھکانا کیا مجھ ایسے بے نوا کا

کلامِ رفیق

محفوظ رکھ کے حسرتِ دیدارِ یار کو | پھونکا ہے سوزِ غم نے دلِ بیقرار کو
ظالم اٹھا کے پردۂ لیل و نہار کو | تو سرفراز کر نگہِ انتظار کو
اُن کی تجلّیوں کے تماشوں کو دیکھ کر | وجد آگیا مری نگہِ انتظار کو
سمجھا دیا ہے جب سے کچھ ان کی نگاہ نے | تسکین ہو گئی ہے دلِ بیقرار کو
کچھ وہ ہی جانتا ہے مزے سوزِ عشق کے | دیکھا ہے جس نے اس نگہِ شرمسار کو
کیا جانئے کس قصور پہ جھنجھلا کے اے رفیؔق | گل کر گئے ہیں وہ مری شمعِ مزار کو

غزل

خندہ زن ہے مری حالت پہ خود آرا کوئی | آہ تنہا بھی نہ ہو محوِ تماشا کوئی
کتنی مشکل سے وہ اِک رات بسر ہوتی ہے | جب تڑپتا ہے ترے حسن کا شیدا کوئی
ذرّہ ذرّہ سے ہو اِک حسن کی دُنیا پیدا | خون سے رنگیں تو کرے دامنِ صحرا کوئی
ہر طرف یاس کا عالم نظر آتا ہے مجھے | وقفِ ناکامیِ حسرت نہ ہو اتنا کوئی
اللہ اللہ یہ تری بیخبری اے انساں | اس طرح ہوتا ہے وارفتۂ دُنیا کوئی

شارقِ جلوہ طلب! جی نہ کہیں کھو دینا
پھر اُٹھاتا ہے نقابِ رُخِ زیبا کوئی

شارق ایرانی

نفسیات اور اکبر

اکبر دورِ زوال کا شاعر ہے لیکن اس انحطاط آفریں دور کی وہ تمام خصوصیات جو ہر ایک فرد میں پائی جانی چاہییں اکبر میں نہیں۔ اس روشن مگر حیرت انگیز حقیقت نفس الامری کو ذہن نشین کرنے کے لیے چند ایک باتوں کو تفصیل سے بیان کرنا ضروری ہوگا۔ یہ نفسیات کا ایک لطیف نکتہ ہے کہ ہر ایک قوم کے مدارج ارتقا میں تہذیب و تمدن شاعری کے دوش بدوش راہِ ترقی پر گامزن ہوتا ہے۔ تہذیب و تمدن کا عروج شاعری میں سطوت و بلند آہنگی پیدا کر دیتا ہے۔ شاعری عمل کی شاعری ہو جاتی ہے اسی طرح انحطاط و زوال کے اثرات شاعری کے زاویہ نگاہ کو تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ یہی شاعری دل کے تمام جذبات کو مردہ کر دیتی ہے لیکن یاد رہے کہ دورِ زوال کی افسردگی جذبات بہترین انفرادی شاعری ہوتی ہے۔ کیونکہ اس وقت شاعر واردات قلب کو بیان کرتا ہے۔ اور دورِ نشاط کی شاعری نیز پرسطوت اور باشوکت ہوتی ہے لیکن اس میں وہ انفرادی عنصر نہیں ہوتا جسے سوز و گداز کا خطاب دیا جاتا ہے۔

اس حقیقت کو سمجھنے کے بعد یہ نکتہ قابلِ لحاظ ہے کہ قانونِ ارتقا کے ہمہ گیر اثر کے تحت میں زوال پذیری ایک حد تک تعین ہے۔ اس کے بعد دورِ زوال کے تمام جذبات پھر ابھرنا شروع ہوتے ہیں۔ لیکن حیات جدید کی یہ سرعت اور شدت بعض دفعہ قوم کو شاہراہِ مستقیم سے ہٹا دیتی ہے۔ اس وقت جو شاعر اعتدال سے تجاوز نہ کرے اور حیاتِ جدید کے تمام پہلوؤں کو نمایاں صورت سے ظاہر کرکے ایک خاص کشمکش، ایک عظیم جد و جہد کا پیغام دیتا ہے۔ حقیقتاً وہی اصلی شاعر ہے۔ یہ تو سب کچھ ہو ... اجتماع کی متحدہ رائے کے اثرات ہر ایک فرد کو جس کی ... اجتماع سے اختلاف رکھنے کے باوجود دور اندیشی اور دانشوری پر مبنی ہو جھک جانے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس وقت شاعر ... قاعد کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس ... ایک قاعد اور شاعر کے امتیازی مسائل ... ہیں۔ وہی سطوت و نفوذ ذاتی جس کے بغیر ... معنی میں قاعد نہیں کہلا سکتا۔ شاعر ... وہ کبھی کسی متفقہ رائے سے بوسعر ہو اتفاق ... بلکہ اپنی ذاتی وجاہت اور خود اعتمادی سے ... مستقل مزاجی سے اپنے فرض کو ...

اس کی یہ مسلسل رواداری اجتماع کے قلوب پر اپنا نقش چھوڑتی چلی جاتی ہے۔ اور آخر کار ان کی تمام قوت' ایک زبردست قوتِ ارادی کے مطیع ہوجاتی ہے بس انہیں تمام نقوش تاثر کو قبول کرنا اور انہیں زبانِ شعر سے ادا کرنا۔ اکبر کا کمال ہے۔

یہ ایک عام خیال ہے کہ ایک ملک کا ادب اس کی معاشری' تمدنی اور اصلاحی حالت کا آئینہ دار ہوتا ہے، اس کلیے کی تصدیق کے لئے آپ کو اکبر سے بہتر کوئی شاعر نہ ملیگا۔ جس انداز سے اس نے قوم کے تمام جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ وہ دورِ ماضی کے تمام شاہکاروں میں نایاب ہے

یہاں ہمارا مقصد ان شعروں کو نقل کرنا نہیں جن میں قوم کو ابھارا گیا ہے۔ جہاں اکبر نے دور اندیش دل و دماغ نے اجتماع کی پیروی نہ کرتے ہوئے ایک دوامی جدوجہد جاری رکھی ہے۔ ان کا تفصیلی بیان آپ آئندہ صفحات میں پائینگے۔ یہاں صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ اس دورِ زوال کے تمام انحطاط آفریں خیالات سے اکبر کہاں تک متاثر ہوا ہے؟

بادی النظر میں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکبر نے کسی انحطاط آفریں جذبے کی ترجمانی نہیں کی۔ مگر اس کے کلیات کو غور سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ ان اثرات سے آزاد نہیں رہا لیکن اکبر کا حقیقی کمال یہ ہے۔ کہ جذبات کے اس تاریک پہلو کو اُسنے اپنی جدت سے روشن کر دکھایا ہے نفس کی جتنی کیفیتیں ہیں ان کا لازمی اصول یہ ہے کہ ارتقائے جذبات کی ہر ایک ترتیب کے معکوس عمل سے متاثر ہوتی ہیں یعنی جو جذبات نفسِ انسانی میں سب سے پہلے ظاہر ہوتے ہیں وہ سب سے اخیر میں انحطاط قبول کرتے ہیں۔ اور جو جذبات سب سے بعد ظاہر ہوتے ہیں وہ سب سے پہلے زوال پذیر ہوجاتے ہیں۔ اس عمل کے زیر اثر حیات کے ہر ایک پہلو پر افسردگی چھائی رہتی ہے۔ اور صرف کشاکشِ عمل ہی ایک ایسی شے ہے جو انسانی دل و دماغ کو ان روح فرسا خیالات سے چھٹکارا دلا سکے۔ اکبر عمل کی کشاکش پیدا کرنا چاہتا ہے۔ مگر مغربی تہذیب سے بچ کر۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی کسی حد تک ناکام کوششیں افسردہ ہوجاتی ہیں۔ یہ افسردگی انحطاطِ جذبات کا پہلا زینہ ہے۔ مگر خیال رکھنا چاہیے کہ اکبر کی افسردگی وہ درماندگی کی کیفیت نہیں جو بارد اور منجمد ہوتی ہے۔ اور جسے کوئی ٹھوکر بیدار نہیں کرسکتی اس کی افسردگی لطیف' رقیق اور رنگین ہے۔ اور چونکہ اکبر کی افتادِ طبیعت صوفیانہ تھی اس افسردگی میں ایک تسلیم و رضا کا عنصر شامل ہوگیا ہے۔ جو روحِ رواں کی طرح مصرعوں کے ہر لفظ میں جاری و ساری ہے۔

کس پر درد انداز سے کہتا ہے ؎

بلبلِ دل کے لئے ہر دامن گلشن ہے یہاں
ہر نفس راہِ جنوں میں گل بدامن ہے یہاں
ہے تجلی نورِ حیرت کی ہر آہ شعلہ بار

ہر تپش سینے کی برقِ طور ایمن سے یہاں
شعلۂ غم سے دلِ سوزاں میں اک جاں آگئی
روح پرور اختلاطِ برق و خرمن ہے یہاں
شعلہ ہائے غم سے ہے نشو و نمائے باغِ دل
دامنِ ابرِ کرم ہر برق خرمن ہے یہاں

. . . .

محبت ہمیشہ سے ہر ملک کے شاعروں کا محبوب ترین موضوع رہا ہے۔ مگر کسی شخص نے ابتک یہ کوشش نہیں کی۔ کہ محبت کے وہ تمام پہلو بھی دکھائے جائیں جن میں گو ابتذال تو ہے مگر جن پر حقیقت میں محبت کا جذبہ اساسی طور پر مبنی ہے۔ ہر ایک شاعر نے محبت کو روحانی فرض کرتے ہوئے اس کو سراہا ہے۔ اس کی رنگینیاں اسکی خواہشات کی فراوانی۔ پاکیزگی اور تقدس کی مزے لے لے کر تعریف کی ہے۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اس پرسوز جذبے سے کسی بنی نوع انسان کا دل خالی نہیں۔ اس کی کیفیات اس قدر لطیف ہیں کہ پانی کے بلبلوں کی طرح ہاتھ لگانے سے ٹوٹ جاتی ہے۔ مگر نفسیات کے نقطۂ نگاہ سے محبت کے جذبے کی تحلیل شاعروں کی تمام تعریفوں سے مختلف ہے۔

"اس بات کا فیصلہ کرنے کے لئے حکماء کے دو گروہ پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک کا خیال ہے کہ قانونِ فطرت نے کسی شخص کو واحد نہیں پیدا کیا۔ بلکہ ہر ایک شخص کا ..... ایک روحانی عکس یا ثنئے بھی پیدا کیا ہے۔ جس کے ساتھ اس کو بیحد مجالست اور دلبستگی ہوتی ہے۔" لیکن مشکل یہ ہے وہ دونوں ایک جگہ نہیں پائے جاتے۔ اگر کوئی انگلستان میں ہے تو دوسرا امریکہ۔ اس لئے عام طور پر معاشقے کی نشو و نما مشکل ہو جاتی ہے۔

دوسرے گروہ کا ادعا ہے کہ ہر ایک مرد و عورت میں بشرطیکہ ان کی صحت میں کسی خاص قسم کا فتور یا نقص نہ ہو۔ معاشقے کی صلاحیت موجود ہے۔ اور جہاں بھی کوئی قوی الاعضاء اور باصحت جوان اور خوبصورت عورت باہم مل کر رہینگے محبت پیدا ہو جانا ضروری ہے۔ جبتک اجتماع کی بندشیں انہیں قیود رسمی سے مجبور رکھتی ہیں۔ بیشک یہ چنگاری سلگتی رہتی ہے۔ مگر جہاں انہیں کوئی ایسا موقع ملا کہ اجتماع نے ان دونوں کو ذرا سی بھی آزادی بخشی یہ آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ اور اس کے بعد ناممکن ہو جاتا ہے کہ کوئی طاقت ان دونوں کو ملنے سے باز رکھ سکے۔ یہ فطرت کا ایک اٹل قانون ہے۔ اور توارث عمرانی میں شامل۔ ان باتوں سے ثابت ہو گیا ہوگا۔ کہ جوان مرد اور عورت کے لئے اپنی آرزوؤں کو کسی خاص مرکز تک محدود رکھنے کی ضرورت نہیں۔ ان کے خیالات خود اختیاری طور سے معاشقے کی طرف راغب ہونگے۔ ہاں یہی رغبت جب کسی خاص محبوب سے مختص ہو جاتی ہے۔ اور مجالست و دلبستگی

ایک گہرے رشتے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ تو اس کیفیت کو عشق کہتے ہیں۔ اس کیفیت کے بعد اگر محبوب نہ ملے تو سخت اضطراب اور کاہش کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور جب تک محبوب سے ملاقات حاصل نہ ہو سکون نہیں آتا۔ مگر یہ تمام کیفیتیں صرف عشق پر ہی منحصر نہیں کسی جوان آدمی یا عورت کو ایک عرصے تک اپنی جنس مقابل سے ناآشنا رکھیے اور پھر دیکھیے کہ اس کے نفس میں بھی وہی اضطراب اور کاہش پیدا ہوتی ہے یا نہیں۔ محبت کی تعریفیں تو بہت سی ہو چکی ہیں۔ جن میں سے شیفتہ کا یہ شعر مقبول خاص و عام ہے ؎

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ

اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

مگر ایسی کوئی تعریف نہ کی گئی تھی جس سے محبت کا اساسی جذبہ بھی ظاہر ہو۔ اکبر کی ایک تعریف سننے کے قابل ہے لکھتا ہے ؎

کیا بلائے جاں جوانی میں طبیعت ہو گئی

جس حسیں سے مل گئیں آنکھیں محبت ہو گئی

. . . .

محبت کی یہ تمام کیفیات بیان کرتے وقت غالباً ہوس کے مظاہر کا ذکر بھی بے موقع نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ مظاہر محبت کے لوازمات ہیں۔ اور اس کے بغیر محبت میں وہ شدت اور حدت نہیں پیدا ہوتی۔ جو محبت کی جان ہے۔ پہلے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ محبت کے ساتھ ہی ہوس کے مظاہر کیوں لذیذ اور دل آویز معلوم ہوتے ہیں۔

اس کے جواب دینے کے لئے غالباً نفسیات کا ایک نکتہ کافی ہو۔ قاعدہ ہے کہ جو چیز نہایت محبوب ہو اس کے ذرائع حصول بھی لذیذ اور دل آویز ہو جاتے ہیں اور انسان ان کو بھی اسی طرح محبوب سمجھنے لگ جاتا ہے جس طرح شے موصوف کو۔ اس کی ایک ادنیٰ سی مثال دولت کی ہر دلعزیزی ہوگی۔ بہت کم اشخاص ایسے ہونگے جن کے ذہن میں دولت کی عشرت کا تصور ان محبوب اشیاء کی وجہ سے پیدا ہو۔ جو دولت کے بدلے خریدی جا سکتی ہیں۔ دراصل دولت کی محبوبیت کی وجہ یہی تھی۔ کہ اس کے بدلے زندگی کی تمام عشرتیں خریدی جا سکتی تھیں۔ مگر رفتہ رفتہ یہی حصول عشرت کا ذریعہ خود بھی ایک احساس عشرت ایک کیفیت انبساط کا باعث ہونے لگا۔ مگر اب تک اس کی یہی وجہ تھی۔ دولت کے حصول کے ساتھ ہی عشرت کے حصول کا خیال آتا تھا۔ مگر بعد میں دولت بذات خود عزیز ہو گئی۔ اور اب ہم اپنے ذہن میں دولت کو ہی معبود و مقصود سمجھ کر اس کے ذرائع حصول کو محبوب تصور کرنے لگے ہیں۔ اور دولت ایک انفرادی خوشی قرار پا گئی ہے۔

اسی طرح شروع میں تو ہوس کے مناظر و مظاہر

محض اس لئے عزیز تصوّر کئے جاتے ہونگے۔ کہ وہ محبّت کے لوازمات ہیں۔ مگر بعد ازیں رفتہ رفتہ انہوں نے بھی ایک مستقل انفرادی حیثیت اختیار کر لی۔ اور وہ بھی عشرت کا ایک امتیازی جزو قرار دئے جانے لگے۔ اگر یہانتک بات ختم ہو جاتی تو خیریت تھی۔ مگر بعض شاعروں نے ہوس کے مناظر و مظاہر کو محبّت کی پاکیزگی اور تقدس سے ناآشنا کر لیا اور صرف انہیں کے مختلف پہلوؤں کو لیکر اپنے شعروں میں ادا کرنے لگے۔ ان کا خیال غالباً یہ تھا۔ کہ نفس انسانی پر اگر اپنے اختیار سے بھی کسی جذبے کے مظاہر جسمانی طاری کر لئے جائیں تو رفتہ رفتہ وہی جذبہ پیدا ہو جاتا ہے چنانچہ کئی شاعروں نے محض ہوس کے مظاہر و مناظر سے محبّت کے مشکل الحصول جذبے کو متہیج کرنا چاہا لیکن وہ بہت دُور نکل گئے۔ انہیں میں سے ایک کا مشہور شعر ہے ؎

یہ سیر ہے کہ دوپٹہ اُڑا رہی ہے صبا
جو وہ چھپاتے ہیں سینہ کمر نہیں چھپتی

اکبر نے بھی انہیں مناظر کو بیان کیا ہے لیکن اس کی قوتِ احساس۔ مدارجِ ارتقا کے زیرِ اثر تمدنِ جدید کے مطابق ہو گئی ہے۔ اسی لئے اس کے جذباتِ ہوس میں بھی شستگی ہے۔ اور کہیں ذرّہ برابر بھی سوقیانہ رنگ نظر نہیں آتا۔ ہاں البتہ یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ اخلاقیات کو ان مناظر سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ یہ بھی ایک منضبط اصول ہے کہ جسقدر اعمال انسانی حیات ہیں براہ راست ممد و معاون ہوتے ہیں۔ ان کو سوسائٹی بنگاہ اکراہ سے دیکھتی ہے۔ کیونکہ محبت بھی جس کا انتہائی معراج اتحادِ جسمی ہے توارث عمرانی کا ایک جزو ہے۔ اور صیانت حیات کا ایک اہم عنصر۔ اس لئے اس کے تمام مناظر میں بھی بلند آہنگی کا پایا جانا سوسائٹی کے نزدیک برا ہے۔

لیکن اکبر ان خطرناک شاہراہوں سے بچکر چلتا ہے وہ بہت کھلتا ہے تو ان شعروں میں کہ ؎

امیدِ بوسہ و ابرو و زلف و چشم کسے
مرے نصیب کہاں اور یہ بلائیں کہاں

.. ..

ہوائے دیر بھی ہے عنبر افشاں۔ عروج بھی ہے مہ مبیں کا
نثار ہونے کی دو اجازت محل نہیں ہے نہیں نہیں کا

.. ..

کچھ انتظار میں موقع کے طول ہجر ہوا
کچھ ابتدائے محبّت میں ہاں نہیں بھی ہوئی

.. ..

یہ عمر یہ حسن، یہ ناز و ادا اس پہ یہ سنگار اللہ اللہ۔
مستیِ نگہ اف اف کی جگہ، سینے کا ابھار اللہ اللہ
گالوں میں ترے کندن کی دمک بالوں میں ترے عنبر کی مہک
سینے پہ جواہر کی یہ چمک اور اس پہ یہ ہار اللہ اللہ

بکھری ہوئی زلفیں دام بلا' یہ جنبش مژگاں تیرِ قضا
تقویٰ کی عدو یہ لغزش پا' یہ رنگِ خمار اللہ اللہ
خود خامۂ قدرت نازاں ہے' ہر چشمِ تماشا حیراں ہے
اس صفحۂ عنصرِ خاکی پر یہ نقش و نگار اللہ اللہ

. . . .

ہمیں ہنسنے سے تھے زیادہ گناہِ اکبر پر
ہمیں کو اب یہ ہے حسرت ہمیں نے کیوں نہ کیا

آخری شعر ہوس کی ایک عجیب کیفیت کا حال ہے۔ قاعدہ ہے کہ جو شخص کسی خاص وجہ سے گناہ کا اقدام نہیں کر سکتا وہ اپنے دل کی تسلی کے لئے تاویلیں گھڑ لیتا ہے۔ اور بادی النظر میں گنہگار کی لغزشوں پر ہنستا ہے۔ مگر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اس کی طبیعت با ریا پارسائی سے اُکتا کر کوئی تنوع چاہتی ہے۔ مگر اس وقت وہ حدت و حرارت جو محبت کی جان ہے۔ باقی نہیں رہتی یا اس کی کمزور فطرت ہر ایک گناہ کے اقدام سے ڈرتی ہے۔ اسی کیفیت کو شبلی نے بھی ایسے ہی موثر پیرائے میں بیان کیا ہے۔ ؎

دو دل بودن دریں رہ سخت تر عیبے ست سالک را
خجل گشتم ز کفر خود کہ دارد بوئے ایماں ہم

احساس ندامت کا تاثر پیدا کرنے کے لئے غالباً ظرافت سے بہتر کوئی حربہ نہیں۔ اور اکبر کی افتاد طبیعت سستم ظریفانہ ہے۔ وہ دوسروں کی بیوقوفی پر ہنستا ہے۔ مگر ضروری ہے کہ اکبر کی ہنسی کو سمجھنے کے لئے اس بات کی کوشش کی جائے کہ خود ہنسی کا راز کیا شے ہے۔ معمول ہے کہ ہر ایک قسم کی بدہیئتی کو دیکھ کر ہمیں خواہ مخواہ ہنسی آ جاتی ہے۔ کوئی شخص خلاف معمول لمبا ہو یا موٹا ہو تو اس کو دیکھ کر دل میں خواہ مخواہ ایک گدگدی سی ہوتی ہے۔ چنانچہ ماہرین نفسیات کا خیال ہے۔ کہ یہ اس زمانۂ جہالت کی یادگار ہے جب انسان بالکل وحشی تھا اور جنگلوں اور غاروں میں رہا کرتا تھا۔ ان دنوں وہ جنگجو اور ظالم تھا اور اپنے دشمنوں کو کسی خطرناک حربے سے قتل کر کے ان کی بدصورتی اور بدہیئتی پر ہنسنا اس کا دستور قانون التزام عواید مفیدہ کے زیر اثر انسان کی ہر ایک حرکت جو اس سے ظہور میں آیا کرتی تھی۔ جو کسی تکلیف کو رفع کرنے میں معاون تھی۔ نظام عصبی میں اس طرح جاگزیں ہو گئی۔ کہ اب ایتلاف افکار سے فوراً ہمارا نفس اپنے اوپر وہی مظاہر طاری کر لیتا ہے۔ جو زمانۂ گزشتہ میں کیا کرتا تھا۔

یہ تو ہوئی ہنسی کی حقیقت' اب دیکھنا یہ ہے کہ اکبر انسانی افعال و اعمال کی حماقتوں پر کس حیثیت سے نظر ڈال کر ہنستا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی شخص کی بدعادتیں چھڑوانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کا مضحکہ کیا جائے تاکہ وہ بار بار خیال کرتا رہے کہ مجھے اس بدعادت سے

ندامت حاصل ہوتی ہے۔ اکبر نے اسی اصول کو مد نظر رکھ کر ظرافت کا نمایاں پہلو اختیار کیا ہے لیکن اس کی ظرافت بالکل سطحی ہے۔ اس کے معانی بین السطور میں ہمدردی کا وہی جذبہ متحرک ہے جو ہر ایک بالغ نظر انسان کے دل میں ہونا چاہئے۔

جب جدید تہذیب کے تمام اثرات کو اپنی قوم کے لئے مضر سمجھ کر اس نے شروع ہی سے ان تمام رسوم کی مخالفت شروع کی تھی۔ جو مشرقی تمدن کے پرانے اصولوں سے متضاد تھے۔ اس کی قدامت پرستی کبھی اس بات کی روادار نہ ہو سکتی تھی۔ کہ وہ تمام باتیں جن کی وجہ سے دوسری شعلہ بہ پیراہن اقوام بدنام ہیں۔ ہندوستانیوں میں بھی رائج ہو جائیں۔ اس کا صدق دل سے یہی خیال تھا۔ کہ مغربی تمدن سے وہیں تک فایدہ اٹھایا جا سکتا ہے جہاں تک وہ مشرق کی تہذیب کو فنا نہ کر دے۔ جدید رنگ تعلیم سے جو نقصانات پیدا ہو سکتے ہیں۔ اکبر ان کا بخوبی اندازہ لگا چکا تھا۔ اور اس کا عقیدہ تھا۔ کہ مغربی تعلیم کی اندھا دھند تقلید۔ قوم کے نونہالوں کو فلسفہ اور الحاد کے خطرناک مسائل سے آشنا تو کر دیگی لیکن وہ نتائج جو اس تعلیم و تربیت سے پیدا ہو جانے ضروری ہیں ان کا علاج مغربی تعلیم کے بہترین ماہروں کے ہاں بھی نہیں۔ کیونکہ جن جذبات کی نشو و نما مشرقی فضا میں ہو رہی تھی۔ ان کے لئے عمل کا میدان کوئی بھی نہ تھا مغرب میں تو مغربی جذبات پھل پھول بھی سکتے ہیں۔ مگر مشرق ابھی ان اثرات کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں مغرب کی آزادیٔ خیال اور بے نیازی طریق مشرق کی پابند اور اسیر کیفیت میں حاصل نہیں ہو سکتی علیگڈھ کالج کی نسبت انہیں شبہات کو بیان کرتے ہوئے اپنی معمولی ظرافت سے کام لیکر کہتا ہے۔ ؎

خدا علیگڈھ کے مدرسے کو تمام امراض سے شفا دے
بھرے ہوئے ہیں رئیس زادے امیر زادے شریف زادے
لطیف و خوش وضع چست و چالاک و صاف و پاکیزہ شاد و خرم
طبیعتوں میں ہے ان کی جودت دلوں میں ان کے ہیں نیک ارادے
کمال محنت سے پڑھ رہے ہیں کمال غیرت سے بڑھ رہے ہیں
سوار مشرق کی راہ میں ہیں تو مغربی راہ میں پیادے
ہر اک ہے ان میں کا بیشک ایسا کہ آپ اسے چاہتے ہیں جیسا
دکھائے محفل میں قد رعنا جو آپ آئیں تو سر جھکا دے
فقیر مانگے تو صاف کہہ دیں کہ تو ہے مضبوط جا کما کھا
قبول فرمائیں آپ دعوت تو اپنا سرمایہ کل کھلا دے
بتوں سے ان کو نہیں لگاوٹ مسوں کی لیتے نہیں وہ آہٹ
تمام قوت ہے صرف خواندن نظر کے بھولے ہیں دل کے سادے
نظر بھی آئے جو زلف پیچاں تو سمجھیں یہ کوئی پالیسی ہے
الکٹرک لائٹ اس کو سمجھیں جو برق وش کوئی مسکرا دے
نکلتے ہیں کر کے غول بندی بنام تہذیب و دردمندی

یہ کہہ کے لیتے ہیں سب چندے ہمیں جو تم دو تمہیں خدا دے
انہیں اسی بات پر یقین ہے کہ بس یہی اصل کار دیں ہے
اسی سے ہوگا فروغ قومی اسی سے چمکینگے باپ دادے
مکان کالج کے سب مکیں ہیں ابھی انہیں تجربے نہیں ہیں
خبر نہیں ہے کہ آگے چل کر ہے کیسی منزل ہیں کیسے جادے
دلوں میں اُن کے ہے نور ایماں قوی نہیں ہے مگر نہادے
ہوائے منطق ادائے طفلی یہ شمع ایسا نہ ہو بجھا دے
فریب دے کر نکالے مطلب سکھائے تحقیر دین و مذہب
مٹا دے آخر کو وضع ملت نمود ذاتی کو گو بڑھا دے
یہی بس اکبر کی التجا ہے جناب باری میں یہ دعا ہے
علوم و حکمت کا درس اُن کو پروفیسر دیں سمجھ خدا دے

مغربی تعلیم نے پردے کی نسبت بھی لوگوں کے دلوں کو متاثر کرنا چاہا تھا۔ مگر اکبر نے اس کی بہت شدومد سے مخالفت کی۔ اور اگرچہ ہر طرف سے اس پر لعنت و ملامت کی بوچھاڑیں ہوئیں۔ مگر وہ اپنی دھن کا پکا یہی کہتا رہا کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ عورتوں کو پردے کی نسبت اتنی آزادی دے دی جاتی۔ تعلیم نسواں کی نسبت وہ خوشگوار خیالات رکھتا تھا۔ مگر اس کے ساتھ جو پردے کے اُٹھنے کی ضد تھی۔ وہ اس کو خطرناک محسوس ہوتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کی ظرافت کے بے پناہ تیر دلوں کو چھید ڈالتے تھے۔ کیونکہ خود اس کے کئی شعر شاہد ہیں کہ لوگ اس کے اس طرز عمل سے ناراض ہو کر اس سے بہت بُرا سلوک کرتے تھے۔ ایک شعر ہے کہ

حمایت پردے کی میں نے تو کی تھی خوش مزاجی سے
مجھے کھلوا رہے ہیں گالیاں وہ اپنی باجی سے

لیکن یہاں بھی اس کی طبعی ظرافت اس کو کبھی نہیں چھوڑتی۔ وہ احباب کو متاثر بھی کرنا چاہتا ہے۔ تو اسی طرح انکے اعمال و افعال پر ہنس ہنس کر۔

جو منہ دکھائی کی رسموں پہ ہے مصر ابلیس
چھپیں گی حضرت حوا کی بیٹیاں کب تک
عوام باندھ لیں دوہر کو تھرڈ و انٹر میں
سکنڈ و فسٹ کی ہوں بند کھڑکیاں کب تک
حرم سرا کی حفاظت کو تیغ ہی نہ رہی
تو کام آئینگی چلمن کی تیلیاں کب تک
یہ مانا حضرت اکبر ہیں حامیٔ پردہ
مگر وہ کب تک اور اُن کی رباعیاں کب تک

مغربی تمدن نے جس طرح عوام کو متاثر کیا ہے اور جس طرح ان کے تمام جذبات کو محکوم کر لیا ہے اس کے نتائج یہ ہوئے کہ وہ روایات جن سے مشرقی تمدن کا دم خم تھا سب مٹ گئیں۔ مشرقی تمدن کی نام نہاد سفاکی، جس سے ایک کا نقصان تو ہزار کا نفع ہوتا تھا۔ خود قوم

کے دلوں میں بُری گنی جانے لگی۔ اور انگریزی خواں لوگوں کے دل جو محض مغربی خیالات کے پروردہ تھے حقیقت میں یہ خیال کرنے لگے۔ اسلام بزورِ شمشیر ہی پھیلا تھا۔ اس تمام اضطراب کی وجہ اور اس کے نتائج کو نمایاں کرنے کے لئے اکبر نے برق کلیسا لکھی۔ طوالت کے خوف سے ہم اس کے کئی شعر حذف کر کے چند ایک شعر نقل کرتے ہیں کیونکہ یہ نظم مقبول عام ہو چکی ہے ؎

ہم میں باقی نہیں اب خالدِ جانباز کا رنگ
دل پہ غالب ہے فقط حافظِ شیراز کا رنگ
یاں نہ وہ نعرۂ تکبیر نہ وہ جوشِ سپاہ
سب کے سب آپ ہی پڑھتے ہیں سبحان اللہ
جوہرِ تیغ مجاہد ترے ابرو پہ نثار
نورِ ایماں کا ترے آئینہ رو پہ نثار
اُٹھ گئی صفحۂ خاطر سے وہ بحثِ بد و نیک
دو دِلے ہو رہے ہیں کہتے ہیں اللہ کو ایک
موجِ کوثر کی کہاں اب ہے مرے باغ کے گرد
مَیں تو تہذیب میں ہوں پیرِ مغاں کا شاگرد
مجھ پہ کچھ وجہ عتاب آپ کو ایجان نہیں
نام ہی نام ہے ورنہ مَیں مسلمان نہیں
جب کہا صاف یہ مَیں نے کہ جو ہیں صاحبِ فہم
تو نکالو دلِ نازک سے یہ شبہ یہ وہم

مرے اسلام کو اک قصۂ ماضی سمجھو
ہنس کے بولی کہ تو پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو

محبّت کے تمام لوازمات میں سے رشک و رقابت ہی ایک ایسا جذبہ ہے جس کی مخلوط حیثیتوں نے شاعروں کو ہمیشہ ایک گورکھ دھندے میں مبتلا رکھا ہے۔ ماہرینِ نفسیات اس کی تحلیل یوں کرتے ہیں۔ کہ رشک ہمیشہ دو انفرادی جذبات کے تابع ہوتا ہے۔ رنج اور خوف۔ جب کسی محبوب ملکیت کی نسبت یہ خوف پیدا ہونے لگتا ہے۔ کہ وہ کسی دوسرے کے قبضے میں چلی جائیگی۔ تو جس وقت یہ خوف کوئی مستقل اور معروف شکل اختیار کر لے۔ رشک کے جذبے کی تخلیق ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک عاشق اپنے معشوق کی نسبت ذرا سا رقابت کا شبہ بھی گوارا نہیں کر سکتا محبّت جسقدر مضطرب اور دیوانہ وار ہوتی چلی جائیگی۔ اُسی مقدار سے رشک کے مدارج احساس بھی بڑھتے چلے جائینگے۔ جہاں محبّت زیادہ ہوگی وہیں شکایت اور اسی قسم کے فرعی جذبات بھی ہمرکاب ہونگے۔ صرف یہی حسیات کی نزاکت و لطافت اس حقیقت ثابتہ کی مظہر ہوتی ہے کہ رشک کرنے والے شخص کے دل میں محبّت کا ایک سمندر موجزن ہے۔ پھر رشک کچھ انہیں چیزوں سے نہیں پیدا ہوتا۔ جو محبوب کی جدائی پر اختیار رکھتی ہوں۔ بلکہ محض محبوب کی جدائی کے خیال کے ساتھ اگر کسی اور شخص کا بھی

خیال آجائے جس کی نسبت یہ شبہ ہو کہ شاید وہ فرقت کا باعث ہوگا تو خواہ مخواہ رشک کا جذبہ مشتعل ہو جاتا ہے۔ مگر عام طور پر یہ حالت سوسائٹی کے اسفل ترین گروہ کی ہو جاتی ہے۔ ورنہ مہذب افراد جن میں شاعر اپنی کیفیات کی لطافت و نفاست کی وجہ سے ممتاز ترین شخصیت ہے۔ اس قسم کے رشک سے گریز کرتے ہیں جس میں ابتذال کا شائبہ ہو کیونکہ محبوب کی ہر ایک بات پر شبہ کرنا' اور بے سبب اس شبے کی سست بنیاد پر رشک و رقابت کی ایک سربفلک دیوار کھڑی کر دینا مذاقِ سلیم سے دور۔ اور ابتذالِ فطرت کی نشانی ہے لیکن یہ کلیہ شاعروں پر صادق نہیں آتا۔ انہیں دنیا کی ہر ایک چیز سے عداوت ہے ہوا محبوب کی زلفوں کو بکھرا کر ان سے اٹھکھیلیاں کرتی ہے۔ سورج کی شعاعیں تارِ نقاب بن بن کر روئے صبیح کے بوسے لیتی ہیں۔ معنبر و معطر لباس ہمیشہ جسم نازنین کو چھوتا رہتا ہے خاکِ راہ ہر وقت قدمبوسی کرتی رہتی ہے۔ گلہائے چمن کو محبوب کے سیمین قدموں سے پامال ہونے کا فخر حاصل ہے۔ مگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا۔ کہ ان تمام باتوں سے رشک کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ جذبہ رشک کا اہم تر عنصر یعنی ان کے محبوب کی جدائی کا باعث ان میں کوئی بھی نہیں۔ اور اس عنصر کے بغیر یہ جذبہ حقیقت میں تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا۔ شاعروں کی مبالغہ آمیزی اور

قوتِ احساس کی رواداری کا لحاظ رکھتے ہوئے بھی کہنا پڑتا ہے۔ کہ سوائے چند شاعروں کے جن کی مثال النادر کالمعدوم کی سی ہے۔ ہر ایک نغزگو نے اسی طرح کی بے حقیقت چیزوں کی وجہ سے رشک کے صدمے اٹھائے ہیں۔ اس کے معاصرین کا تو کیا ذکر کہ وہ اس کی شان کے آگے کچھ وقعت ہی نہیں رکھتے۔ خود غالب نے جو نفسیاتِ جذبات پر اتنی قدرت رکھتا۔ جگہ جگہ اس قسم کے جذبات ظاہر کئے ہیں۔ مثلاً ؎

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

آتا ہے میرے قتل کو پر جوشِ رشک سے
مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

الجھا ہوا نقاب میں ہے ان کی ایک تار
ڈرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

اس جذبے کی تحلیل کی بہترین مثالیں آپ کو میر کے ہاں ملینگی۔ اور پھر یہ بات بھی ہے کہ کونسا ایسا جذبہ ہے جس کو میر نے بہترین طریق سے ادا نہ کر دیا ہو لیکن اکبر نے بھی جس حسنِ بیان و اسلوب سے اس جذبے

کی تشریح کی ہے۔ وہ بھی کچھ کم نہیں۔ اس نے ہر جگہ اس بات کا خیال رکھا ہے کہ رشک کے لئے کافی سے زیادہ وجوہات موجود ہوں۔ تاکہ سامع کے ذہن پر وہی نقوش تاثر ثبت ہو جائیں۔ جن کی وہ ترجمانی کرنا چاہتا ہے۔ چند ایک شعر سُنئے۔ ے

وہی مَیں ہوں کہ غیروں کو وہاں آنے نہ دیتا تھا
وہی میں ہوں کہ پہروں منتیں کرتا ہوں درباں کی

رشک آتا ہے جو تکیے پہ وہ سر رکھتے ہیں
صاحبِ حس نہ کہیں ہو مرے زانو کی طرح

غیروں کو اپنے ہاتھ سے ہنس کر کھلا دیا
مجھ سے کبیدہ ہو کے کہا پان لیجئے

وہ جانتے ہیں غیر مرے گھر میں ہے مہماں
آئینگے تو مجھ پر کوئی احسان نہ کریں گے

مَیں کیا ہوں خوش اگر ان کو رہی نہ الفتِ غیر
ملینگے اس سے محبت اگر نہیں بھی رہی

صبا بھی اس گل کے پاس آئی تو جیسے دل کو ہوا یہ کھٹکا
کوئی شگوفہ نہ یہ کھلائے۔ پیام لائی نہ ہو کہیں کا

اب مَیں اس مضمون کو اکبر کے چند منتخب اشعار پر ختم کرتا ہوں۔ جن سے اس کے اخلاقیات کے نقطۂ نگاہ کا اندازہ بخوبی ہو سکیگا۔ ے

جو اپنی زندگانی کو حباب آسا سمجھتے ہیں
نفس کی موج کو موجِ لبِ دریا سمجھتے ہیں

گواہی دینگے روزِ حشر یہ سارے گناہوں کی
سمجھتا مَیں نہیں لیکن مرے اعضا سمجھتے ہیں

شریکِ حال دُنیا میں نظر آتا نہیں کوئی
فقط اک بےکسی ہے جس کو ہم اپنا سمجھتے ہیں

جو ہیں اہلِ بصیرت اس تماشاگاہِ ہستی میں
طلسمِ زندگی کو کھیل لڑکوں کا سمجھتے ہیں

عابد

غزل

دل کو غریقِ بحرِ محبت بنا دیجے
ناکامیوں پہ دل کی دمِ سرد کھینچئے

نالوں سے کیجئے تہ و بالا پھر اک جہاں
جاں کیوں نہ شرمِ دوست پہ کر دیجئے نثار

رنج و الم سے بیٹھ گیا دل ہزار بار
اِک اِک لہو کی بوند سے طوفاں اٹھائیے

دوشِ صبا پہ میّتِ ارماں اٹھائیے
پھر آج سر پہ کوہ و بیاباں اُٹھائیے

کیوں جنبشِ نگاہ کا احساں اُٹھائیے
کب تک جلیل اب غمِ ہجراں اٹھائیے

جلیل

عارف

(آسکر وائلڈ کی ایک نظم منثور کا ترجمہ)

بچپن ہی سے اس کے انداز اللہ والے لوگوں کے سے تھے۔ اور ابھی وہ نوعمر لڑکا ہی تھا۔ کہ بڑے بڑے اولیا۔ اللہ اور بعض مقدس عورتیں جو اس کی پیدائش کے آزاد شہر میں رہتی تھیں۔ اُس کے جوابوں کی عارفانہ سنجیدگی سے حیرت میں آجاتی تھیں۔

اور جب اُس کے ماں باپ اُسے جوانی کا جنیو پہنا چکے۔ تو اس نے اُنہیں الوداعی بوسہ دیا۔ اور گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ کہ دُنیا میں جاکر دُنیا والوں کو خدا کی باتیں بتائے۔ کیونکہ اُس زمانے میں ایسے لوگ بے شمار تھے۔ جنہیں یا تو سرے ہی سے خدا کا کچھ علم نہ تھا۔ یا تھا تو ادھورا اور ناقص۔ اور وہ اُن مصنوعی دیوتاؤں کو پوجتے تھے۔ جو عیش باغوں میں رنگ رلیاں منایا کرتے ہیں۔ اور اپنے پرستاروں کی مطلق خبر نہیں لیتے۔

اور اُس نے سُورج کو اپنا رہنما بنایا۔ اور اپنے سفر پر چل دیا۔ ننگے سر ننگے پاؤں، جس طرح اُس نے اکثر درویشوں کو جاتے دیکھا تھا۔ اور ایک چمڑے کی خرجین اور ایک مٹی کا برتن کھانے پینے کی چیزوں سے بھر کر کاندھوں پر لٹکا لیا۔

اور جب وہ شاہراہ پر جا رہا تھا۔ تو اس کا سینہ اُس خوشی سے بھرپور تھا۔ جو صرف خدا کے پورے پورے علم سے حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ خدا کی حمد و ثنا میں گیت پر گیت گاتا چلا جاتا تھا۔ تا آں کہ وہ ایک نئی سرزمین میں جا نکلا۔ جہاں چپے چپے پر شہر آباد تھے۔

اور وہ یکے بعد دیگرے گیارہ شہروں میں سے گزرا۔ اُن میں سے بعض شہر وادیوں میں آباد تھے۔ اور بعض چوڑے چکلے دریاؤں کے کنارے اور باقی پہاڑوں کی چوٹیوں پر، ہر شہر میں اُسے کوئی نہ کوئی شخص ایسا ضرور مل گیا۔ جس نے اس کی تعلیم پر ایمان لاکر اُس سے پیمانِ ارادت باندھا۔ اور شہر میں سے لوگوں کا ایک بڑا گروہ اس کی پیروی اختیار کر کے اُس کے ساتھ ہولیا۔ اس طرح خدا کا علم مُلک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گیا۔ اور بہت سے حکمران بھی ایمان لائے۔ اور بتکدے کے مہنتوں نے دیکھا کہ اُنکی آمدنی

نصف سے بھی کم رہ گئی ہے۔ اور جب وہ دوپہر کے وقت اپنے سنکھ بجاتے، تو گنتی کے چند لوگ قربانی کے مور اور چڑھاوے کا گوشت لے کر نذر و نیاز کی قدیم رسم کے نباہنے کو آتے۔

لیکن باوجود اس بات کے کہ لوگ تابڑ توڑ اس کے معتقد بنتے جاتے تھے۔ اور اس کے شاگردوں کی تعداد دن دونی رات چوگنی بڑھتی جاتی تھی۔ اُسے اپنے دل میں ایک غم سا محسوس ہوتا تھا۔ جو ہر لحظہ ترقی کرتا جاتا تھا۔ اور وہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ کہ اُس کے دل میں یہ غم کیسا ہے۔ کیونکہ وہ تو ہمیشہ بھولی بھٹکی روحوں کو سیدھی راہ دکھاتا تھا۔ اور علمِ الٰہی کے ان بھرے خزانوں سے جو خود خُدا نے اُسے بخشے تھے۔ حاجتمندوں کی جھولیاں بھرتا تھا۔

اور ایک شام وہ گیارھویں شہر میں سے نکلا۔ جو کہ آرمینیا کا ایک شہر تھا۔ اور اُس کے شاگردوں اور پیروؤں کا ایک بڑا گروہ اُس کے ہمراہ تھا۔ اور وہ ایک پہاڑ پر چڑھ کر ایک چٹان پر بیٹھ گیا۔ اور اُس کے شاگرد اس کے اردگرد حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے اور باقی لوگ وادی میں مؤدبانہ دوزانو ہو گئے۔

اور اُس نے ہاتھوں میں اپنا سر پکڑ لیا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ اور اپنی رُوح سے پُوچھا۔ "مجھ پر یہ رنج اور خوف کیوں چھایا ہے۔ اور کیوں مجھے اپنا ہر شاگرد ایک دشمن نظر آتا ہے؟"

اور اُسکی رُوح نے جواب دیا۔ "خدا نے تجھے اپنے علم کی دولت ودیعت کی۔ اور تو نے امانت میں خیانت کر کے لُٹا ہر کس و ناکس کو دیدیا ہے۔ اس انمول موتی کو تو نے ریزہ ریزہ کر دیا ہے۔ اور اس خلعتِ فاخرہ کی تو نے دھجیاں اُڑا دی ہیں۔ وہ جو اپنی عقل و دانش اوروں کو دے دیتا ہے۔ اپنی چوری آپ کرتا ہے اُس کی مثال عین اُس شخص کی ہے۔ جو اپنے ہاتھوں اپنے مال و ملک کو چوروں کے سپرد کر دے۔ کیا تو یہ سمجھتا ہے۔ کہ خدا تجھ سے زیادہ دانا نہیں ہے؟ تو کون ہے کہ اس راز کو جو خدا نے تجھ پر ظاہر کیا ہے۔ تو جابجا رسوا کرتا پھرے؟ ایک وقت تھا۔ جب میں دولت [illegible] سے مالامال تھی۔ اب تو نے مجھے نادار کر دیا ہے۔ کبھی [illegible] اُسے دیکھتی تھی۔ اور اب تو نے اُسے [illegible]"

اور وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ کیونکہ وہ [illegible]

اس کی رُوح سچ کہہ رہی ہے۔ بیشک اس [illegible]

خدا کا علم دے دیا تھا۔ اور اب وہ پہلے کی طرح [illegible]

مقرّبانِ منظور میں نہ تھا۔ اور اُس کا دل [illegible]

خالی ہوا چاہتا تھا۔ کیونکہ اُسنے اُسکے حصّے بخرے [illegible]

اور اُس نے اپنے آپ سے کہا۔ " [illegible]

کی باتیں نہ بتاؤنگا۔ وہ جو اپنی عقل [illegible]

دیتا ہے۔ اپنی چوری آپ [illegible]

اور کچھ عرصے کے بعد اُس کے شاگرد اُسکے پاس آئے
اور زمین بوس ہو کر عرض کرنے لگے "اے ہمارے پیر طریقت
ہمیں خدا کی باتیں بتا۔ کیونکہ تجھے خدا کا پُورا پورا علم حاصل
ہے۔ اور دُنیا میں کسی دوسرے کے پاس یہ شے نہیں ہے"۔
اور اُسنے اُنہیں جوابدیا "میں تم سے زمین و آسمان کی ہر چیز
کا ذکر کرونگا۔ لیکن تمہیں خدا کی باتیں نہ بتاؤنگا نہ اب اور نہ
کبھی، میں تمہیں خدا کی باتیں بتاؤنگا"۔
اور اُنہوں نے خفگی کا اظہار کیا اور اُس سے کہا "تو
ہمیں اس بیٹلے بیابان میں لے آیا ہے کہ ہم تیری باتیں سُنیں
کیا تو ہمیں بھوکا پیاسا گھر لوٹا دیگا۔ اور لوگوں کے اس بڑے گروہ کو
بھی جو تیرے کہنے کے مطابق تیرے ساتھ یہاں آیا ہے؟"
اور اُسنے اُنہیں جوابدیا "میں تمہیں خدا کی باتیں نہ بتاؤنگا"۔
اور لوگوں کا گروہ بڑبڑاتا تھا۔ اور اُس سے کہتا تھا "تو ہمیں
اس بیٹلے بیابان میں لے آیا ہے۔ اور ہم بھوکے ہیں ہمیں
خدا کی باتیں بتا۔ اسکے سوا ہم کچھ نہیں چاہتے"۔
لیکن اسنے جواب میں ایک حرف نہ کہا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر
وہ اُنہیں خدا کی باتیں بتائیگا تو اپنا خزانہ لٹا دیگا۔
اور اُسکے شاگرد مغموم و ملول واپس چلے گئے۔ اور لوگوں کا گروہ
اپنے اپنے گھروں کو لوٹا۔ اور بہت سے لوگ راہ ہی میں مر گئے۔
اور جب وہ [illegible] گیا تو وہ اُٹھا اور اس نے چاند کو
[illegible] مہینوں تک سفر کرتا رہا۔ اس اثنا
میں اُس نے کسی سے بات نہ کی۔ نہ کسی کے سوال کا جواب دیا۔
بس اپنے کام سے کام رکھا۔ اور جب ساتویں مہینے کا چاند
غروب ہو گیا۔ تو وہ اُس صحرا میں پہنچا۔ جس پر دریائے اعظم اپنی
ریت کا فرش بچھاتا ہے۔ اور وہاں اُسے ایک غار ملا جس میں
پہلے ایک سنٹار[1] رہتا تھا۔ اُس نے اسے اپنے رہنے کا مکان
بنا لیا۔ اور اپنے لئے گھاس کے تنکوں کی ایک چٹائی تیار
کی۔ اور پورا پورا بن باسی فقیر بن گیا۔ اور دن کے ہر لمحے میں
یہ فقیر خدا کا شکر ادا کرتا کہ اُس نے اپنی عظمت و جبروت کا
کچھ علم اُس کے سینے میں محفوظ رہنے دیا تھا۔
ایک شام کا ذکر ہے۔ کہ فقیر اُس غار کے مُنہ کے سامنے
جسے اُس نے اپنے رہنے کا مکان بنا لیا تھا۔ بیٹھا
تھا کہ اُسے ایک نوجوان نظر پڑا۔ جس کے خوبصورت چہرے
سے بدمعاشی کے آثار نمایاں تھے۔ اور جو پھٹے پرانے کپڑے پہنے
خالی ہاتھ اُدھر سے گزر رہا تھا۔ ہر شام وہ نوجوان خالی ہاتھ
اُدھر سے گزرتا اور ہر صبح ہاتھوں میں زر و جواہر کی تھیلیاں
لئے ہوئے واپس آتا۔ کیونکہ وہ ایک چور تھا اور سوداگروں
کے کاروانوں کی چوری کرتا تھا۔
اور فقیر اُسے دیکھتا تھا۔ اور اس کی حالت پر رحم کھاتا لیکن
اُسنے کبھی ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا
کہ وہ جو ایک لفظ بھی بولتا ہے اپنی دولت ایمان سے ہاتھ دھو
بیٹھتا ہے۔

[1] [illegible] خیالی جاندار جس کا سر انسان کا اور باقی جسم گھوڑے کا ہوتا تھا۔

"اور ایک صبح جب وہ نوجوان زر و جواہر کی تھیلیاں ہاتھوں میں لئے ہوئے۔ واپس آیا تو وہ غار کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ اور تیوری چڑھا کر اور غیظ و غضب سے زمین پر پاؤں مار کر فقیر سے بولا۔ "جب میں یہاں سے گزرتا ہوں تم کیوں مجھے اس انداز سے دیکھتے ہو؟ مجھے بتاؤ۔ مجھے تمہاری ان آنکھوں میں کیا نظر آتا ہے؟ اس سے پہلے کبھی کسی نے مجھے اس انداز سے نہیں دیکھا۔ اور تمہارا اس طرح دیکھنا مجھے کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔"

اور فقیر نے جواب دیا۔ "جو کچھ تمہیں میری آنکھوں میں نظر آتا ہے۔ ہاں وہ رحم ہے۔ جو تم میری آنکھوں میں دیکھتے ہو۔"

اور نوجوان حقارت کی ہنسی ہنسا' اور ایک درشت لہجے میں فقیر سے بولا۔ "میرے ہاتھوں میں زر و جواہر کی تھیلیاں ہیں' اور تمہارے پاس کیا رکھا ہے؟ یہ تنکوں کی دقیانوسی چٹائی؟ تم مجھ پر کیا رحم کرو گے؟ ہاں کہو تمہیں مجھ پر کیوں رحم آتا ہے؟"

فقیر نے جواب دیا۔ "مجھے تم پر اس لئے رحم آتا ہے کہ تم خدا کے علم سے محروم ہو۔"

نوجوان نے پوچھا۔ "کیا یہ خدا کا علم کوئی چیز ہے؟" اور وہ غار کے منہ کے قریب آگیا۔

فقیر نے جواب دیا۔ "یہ دنیا کے تمام زر و جواہر سے زیادہ قیمتی ہے۔"

نوجوان چور نے پوچھا۔ "اور وہ تمہارے پاس ہے؟" اور وہ اور بھی قریب آگیا۔

فقیر نے جواب دیا۔ "ہاں ایک وقت تھا کہ مجھے خدا کا پورا پورا علم حاصل تھا لیکن میں نے بیوقوفی کی کہ اس کے حصے بخرے کر دیئے۔ پھر بھی لے دے کر میرے پاس جو علم رہ گیا ہے میں اُس کو دنیا کے تمام زر و جواہر سے قیمتی سمجھتا ہوں۔"

اور جب نوجوان چور نے یہ سُنا تو اُس نے زر و جواہر کی تھیلیاں پھینک دیں' اور ایک تیز دھار کی خمدار تلوار سوت لی اور للکار کر بولا۔ "ابھی یہ علم جو تمہارے قبضے میں ہے' مجھے دیدو۔ ورنہ میں تمہیں یقیناً قتل کر دونگا۔ میں کیوں اُس شخص کو قتل نہ کروں جس کے پاس مجھ سے زیادہ خزانہ ہے؟"

اور فقیر نے اپنا سینہ کھول کر آگے کر دیا۔ اور بولا۔ "میرے لئے اس سے بہتر کیا ہوگا کہ میں مر کر خدا کے حضورِ خاص میں باریاب ہو جاؤں۔ اور اُس کے قریب جا کر اُس کی حمد و ثنا کے گیت گاؤں؟ اس کے علم کے بغیر میں اس دنیا میں رہ کر کیا کرونگا؟ ہاں آؤ مجھے مار ڈالو لیکن یہ کبھی نہ ہوگا کہ میں تمہیں خدا کا علم دیدوں۔"

اور نوجوان چور نے گھٹنے ٹیک کر اس سے التجا کی لیکن فقیر نے اُس کی ایک نہ مانی' اور اُسے خدا کی باتیں نہ بتائیں' پس نوجوان چور اُٹھا۔ اور فقیر سے بولا۔ "اچھا' تمہاری مرضی پھر نہ کہنا' میں سات گناہوں کے شہر میں جاتا ہوں۔ وہ

اور منا دن میں وہاں پہنچ جاؤنگا۔ اور وہاں میرے سونے رسلے مجھے عیش ملیگا۔ اور میرے جواہر کے عوض بخوشی سے مَیں نے زرد جواہر کی تھیلیاں اُٹھالیں۔ اور تیزی سے بھاگنا شروع کر دیا۔

اور فقیر نے پکار پکار کر اُس سے التجائیں کی' اور اس کے پیچھے بھاگا۔ تین دن تک وہ نوجوان چور کے پیچھے بھاگتا رہا۔ اور اُس سے التجائیں کرتا رہا۔ کہ وہ واپس آجائے اور اُس خطرناک شہر میں قدم نہ دھرے۔

اور بار بار نوجوان چور پیچھے مڑکر دیکھتا' اور فقیر سے پُوچھتا۔ "کیا تم مجھے خُدا کا علم دے دوگے' جسے تم زرد جواہر سے بھی زیادہ قیمتی بتلاتے ہو؟ اگر تم یہ مجھے دیدوگے' تو مَیں اُس شہر میں قدم نہ دھرونگا۔"

اور ہر بار فقیر جواب دیتا۔ "تمام چیزیں جو میرے پاس ہیں۔ مَیں تمہیں دے دُونگا۔ ایک نہیں تو خُدا کا علم۔ کیونکہ اُس چیز کا دے دینا مجھے واجب نہیں۔"

اور تیسرے دن' جب سُورج غروب ہو رہا تھا وہ شہر کے سرخ دروازوں کے قریب پہنچ گئے اور شہر کے اندر سے قہقہوں کی آواز آتی تھی۔

اور نوجوان چور نے جواب میں ایک قہقہہ لگایا۔ اور دروازہ کھٹکھٹانا چاہا۔ وہ یہ کیا ہی چاہتا تھا۔ کہ فقیر دوڑکر اُس کے پاس پہنچا۔ اور اس کے پیراہن کا دامن پکڑکر اُس سے بولا:-

"اپنے ہاتھ پھیلادو۔ اور اپنی باہیں میرے گلے میں ڈال دو۔ اور اپنے کان میرے ہونٹوں سے لگادو۔ اور مَیں تمہیں اپنا رہا سہا علم دیدوں گا۔"

اور نوجوان چور رُک گیا۔

اور جب فقیر خدا کا علم نوجوان چور کو دے چُکا۔ تو وہ زمین پر گر پڑا۔ اور پھُوٹ پھُوٹ کر رویا۔ اور ایک گھٹا ٹوپ تاریکی نے شہر اور چور کو اُس کی نظروں سے چھپا دیا۔

اور جب وہ اس عالم میں رو رہا تھا اُس نے دیکھا کہ کوئی اُس کے پاس کھڑا ہے۔ اور وہ جو اُسکے پاس کھڑا تھا' اُس کے پاؤں پیتل کے تھے۔ اور اُس کے بال ملائم اُون کی طرح۔ اور اُس نے فقیر کو زمین پر سے اُٹھایا' اور اُس سے کہا۔

"اس سے پیشتر' تو خدا کا عارف تھا۔ جا' اب تو خدا کا عاشق ہے۔" اور اُس نے فرطِ شفقت سے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

(آسکر وائلڈ)

محمد ہادی حسین

ہے؟"

چندن ہار

راکا پُور اُپورا

۱۹۱۸ء میں میں گورنمنٹ کالج لاہور کی بی۔ اے کلاس میں تعلیم پاتا تھا۔ یہ کہنے میں مجھے ذرا بھی تامل نہیں کہ کالج کے امتحانوں کے نتیجے جب دیواروں پر لگتے تو اس فہرست میں میرا نام زیر پا یوں بلکہ اکثر اوقات زیر دو زہوا کرتا تھا۔ لیکن چونکہ میں کالج کی دلچسپیوں میں معتد بہ حصّہ لیتا۔ اور اپنے لباس وغیرہ کی نفاست کے باعث کالج کی نمایاں ہستیوں میں شمار ہوتا تھا۔ اس لئے پروفیسروں اور طلباء میں یکساں ہر دلعزیز تھا۔ میرے دوست میری تعلیمی کمزوری کو میرے دوسرے مشاغل سے جنہیں وہ کالج کی زندگی کا ضروری جزو خیال کرتے تھے۔ منسوب کرنا مناسب سمجھتے۔ پروفیسر گو مجھے تعلیم کی طرف توجہ کرنے کی نصیحت کرتے۔ تاہم انہیں بھی میری ذہانت کا اعتراف تھا۔ اور وہ میری کمزوری کو "انتخاب مضامین" کی غلطی قرار دیا کرتے تھے۔ اور میرے والدین اور بزرگوں کے تمول اور بےفکری کے لئے تو یہ باتیں اس قدر معمولی تھیں کہ وہ انہیں نظرانداز کر دیتے تھے۔ ان حالات میں میرے لئے اپنی تعلیم کی طرف توجہ کرنے کی کوئی خاص وجہ نہ تھی۔

میں ذہین ضرور تھا۔ مگر ذہانت کو مناسب طریق سے حصول تعلیم پر صرف نہ کیا جاتے۔ تو وہ امتحان میں کامیابی کی ضامن نہیں ہو سکتی۔ اور اس میں کسے شبہ ہو سکتا ہے کہ لائق سے لیکر غبی طلباء تک ہر ایک یکساں طور پر امتحان میں کامیاب ہونے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ ذرائع اور سعی حصول کا سوال علیحٰدہ ہے۔

آخر جب امتحان سر پہ آپہنچا تو میں نے مناسب سمجھا کہ اب کتابیں بازار سے خرید لوں۔ یہ ارادہ کچھ کامیابی کی امید میں نہ تھا۔ اور نہ بظاہر کامیابی کا کوئی امکان ہی تھا۔ اسکی وجہ صرف یہ تھی۔ کہ اب مجھے اپنی بیفکریاں خود بخود کچھ بےوقت کا سا راگ معلوم ہونے لگی تھیں۔ دوسرے اس وقت کی وقت گردانی کے بعد کی ناکامی کو یونیورسٹی کی ناانصافی سے بہ آسانی منسوب کر سکتی تھی۔ تیسرے حسن اتفاق بھی میری رائے میں ایک خاص چیز تھی۔

میں نے تمام دلچسپیوں سے دامن چھڑا کر جب کتابوں سے ناتہ جوڑنا چاہا تو دو سال کی میٹھی نیند اور بےفکری کے قہقہوں کی قیمت معلوم ہوئی۔ مگر میں اس قلیل جماعت کا فرد نہ تھا جو ماضی کے تجربات سے حال میں فائدہ اٹھاتی ہے۔ میرے نزدیک ماضی سے مستقبل میں مستفید ہونا زیادہ آرام دہ

اور مناسب تھا۔

ربما کہتے یا بعض عزیزوں اور دوستوں کے اصرار کیوجہ سے میں نے پروفیسر گھوش سے ان کے مکان پر پڑھنا شروع کر دیا۔ میں ہر روز شام کو ان کے گھر چلا جاتا۔ پروفیسر صاحب ہر فن مولا تھے۔ انگریزی اور فلسفہ تو بآسانی اور فارسی کچھ مطالعہ کرنے کے بعد پڑھا دیا کرتے۔ میں باری باری ہر روز یہ مضامین ان سے پڑھا کرتا تھا۔

پروفیسر صاحب نے شہر سے باہر ایک مکان لے رکھا تھا۔ گھر کے لوگوں کو کہیں بنگال کے دیہات میں چھوڑ آئے تھے۔ اور یہاں صرف ایک نوکر کے ساتھ تنہا رہتے تھے۔ اگر رنگت سے قطع نظر کر لینا ناظرین کے لئے مشکل نہ ہو تو میں یقین دلاتا ہوں۔ کہ پروفیسر صاحب بہت خوبصورت تھے۔ قد کے اچھے لمبے اور جسم کے بھاری تھے۔ لباس کی چنداں پروا نہ کرتے تھے۔ ان کی پتلون اور کوٹ کی آستین ان کے گھٹنوں اور کہنیوں کے مدور ہونے کا ثبوت تھیں۔ نکٹائی شرماتی ہوئی کالر میں ایک طرف کو منہ چھپاتے رکھتی تھی۔ موزے وہ سیاہ رنگ کے استعمال کرتے تھے۔ اس لئے اگر کبھی وہ بیٹھے ہوئے بھی ہوتے تو اس عیب کا معلوم کرنا کچھ آسان نہ ہوتا تھا۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ یہ تمام باتیں پروفیسر صاحب کی شگفتہ مزاجی اور ظرافت سے ویسی ہی نسبت رکھتی تھیں۔ جیسے کسی ایکٹر کا مضحکہ لباس اس کے پارٹ کے ساتھ مل کر سونے پر سہاگے کا کام کرتا ہے۔

پروفیسر صاحب اپنی زندگی کا وافر حصہ تعلیمی مشغول میں صرف کر چکے تھے۔ اور نہ صرف قابل ہی تھے۔ بلکہ طلباء کے فطرت شناس اور بہت بڑے نباض تھے۔ یہ ان ہی کی شکر میں لپٹی ہوئی کونین کی گولیاں تھیں۔ جو میں ہضم کر سکا۔

(۲)

میں حسب معمول ایک روز شام کو پڑھنے کے لئے گیا تو دیکھا کہ پروفیسر صاحب کو کوچ پر لیٹے ہوئے اخبار بینی کے مرغوب شغل میں نہیں۔ بلکہ مکان کے باہر برآمدے میں نہایت بے چینی سے ٹہل رہے ہیں۔ میں آگے گیا۔ تو وہ بولے۔ "آج تم کو نہ پڑھا سکونگا"

میں نے ان کا چہرہ پریشان دیکھ کر پوچھا "خیر باشد؟"

کہنے لگے۔ کہ "رات میرے گھر میں چوری ہو گئی"

میں نے گھبرا کر پوچھا کیا چیز چوری ہو گئی؟

پروفیسر صاحب گردن اونچی کر کے یا ادھر اُدھر موڑ کر سڑک کی طرف اس طرح دیکھ رہے تھے۔ جیسے کسی کا انتظار کر رہے ہوں۔ ایک بے خبری کے عالم میں بولے۔ "میری بیوی نے —— وہ —— اس نے اپنی ہیلی کا چندن ہار مجھے دیا تھا۔ کہ بکوا دوں۔ بدمعاش جگو لیکر

سے نکل بھاگ گیا"

میں نے حیران ہو کر پوچھا "جگو! یہ آپ کا ملازم؟"

"جی ہاں۔ وہی بدمعاش کمبخت بچپن سے ہمارے ہاں پلا بڑھا۔ برباد کر گیا!"

میں نے پوچھا "پولیس میں رپورٹ کر دی آپ نے؟"

"رپورٹ تو کر دی مگر پولیس ہر چوری کا سراغ تھوڑا ہی لگا دیتی ہے۔"

پروفیسر صاحب ابتک بہت اضطراب کی حالت میں سڑک کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ چونکہ اپنے اضطراب کو چھپانے میں کچھ ... ط نظر نہ آتے تھے مجھے پوچھنے کی جرأت ہوئی۔ "آپ اس وقت کسی کے منتظر ہیں؟"

"ہاں یہاں میرے ایک پرانے شاگرد مسٹر عثمان رہتے ہیں۔ جرائم کے متعلق ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ اور ان کو اس قسم کی تحقیقات کا شوق بھی بہت ہے۔ پولیس کی امداد کے بغیر وہ کئی مقدمات کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ آج کالج سے اٹھ کر میں ان کے ہاں بھی گیا تھا۔ اس وقت وہ آنے والے ہیں۔ انہیں کا انتظار ہے۔"

پولیس کی امداد کے بغیر کسی جرم کا سراغ نکالنا ہندوستان میں بالکل نئی نہیں۔ تو کچھ عام بات بھی نہ تھی۔ سراغرسانی کے متعلق میں نے انگریزی میں سے انگریزی میں جو افسانے پڑھ رکھے تھے۔ ان کی دلچسپیوں نے مجھے گھیر لیا۔ اور میں یہ کہنے ہی والا تھا۔ "اگر مضائقہ نہ ہو۔ تو میں بھی مسٹر عثمان کو دیکھ لوں۔" لیکن اتنے ہی میں پروفیسر صاحب "وہ آئے" کہہ کر جلدی سے برآمدے میں سے اتر کر باہر سڑک پر چلے گئے۔ سامنے سے ایک نوجوان چلا آ رہا تھا۔ ایک نہایت عمدہ تراش کا چسٹر جس کے نیچے سے پتلون دکھائی دے رہی تھی۔ نرم ترکی ٹوپی۔ عینک۔ اور اسکارف اس کے لباس میں نمایاں چیزیں تھیں۔ ہاتھ میں ایک موٹی سی چھڑی اور منہ میں سگار تھا۔

عثمان دیکھنے میں سراغرساں سے زیادہ شاعر معلوم ہوتا تھا۔ اس کی لمبی لمبی آنکھیں خوابناک تھیں۔ رنگت سانولی تھی۔ اور داڑھی مونچھ صاف۔ اور گو نقش و نگار معمولی تھے لیکن اس کے چہرے پر ایک ایسی لطیف ذہانت ظاہر تھی۔ کہ اسے دیکھ کر بے اختیار میرا دل چاہا۔ کاش میں اس سے متعارف ہوتا لیکن پروفیسر صاحب اس کی طرف اسقدر متوجہ تھے۔ کہ مجھے اپنی موجودگی دخل در معقولات معلوم ہوئی۔ اس لئے مجبوراً میں نے کہا "تو مجھے اجازت ہے؟"

پروفیسر صاحب کسی قدر لجاجت سے بولے "اچھا!

مجھے امید ہے۔ کہ تم مجھے معاف کرو گے:"

مَیں چلنا ہی چاہتا تھا کہ عثمان نے میری طرف دیکھ کر پروفیسر صاحب سے پُوچھا۔ "یہ آپ کے شاگرد ہیں؟"

اس فقرہ کا اقتضا تھا کہ مَیں کسی قدر توقف کروں چنانچہ مَیں ذرا ٹھہرا۔ اور بے چین پروفیسر نے با دلِ نخواستہ انہیں میرا و میرے والد کا نام بتایا۔ عثمان نے میرے والد کا نام سُن کر کہا: "اخاہ! انہیں تو مَیں جانتا ہوں" اور یہ کہہ کر نہایت تپاک سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

پروفیسر صاحب گھڑی گھڑی کمرے کے اندر جانا چاہتے تھے۔ مگر یہ دیکھ کر کہ نوجوان ابھی باہر ہی کھڑا ہے۔ وہ پھر رک جاتے۔

آخر نوجوان بولا "آپ بہت پریشان معلوم ہوتے ہیں" ساتھ ہی مَیں نے کہا "صاحب تعارف تو نامکمل رہا"

پروفیسر صاحب نے اب مجبوراً اپنے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ اور نوجوان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "مسٹر عثمان حیدر بی۔ اے" اور پھر اس کی طرف دیکھ کر کہنے لگے "اور کیا کہوں؟"

عثمان نے کسی قدر مسکرا کر مجھ سے کہا "میرا کام محض فراغت اور مطالعہ ہے۔ آپکے والد ماجد تو بخیریت ہیں؟"

پروفیسر صاحب نے لاچار ہو کر مجھ سے کہا کہ "اگر تمہارا ہرج نہ ہو تو تم بھی تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ:"

مَیں بخوشی رضامند ہو گیا۔ اور ہم سب اندر جا کر بیٹھ گئے۔ پروفیسر صاحب کچھ خاص بات کہنے کو بیحد مضطرب ہو رہے تھے لیکن عثمان کسی قدر بے تعلقی سے سگار کے کش لگانے میں مصروف تھا۔ اور اس کے دوران میں مجھ سے یا اِدھر اُدھر کوئی چیز دیکھ کر پروفیسر صاحب سے کچھ ایسا سوال کر دیتا جو یقیناً ان پر بار گزرتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے اپنا سگار ختم کر کے باہر پھینک دیا۔ اور کہا "مسٹر گھوش معاف فرمایئے گا میں آپ کی بے قراری کو دیکھ رہا تھا۔ مگر چاہتا تھا کہ معاملہ سُننے سے پہلے آپ کے یا اس جگہ کے متعلق جو سوالات میرے دل میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ ان کے متعلق اطمینان کر لوں۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے۔ کہ بات سُنتے سُنتے کسی خاص چیز پر نظر پڑ جاتی ہے۔ اور دل ہی دل میں اس کے متعلق کچھ ایسا سلسلہ خیالات شروع ہو جاتا ہے۔ کہ مقرر کی طرف پوری توجہ قائم نہیں رہ سکتی:"

پروفیسر صاحب نے کہا "خیر۔ تو اب مَیں شروع کروں؟"

عثمان بولا "ہاں فرمایئے۔ اگر آپ لوگوں کو ناگوار نہ ہو تو مَیں اس آرام کرسی پر بیٹھ جاؤں"

وہ آرام کرسی پر دراز ہو گیا۔

(۴)

پروفیسر صاحب نے اپنی داستان اس طرح شروع کی:۔ "آپ کو معلوم ہے کہ میں آٹھ نو سال سے لاہور میں اور اسی مکان میں رہتا ہوں۔ میرے بال بچے بنگال میں رہتے ہیں۔ اور یہاں میرے پاس صرف میرا نوکر جگو تھا جگو کی عمر کوئی بیس سال کے قریب ہے۔ وہ یتیم ہے۔ اور اس کی عمر چار سال کی تھی۔ جب میں نے اس کو پالا تھا۔ اس وقت سے کل رات تک مجھے دنیا کی کوئی طاقت بھی یقین نہ دلا سکتی تھی۔ کہ وہ بے ایمان ہے۔

گزشتہ تعطیل سرما میں جب میں بنگال گیا۔ تو میری بیوی نے اپنی کسی بیوہ سہیلی کا ایک چندن ہار مجھے دیا تھا۔ کہ فروخت کر کے قیمت اسے بھجوا دوں۔ میں زیور لے آیا لیکن چونکہ مجھے اس کی فروخت کا کوئی آسان طریق معلوم تھا اور نہ میرے پاس کوئی ذریعہ ہی تھا۔ اس لئے کل شام تک وہ زیور بدستور ایک صندوقچے میں بند رہا۔ میری بیوی نے کئی مرتبہ اسکے متعلق یاددہانی کی لیکن میں ٹالتا رہا۔ اب تین روز ہوتے بذریعہ ڈاک اس کا سخت تاکیدی خط آیا۔ تو میں نے جگو سے کہا۔ کہ کسی ایجنٹ یا سنار کو بلا لائے۔ کہ اسکی معرفت میں اس کی فروخت کی گفتگو کروں۔

"یہ ہمارے ہمسائے میں بائیں ہاتھ مڑ کر اور کوئی آٹھ دس مکان چھوڑ کر ایک بابو شو داس رہتے ہیں میں نے انہیں دیکھا تو کئی مرتبہ تھا۔ مگر جانتا نہ تھا۔ اور ان میں کوئی ایسی بات بھی نہ تھی۔ کہ میں ان سے متعارف ہونے کی کوشش کرتا لیکن جگو کی ان سے جان پہچان تھی۔ اسی روز شام وہ ان کو بلا لایا۔ اور کہنے لگا کہ" یہ بابو جی زیور بکوا دیں گے۔"

"میں نے اسے زیور کا صندوقچہ لانے کے لئے کہا۔ یہاں میرا یہ کہہ دینا ضروری ہے۔ کہ میرا تمام حساب کتاب روپیہ پیسہ گھر کے صندوقوں وغیرہ کی چابیاں جگو ہی کے پاس رہتی تھیں۔ اور مجھے اس سے کبھی کوئی شکایت کا موقع پیدا نہ ہوا تھا۔ غرض وہ صندوقچہ لینے چلا گیا۔ اس کے پیچھے وہ بیچارے بابو کہنے لگے کہ تعجب ہے۔ کہ آپ زیور وغیرہ بھی نوکروں کے ہاتھ میں چھوڑ دیتے ہیں!

میں نے کہا۔ "میں نے اسے بچپن سے پالا ہے اور مجھے اس پر پورا بھروسہ ہے۔"

"یہ سن کر وہ چپ ہو رہے۔ تھوڑی دیر میں جگو صندوقچہ کھول دیا۔ میں نے چندن ہار کو نہایت احتیاط سے لپیٹ لپاٹ کر صندوقچے میں رکھ چھوڑا تھا۔ نکال کر بابو جی کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ غور سے اسے دیکھتے اور کچھ سوچتے رہے۔ آخر بولے "جڑاؤ زیوروں کی فروخت

ذرا مشکل ہوتی ہے۔ اور جلدی میں اچھا سودا نہیں بنا کرتا آپ کچھ روز انتظار کر سکیں تو شاید معقول قیمت مل جائے۔"

"میں نے کہا بہت بہتر۔ آپ اپنی طرف سے پوری کوشش کیجئے۔ آپ کا جو حق ہوگا اس کے دینے میں میں بخل سے کام نہ لونگا۔"

"اس کے بعد جگو صندوقچہ بند کر کے لے گیا۔ بابو جی تھوڑی دیر تک بیٹھے رہے۔ اور ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔

عثمان نے بات کاٹ کر پوچھا "کیا باتیں؟"

پروفیسر صاحب نے کہا۔ "ان باتوں کا اس معاملے سے کچھ تعلق نہیں۔

عثمان بولا۔ "آپ کوئی بات بھی نظر انداز نہ کیجئے۔"

پروفیسر صاحب نے جواب دیا۔ "بہت بہتر۔ کچھ باتیں بازار کی چیزوں کے نرخ کے متعلق ہوئیں۔ بابو جی کو ان کے متعلق اچھا علم تھا۔ ان کو گزشتہ سالوں کے نرخ کے اعداد بھی یاد تھے۔ چنانچہ وہ ان کا اور موجودہ نرخوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ پھر مکانوں کے کرایوں کا ذکر ہونے لگا۔ انہوں نے میرے مکان کے کرائے اور گنجائش وغیرہ کے متعلق استفسار کیا۔ اور جب میں نے انہیں اپنے مکان کا حال بتا کر اس کے غیر محفوظ ہونے کی شکایت کی تو انہوں نے ایک فراخ اور کم قیمت کا مکان میرے لئے تجویز کیا۔"

عثمان نے پوچھا۔ "اور اس وقت جگو کہاں تھا؟"

پروفیسر صاحب نے کہا۔ "صندوقچہ رکھ کر وہ واپس آیا۔ کچھ دیر کمرے میں کھڑا رہا۔ پھر کھانا تیار کرنے کو چلا گیا اس کے بعد بابو جی بھی رخصت ہو گئے۔ اصل معاملہ تو ابھی دور ہے۔ آپ سنتے جائیے۔"

"کل تیسرے پہر بابو شودا س پھر آئے میں اسی وقت کالج سے آیا تھا۔ اور آرام کر رہا تھا۔ مجھ سے کہنے لگے۔ یہاں ایک جگہ چندن ہار فروخت ہو جانے کی امید ہے مگر آج شام تو میں دو تین روز کے لئے لاہور سے باہر جا رہا ہوں۔ واپس آ کر میں چندن ہار دکھلانے کے لئے لے جاؤنگا۔ جگو میرے ساتھ چل کر دکھا لائیگا۔ اگر پسند آگیا۔ تو امید ہے معقول قیمت مل جائیگی۔"

"میں نے بابو جی کا شکریہ ادا کیا۔ اتنے ہی میں جگو آگیا۔ اور کہنے لگا۔ "چائے تیار ہے۔" میں نے بابو جی سے چائے پینے کو کہا۔ لیکن وہ بولے۔ مجھے آج ہی رات کو لاہور سے چلا جانا ہے۔ اور جانے سے پہلے کئی ضروری کام کرنے ہیں۔ اس لئے اب تو اجازت ہی دیجئے۔ میں صرف آپ کو اطلاع دینے کی غرض سے آیا تھا۔"

"یہ کہہ کر بابو صاحب رخصت ہو گئے۔ میں نے

چائے پی۔ اور کچھ دیر تک ادھر ادھر کی متفرق باتیں کرتا رہا۔"

عثمان نے بات کاٹ کر پوچھا "کیا باتیں؟"

پروفیسر صاحب بولے "کچھ گھر کے معاملات کے متعلق تھیں۔ پھر دکان سے کپڑے لانے کی تاکید کی۔ پھر کتابیں جو دفتری کو جلد باندھنے کے لئے اس کی معرفت دی تھیں۔ ان کی جلد بندھوانے کے لئے کہا۔ پھر کمرے میں آگیا۔ ذرا دیر کی حالت کو دیکھتا رہا اور پڑھنے لگا۔ اس کے بعد (میری طرف اشارہ کر کے) یہ مجھ سے پڑھنے کے لئے آ گئے۔ انہیں پڑھایا۔ پھر فراغت پا کر کھانا کھایا۔ اور چونکہ جلد سو جانے کا عادی ہوں۔ اس لئے ہفتہ ڈیڑھ گھنٹہ مطالعہ کرنے کے بعد سو رہا۔

"اب میں ذرا آپ کو اپنے مکان کا نقشہ بھی بتا دوں۔ آپ خود بھی ابھی اٹھ کر دیکھ لیجئے گا۔ میرے گھر میں چار کمرے ہیں۔ یہ اس طرف برآمدہ ہے۔ اور پچھلی طرف صحن ہے۔ صحن کی دوسری طرف غسل خانہ۔ باورچی خانہ وغیرہ ہے۔ یہ کمرہ میرے بیٹھنے کا ہے۔ اس سے اگلا کمرہ خالی ہے۔ اس میں رات کو جگو سویا کرتا تھا۔ اس کمرے کے پہلوؤں میں جو دو کمرے ہیں۔ لمبائی میں ان بیچ کے دونوں کمروں کے برابر ہیں۔ ان میں سے اس دائیں ہاتھ والے کمرے میں میں سوتا ہوں۔ اور بائیں ہاتھ کے کمرے میں گھر کا سامان ہے۔ اسی میں مسروقہ صندوقچہ بھی تھا۔ ان پہلوؤں کے کمروں میں کھڑکیاں ہیں۔ اور چونکہ کھڑکیوں میں سلاخیں نہیں ہیں صرف شیشے لگے ہیں۔ اس لئے میں نے جگو کو سخت تاکید کر رکھی تھی کہ سب چیزیں الماری میں رکھا کرے۔ اور الماری میں مضبوط قفل لگے ہیں۔ چونکہ صحن کی دیواریں بھی چھوٹی تھیں۔ اس لئے صحن کی طرف کے تمام دروازے بھی جگو رات کو بند کر لیا کرتا تھا۔

رات میں سونے کے لئے لیٹا۔ ابھی جاگ ہی رہا تھا کہ جگو میرے کمرے میں آیا۔ اور کہنے لگا۔ بابو جی سو گئے؟

"کیوں کیا ہے؟"

"میں ذرا باہر جاتا ہوں۔ ابھی آ جاؤں گا۔"

"میں نے جگو کو آزادی دے رکھی تھی۔ اور سوائے اس کے کہ وہ میرا کام کرتا تھا میں اسے بالکل عزیزوں کی طرح رکھتا تھا۔ اور اس کے معاملات میں مین میخ نہ نکالتا تھا۔ دوسرے مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اس وقت وہ ہمسایوں کے نوکروں کے ساتھ تاش وغیرہ کھیلنے کو چلا جاتا ہے۔ اس لئے میں نے اسے اجازت دے دی۔ اور کہا کہ "جلدی آجانا۔"

"اگرچہ مجھے جلدی سو جانے کی عادت ہے لیکن رات نہ معلوم کیوں مجھے نیند نہ آئی۔ مجھے خاص خیال بھی نہ تھا۔ بلکہ یہ حالت تھی کہ توجہ خود بخود کسی خیال پر ہونا چاہتی

اور پھر ہر چیز کو غیر ضروری اور پریشان کن پا کر چھوڑ دیتی بہر حال جس وقت جگو آیا۔ میں جاگ رہا تھا۔ جگو نے آکر آہستہ سے کہا۔ "بابو جی!"

"میں نے کہا۔ کیوں؟"

"ابھی جاگ رہے ہو؟"

"ہاں"

"یہ سُن کر وہ چپکا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اور لیٹا رہا۔ تھوڑی دیر کروٹیں لینے کے بعد میری بھی آنکھ لگ گئی۔

"رات کے دو بجے ہونگے۔ کہ کسی کھڑکے سے میری آنکھ کھلی۔ میں نے ذرا دیر کان لگا کر آواز کو سننا چاہا۔ کچھ ہلکی ہلکی سی آواز پھر آئی۔ میں نے بجلی کا ٹیبل لمپ جلایا تو بجلی غائب تھی! اب میں کچھ گھبرایا۔ اور اُٹھ کر جگو کے کمرے میں آیا۔ جہاں وقت بے وقت کے لئے اس نے ایک الماری میں موم بتیاں اور دیا سلائی رکھ چھوڑی تھیں۔ دیکھتا ہوں تو ساتھ کے کمرے میں جس میں صندوقچہ رہتا تھا۔ موم بتی جل رہی ہے۔ اور اس کی ہلکی ہلکی روشنی جو ادھر آرہی تھی۔ اس میں میں نے دیکھا۔ کہ جگو بستر پر سے غائب ہے! میں کچھ حیران ہُوا۔ اور آگے بڑھا۔ تو دیکھا۔ کہ زیور کے صندوقچے والی الماری کھلی ہے۔ اور جگو موم بتی لئے اس میں کچھ دیکھ رہا ہے۔ میں نے جھٹ کہا۔ "جگو کیا ہے؟"

"اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ اس کی رنگت ایسی زرد تھی۔ گویا قبر میں سے نکل کر آیا ہے۔ اس کی گھگھی بندھ رہی تھی۔ موم بتی اس کے ہاتھوں میں کانپ رہی تھی۔ اس نے بمشکل رُک رُک کر کہا۔

"صندوقچہ نہیں!"

"مجھے ایسا معلوم ہُوا۔ کہ میرے دل کی حرکت تھم گئی ہے۔ میں نے کہا۔ "نہیں؟"

"جی"

جگو کو اس حالت میں دیکھ کر مجھے خوف ہُوا کہ کہیں ڈر کے مارے اس کی جان نہ نکل جائے میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اور اس کی طرف بڑھا۔ مگر وہ مجھ سے ڈر کر کچھ سکڑ سا گیا۔ میں نے قریب بڑھ کر اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ تو وہ نہایت لجاجت سے کہنے لگا۔ "میں نے نہیں چرایا۔"

"میں نے کہا۔ آخر یہ کیسے ہُوا۔ کچھ بات تو بتاؤ؟"

"اس کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ میں نے جب تسلی دینے کے لئے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ تو اُسے کسی قدر تسکین سی ہوئی۔ اور اُس نے رُک رُک کر کہا۔ ابھی ابھی مجھے کھڑکی کی آواز آئی۔ میں نے بجلی کا بٹن دبایا تو بجلی

خیر نہیں۔ میں نے موم بتی نکال کر جلائی۔ دروازے کی کنڈی کھولی۔ ... آپ کے آگے آگے میں یہاں آیا ہوں۔ یہاں آکر دیکھا تو صندوقچہ غائب تھا۔"

"میرے مکان میں بجلی کا مین سوئچ باہر برآمدے میں ہے۔ مجھے ... خیال آتا تھا کہ یہ غیر محفوظ جگہ ہے۔ کبھی کوئی یوں ہی دل لگی سے بجلی بجھا کر پریشان نہ کرے۔ چنانچہ اس وقت مجھے فوراً خیال آیا۔ کہ چل کر مین سوئچ دیکھوں۔ میں نے جگو کے ہاتھ سے موم بتی لی۔ اور اس کمرے میں آکر برآمدے کا دروازہ کھولا۔ اس دروازے کے بائیں ہاتھ کو مین سوئچ ہے میں نے دیکھا تو مین سوئچ بند تھا۔ مین سوئچ کھول کر جھٹ اس کمرے میں واپس گیا۔ مزید اطمینان کے لئے میں نے خود پھر الماری میں صندوقچے کو دیکھا۔ اور اس کو غائب پاکر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کہ شاید کوئی اور امر چوری پر روشنی ڈال سکے۔ دیکھتا ہوں تو کھڑکی کھلی ہوئی ہے۔ میری کھڑکی کے نیچے زمین کا ایک غیر آباد قطعہ ہے۔ میں کچھ دیر تک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر اُدھر دیکھتا رہا۔ اور آخر کھڑکی میں سے باہر کود گیا۔ کودا ہوں تو میرے قدم شیشے کے اوپر پڑے۔ مجھے خیال آیا۔ کہ ضرور کھڑکی کا شیشہ نکالا گیا ہے۔ کھڑکی کے پٹ دیکھے تو واقعی ایک شیشہ ندارد تھا۔ خیر میں نے اس سے بے پروا ہو کر چاروں طرف دیکھنا شروع کیا۔ جگو بھی کھڑکی میں سے ... آگیا ... اندھیرا تھا۔ اور کوئی متنفس موجود نہ ... ہر طرف دیکھنے کے بعد سامنے کے راستے سے اندر واپس آئے۔ مجھے مایوس دیکھ کر جگو پوچھنے لگا

'بابو جی اب کیا ہوگا؟'

میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ برآمدے میں خاموش کھڑا ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد پھر بے چین ہوا۔ اور اسی کمرے میں واپس چلا گیا۔ اب جو میں نے ادھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔ تو میری نظر الماری کی کنڈی پر پڑی۔ دیکھتا ہوں۔ تو تالا اور اس میں وہ چابیوں کا گچھا جو جگو کے پاس رہا کرتا تھا۔ کنڈی میں لٹک رہا ہے۔

یہ دیکھ کر میں نے جگو سے کہا۔ یہ چابیاں یہاں کہاں سے آئیں؟"

"وہ حیران ہو کر کہنے لگا۔ مجھے معلوم نہیں۔"

میں نے کہا۔" تو نے الماری نہیں کھولی تھی؟"

وہ کانپ کر بولا۔" نہیں جی۔ میں آیا۔ تو یوں ہی

کھلی ہوئی تھی۔

میں نے کسی قدر غصّے سے کہا۔ "تو یہ بتاؤ چابیوں کا گچھا اس جگہ کیسے آیا؟"

"اب وہ بہت حیران ہوا۔ جاکر اپنے لوٹ کو دیکھنے لگا۔ اور تھوڑی دیر بعد چپکا واپس آگیا۔"

"اپنے اس انکشاف سے مجھے جگو پر بہت شبہ ہوگیا۔ لیکن میں نے اسے کچھ نہ کہا۔ اور اپنے کمرے میں آکر خاموش بیٹھ رہا۔

"جگو بھی میرے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ وہ بہت پریشانی سے میرا مُنہ دیکھ رہا تھا۔ آہستہ سے پُوچھنے لگا۔

"بابوجی۔ اب کیا ہوگا؟"

"جو ہوگا دیکھ لوگے۔"

"آخر کیا ہوگا بابوجی؟"

"میں نے اس کی طرف تیز نگاہ سے دیکھ کر کہا۔ صبح کو پولیس میں خبر کرونگا؟"

"یہ سُن کر وہ بالکل زرد پڑ گیا۔ کچھ دیر تک کھڑا رہا۔ اور پھر اپنے کمرے میں جاکر رونے لگا۔

اس کی سسکیوں کی آواز مجھ تک آرہی تھی۔

رات بھر میرے کمرے کا لمپ جلتا رہا۔ اور میں سو نہ سکا۔ اور نہ جگو ہی سویا۔ صبح کو اُٹھ کر وہ حسب معمول دودھ لینے کو گیا۔ اس کا چہرہ رات بھر میں ایسا ہو گیا تھا۔ جیسے مہینہ بھر کا بیمار ہے۔

مصیبت نے میرے دل کو اس قابل نہ چھوڑا تھا۔ کہ میں اس سے ہمدردی کر سکتا۔

وہ خاموشی سے آہستہ آہستہ باہر نکل گیا۔ اور اس وقت سے ابتک غائب ہے۔ پندرہ بیس منٹ میں وہ دودھ لے کر واپس آجایا کرتا تھا۔ ایک گھنٹے کے بعد مجھے یکلخت خیال آیا۔ کہ وہ کہیں بھاگ نہ گیا ہو۔ مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں سے دودھ لاتا ہے۔ غرض میں نے نہایت بے چینی کے عالم میں ایک گھنٹہ اور اس کا انتظار کیا۔ جب وہ نہ آیا۔ تو مجھے یقین ہوگیا۔ کہ صندوقچہ ضرور اسی نے چُرایا ہے۔

میں نے تھانہ میں رپورٹ کر دی۔ ایک سب انسپکٹر نے آکر کمرے وغیرہ کو دیکھا۔ اور اب جگو کی تلاش پر متعین ہے۔"

(۴)

عثمان آرام کرسی پر نہایت آرام سے لیٹا ہوا اس داستان کو سنتا رہا۔ اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ اور ایسا بے حس و حرکت پڑا تھا کہ بعض اوقات مجھے شبہ ہوا کہیں وہ سو تو نہیں گیا۔ غالباً اسی خیال سے پروفیسر صاحب بھی کبھی کبھی اپنی داستان کسی قدر بلند آواز سے شروع کر دیتے۔ یا بیچ میں ذرا توقف کرنے میں وہ فوراً سر ہلا کر انہیں اپنی داستان جاری رکھنے کو کہہ دیتا۔ اور ہمیں معلوم ہو جاتا تھا کہ وہ جاگ رہا ہے اس کے چہرے بشرے سے کسی قسم کا جذبہ ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ایک آدھ موقع پر اس کے چہرے پر ایک خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ایک جگہ اس کی بھویں اوپر کو اٹھیں۔ اور ایک بار سکڑی بھی گئیں صرف یہی علامات تھیں جن سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس معاملے پر شاید غور بھی کر رہا ہے

پروفیسر صاحب کی داستان ختم ہوتے ہی وہ نہایت مستعدی سے آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور بولا۔ "پولیس نے جگو ہی کو ملزم قرار دیا ہے؟"

پروفیسر صاحب نے جواب دیا۔ "تو اور کیا مجھ کو ملزم ٹھیراتے!"

عثمان نے پوچھا۔ "اس معاملے میں کسی اور شخص کا تعلق تو نہیں؟ میرا مطلب ہے کہ کسی اور شخص کو بھی اس صندوقچے کا علم تھا؟"

"قطعی نہیں"

رات کو جب جگو آپ سے اجازت لے کر باہر گیا تو کتنی دیر کے بعد واپس آیا؟"

"غالباً دو گھنٹے بعد"

جگو اس سے پہلے جب کبھی باہر گیا ہے۔ اتنی ہی دیر میں آجایا کرتا تھا۔ یا جلدی آتا تھا؟"

"میں اس کی واپسی تک سو جایا کرتا تھا۔ لیکن بعض اوقات اگر اتفاق سے میں جاگتا رہتا تو وہ جلد لوٹ آیا کرتا تھا۔

"وہ آپ کے ہمسائے شردانند جنہیں آپ نے کل زیور دکھایا تھا باہر چلے گئے ہیں؟"

"مجھے معلوم نہیں"

دفعتاً اٹھ کر وہ باہر برآمدے میں گیا۔ اور مین سوئچ کو دیکھ کر دروازے میں آ کھڑا ہوا ہم حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ دفعتاً اس نے پوچھا۔

"اچھا جب آپ نے مین سوئچ دبایا تو کس کس کمرے کا لیمپ جلا تھا؟"

"اس کا تو مجھے خیال نہیں"

"دیکھئے میں ابھی یاد دلائے دیتا ہوں۔ آپ کے اس کمرے کے دروازے کی بائیں طرف مین سوئچ ہے۔ اگر آپ اس کمرے کے دروازے میں بائیں ہاتھ کھڑے

ہوں۔ تو آپ کو اپنی خوابگاہ کی روشنی آسانی سے نظر نہیں آسکتی۔ کیونکہ وہ کمرہ پرے کو ہے۔ لیکن یہ کمرہ ورس کے آگے جگو کے سونے کا کمرہ آپ کی نگاہ کے عین مقابل میں تھے۔ اور اس کمرے کے لیمپ کی بجلی کا بٹن بند تھا۔ چنانچہ جگو کے کمرے میں روشنی ہوتی ہو تو آپ کو بہت آسانی سے نظر آگئی ہوگی۔"

پروفیسر صاحب نے جلدی سے کہا۔ "ہاں ہاں جگو کے کمرے کا لیمپ جل گیا تھا۔ یہ مجھے اس طرح بھی یاد ہے۔ کہ بٹن سوئچ دبانے کے بعد میں نے موم بتی تو بجھا دی تھی اور جگو کو پکڑا دی تھی۔ اور خود جگو کے کمرے میں سے ہوکر اس کمرے میں گیا تھا۔ جس میں چوری ہوئی تھی۔ اس وقت جگو کے کمرے میں روشنی تھی۔ اور اسی کمرے کی روشنی چوری والے کمرے میں بھی پڑ رہی تھی۔ یہ تو مجھے بہت ہی اچھی طرح یاد آگیا کہ جگو والے کمرے ہی سے آنیوالی ہلکی ہلکی روشنی میں میں نے چوری والے کمرے کی بجلی کا بٹن دبا دیا تھا۔"

عثمان نے کسی قدر اطمینان سے کہا "بہت خوب جس وقت آپ نے بٹن سوئچ دبایا۔ جگو کہاں تھا؟"

پروفیسر نے کہا وہ میرے پیچھے پیچھے چلا آیا تھا اور بٹن سوئچ دبانے کے بعد میں نے موم بتی بجھا کر اس کو پکڑا دی تھی۔"

عثمان نے پوچھا۔ "وہ موم بتی جگو نے اسی وقت نکالی تھی۔ یا پہلے بھی استعمال کی جا چکی تھی؟"

پروفیسر نے کسی قدر حیران ہوکر کہا "غالباً نئی ہوگی کیونکہ میرا خیال ہے کہ اس سے پہلے تو کبھی اس قسم کی ضرورت نہ پڑی تھی۔

عثمان نے دریافت کیا۔ "وہ موم بتی تو آپ کے پاس موجود ہوگی؟"

پروفیسر نے اور زیادہ متعجب ہوکر کہا۔ "ہاں"

عثمان نے کہا۔ "وہ موم بتی مجھے لا دیجئے۔"

عثمان کے ان عجیب سوالات سے میں خود حیران تھا۔ چنانچہ پروفیسر صاحب کے استعجاب کو بھی برمحل سمجھ رہا تھا۔ پروفیسر صاحب اُٹھے اور ذرا سی دیر میں وہ موم بتی لا حاضر کی۔ موم بتی کو دیکھ کر عثمان مسکرا پڑا اور اسے علیحدہ میز پر رکھ دیا۔ اور پھر بولا۔ "اچھا چلئے پہلے آپ مجھے موقع دکھائیے۔"

ہم سب اُٹھ کر اس کمرے میں چلے گئے۔

عثمان نے اپنا چسٹر اُتار دیا۔ جسے خود پکڑ لینے میں مجھے ایک خاص مسرت حاصل ہوئی۔

عثمان نے اپنی جیب میں سے ایک محدب شیشہ۔ ایک بتری اور ایک ناپنے کا فیتہ نکال لیا۔ بہت دیر تک الماری کی کنڈی کو الماری کو۔ الماری کے نیچے زمین کو

اور نہیں کہیں اور جگہ زمین کو محدب شیشے سے بڑی کی روشنی میں دیکھا۔ اور کچھ ناپتا رہا۔ دفعتاً اس نے سر اُٹھا کر پوچھا۔ "جب آپ نے مجھکو اس کمرے میں دیکھا۔ تو اس نے چوڑیاں پہن رکھی تھیں یا نہیں؟"

پروفیسر صاحب نے کہا۔ غالباً پہن رکھی ہونگی۔"

عثمان نے فوراً پوچھا۔ "وہ شیشے کی کرچیں آپ نے کھڑکی کے نیچے سے اٹھوا دیں؟"

پروفیسر صاحب نے کہا۔ "انہیں کیا کیجئے گا۔ وہ شاید کھڑکی کے نیچے ہی پڑی ہوں۔"

عثمان جھٹ کھڑکی میں سے باہر کود گیا۔ اور کہنے لگا۔ "کوئی موم بتی یہاں لائیے۔"

پروفیسر صاحب جلدی سے ایک موم بتی لے کر باہر گئے۔ اور اس کی روشنی میں عثمان کو جتنی کرچیں نظر پڑیں۔ اس نے جمع کرلیں اور اندر آکر بجلی کی روشنی میں اس طرح ان میں سے ہر ایک کو دیکھنے لگا۔ گویا کسی بہت بڑے راز کا حل ان پر لکھا ہوا ہے۔ دفعتاً اس کے مُنہ سے بہت زور سے "اخاہ" نکل گیا۔

مَیں اور پروفیسر صاحب تصویر حیرت بنے ہوئے اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مگر میرا خیال ہے کہ کوئی ماہر فنِ قیافہ بھی اس کے چہرے سے اس کے دلی راز معلوم نہ کر سکتا تھا۔

تھوڑی سی دیر بعد اس نے ہنس کر ان کرچوں کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ اور بولا۔ "مجھے بہت کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ صرف ایک بات ہے۔ جو مَیں اب تک نہیں سمجھ سکا۔"

(۵)

وہ اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر کچھ سوچتا ہوا بیٹھنے کے کمرے میں آگیا۔ اور ہم دونوں حیران اور خاموش آہستہ آہستہ اس کے پیچھے پیچھے چلے آئے۔ تمام واقعات کچھ ایسے عجیب و غریب طور پر ہو رہے تھے۔ کہ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ گویا میرا سر چکرا رہا ہے

ہم باہر آئے ہی تھے۔ کہ اتنے میں وہ سب انسپکٹر آگیا۔ جو گلوبند کی تلاش پر متعین تھا۔

پروفیسر صاحب نے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملایا اور نہایت بیتابی سے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

عثمان نے بھی ایک دلچسپی کی نگاہ پولیس انسپکٹر پر ڈالی۔ اور اس کے جواب کا متوقع ہوا۔

سب انسپکٹر نے اپنی تلاش کی ایک لمبی چوڑی داستان بیان کی۔ کہ مینے کوتیں اور باغ اور ریلوے اسٹیشن اور ہر جگہ تلاش کی۔ مگر ابتک کوئی سراغ نہیں ملا۔

عثمان نے انسپکٹر کو خطاب کر کے کہا۔ قطع کلام ہوتا ہے۔ لیکن آپ ازراہِ عنایت مجھے بتا سکتے ہیں کہ آپ نے

کس نے بنا پر جگو پر شبہ کیا؟"

سب انسپکٹر نے کہا۔" اور اس کا الزام کس پر ہو سکتا ہے؟"

عثمان نے کسی قدر مضحکہ خیز انداز سے کہا۔" یہ تو عجیب استدلال ہے!"

انسپکٹر صاحب بولے۔" حضرت چابیاں اس کے پاس تھیں۔ الماری کے سامنے وہ موجود پایا گیا۔ ڈر اس پر غالب تھا۔ اور بھاگ وہ گیا۔ اس کے علاوہ بھی کسی بات کی ضرورت ہے؟"

عثمان نے جواب میں کہا۔ کہ" اگر ہم اس نقطۂ نظر سے اس معاملے پر غور کریں۔ کہ جگو بے گناہ تھا۔ تو ان سب باتوں کا جواب بن سکتا ہے؟"

سب انسپکٹر نے پوچھا۔" کیسے؟"

عثمان نے کہا۔" ممکن ہے چابیاں اس سے کھوئی گئی ہوں یا کسی نے اڑا لی ہوں۔ الماری کے سامنے موجود ہونے کے متعلق اس کا وہ بیان صحیح ہو جو اس نے پروفیسر صاحب کو دیا۔ اور وہ اس ڈر کی وجہ سے بھاگ گیا ہو کہ قرائن سے اس پر شبہ ہوگا۔"

انسپکٹر نے مسکرا کر کہا۔" آپ بہت دلچسپ آدمی ہیں۔"

عثمان نے غصے سے کہا۔" اور مجھے یقین ہے۔ کہ جس قدر وقت آپ نے اپنی اس پگڑی کے خود رنگنے میں صرف کیا ہے۔ اتنی دیر اس معاملے پر غور نہیں کیا۔"

سب انسپکٹر دفعتاً چونک اٹھا۔ اور بے حد تعجب سے عثمان کو اس طرح دیکھنے لگا۔ جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ عثمان کو یہ کیسے معلوم ہوگیا۔

عثمان نے اس کی کچھ پروا نہ کی۔ اور میری طرف توجہ کر کے کہا۔" اگر آپ کو کچھ فراغت ہو تو ذرا میرے ساتھ تشریف لائیے۔"

میں بخوشی تیار ہوگیا۔

عثمان نے پروفیسر صاحب سے کہا۔" آپ سے میں پھر ملونگا۔" یہ کہہ کر" مجھے ساتھ لے کر وہ باہر نکل گیا۔ اور پروفیسر اور سب انسپکٹر دونوں ہمیں حیرت سے دیکھتے رہ گئے۔

(۶)

باہر نکل کر عثمان ایک گلی میں مڑ گیا۔ اور ایک شخص سے پوچھا کہ" لالہ شودا س کا مکان کونسا ہے؟"

اس نے ہاتھ سے اشارہ کر کے بتا دیا۔

عثمان نے مجھ سے کہا۔" اب آپ ذرا تکلیف کریں۔ اور اس مکان پر جا کر پوچھیں۔ کہ لالہ شوداس گھر پر موجود ہیں یا نہیں۔"

میں نے پوچھا۔" اور اگر وہ ہوں تو کیا کہوں؟"

عثمان نے کہا۔" آپ مطلق رہیئے۔ وہ گھر پر موجود

نہ ہوں گے۔"

میں نے تعجب سے پوچھا۔" تو پھر آپ مجھے بھیجتے ہی کیوں ہیں!"

عثمان نے کہا۔ آپ جائیے تو سہی۔ میں یہیں موڑ پر کھڑا ہوں۔"

میں بادل ناخواستہ چلا۔ چلتے چلتے دو ایک دفعہ رکا۔ دل میں آیا۔ کہ پھر عثمان سے دریافت کروں۔ کہ اس کی کیا ضرورت ہے۔ اور اگر مالک مکان باہر آگیا۔ تو میں کس قدر خفیف ہونگا۔ مگر مجھے جرأت نہ پڑی۔ آخر میں آگے بڑھا۔ اور بیٹھے دروازے پر جا کر "لالہ شو داس" کہہ کر آواز دی۔ دو تین آوازیں دی ہونگی۔ کہ ایک بڑھیا گھر میں سے نکلی۔ چندھیائی ہوئی آنکھوں سے میری صورت دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئی بولی۔ "کون ہے؟"

میں نے کہا "لالہ جی گھر پر ہیں؟"

بڑھیا نے کہا۔ "نہیں بیٹا۔ وہ تو کل رات لاہور سے باہر گئے ہیں۔"

میں چلنے لگا تو اس نے پوچھا "تمہیں کیا کام تھا کام بتا دو۔"

میں نے کہا۔" اب نہیں کیا بتاؤں۔ کام تو انہی سے ہے۔"

بڑھیا نے پھر پوچھا۔ آخر کچھ معلوم تو ہو؟"

میں نے کہا۔ "تم ان کی نوکر ہو؟"

بڑھیا بولی "نہیں بیٹا میں تو اس کی ماں ہوں۔"

میں نے پوچھا۔" آپ کو معلوم ہے کہ وہ کہاں گئے ہیں اور کب آئینگے؟"

بڑھیا بولی۔" بیٹا یہ تو نہیں معلوم کہ وہ کہاں گئے ہیں ہاں شاید کل پرسوں تک آجائینگے۔"

میں نے کہا خیر۔ جب آئینگے تو دیکھا جائیگا۔"

یہ کہہ کر میں چلا آیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ تو بڑھیا مجھے کھڑی ہوئی دیکھ رہی تھی۔ میرے مڑ کر دیکھنے پر وہ گھر میں چلی گئی۔ موڑ پر عثمان میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے تمام گفتگو اُسے بتائی۔ اسے سن کر اس نے میری پیٹھ پر ہاتھ مار کر "شاباش" کہا۔ اور پھر بولا۔ "میں ایک ضروری کام پر جاتا ہوں۔ تم یہیں کہیں چھپ کر دیکھتے رہو۔ کہ کوئی اس مکان سے باہر تو نہیں نکلتا۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں واپس آتا ہوں۔"

عثمان کی شاباش سے میں حد درجہ مسرور ہوا۔ اور اب مجھے کچھ ایسا احساس ہوا۔ گویا ایک نہایت اہم ذمہ داری میرے سپرد کی جا رہی ہے۔ میں بخوشی اس پر تیار ہو گیا۔ اور وہیں ایک کونے میں چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ اور عثمان وہاں سے رخصت ہوا۔

(۷)

تھوڑی دیر تک تو میں اس مستعدی سے وہاں کھڑا

رہا۔ گویا نہ صرف میری آنکھیں بلکہ بدن کا عضو عضو کسی آنے والے کی تاک میں تھے۔ لیکن جب خلاف توقع پانچ دس منٹ تک کچھ نہ ہوا۔ تو میں ان تمام گزشتہ واقعات پر غور کرنے لگا۔ جو ایسے حیرت انگیز طریق سے ظہور پذیر ہوئے تھے۔ عثمان نے جن جن چیزوں کو دیکھا تھا اور جو جو سوال کئے تھے۔ میں کوشش کرنے لگا۔ کہ ان کی امداد سے سمجھوں کہ وہ کس نتیجے پر پہنچا ہے۔ لیکن میرے لئے ان واقعات پر غور کرنا تاریکی میں ہاتھ پاؤں مارنا تھا۔ غور کرنے سے میرا دماغ کچھ گم سا ہو گیا۔ اور میں نے اس سعی لاحاصل سے احتراز کی کوشش کی۔ مگر توجہ بار بار پروفیسر کی داستان کے کسی جزو یا عثمان کے کسی سوال یا مشاہدہ کی طرف منعطف ہو جاتی۔ اور میں پھر تھوڑی دیر تک اپنا وقت ضائع کر لیتا۔

مجھے وہاں کھڑے کھڑے آدھے گھنٹے کے قریب گزر گیا۔ میری نظر اننک شود اس کے مکان کی چوکھٹ کی بلائیں لے رہی تھی۔ اور مجھے وہاں کھڑا ہونا بار سا معلوم ہونے ہی لگا تھا۔ کہ دفعتاً میں نے دیکھا وہی بڑھیا مکان سے باہر آئی کھڑی ہو کر تھوڑی دیر ادھر اُدھر دیکھتی رہی۔ اور پھر اندر چلی گئی۔ اتنی بات میرے دوران خون کو تیز کرنے کے لئے کافی تھی۔

تھوڑی دیر میں وہ بڑھیا پھر باہر نکلی۔ اور چپکے سے دوسری طرف کو چل دی۔ میرا دل بلیوں اُچھل رہا تھا۔ میں نے سوچا۔ کہ میں عثمان سے یہ پوچھنا بھول گیا۔ کہ اگر کوئی باہر نکلے تو میں کیا کروں۔ بہرحال مجھے یہی مناسب معلوم ہوا۔ کہ اس کے پیچھے پیچھے جاؤں۔ میں کچھ فاصلے پر رہ کر اس کے پیچھے چلتا رہا۔ وہ گلی کی لالٹین کے قریب پہنچی تو مجھے معلوم ہوا کہ اس نے دوپٹے کے نیچے بغل میں کچھ دبا رکھا ہے۔ نمعلوم کیسے میرے دل کو یقین ہو گیا کہ پروفیسر گھوش کا مسروقہ صندوقچہ ہے۔ میں حیران تھا۔ اب کیا کروں۔ کہ یکایک مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ بڑھیا اپنے گھر سے کوئی دو فرلانگ دور گئی ہوگی۔ کہ میں نے کیا کیا۔ اس کی جس بغل میں صندوقچہ تھا۔ تیزی سے ادھر سے گزرا اور گزرتے وقت ایسا دھکا لگایا کہ صندوقچہ اس کی بغل سے نکل کر گر پڑا۔

دھکا لگاتے ہی میں نے کہا معاف کرنا میں نے جان بوجھ کر نہ کیا تھا۔ لیکن اس وقت تک صندوقچہ میری نظروں کے سامنے تھا۔ اس کے گرنے کی آواز سے مجھے معلوم ہو گیا تھا۔ کہ اس میں زیور موجود ہے۔ میں نے فوراً کہا "پروفیسر گھوش کا مسروقہ صندوقچہ!" بڑھیا کے کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ یا تو دم بخود پڑی تھی۔ یا یکلخت میرے پاؤں میں گر پڑی۔ اس نے میری آواز سے مجھے پہچان لیا تھا۔

میں نے کہا "یہ صندوقچہ اٹھا لو۔ اور چپ چاپ میرے ساتھ چلی آؤ۔"

بڑھیا کی منتوں اور خوشامدوں کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔ وہ عمر بھر کے لئے میری غلامی کو تیار تھی۔ وہ اپنے بیٹے کو مجھ پر نثار کرنے پر رضامند تھی۔ اور جو کچھ بھی میں کہتا۔ اس کی تعمیل کو بسر و چشم حاضر تھی۔

میں نے کہا "یہ سب کچھ پروفیسر صاحب سے کہنا۔"

بڑھیا نے صندوقچہ اٹھا لیا اور میرے ساتھ چل دی۔

ایک ایک قدم پر وہ ہزار ہزار منتیں کرتی اور واسطے دیتی تھی۔ کبھی وہ اپنے آپ کو اور کبھی اور کو کوسنے لگتی کبھی وہ مجھ سے سوال کرتی۔ اب کیا ہوگا۔ مگر میں خاموش تھا صرف کبھی کبھی اتنا کہہ دیتا "سب کچھ پروفیسر صاحب کی مرضی پر منحصر ہے"

جب ہم واپس ہوتے ہوئے اس کے گھر کے قریب پہنچے تو میں نے کہا "دیکھو اگر یہاں تم نے شور مچایا تو پھر تم لوگوں کے بچنے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔"

بڑھیا نے ہزار منت و خوشامد کہا "ذرا مجھے اپنے بیٹے سے مل لینے دو۔"

میں نے کہا "بیٹے سے! تم تو کہتی تھیں۔ کہ وہ لاہور سے باہر گیا ہے؟"

بڑھیا کچھ خاموش ہوئی اور پھر بولی "نہیں بیٹا۔ وہ گھر پر ہی موجود ہے۔ اس کا جی اچھا نہیں تھا۔ اس لئے وہ نہیں بلاتا تھا۔"

میں نے کہا "خیر میں انہیں بھی بلا لونگا۔ تم ذرا میرے ساتھ چلی آؤ۔"

(۸)

ہم پروفیسر گھوش کے مکان پر پہنچے۔ تو میں نے دیکھا کہ سامنے ایک ادھیڑ عمر کا شخص کرسی پر بیٹھا ہے۔ سب انسپکٹر اور پروفیسر صاحب اس کے چہرے کو غور سے دیکھ رہے ہیں۔ اور شاید گفتگو بھی کر رہے ہیں۔ اور ایک تاروالا کمرے میں ٹہل رہا ہے۔

اگر پروفیسر صاحب وہاں موجود نہ ہوتے تو اس غیر متوقع مجمع کو دیکھ کر میں قطعی یہ سمجھتا۔ کہ میں کسی اور کے مکان میں آگیا ہوں۔ بہر حال میں نے برآمدے میں توقف کیا اور بڑھیا کے ہاتھ سے صندوقچہ خود لے لیا۔ کہ اتنے میں اس تاروالے نے مجھے دیکھا۔ اور میری طرف بڑھا۔ ساتھ ہی جو ادھیڑ عمر کا شخص کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کی اور بڑھیا کی نگاہیں دوچار ہوئیں۔ بڑھیا چلا اٹھی۔ "ستو!" اور اس کی جانب بڑھی۔ اس شخص نے ایک چیخ ماری۔ اور بھاگنے کی کوشش کی مگر سب اس پر ٹوٹ پڑے۔ اور پھر اس کو پکڑ کر کرسی پر بٹھا دیا۔ اس کشمکش سے فراغت پانے کے بعد میں نے وہ صندوقچہ پروفیسر صاحب کے سامنے پیش کیا۔ تاروالا مسکرایا۔ اور اس نے بڑھ کر تحسین و آفرین کے انداز سے میری "ٹھ پہ

اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اور جب اُس نے مجھے خطاب کیا تو میں پہچان گیا کہ یہ عثمان ہے۔ اور چونک کر تعجب سے اُس کی صورت کو دیکھنے لگا۔

پروفیسر صاحب اور سب انسپکٹر اس قدر حیران تھے کہ ان کے مُنہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ اور وہ ہر ایک کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ شوداس کی ماں پروفیسر صاحب کی کرسی کے پاس فرش پر بیٹھ گئی وہ رو رہی تھی۔ فریاد کر رہی تھی۔ ان کے پیروں کو ہاتھ لگاتی تھی۔ ان کے قدموں میں اپنا سر رکھ دینے کی بھی کوشش کرتی تھی۔

عثمان نے اس کی ماں سے پوچھا "کل رات جگو تمہارے ہاں گیا تھا؟"

بڑھیا نے نہایت عاجزی سے جواب دیا۔ "ہاں بیٹا گیا تھا"

عثمان نے دریافت کیا "وہاں اس نے کیا کیا؟"

شوداس نے کچھ بولنا چاہا۔ اس پر عثمان نے سب انسپکٹر کو اشارہ کیا۔ اور وہ اُسے اُٹھا کر دوسرے کمرے میں لے گیا۔

بڑھیا ڈر گئی۔ کہ مبادا میرا بیان میرے بیٹے کے سر پر کوئی مصیبت لائے۔ اس لئے اب اس نے جواب دینے میں تامل کیا۔ لیکن عثمان کی نرم گفتگو سے وہ بہت جلد پھر اپنے راستے پر آگئی۔ اور کہنے لگی "شبو رات کو اُسے اپنے ساتھ گھر لایا تھا۔ اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ پھر اس سے کہا۔ کہ ذرا میرا اسباب بندھوا دے۔ میں لاہور سے باہر جاؤنگا۔ اس سے بستر ٹرنک وغیرہ بندھوایا۔ پھر ایک ٹانگہ منگوایا۔ اور چار آنے کے پیسے اس کی جیب میں ڈال دیئے"

یہ کہکر بڑھیا چُپ ہوگئی۔ اور پھر پروفیسر صاحب کی منتوں خوشامد میں مصروف ہوگئی۔

پروفیسر صاحب نے پُوچھا "پھر کیا ہوا؟" مگر عثمان نے کہا "بس یہ سب کچھ کس طرح ہوا۔ صاف طور پر میری نظروں میں ہے۔ مجھے اب ان سے اور کچھ پُوچھنے کی ضرورت نہیں۔ اس نے سب انسپکٹر کو بلایا اور کہا۔ "آپ انہیں اپنے ساتھ لے جائیں۔ اور جگو کی تلاش سے دست بردار ہو جائیں"

معلوم ہوتا تھا۔ کہ سب انسپکٹر عثمان سے بہت مرعوب ہو چکا ہے۔ وہ عثمان کی تعریفیں کرنے لگا۔ اور اپنی پہلی بدتمیزی کی معافی چاہی۔ پھر وہ ایک تانگہ لایا۔ اور شوداس اور چیختی چلاتی بڑھیا اور صندوقچے کو ساتھ لے روانہ ہوگیا۔ اور عثمان ایک آرام کرسی پر دراز ہوگیا۔

(۹)

پروفیسر صاحب کی خوشی کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔ اور میں تو اس سے متعارف ہونے کی عزت سے اس قدر مسرور

تھا۔ کہ جیسے کسی امتحان میں کامیابی حاصل کر کے بھی اتنی خوشی نہ ہوئی تھی۔ میں نے کہا۔ "ہاں اس معاملے کا سب سے زیادہ دلچسپ حصہ تو ابھی باقی ہے۔ آپ نتائج پر کس طرح پہنچے تھے۔ یہ تو بیان فرمائیے"

عثمان نے جیب سے سگار بکس نکالا اور ہم دونوں کو پیش کرنے کے بعد ایک سگار خود سلگایا۔ اور تین چار بڑے بڑے کش لگا کر بولا۔ "یقین مانئے شرلک ہومز ایک خیالی چیز ہو لیکن اس کا طریق سراغرسانی' اور طرز استدلال صرف کانن ڈائل کی تخیل نہیں ہے۔ ایک حقیقت ہے۔ کوشش اور محنت کا انسان شرلک ہومز نہ بن سکے۔ تو اس کے قریب قریب پہنچنے کے بعض ذرائع موجود ہیں۔ مگر خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ یہ تفتیش ہر ایسے شخص کے لئے جس نے شرلک ہومز کے کارنامے سرسری نظر سے بھی پڑھے ہوں ایک ذرا سا دلچسپ مشغلہ تھا۔ جس کی تفصیل بیان کرنے سے بھی مجھ کو شرم آتی ہے۔ یقین مانئے اس میں دماغ خرچ کرنے کا موقع ذرا بھی نہ تھا۔ تمام واقعات اظہر من الشمس تھے۔ جس وقت آپ مجھے داستان سنا رہے تھے۔ تو آپ کے بیان سے تو مترشح ہوتا تھا کہ جگو ملزم ہے۔ لیکن میں حتی الامکان کوشش کر رہا تھا۔ کہ تمام معاملہ سنے بغیر کوئی رائے قائم نہ کروں تمام داستان سننے کے بعد میں نے پروفیسر صاحب سے چند سوالات کئے اور موم بتی دیکھی۔ اتنے ہی سے میرا خیال یہ ہو گیا تھا کہ جگو بیگناہ ہے۔

"آپ نے مان لیا تھا کہ جب آپ نے بجلی کا مین سوئچ دبایا۔ تو جگو کے کمرے کا لیمپ جل اٹھا تھا۔ میں نے سوچا کہ لیمپ کیوں جلا؟ اگر جگو نے چوری کی ہوتی۔ یا وہ اس میں شریک ہوتا۔ تو کیا یہ ممکن تھا کہ وہ پہلے اپنے کمرے کی بجلی جلاتا۔ اور تمام گھر میں روشنی کرنے کے بجلی کا مین سوئچ بند کرنے جاتا؟ اس کا ایک حل ممکن تھا۔ کہ اس نے اس قدر دور اندیشی سے کام لیا ہو۔ کہ پہلے مین سوئچ بند کیا ہو۔ اور پھر واپس آ کر اپنے کمرے کی بجلی کا بٹن اس خیال سے دبا دیا ہو کہ بعد میں میرے بیان کی صداقت ظاہر ہو جائے۔ لیکن میرے خیال میں ہندوستان میں جرم کی اتنی نشوونما نہیں ہوئی۔ اس امر کی ایک تیسری توجیہہ بھی ممکن تھی۔ کہ جگو نے کسی کے ساتھ مل کر صندوقچہ چرایا ہو۔ اور اس نے اپنے ساتھی کی آمد کی یہ نشانی مقرر کر رکھی ہو۔ کہ جب بجلی جلانے سے نہ جلے تو یہ بھی اس کی امداد کو نکل آئے۔ مگر جگو جیسے ڈرپوک آدمی سے اور خصوصاً ایسی حالت میں کہ اس نے اپنی تمام زندگی آپ کے پاس ایمانداری سے گزاری تھی۔ یہ توقع نہ ہو سکتی تھی کہ وہ اتنی دلیری کر سکتا۔

"جو موم بتی آپ نے دکھائی۔ وہ ابھی بالکل نہ جلی

تھی۔اس کا موم ابھی جلنا شروع بھی نہ ہوا تھا۔بلکہ صرف اس کی اندر کی بتی ہی استعمال ہوئی تھی۔اگر جگو وہاں پہلے سے موجود ہوتا یا اس نے جرم میں حصہ لیا ہوتا تو موم بتی بہت کچھ جل جاتی۔یہ موم بتی غالباً دو تین منٹ جلی تھی۔ ان امور کے باعث اور پھر اس وجہ سے بھی کہ اگر جگو نے خود صندوقچہ چرایا۔یا کسی اور کو دیا۔ تو پھر اس تمام واقع کے بعد وہ الماری میں کیا دیکھ رہا تھا! مجھے یہ خیال ہو گیا۔کہ چوری جگو نے نہیں کی لیکن اس امر کا ٹھیک فیصلہ میں نے موقع کے مشاہدے تک ملتوی رکھا۔

جب میں اس کمرے میں پہنچا ہوں۔تو وہاں میں نے زمین پر پیروں کے نشان دیکھے۔ان میں سے ایک نشان نصف پاؤں یعنی پنجے کا تھا۔معلوم ہوتا تھا۔کہ یہ چور کا پاؤں ہے۔ وہ شور کے خیال سے ایڑیاں اُٹھا اُٹھا کر چلتا ہوگا۔یہ نشان کھڑکی میں بھی موجود تھا۔اور کھڑکی سے دونوں دروازوں تک گیا تھا۔گویا چور نے اطمینان کرنا چاہا تھا۔کہ اب لوگ سو رہے ہیں یا نہیں۔ اب مجھے خیال ہوا۔کہ اگر جگو اس چوری میں شریک ہوتا تو چور یہ تکلیف خود نہ اُٹھاتا۔بلکہ میری رائے میں وہ خود باہر ٹھیرتا۔اور اندر کا تمام کام جگو کے سپرد کرتا۔دفعتاً مجھے خیال آیا۔کہ آپ جب کھڑکی میں سے کودے تھے۔تو آپ کو معلوم ہوا تھا کہ نیچے شیشے کی کرچیں ہیں۔

یہ کرچیں اس شیشے کی تھیں۔جو چور نے کھڑکی سے اُتار کر نیچے رکھ دیا تھا۔میں نے سوچا کہ چور ننگے پاؤں تھا۔ اگر وہ کھڑکی میں سے کودا ہوگا۔ تو اُسے ضرور زخم آیا ہوگا چنانچہ جب میں نے شیشے کی کرچوں کو جمع کیا۔تو دیکھا۔ کہ شیشے کے بعض ٹکڑوں پر خون کے نشان موجود ہیں۔ اس سے مجھے یقین ہو گیا۔کہ جو بھی چور تھا۔کودتے وقت اس کے پیروں میں شیشے سے زخم لگا ہے جب مجھے اطمینان ہو گیا۔کہ جگو کے پیروں میں جوتیاں تھیں۔اور اُسے کوئی چوٹ نہ آئی تھی۔ تو اس سے میرے اس خیال کو اور بھی تقویت پہنچی۔کہ جگو نے صندوقچہ نہیں چرایا۔ اور نہ اس کا اس معاملے سے اور کچھ تعلق ہے لیکن چابیوں سے تالا کس طرح کھلا۔یہ ابھی تک ایک معمہ تھا۔جسے میں حل نہ کر سکا تھا۔لیکن محض اس بنا پر میں نے جگو پر شبہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔اب میں نے خیال کیا۔کہ جگو نے صندوقچہ نہیں چرایا۔ اور نہ اس کا اس معاملے سے کوئی خاص تعلق ہے۔دوسرا شخص جسے صندوقچے کے متعلق علم تھا۔شودا سن تھا۔میں نے پہلے اس کے متعلق اطمینان کرنا مناسب سمجھا۔اس کے متعلق مجھے دو باتیں کھٹکیں تھیں ایک تو یہ کہ اس نے باتوں باتوں میں آپ کے گھر کا نقشہ سمجھ لیا تھا۔اور دوسرے تمام زیور وغیرہ دیکھنے کے بعد اپنا لاہور سے باہر جانا ظاہر کیا تھا۔بہت ممکن ہے۔

کہ اسے اسی وقت زیور کے چرانے کا خیال سوجھا ہو اور اس نے اسی خیال سے اپنا باہر جانے کا ارادہ ظاہر کیا ہو۔ کہ اس پر کسی کو شبہ نہ ہو سکے۔ گو یہ باتیں کمزور تھیں مگر اس کے متعلق اطمینان کر لینے میں کچھ اندیشہ نہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر اس نے چوری کی ہے تو مسروقہ زیور اس کے گھر میں ہوگا۔ کیونکہ اس کے اپنے خیال کے مطابق کسی کو اس پر شبہ نہ ہو سکتا تھا۔ اس نے باہر جانے کا ذکر محض اپنے آپ کو بری ظاہر کرنے کو پیش کیا ہوگا اور دوسرے اگر اس نے چوری کی ہے تو اس کے پیروں میں شیشے سے زخم بھی پہنچ چکے ہونگے۔

"میں نے آپ کے اس ذہین طالب علم کو دو خیالوں کی وجہ سے اس کے گھر بھیجا۔ ایک تو اس خیال سے کہ ذرا اس کا رویّہ معلوم ہو جائے۔ اور دوسرے اس وجہ سے کہ چور ذرا سی بات سے ڈر جاتا ہے۔ اگر اس نے چوری کی ہے۔ تو محض ایک گمنام شخص کا اس سے ملنے کو جانا اس کے دل میں طرح طرح کے شبہے پیدا کر دے گا۔ اور وہ مال مسروقہ کو کسی محفوظ جگہ پہنچانے کی کوشش کریگا۔ چنانچہ اس مقصد میں کامیاب ہو کر میں نے یہ ارادہ کیا کہ اب کسی طرح یہ معلوم کروں۔ کہ شوداس واقعی گھر میں موجود ہے یا نہیں۔ میں نے ان کو تو اسی خیال سے وہاں ٹھیرایا کہ یہ خیال رکھیں کہ کوئی مکان میں آنے جانے نہ پائے۔

اور اگر مال مسروقہ اس کے گھر میں موجود ہو۔ تو وہ اس کو کہیں اور منتقل نہ کر سکے۔ اور خود مزید اطمینان کی غرض سے یہ ترکیب کی۔ کہ تار والے کا لباس پہنا۔ اور ایک تار کا لفافہ ہاتھ میں لے کر اس کے گھر پہنچا۔

"جب وہاں پہنچا تو دیکھا۔ کہ یہ اپنی متعینہ جگہ پر موجود نہ تھے۔ چنانچہ مجھ کو کسی قدر یقین ہو گیا۔ کہ میں درست سراغ پر ہوں۔

"میں نے دروازے پر جاکر بابوجی۔ تار والا' کہہ کر آواز دی۔ تین چار آوازیں دینے کے بعد اندر سے آواز آئی 'اندر آجاؤ' میں اندر گیا۔ تو دیکھا کہ سامنے کوئی نہ تھا۔ شوداس شاید اندر دروازے میں سے جھانک کر اطمینان کرنا چاہتا تھا کہ واقعی تار والا ہے۔ یا کوئی پولیس والا۔ جب میرا لباس وغیرہ دیکھ کر اسے کچھ شک و شبہ نہ پڑا۔ تو وہ باہر نکل آیا۔ اور تار مجھ سے لے لیا۔ اسی وقت مجھے دکھائی دیا۔ کہ اس نے پیر پر پٹی باندھ رکھی ہے۔ تار لے کر اس نے پنسل کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ اور میں نے پنسل کی بجائے ہتھکڑی نکال کر اس کے ہاتھوں کی تواضع کی۔ وہ بھڑکا۔ مگر میرے ہاتھ سے کہاں جا سکتا تھا۔"

میں نے کہا۔ "اگر آپ کا خیال شوداس کے متعلق غلط ہوتا۔ اور آپ دیکھتے کہ اس کے پیر پر زخم بھی نہیں تو پھر آپ کیا کرتے۔

عثمان نے جواب دیا "میں بات ٹال دیتا۔ اور کہہ دیتا۔ کہ میں غلط پتہ پر آگیا۔ یہ تار کسی اور کے نام تھا"

اس کے بعد میں نے بڑھیا کی گرفتاری کی تفصیل سُنائی جس سے عثمان بہت خوش ہوا۔ اور بولا "یہ واقعہ نہایت ہی معمولی تھا۔ اس کی تفصیل سُناتے وقت مجھے بے انتہا شرم آرہی تھی۔ لیکن پروفیسر صاحب یہ تفصیل میں نے اس لئے سُنائی ہے۔ کہ آپ کا طالب علم مجھے ہونہار معلوم ہوتا ہے اور میرا خیال تھا کہ شاید یہ تفصیل ان پر کچھ اچھا اثر ڈال سکے اور یہ اس فن میں دلچسپی لینے لگیں"۔

میں نے دلی شکریہ ادا کیا۔ پروفیسر صاحب کی نظروں سے داد ظاہر تھی۔ اور میں تو گویا اس پر مٹ رہا تھا۔ پروفیسر صاحب نے تمام داستان سُننے کے بعد پھر اس سے گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور کہا "جگو بیچارہ ــــــ"

عثمان بات کاٹ کر بولا "وہ ڈر کے مارے بھاگ گیا آپ مطمئن رہیے وہ عنقریب واپس آجائیگا"۔

میں نے پوچھا "لیکن آپ نے سب انسپکٹر صاحب کی پگڑی کے متعلق پھبتی کیسے کہی تھی۔ ان کے چہرے سے تو صاف ظاہر ہوتا تھا۔ کہ آپ کا خیال صحیح ہے"۔

عثمان نے ایک قہقہہ لگا کر کہا "اس کی پگڑی نسواری رنگ کی تھی۔ اور شلوار پر بھی ایک دو نسواری رنگ کے دھبے پڑے تھے۔ اس رنگ کے دھبے اسی صورت میں اس کی شلوار پر پڑ سکتے تھے۔ کہ اس نے اپنی پگڑی خود رنگی ہو"

پھر اس نے مجھ سے کہا "آج تم سے مل کر اور اس مختصر سی واردات میں اکٹھے شریک ہو کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ تم مجھے ہونہار معلوم ہوتے ہو۔ اگر کسی وقت تم مجھے ملنے کے لئے میرے گھر پر آؤ۔ تو مجھے بہت خوشی ہوگی"۔

اس نے اپنی جیب میں سے ایک کارڈ نکال کر مجھے دیا۔ جس پر اس کا مفصل پتہ درج تھا۔ اس کے بعد اس نے مفصل طور پر اپنا پتہ مجھے سمجھایا۔ اور ہم دونوں سے بہت گرمجوشی سے مصافحہ کر کے بولا "میں آپ لوگوں کا بے حد مشکور ہوں کہ آپ کی بدولت میری آج کی شام نہایت لطف میں گزری"۔

پروفیسر صاحب نے بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ اور وہ مُسکراتا ہوا رخصت ہوگیا۔

میں گھر واپس آیا۔ تو مجھے خیال ہو رہا تھا۔ کہ کہیں یہ سب باتیں خواب تو نہ تھیں۔ تمام واقعات کیسے فوری طور پر اور حیرت انگیز پیرائے میں وقوع ہو گئے تھے۔

آئندہ روز میں پروفیسر صاحب کے ہاں گیا۔ تو دیکھتا ہوں کہ جگو اپنے کام میں بدستور مشغول ہے اور اسقدر خوش معلوم ہوتا ہے جیسی خوشی آدم کو اس وقت ہوتی۔ اگر اسے باغ فردوس میں دوبارہ جانیکی اجازت مل جاتی۔

امتیاز علی تاج

لالۂ صحرا

دشت

فضا سے دشت میں چھائی ہے ویرانی سی ویرانی
پھر اس پر سوزشِ گرما ہے وقفِ شعلہ سامانی

ہر اک جانب غبارِ ناتواں اٹھتا ہے ذرّوں سے
کہ پیچ و تاب ہیں اس کے ہے دود آسا پریشانی

رواں ہے موج اندر موج لو جھلسی ہوئی ایسے
کہ گویا بحرِ ذاخر میں بپا ہو جوشِ طغیانی

فضا میں ایک ہیبت زا ادا سی رقص کرتی ہے
بگولے دوڑتے ہیں صورتِ غولِ بیابانی

وہ منظر ہے کہ آنکھوں میں پھریں حسرت کی تصویریں
وہ منظر ہے کہ خوابِ عیش کی نکلی ہیں تعبیریں

نخلستان

مگر شاداب خطہ بھی ہے اک اس دشتِ ویراں میں
کہ نزہت کام آئی جس کی تخلیقِ گلستاں میں

سمائی ہے سکونِ غم کی عشرت ذرّے ذرّے میں
تلاطم ہے نہاں لیکن ہوا کی موجِ لرزاں میں

یہاں دو پاک روحیں عشق کا دربار کرتی تھیں
کہ ہیں نغمے انہیں کے نالہائے عندلیباں میں

انہیں سے روشنی یہ مل گئی ہے ماہِ تاباں کو
انہیں سے آتی ہیں یہ سُرخیاں لعلِ بدخشاں میں
محبت ان کی تھی آئینہ دارِ نورِ یزدانی
وُہ نکلے عرش پر جا کر جو ڈوبے بحرِ عصیاں میں

وہیں تربت بنی تھی اک شہیدِ بیقراری کی
کہ پیہم دوسرے نے اس پہ برسوں اشکباری کی

لالہ صحرا

ہُوئی آخر کسی کی مرہمِ زخمِ جگر پیدا
ہُوا اس دشت میں اک غنچۂ رنگیں اثر پیدا
مرادوں کے شگوفے کھل گئے غربت کی وادی میں
نہالِ عاشقی میں ہو گئے یعنی ثمر پیدا
محبت پھوٹ نکلی کاروانِ رنگ و بو ہو کر
اچانک ہو گیا ذرّوں میں عشقِ فتنہ گر پیدا
ہُوئے اس شمع کے جلنے سے دل کے بتکدے روشن
فریبِ آرزو کرنے لگا حسنِ نظر پیدا

وہی اک لالہ صحرا فروزاں ہے وہاں ابتک
بہارِ عاشقی کی رُوح خنداں ہے وہاں ابتک

عابد

مستِ شباب

اس کی آنکھوں میں ایسے خندہ ہائے عشق نواز پائے جاتے ہیں جنہیں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موسم بہار نے اپنے سب سے زیادہ شاعرانہ تبسمات اُس میں ودیعت کر رکھے ہیں۔

گلہائے نوشگفتہ کے الوانِ لطیف اس کے رخساروں میں موجزن نظر آتے ہیں۔ میری آنکھوں کے سامنے "جوان لڑکی" شعر و بہار سے مرکب ایک رُوح پرور مرقع پیش کر رہی ہے۔

وہ سرسبز مرغزاروں میں تختہ ہائے گل کے درمیان اِک تیتری کی طرح اُڑتی ہوئی گزری۔

میری آنکھیں بھی ایک والہانہ انجذاب کے ساتھ اُس کے پیچھے کھنچتی ہوئی چلیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ اِک پھولوں کے تختہ میں بیٹھ گئی اور بدائع فطرت کے سامنے اپنی محبّت پیش کرنے لگی۔ اُس وقت اُس کی لبوں پر ایک شیریں تبسّم تھا۔

بہار کے پرندے اور تیتریاں اس کے آس پاس اُڑ رہی تھیں۔ اور وہ اُسے بہار کا ایک نوشگفتہ پھول خیال کرتی تھیں۔

میں نے چاہا کہ دوڑ کر اس پیکرِ حسن و محبت کے قدموں پر گر پڑوں۔ مگر میں ڈرا کہ وہ کہیں اڑ نہ جائے۔

(ماخوذ از ترکی) **ابوالمحاسن محمود علی**

غزل

زندگی کو حباب کہتے ہیں ۔۔۔ آرزو کو سراب کہتے ہیں
تو سمجھتا ہے جس کو بیداری ۔۔۔ اہلِ دل اس کو خواب کہتے ہیں
رقصِ برقِ جمال ہے دل میں ۔۔۔ کم نظر اضطراب کہتے ہیں
کاش آغوشِ شوق ہو تیرا ۔۔۔ جس کو حسن المآب کہتے ہیں

مستِ خمخانۂ ازل ہے اثرؔ
لوگ رندِ خراب کہتے ہیں

اثرؔ صہبائی

گورا

مصنفہ رابندرا ناتھ ٹیگور — مترجمہ عبدالستار خاں

باب (۵) پانچواں

انندامائی نے اپنے شوہر کے عبادتکدے کی کنڈی کھٹکھٹائی اور آواز دیکر کہا: "سُنتے ہو! میں اندر نہیں آنا چاہتی ڈرو نہیں۔ مَیں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ آجکل تم کو نئے سنیاسی کا ساتھ ملا ہے۔ پھر کا ہیکو کئی دنوں تک تمہاری صورت نظر آئیگی۔ اسی لئے مَیں یہاں آئی تھی۔ جب تم اپنا وظیفہ ختم کرلو تو ایک منٹ کے لئے ضرور آنا۔" وہ کہہ کر اپنے کام کاج میں مصروف ہوگئی۔

کرشن دیال بابو سیاہ فام میانہ قد اور گٹھیلے بدن کے آدمی تھے آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ ڈاڑھی خوب گھنی اور بالکل سفید تھی۔ مونچھیں بھی بڑی بڑی تھیں کپڑے ریشمی پہنتے تھے۔ کھڑاؤں پہنے رہتے اور ہاتھ میں ہندو سادھوؤں کی طرح پیتل کا کمنڈل لئے رہتے۔ سر پہ چاند تھی پچھلے حصّے میں بال بڑے بڑے تھے۔ اُن کا جوڑا سر پر کھڑا باندھ لیا کرتے۔

ایک وہ زمانہ تھا۔ کہ جب وہ کمسریٹ میں ملازم تھے۔ اور فوج کے ساتھ ساتھ بنگال سے باہر گھوما کرتے تھے۔ تو فوجی سپاہیوں کے ساتھ ہر قسم کا گوشت کھاتے، اور خوب شراب پیتے۔ اس وقت ہندو مذہب کے رسم و رواج کی پابندیوں کو توڑنا۔ پنڈتوں سنیاسیوں اور مذہبی خیالات کے آدمیوں کی مذمت کرنا اخلاقی جرأت خیال کرتے تھے۔ مگر آج ذرا ذرا سی مذہبی باتوں کا بڑا خیال ہے۔ اگر کوئی سنیاسی مل جاتا ہے تو اُس کی خدمت میں گھنٹوں محض اس امید میں حاضر رہتے ہیں۔ کہ انہیں عبادت کا کوئی نیا طریقہ معلوم ہو جائے۔ ان کو نجات حاصل کرنے کے آسان طریقے کی بڑی جستجو تھی۔ اور خاص بزرگوں کے علم سینہ سے بہرہ مند ہونے کی حرص۔ جس زمانہ میں وہ "تانتر" طریقے پر عمل کر رہے تھے اس وقت ایک بدھ مذہب کے سادھو سے ملاقات ہوگئی۔ اُس کی تلقین کی وجہ سے اُن کے دل میں دوبارہ شکوک و اوہام آنے لگے۔

جب کرشن دیال کی عمر صرف ۴۰ سال تھی اُس وقت اُن

کی پہلی بیوی سے لڑکا پیدا ہوا۔ اور بیوی کا زچگی میں انتقال ہوگیا۔ کرشن دیال کو سخت صدمہ ہوا۔ اُن کی حالت یہ ہوگئی کہ اس بچہ کو جو اپنی ماں کی موت کا باعث ہوا تھا دیکھ نہ سکتے تھے۔ اس لئے اس کو اپنے خسر کے حوالہ کیا اور اسی حالت میں مغرب کی طرف کہیں چلے گئے۔ لیکن کچھ ہی مہینے کے اندر اُن کی حالت تبدیل ہوگئی اور بنارس میں ایک زبردست پنڈت کی پوتی سے شادی کرلی جس کا نام اندرا مائی تھا۔ وہیں اُن کو کمسریٹ میں ملازمت مل گئی۔ اور انہوں نے اپنی کارگزاریوں اور چالاکیوں کی وجہ سے اپنے افسروں کی خوشنودی حاصل کرلی۔ اُن کے دادا کے انتقال کے بعد اس خاندان میں کوئی ایسا شخص نہ رہ گیا جو ان کی خبرگیری کرتا۔ اس لئے کرشن دیال اپنی بیوی کو اپنے ہمراہ رکھنے پر مجبور ہوگئے۔

اسی زمانہ میں غدر شروع ہوگیا۔ کرشن دیال نے بڑے بڑے افسروں کی جانیں بچائیں۔ ان کو اپنے یہاں چھپایا۔ اور بڑی بڑی ترکیبیں کیں۔ غدر فرو ہونے کے بعد ان کو اس وفاداری کے صلہ میں خطاب، عزت اور جاگیر ملی۔ لیکن تھوڑے دنوں بعد انہوں نے ملازمت سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ اور بنارس میں گورا کو لیکر رہنے لگے۔ جب گورا پانچ سال کا ہوا۔ تو انہوں نے بنارس چھوڑدیا۔ اور کلکتہ میں جا رہے۔ وہاں انہوں نے اپنے بڑے لڑکے مہم کو اپنے نانا کے یہاں سے بلوالیا۔ اور تعلیم دینا شروع کردیا۔ تھوڑے دنوں بعد مہم کو اپنے والد کے مربیوں کی بدولت سرکاری خزانہ میں ایک جگہ مل گئی۔ اور وہ وہاں بڑی تن دہی و محنت سے کام کرنے لگے۔

گورا بچپن میں بڑا شریر تھا اور اسکول اور محلہ کے لڑکوں کا سرغنہ۔ اُسے مدرسہ میں اپنے ماسٹروں سے شرارت کرنے میں بڑا لطف آتا۔ اور اُن کی زندگی تلخ کئے رہتا تھا۔ جب اُس کی عمر کچھ اور زیادہ ہوئی تو اُس نے طلبا کا نیشنل کلب (قومی کلب) قائم کیا۔ جس میں طلبا شریک ہوکر قومی گیت گاتے۔ اور گورا انگریزی میں لکچر دیا کرتا تھا۔ اس طرح تھوڑے ہی دنوں میں وہ کم سن باغیوں کا مشہور لیڈر بن گیا۔ رفتہ رفتہ اسی جمعیۃ الطلبا کی مجلسوں میں تقریر کرتے کرتے اس کو اتنی تقویت ہوگئی کہ عام جلسوں میں نہایت اچھی تقریریں کرنے لگا۔ کرشن دیال اس کو ایسی تقریریں کرتے ہوتے دیکھکر بہت خوش ہوتے تھے۔

گورا کی دُور دُور تک اچھی خاصی شہرت ہوگئی۔ لیکن گھر والے اس کا چنداں خیال نہ کرتے تھے۔ صرف مہم اپنی سرکاری ملازمت کی وجہ سے اُسے اپنی سرگرمیوں سے باز رکھنا چاہتا تھا۔ وہ اکثر گورا کو طعنے دیا کرتا اور اُس

[redacted]

کا مضحکہ کرتا تھا۔ کبھی اُسے بنگلا بھگت اور کبھی طنزاً اُسے ہرش مکرجی ثانی کہا کرتا تھا۔ بعض وقت اسی وجہ سے دونوں میں ہاتھا پائی کی نوبت آجاتی تھی۔ گورا کو بدیشی اور خصوصاً برطانوی ساخت کی چیزوں سے سخت نفرت تھی جس سے اکثر آنند امائی کو دلی کوفت ہوتی۔ اور وہ اُس کے خیالات میں تبدیلی پیدا کرنے کی اکثر سعی لاحاصل کیا کرتی تھی۔ گورا انگریزوں کی مخالفت کرنے سے بڑا خوش ہوتا۔ اس زمانہ میں گورا کشیب چندر کی فصاحت سے مسحور ہو رہا تھا۔ اور اس کا رجحان برہمو سماج کی طرف زیادہ تھا۔

ایسی حالت میں یکایک کرشن دیال کے خیالات نے پلٹا کھایا۔ اور وہ اپنے مذہب کے سخت پابند ہو بیٹھے۔ اُن کا تعصب اتنا بڑھ گیا کہ اگر احیاناً گورا اُن کے کمرے میں چلا جاتا تو اُنہیں سخت ناگوار گذرتا تھا۔ اُنہوں نے مکان کا ایک حصہ اپنے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ اور اپنے کٹرپنے میں اتنا غلو کرنے لگے تھے کہ انہوں نے دروازہ پر ایک تختے پر "صومعہ" لکھا کر آویزاں کر رکھا تھا۔ گورا کی طبیعت اپنے والد کے طریقوں کو دیکھ دیکھ کر برگشتہ ہو گئی تھی۔ وہ کہتا تھا "میں یہ تمام باتیں برداشت نہیں کر سکتا۔ اور نہ مجھ سے یہ ہو سکتا ہے۔" وہ اتنا برافروختہ ہو رہا تھا کہ اس نے اپنے والد سے سب تعلقات قطع کرنے کی ٹھان لی تھی۔ لیکن آنندامائی نے بیچ میں پڑ کر بڑی مشکلوں سے اس معاملہ کو رفع دفع کیا۔

گورا اپنے والد سے ملنے والے پنڈتوں کی بڑی خبر لیا کرتا تھا۔ اس کے ان سے بحثنے کو مباحثہ نہیں کہہ سکتے بلکہ اُس کی باتیں ایسی ہوا کرتی تھیں۔ گویا وہ طمانچے مارتا ہو۔ یہ پنڈت زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے۔ مگر اُن کو اپنے امتیاز پر بڑا فخر تھا۔ وہ گورا کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے اور اس کے نام سے سہم جاتے تھے۔

لیکن ان پنڈتوں میں ایک شخص ایسا تھا جس کی گورا بہت جلد بڑی تعظیم کرنے لگا۔ اس شخص کا نام ودیاباگیش تھا۔ اُس کو کرشن دیال بابو نے ویدانت فلسفہ سمجھانے کے لئے مقرر کیا تھا۔ پہلے پہلے تو گورا اس سے بھی بدتہذیبی سے پیش آیا۔ اور اپنے مباحثہ سے زیر کرنا چاہا۔ لیکن اس کے سامنے ایک نہ چلی اور خود ہی بے بس ہو گیا۔ یہ شخص صرف فلسفہ ویدانت کا ماہر ہی نہ تھا بلکہ تعصب تو اُسے چھو نہ گیا تھا۔ گورا کو خواب میں بھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ صرف سنسکرت کے شلوک پڑھنے والے ذہین۔ نکتہ سنج اور دقایق رس بھی ہوتے ہیں۔ اور ان میں انتہائی قابلیت بھی ہوا کرتی ہے۔ ودیاباگیش بڑا سنجیدہ طبیعت اور مستقل مزاج شخص تھا۔ اس کا طریقہ کچھ ایسا تھا کہ گورا آپ ہی آپ اس کا حد سے زیادہ احترام کرنے لگا۔ گورا

نے ان سے ویدانت فلسفہ پڑھنا شروع کیا۔ اگرچہ کچھ کن وہ ادھورا نہ چھوڑتا تھا۔ اس لئے وہ بڑی محنت سے مطالعہ میں مشغول ہو گیا۔

اسی زمانہ میں جب گورا نے ویدانت فلسفہ پڑھنا شروع کیا تھا ایک انگریز پادری نے ہندوؤں اور ان کے مذہب پر سخت حملے کئے تھے۔ اور ایک اخبار میں یہ بحث چھیڑ کر مباحثہ کا چیلنج دیا تھا۔ اگرچہ اس وقت تک گورا خود ہی اپنے مذہب اور اپنے رسم و رواج پر طرح طرح کے اعتراضات کیا کرتا تھا۔ تو بھی اس پادری کی جسارت دیکھ کر وہ آگ بگولا ہو گیا۔ اسے اس وجہ سے غصہ آگیا کہ ہندوؤں کی توہین ایک اجنبی نے کی تھی اور فوراً اس قضیہ میں شریک ہو کر مدافعت کرنا شروع کر دی۔ اس نے ایک اعتراض کو بھی قبول نہ کیا چند خطوط کے شائع ہونے کے بعد اخبار کے ایڈیٹر نے اس مباحثہ کو یکلخت بند کر دیا

اس جھگڑے نے گورا کو بیدار کر ہی دیا تھا۔ اب اس نے انگریزی میں ایک کتاب لکھنی شروع کی۔ اور اس میں ہندو مذہب کی خوبیوں کو ایک جگہ جمع کر کے ہندو سوسائٹی کو عقلی و نقلی دلائل سے بے عیب ثابت کرنے کی کوشش کی۔

اس سے یہ ہوا کہ وہ خود ہی ہندو مذہب کی خوبیوں کا قائل ہو گیا۔ وہی جو پہلے ہندو مذہب سے کوسوں بھاگتا تھا۔ اب اس کا گرویدہ ہو گیا۔ اور اس کا حد سے زیادہ احترام کرنے لگا۔ اور کہنے لگا۔ کہ اب ہم اپنے ملک کو اجنبی عدالت کے سامنے مجرم کی حیثیت سے نہ کھڑا ہونے دینگے اور اپنی ملکی برائیوں اور خوبیوں کو اجنبی قوانین کی میزان میں نہیں تولنے دینگے۔ ہماری خرابیوں اور خوبیوں کا اندازہ مغربی نکتہ نظر سے نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اپنے ملک، اپنے رسم و رواج۔ اپنے مذہب اور مذہبی کتابوں کی تعلیم کو قابل شرم سمجھیں۔ ہمیں اپنے ملکی رسم و رواج کی پابندی پوری پوری کر کے اس پر فخر کرنا چاہئے بس یہی ایک طریقہ ہے۔ جس سے ہم اپنے ملک کی عزت برقرار رکھ سکتے ہیں۔

انہیں خیالات میں سرشار ہو کر گورا مذہبی پابندی کرنے لگا۔ قاعدے کے مطابق گنگا اشنان اور سندھیا کیا کرتا تھا۔ اس نے چوٹی رکھ لی۔ ہر روز صبح اٹھ کر اپنے والدین کے قدموں کی خاک پیشانی پر ملتا تھا۔ اس سے قبل وہ انگریزی تعلیم کے اثر سے مہم کو مجہول اور یاوہ گو کہنے میں ذرا بھی نہ محجوب ہوتا تھا۔ اور خوب ڈانٹتا تھا۔ اب اس کا اتنا احترام کرنے لگا۔ کہ اس کے آتے ہی ادب سے کھڑا ہو جاتا۔ اور آداب بجالاتا تھا۔ مہم اس تبدیلی پر گورا کا بہت کچھ مذاق اڑاتا تھا۔ تاہم وہ کبھی جواب نہ دیتا۔

[redacted]

گورا موہن کے درشن، تلقین اور ذاتی پابندیوں کی وجہ سے نوجوانوں کا ایک گروہ اس کا ہمخیال ہوگیا۔ ان نوجوانوں کو گورا کے ہمخیال ہوتے ہی اس کشمکش سے نجات سی مل گئی۔ جس میں وہ ہمیشہ مبتلا رہتے تھے۔ کیونکہ وہ دو مختلف قوتوں کی کشاکش میں پڑ گئے تھے۔ بعض اوقات وہ اُکتا کر بول اُٹھتے تھے۔ کہ ہم کو اس تفتیش میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں کہ ہم اچھے ہیں یا بُرے ہم مہذب ہیں یا وحشی بلکہ ہم کو اپنی اصلی صورت پہچاننا چاہیے کسی سے ہم کو کیا واسطہ؟

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ گورا کی اس تبدیلی پر کرشن دیال بابو کی خفگی یا خوشی کا کچھ حال معلوم نہ ہوسکا ایک دن تو انہوں نے گورا کو بلوا کر کہا۔ "سنو میاں! ہندو مذہب ایک بہت وسیع مذہب ہے۔ اور ہر شخص کا کام نہیں کہ جس مذہب کی بُنیاد رشیوں نے رکھی ہے اس کی تہ کو پہنچ سکے۔ میری رائے میں تو یہ مناسب نہیں کہ بغیر سوچے سمجھے ہوئے انسان اس پر اتنا مائل ہو۔ جیسا کہ تم معلوم ہوتے ہو اب تک تمہاری سمجھ پختہ نہیں ہوئی ہے۔ اور تم بچے بھی ہو علاوہ ازیں تم کو جو تعلیم دی گئی ہے۔ وہ بھی انگریزی کی تعلیم ہے۔ چنانچہ پہلے جو تمہارا میلان برہمو سماج کی طرف تھا۔ وہ تم جیسے آدمی کے لئے بہت موزوں ہے۔ اسی لئے میں تمہارے اس رجحان سے کبھی ناخوش نہ ہوا۔ بلکہ وہ عین میری مرضی کے مطابق تھا لیکن اب جو طریقہ تم نے اختیار کیا ہے اُسے میں پسند نہیں کرتا اور نہ یہ طریقہ تمہارے لائق ہے۔

گورا۔ اباجان آپ یہ کیا فرماتے ہیں۔ کیا میں ہندو نہیں ہوں۔ اگر آج میں اس مذہب کے دقائق نہ سمجھ سکا تو کل سمجھ لونگا۔ فرض کیجئے کہ میں کبھی بھی نہ سمجھ سکا تو بھی میرا فرض ہے۔ کہ میں ان ہی طریقوں کو اختیار کروں۔ مجھ کو ہندو مذہب کے پورو جنم[51] سے تعلق ہے۔ اور اسی تعلق کی وجہ سے میں اس مرتبہ ایک برہمن کے یہاں پیدا ہوا ہوں۔ اور اسی قوم میں بار بار جنم لے کر نجات حاصل کر لونگا۔ احیاناً کہیں غلطی سے میں نے دوسرا طریقہ اختیار کر لیا۔ تو مجھے دونی رفتار سے اپنی متعینہ شاہراہ پر واپس ہونا پڑیگا۔

کرشن دیال نے سر ہلا کر کہا۔ سنو صاحبزادے ہندو کہنے سے ہندو نہیں ہوجاتا۔ مسلمان[52] ہونا آسان ہے۔ عیسائی ہونا اس سے بھی آسان ہے۔ لیکن ہندو ہونا لوہے

---

[51] پورو جنم ہندوؤں کا عقیدہ ہے۔ کہ انسان اپنے اعمال کے مطابق بار بار پیدا ہوتا ہے۔ اور فنا ہوجاتا ہے۔ حتّٰی کہ جب اُسے خدا کا عرفان ہوجاتا ہے۔ تو اس میں جا کر جذب ہوجاتا ہے۔

[52] مسلمان معلوم نہیں اس سے مُصنّف کی کیا مراد ہے اگر روحانیت یا مذہب کے مکمل ہونے میں شک ہے تو یقیناً مصنّف کی لاعلمی ہے۔ جو ایسے زبردست فلسفی کے لئے عار ہے۔ اس زمانہ میں ضرورت اس کی ہے کہ ہندو اسلام کے سمجھنے کی کوشش کریں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے قول کی پابندی کی جائے۔ (مترجم)

کے چنے چبانا ہے۔

گورا۔ آپ جو فرماتے ہیں۔ لیکن جب میں نے ہندو کے یہاں جنم لیا تو گویا پہلی منزل طے کر چکا ہوں۔ غیر قوموں کیلئے ہندو ہونا مشکل ہے مشکل ہی نہیں بلکہ غیر ممکن ہے۔ اگر میں صراط مستقیم پر ثابت قدمی سے عبادات چلتا رہا۔ تو یقیناً یہ سعی بار آور ہوگی۔

کرشن دیال۔ دلیلوں سے تو میں نہیں سمجھا سکتا جو کچھ تم کہتے ہو وہ اسی معنی میں بالکل صحیح ہے۔ جس مذہب پر بھی تم رہو۔ اپنے اعمال کے مطابق گھوم پھر کر اسی پر آؤ گے۔ جس سے کوئی باز نہیں رکھ سکتا۔ خدا کی یہی مرضی ہے۔ اور ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ ہماری مثال ذرات کی سی ہے۔

پاداش عمل۔ مرضی الٰہی۔ تصوف اور عرفان سب کچھ کرشن دیال کے نزدیک ایک ہی تھا۔ ان میں جو باریک امتیاز ہے وہ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔

باب چھٹا (۶)

کرشن دیال نے صبح غسل کیا اس کے بعد ناشتہ کیا۔ اسکے بعد انہیں اپنی بیوی کے بلانے کا خیال آیا۔ وہ بہت دنوں کے بعد اس کے کمرے میں گئے۔ وہاں اپنے ہاتھ سے سے کمبل بچھا کر اس پر پالتھی مار کر سادھوؤں کی طرح آسن جما کر بیٹھ گئے۔ اُن کی طرز نشست سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ اپنے آپ کو وہاں کے علائق سے بالکل الگ کئے ہوتے ہیں۔

انندامائی نے گفتگو شروع کی۔ اور کہا "آجکل آپ عبادت و ریاضت میں ایسے مشغول ہو رہے ہیں۔ کہ گویا آپ نے کسی سے شرط بدلی ہے۔ گھر بار کا کچھ خیال نہیں مجھے گورا کی فکریں مارے ڈالتی ہیں"۔

کرشن دیال۔ خیر تو ہے یہ فکر کیسی۔

انندامائی۔ میں انہیں ٹھیک ٹھیک تو بیان نہیں کر سکتی لیکن جو کچھ میرے دل میں ہے وہ کہے دیتی ہوں۔ آج کل گورا جس سرگرمی سے ہندو مذہب کی پابندی کر رہا ہے وہ نبھ نہیں سکتی۔ ایک نہ ایک دن کوئی نہ کوئی آفت آئیگی میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ اس کو جینو (زنار) نہ پہناؤ مگر آپ کا ہے کو مانتے ہیں۔ یہ کہہ کر ٹال دیا کہ گلے میں دو دھاگے ڈال دینے سے کیا ہوتا ہے آج انہی دھاگوں کی کرامات کو دیکھئے۔ کہ کیا آفت ڈھا رہے ہیں۔ اور اس کو مذہب میں جذب کئے لیتے ہیں۔ اس کا اب کیا علاج ہے؟

کرشن دیال نے شکایتاً جواب دیا۔ اب تو ساری غلطی تم میرے ہی سر مڑھو گی۔ کیا تم نے پہلے غلطی نہیں کی۔ پہلا قصور تو تمہارا ہی ہے۔ تم نے اُس کو دینے سے انکار

[redacted]

کیا۔ اس وقت تو مجھ کو مذہب وغیرہ کی کچھ پروا نہ تھی لامذہبی کا بھوت میرے سر پر سوار تھا۔ آج جبکہ عقل و تمیز ہوتی تو پھر ایسا ہوتا ہی کیوں؟

انت راما ئی۔ آپ جو چاہیں کہیں لیکن میں یہ نہیں مان سکتی۔ کہ میں نے کوئی غلطی کی ہے۔ بچہ ہونے کے لئے میں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ جس نے جو کچھ کہا میں نے وہی کیا۔ کتنے وظیفے پڑھے۔ کتنی منتیں مانیں۔ کتنے تعویذ پہنے۔ یہ سب مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک دن رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ سفید پھولوں کی ایک ٹوکری میں ٹھاکر جی پر چڑھا رہی ہوں۔ اتنے میں وہ پھول تو غائب ہو گئے اور اُن کی جگہ ویسا ہی گورا چٹا خوبصورت بچہ پڑا ہوا ہے ہے۔ وہ سماں اب تک میری آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ جو کچھ میں نے دیکھا۔ اُس کو کس طرح بیان کروں۔ اس وقت میری آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہنے لگے لیکن جونہی میں نے اُسے گود میں لینے کے لئے ہاتھ بڑھائے میری آنکھ کھل گئی۔ اس کے دس ہی دن بعد 'گورا' خاص خدا کا عنایت کیا ہوا مجھ کو مل گیا۔ اور میری گود میں آبیٹھا۔ بھلا میں اُسے کسی کو دے سکتی ہوں؟ معلوم ہوتا ہے کہ میں نے اپنے پہلے جنم میں اُس کو اپنی کوکھ میں رکھا تھا۔ اور سخت تکلیفیں اُٹھائی تھیں۔ اسی وجہ سے اس جنم میں وہ مجھے ماں کہنے آیا ہے۔ ذرا سوچئے تو وہ ہم تک کس طرح پہنچا ہے۔ اُس دن رات کو ہر طرف مار دھاڑ اور خون خچر مچا ہوا تھا۔ ہم تم اپنی اپنی جانوں کی خیر منا رہے تھے۔ اتنے میں اُس میم نے اپنے یہاں آنکر پناہ لی۔ مارے خوف کے تم اُس کو رکھنے کے روادار نہ ہوتے تھے۔ میں نے اسے آپ کی آنکھ بچا کر گایوں کے کوٹھے میں چھپا دیا۔ اسی رات کو اُس نے بچہ جنا اور مر گئی اگر میں اس یتیم و لاوارث بچے کا خیال نہ کرتی تو وہ بچ سکتا تھا؟ آپ کو کیا فکر تھی؟ آپ تو اُسے ایک پادری کو دینے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ وہ پادری اس کا کون تھا۔ کیا اُس نے اس کی جان بچائی تھی؟ اس طرح ملے ہوتے بچے سے اپنے خاص بچے سے کم محبت ہو سکتی ہے؟ آپ جانے جو کہیں اس لڑکے کو جس نے مجھے دیا ہے جب تک وہی خود مجھ سے نہ لے لے۔ میں اس وقت تک کسی حالت میں اُسے جدا نہیں کر سکتی۔

کرشن دیال۔ خواہ مخواہ کہتی چلی جاتی ہو۔ میں سب جانتا ہوں۔ اپنے گورا کو جیسے چاہو رکھو میں تو ان معاملات میں کبھی دخل نہیں دیتا۔ جب ہم نے اس کو اپنا خاص لڑکا کہہ کر مشہور کیا۔ تو پھر اُس کو جینو پہنانا بھی ضروری تھا۔ اگر ہم ایسا نہ کرتے تو اپنے پرائے اور برادری والے ہم کو کیا کہتے۔ اب صرف دو سال باقی ہیں اور وہی قابل غور ہیں۔ انصافاً تو تم ہی میری سب جائداد کا وارث جانیں

ہے۔ اسی لئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اننداماتی نے بات کاٹ کر کہا۔ آپ کی جائیداد میں کون حصّہ بٹانے لگا ہے۔ جو کچھ آپ کی جائیداد اور دولت ہے۔ وہ سب تم لے لو دے دیجئے۔ گورا ایک پیسہ بھی نہ لیگا۔ خدا کے فضل سے وہ پڑھا لکھا اور قابل ہے خود کما کھا سکتا ہے۔ اور خوشی سے اپنی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ وہ دوسرے کی دولت کا خواہ مخواہ لالچ کیوں کرنے لگا۔ دُنیا میں مجھے کسی چیز کی تمنّا نہیں ہے۔ میرے لئے اتنا ہی بہت ہے۔ کہ وہ زندہ اور خوش رہے۔

کرشن دیال۔ یہ بات نہیں کہ میں گورا کو اپنی جائیداد میں کا کچھ بھی نہ دوں۔ میں اپنی جاگیر اسی کو دُونگا اس جائیداد سے کم از کم ہزار روپیہ سال کی آمدنی ہو گی۔ سب سے مشکل سوال اس کی شادی کا ہے۔ جو کچھ ہُوا ہُوا اب تو چاہے تم خفا ہی کیوں نہ ہو جاؤ میں اس کی شادی کسی برہمن کے یہاں نہیں کر سکتا۔

اننداماتی۔ میں گھر بھر میں گنگا جی کا پانی نہیں چھڑکتی پھرتی۔ اس لئے شاید تم سمجھتے ہو۔ کہ میرا مذہبی احساس مردہ ہو گیا ہے۔ میں خود اس کی شادی برہمن کے یہاں نہیں کر سکتی۔ اس میں خفا ہونے کی کونسی بات ہے۔

کرشن دیال۔ تم خود برہمن کی لڑکی ہو نا اس لئے یہ کہتی ہو!

اننداماتی۔ میں برہمن کی لڑکی ہُوئی تو کیا ہُوا لیکن ایک زمانہ سے میں نے اس نسبی تعلق پر فخر کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ہیم کی شادی میں تو سب ہی برادری والے میرے غیر متعصبانہ رویہ کو دیکھ کر کھچڑی سی پکایا کرتے تھے میں نے جب یہ دیکھا تو خود ہی الگ ہو گئی۔ اور ایک لفظ بھی زبان سے نہ بولی۔ سب ہی تو مجھ کو عیسائن کہتے ہیں یہی نہیں بلکہ جس کے مُنہ میں جو آتا ہے وہ کہتا ہے میں ایک کا بھی جواب نہیں دیتی اور خاموش سُنا کرتی ہوں۔ اگر کچھ کہا بھی تو یہی کہ عیسائی آدمی نہیں ہوتے۔ اگر تم ہی خُدا کے سب سے زیادہ محبوب بندے ہو اور تم ہی سب سے اشرف و اعلےٰ ہو تو پھر اس خُدا نے پہلے پٹھانوں۔ اس کے بعد مغلوں اور اب انگریزوں کے آگے تمہارے سر کیوں جھکا دیئے۔ اور تم کو ایسی پستی میں کیوں ڈال دیا اور ان لامذہبوں کے ہاتھوں میں مُلک کی عنانِ حکومت کیوں دی؟

کرشن دیال نے کچھ بے صبری سے کہا "یہ ایک طویل قصّہ ہے۔ اس کو چھوڑو۔ تم عورت ذات ہو ان تمام معاملات کو اچھّی طرح نہیں سمجھ سکیں۔ کم از کم اتنا تو ضرور جانتی ہو کہ جماعت اور برادری یہی دو چیزیں ہیں جن کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔

اننداماتی۔ مجھے اس کے سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے لیکن میں یہ ضرور سمجھتی ہوں کہ جب میں نے گورا کو اپنے

خاص بچے کی طرح پرورش کر کے اتنا بڑا کیا ہے۔ اور اب تعصب برتنے لگوں۔ تو اس سے صرف برادری ہی کو نقصان نہ پہنچے گا۔ بلکہ میرا ضمیر بھی سخت مجروح ہو جائیگا میں تو مذہب ہی کے خوف سے سب سے کہہ دیتی ہوں کہ میں متعصبانہ رسم و رواج کی پابند نہیں ہوں جس کی وجہ سے میں ہدف ملامت بنتی ہوں۔ مگر پھر بھی اپنا کام کئے جاتی ہوں میں نے صرف ایک ہی بات چھپا رکھی ہے جس سے رات دن خدا کے خوف کے مارے سہمی جاتی ہوں۔ خدا جانے اس کی کیا پاداش بھگتنی پڑے۔ سنئے! میں چاہتی ہوں۔ کہ گورا سے سب باتیں صاف صاف کہہ دی جائیں۔ اس کے بعد جو کچھ قسمت میں لکھا ہوگا وہی پیش آئیگا۔

کرشن دیال نے بہت پریشان ہو کر کہا "ہرگز نہیں میں جب تک زندہ ہوں اس وقت تک یہ بات کسی طرح ظاہر نہ ہونے پاتے۔ تم گورا کی طبیعت سے واقف ہو۔ خدا جانے وہ کیا کچھ کر بیٹھے۔ اس کے علاوہ برادری میں ایک بڑا جھگڑا پیدا ہو جائیگا۔ ان سب باتوں سے بڑھ کر تو یہ ہے کہ گورنمنٹ بھی بہت تنگ کریگی۔ اگرچہ گورا کا باپ غدر میں مارا گیا اور ہم یہ بھی جانتے ہیں۔ کہ اُس کی ماں بھی مر چکی ہے لیکن غدر فرو ہونے کے بعد ہم لوگوں کو چاہئے تھا کہ اس معاملہ کی مجسٹریٹ کو اطلاع کرتے اگر یہ بات ظاہر ہو گئی تو ساری عبادت اور ریاضت خاک میں مل جائیگی۔ اور جو کچھ بھی مصیبت مجھ پر پڑیگی۔ اُس کا علم تو خدا ہی کو ہے۔

انند امائی خاموش رہی اور تھوڑی دیر کے بعد کرشن دیال نے گفتگو کا سلسلہ شروع کر دیا۔ "گورا کی شادی کے متعلق ایک بات میرے ذہن میں آتی ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ پریش بھٹاچاریہ میرے ایک ہم سبق تھے۔ اور انسپکٹر مدارس رہ چکے ہیں پنشن لینے کے بعد وہ آجکل کلکتہ ہی میں رہتے ہیں۔ وہ بڑے کٹر برہمو سماج ہیں۔ سنا ہے۔ ان کے یہاں کئی کنواری لڑکیاں ہیں۔ اور شادی کے قابل ہو گئی ہیں۔ اگر گورا کا اُن سے تعارف کرا دیا جائے۔ اور وہ اُن کے یہاں آنے جانے لگے۔ تو کوئی نہ کوئی لڑکی اس کو پسند آ ہی جائیگی۔ بعد کو شادی کی بات چیت کر لی جائیگی"۔

انند امائی۔ میں تو نہیں سمجھتی کہ اب گورا اُن کے یہاں جائے۔ وہ زمانہ گیا۔ جب وہ برہمو سماج کو اچھا سمجھتا تھا۔

اتنے میں گورا اپنی والدہ کو پکارتا ہوا آیا اور اپنے والد کو بیٹھا ہوا دیکھ کر متعجب سا ہوا۔ اور ٹھہر گیا۔ انند امائی فوراً اُٹھ کر اس کے پاس آگئی۔ اور محبت سے دیکھ کر کہنے لگی: "کہو بیٹا کیا کام ہے"

گورا۔ کچھ نہیں ایسا کوئی ضروری کام نہیں ہے پھر مولے گا

یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑا ہونے لگا۔ لیکن کرشن دیال نے پکار کر کہا۔ "گورا کہاں جاتے ہو ٹھیرو مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔ میرے ایک برہمو سماج دوست کلکتہ آئے ہوئے ہیں۔ اور وہ ہیڈن اسٹریٹ میں رہتے ہیں۔"

گورا کہیں پریش بابو تو نہیں۔

کرشن دیال نے تعجب سے کہا۔ "ہاں ہاں وہی تو تم کو کیسے معلوم ہوا۔"

گورا۔ بی سے ان کے مکان کے قریب رہتے ہیں اور اُنہوں ہی نے مجھ سے ذکر کیا تھا۔

کرشن دیال۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ان سے ملو۔ اور میری طرف سے اُن کی مزاج پرسی کر آؤ۔

گورا تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ اور اس کے بعد جواب دیا۔ "بہت اچھا کل پہلے انہی کے یہاں جاؤنگا"

انندامائی کو گورا کا جواب سن کر کچھ تعجب سا ہوا۔

لیکن ایک منٹ کے بعد اس نے کہا۔ "ہاں میں بھول گیا تھا۔ کل نہ جاؤنگا۔"

کرشن دیال۔ کیوں کل کیوں نہ جاؤ گے۔

گورا۔ کل مجھ کو تری بینی جانا ہے۔

کرشن دیال۔ "تری بینی!"

گورا۔ جی ہاں! کل سورج گرہن کا اشنان ہے۔

انندامائی۔ تم تو غضب کرتے ہو۔ کیا کلکتہ میں گنگا جی نہیں۔ بغیر تری بینی گئے تمہارا اشنان نہ ہوگا۔ تم تو بڑے ہندوؤں سے بھی کٹر نکلے۔

گورا نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ اور چپ چاپ چلا گیا۔ گورا نے تری بینی جانے کا اس لئے ارادہ کیا تھا کہ وہاں کثرت سے تیرتھ کرنے والے جمع ہونگے۔ اور وہاں ایک ہی وقت میں ملاقات کا بھی موقع ملیگا۔ اور مذہبی وعظ و گفتگو کا بھی اچھا موقع ہوگا۔

(باقی آئندہ)

نوٹ:۔ ۱۔ دفتر میں ہزار داستان جلد ۳ نمبر ۲ کی چند کاپیاں مطلوب ہیں۔ اگر کسی صاحب کے پاس موجود ہوں اور درست حالت میں ہوں۔ اور وہ صاحب دینا بھی منظور کریں۔ تو براہِ کرم دفتر ہذا کو مطلع کریں۔ تاکہ پوری قیمت ادا کرکے دفتر ان سے خرید لے۔

۲۔ ہزار داستان کے سرپرستوں سے درخواست ہے۔ کہ خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری (جو لفافے کی داہنی طرف مندرج ہوتا ہے) ضرور لکھیں ورنہ عدم تعمیل کی شکایت معاف۔ (جواب طلب خطوط کے لئے جوابی کارڈ لازمی ہے)

۳۔ ترسیل زر و مضامین اور جملہ دفتری معاملات کے متعلق مراسلت میں ایڈیٹر ہزار داستان کا نام نہ لکھا جائے تو مناسب ہے۔ کیونکہ بعض اوقات موسومہ مراسلت کی تعمیل و جواب میں دیر ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ایسی مراسلت صاحب موصوف کی شخصی و ذاتی مراسلت سمجھی جاتی ہے۔ لہٰذا جملہ خط و کتابت منیجر ہزار داستان کے نام ہونی چاہیے۔

منیجر ہزار داستان

باغبان

مصنفہ رابندرا ناتھ ٹیگور

مترجمہ سالک

(۱)

نوکر۔ میری رانی اپنے نوکر پر رحم کرو۔

رانی۔ سبھا ہو چکی اور میرے تمام نوکر چلے گئے۔ تم اس قدر دیر سے کیوں آئے؟

نوکر۔ رانی۔ جب تم دوسرے نوکروں سے فارغ ہو جاتی ہو۔ تو میرا وقت آتا ہے۔ مَیں یہ دریافت کرنے آیا ہوں کہ اب کونسا کام باقی رہ گیا ہے۔ جسے تمہارا آخری نوکر انجام دے!

رانی۔ جب اتنی دیر ہو چکی۔ تو اب تم مجھ سے کیا توقع رکھ سکتے ہو؟

نوکر۔ مجھے اپنے پھول باغ کا مالی بنا لو۔

رانی۔ یہ کیا نادانی ہے؟

نوکر۔ مَیں اپنے تمام دوسرے کام چھوڑ دُونگا۔ مَیں اپنی تلواریں اور اپنے نیزے خاک پر پھینک دُونگا۔ مجھے دُور دراز کے درباروں میں نہ بھیجو۔ مجھے نئی نئی فتوحات حاصل کرنے کا حکم نہ دو۔ بس اتنی بات مانو۔ کہ مجھے اپنے پھول باغ کا مالی بنا لو۔

رانی۔ تم کیا کیا فرائض انجام دوگے؟

نوکر۔ تمہارے بیکار دنوں کی خدمت کرنا میرا کام ہوگا۔ مَیں اُس گھاس والے راستے کو سرسبز و شاداب رکھونگا جس پر تم صبح کو ٹہلتی ہو۔ ہاں ہر قدم پر تمہارے پاؤں کی تعریف وہ پھول گائیں گے۔ جو موت کے اشتیاق میں سرگرم ہیں۔

مَیں ... کی شاخوں میں تم کو جھولا جھلاؤنگا جہاں قریب شام کا چاند پتّوں میں چھپ چھپ کر تمہارے لہنگے کے دامن کو چوم لینے کی کوشش کریگا۔

مَیں اُس چراغ کو جو تمہاری سیج کے پاس روشن ہوتا ہے۔ خوشبودار تیل سے لبریز کر دُونگا۔ اور صندل اور کیسر کو گوندکر تمہارے پاؤں کی چوکی کو عجیب و غریب طریقوں سے رنگین و آراستہ کر دُونگا۔

رانی۔ تم اپنی ان خدمتوں کا انعام کیا لوگے؟

نوکر۔ ان خدمتوں کے بدلے میں مجھے اجازت دو کہ مَیں تمہاری چھوٹی چھوٹی مٹھیوں کو کنول کی نازک نازک کلیوں کی طرح تھام لوں۔ اور تمہاری کلائیوں میں پھولوں کے

محبت بھرنا اس "اشوک" کی پتیوں کے لال لال رس سے تمہارے پاؤں رنگ دوں گا۔ اور اگر گرد وغبار کا کوئی ذرہ اتفاق سے ان قدموں پر باقی رہ جائے تو اسے بوسہ سے اٹھا دوں۔

رانی۔ میرے نوکر تمہاری التجائیں قبول کی گئیں۔ جاؤ تم آج سے میرے پھول باغ کے مالی ہو!

---

(۲)

صبح کے وقت میں نے اپنا جال سمندر میں ڈال دیا!

میں سمندر کی تاریک۔ اور گہری تہ سے عجیب حالت اور عجیب حسن کی چیزیں کھینچ لایا۔۔۔ کوئی چیز تبسم کی طرح چمک رہی تھی۔ کوئی آنسو کی طرح جھلک رہی تھی۔ اور کوئی دلہن کے رخساروں کی طرح تمتما رہی تھی۔

جب میں دن بھر کا بوجھ لادے ہوئے گھر پہنچا۔ تو میں نے دیکھا کہ میری پیاری باغ میں بیٹھی ہوئی یونہی ایک پھول کی پتیاں توڑ توڑ کے پریشان کر رہی ہے۔

میں ایک لمحہ کے لئے ٹھٹکا پھر وہ تمام چیزیں جو میں نے سمندر کی تہ سے نکالی تھیں۔ اس کے قدموں میں ڈال دیں۔ اور خاموش کھڑا رہا۔

اس نے ان پر ایک نگاہ ڈالی۔ اور کہنے لگی۔ "یہ کیسی انوکھی چیزیں ہیں۔ میں نہیں جانتی یہ کس کام آئیگی۔"

میں نے شرم وندامت سے اپنا سر جھکا لیا۔ اور سوچا کہ میں نے ان چیزوں کے لئے کوئی جنگ نہیں کی۔ نہ میں نے ان کو بازار سے خریدا۔ یہ چیزیں میری پیاری کے سامنے پیش کرنے کے قابل نہیں ہیں۔

پھر تمام رات بھر میں ان چیزوں کو ایک ایک کر کے کوچے میں پھینکتا رہا۔

صبح کے وقت پردیسی مسافر آئے۔ انہوں نے وہ چیزیں اٹھا لیں۔ اور انہیں دور دراز ملکوں میں لے گئے۔

---

(۳)

میں بے چین ہوں۔ میں دور دراز چیزوں کے لئے پیاسا ہو رہا ہوں۔

میری روح اس آرزو میں نکلتی ہے کہ دور کے دھندلے فاصلے کا کنارہ چھو لے۔

اے ورائے برتر! آہ تیری بانسری کی تیز آواز!!

میں بھول جاتا ہوں۔ میں ہمیشہ بھول جاتا ہوں۔ کہ میں اڑنے کے لئے پر نہیں رکھتا۔ اور میں اس مقام پر پابند کر دیا گیا ہوں۔

میں سرگرم اور ہوشیار ہوں۔ میں ایک اجنبی سرزمین میں اجنبی مسافر ہوں۔ تیرا سانس مجھ تک آتا ہے لو میرے

کانوں میں ایک امید موہوم کی سرگوشیاں کرتا ہے۔ تیری زبان کو میرا دل اپنی ہی زبان کی طرح سمجھتا ہے۔

او انسانی تلاش سے دور! آہ تیری بانسری کی تیز آواز!!

میں بھول جاتا ہوں۔ ہمیشہ بھول جاتا ہوں کہ میں راستہ نہیں جانتا۔ اور میرے پاس پردار گھوڑا نہیں ہے۔

میں غافل و بے پرواہوں میں اپنے دل ہی میں آوارہ پھر رہا ہوں!

سست و بیکار گھڑیوں کی روشن دھند کے اندر تیرا وسیع خیال آسمان کے نیل میں کیا کیا صورت اختیار کرتا ہے

اے دور ترین کنارے! آہ تیری بانسری کی تیز آواز!!

میں بھول جاتا ہوں۔ ہمیشہ بھول جاتا ہوں۔ کہ جس گھر میں میں اکیلا رہتا ہوں اس کے دروازے ہر طرف سے بند ہیں۔

---

(۴)

گھریلو چڑیا پنجرے میں تھی۔ آزاد پرندہ جنگل میں تھا۔ جب وقت آیا۔ تو وہ آپس میں ملے قیمت کا ایک فیصلہ تھا۔

آزاد پرندہ پکارتا ہے۔ "اے میری پیاری۔ آ جنگل کو اڑ چلیں!"

پنجرے کی چڑیا چپکے چپکے کہتی ہے۔ "ادھر آ۔ ہم دونوں پنجرے میں رہیں"

آزاد طائر کہتا ہے۔ کہ "پنجرے کی تیلیوں کے درمیان اتنی جگہ کہاں ہے۔ جہاں کوئی اپنے پر پھیلا سکے"!

پنجرے کی چڑیا چلا کر کہتی ہے۔" آہ۔ افسوس میں نہیں جانتی کہ آسمان میں ٹہنی پر بیٹھنے کی جگہ کہاں ہے۔

آزاد پرندے نے پکار کر کہا۔" میری پیاری جنگل کے گیت گاؤ"۔

پنجرے کی چڑیا کہتی ہے۔" میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں داناؤں کی باتیں سکھاؤنگی"

جنگل کا پرندہ چلاتا ہے۔" نہیں۔ آہ۔ نہیں گیت کبھی سکھائے نہیں جا سکتے"

پنجرے کی چڑیا کہتی ہے۔" آہ۔ افسوس ہے۔ کہ میں جنگلوں کے گیت نہیں جانتی!

ان دونوں کی محبت کا جذبہ جوش آرزو سے تیز ہو رہا ہے۔ مگر وہ پہلو بہ پہلو کبھی نہیں اڑ سکتے۔ وہ پنجرے کی تیلیوں میں سے ایک دوسرے کو تکتے ہیں۔ اور ان کے دلوں میں ایک دوسرے کو جاننے کی بیکار خواہش پیدا

ہو رہی ہے۔

وہ آرزو کے جوش میں اپنے پروں کو پھڑپھڑاتے ہیں اور گا نے ہیں "میری جان۔ قریب تر آجا۔"

آزاد پرندہ کہتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا میں پنجرے کی بند کھڑکیوں سے ڈرتا ہوں۔

پنجرے کی چڑیا آہستہ آہستہ کہہ رہی ہے:-

"افسوس! میرے بازو بے طاقت اور مردہ ہو چکے!"

---

(۵)

تم جیسی ہو ویسی ہی چلی آؤ۔ اپنے سنگار میں دیر نہ لگاؤ

اگر تمہارے سنورے ہوئے بال کھل گئے ہیں۔ اگر تمہاری مانگ سیدھی نہیں رہی۔ اگر تمہاری چولی کے بند کھلے ہی ہیں۔ تو پروا نہ کرو۔

جیسی ہو ویسی ہی چلی آؤ۔ اپنے سنگار میں دیر نہ لگاؤ۔

گھاس پر تیز قدم اٹھاتی ہوئی آجاؤ!

اگر اوس کی وجہ سے تمہارے پاؤں سے نمی ٹپک رہی ہے۔ اگر تمہارے پاؤں کے گھنگروں کے چھلے ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔ اگر تمہاری مالا کے موتی گرے جاتے ہیں تو پروا نہ کرو۔

گھاس پر تیز قدم اٹھاتی ہوئی آجاؤ!

دیکھتی ہو؛ بادل آسمان کے گرد لپٹ رہے ہیں!

دریا کے اس پار کے کنارے سے بگلوں کی قطاریں اوپر اڑی جا رہی ہیں۔ اور آندھی کے تیز و تند تھپیڑے درختوں کے اوپر فراٹے بھر رہے ہیں!

فکرمند مویشی گاؤں کو اپنے اپنے چھپروں کی طرف بھاگے جا رہے ہیں۔

دیکھتی ہو؛ بادل آسمان کے گرد لپٹ رہے ہیں

تم اپنے سنگار کا چراغ بیکار روشن کرتی ہو۔ کہ وہ آندھی سے ٹمٹماتا ہے۔ اور بجھ جاتا ہے۔ کون جان سکتا ہے۔ کہ تمہارے پپوٹوں پر کاجل نہیں لگایا گیا۔ کیونکہ تمہاری آنکھیں تو گھٹاؤں سے بھی زیادہ کالی ہیں۔

تم اپنے سنگار کا چراغ بیکار روشن کرتی ہو۔

وہ بجھ جاتا ہے!

تم جیسی ہو ویسی ہی چلی آؤ۔ اپنے سنگار میں دیر نہ لگاؤ۔

اگر ہار نہیں گوندھا گیا۔ تو اس کی پروا کس کو ہے؟ اگر گجرے نہیں پروئے گئے۔ تو نہیں سہی۔ آسمان بادلوں سے گھر گیا۔ دیر ہو رہی ہے۔

جیسی ہو ویسی ہی چلی آؤ۔ اپنے سنگار میں دیر نہ لگاؤ۔

---

(۶)

ہاتھ ہاتھوں کو لپٹ جاتے ہیں۔ آنکھیں آنکھوں پر جم جاتی ہیں۔ اس طرح ہمارے دلوں کا ماجرا شروع ہوتا ہے

مارچ کی چاندنی رات ہے۔ حنا کی میٹھی میٹھی خوشبو ہوا کو معطر کر رہی ہے۔ میری بانسری کس مپرسی کی حالت میں زمین پر پڑی ہے۔ اور تیرا پھولوں کا ہار ادھورا پڑا ہے۔

میری اور تیری محبت ایک گیت کی طرح سادہ ہے

تیرا زعفرانی نقاب میری آنکھوں کو مخمور کئے دیتا ہے

وہ چنبیلی کا ہار جو تو نے میرے لئے گوندھا تھا میرے دل میں مدح و تعریف کی سی سنسنی پیدا کر رہا ہے۔

یہ کھیل دینے اور روک رکھنے آشکارا کرنے اور پھر چھپا لینے کا کھیل ہے۔ اس میں کچھ تبسم ہیں۔ کچھ تھوڑا سا شرمیلا پن ہے۔ اور کچھ میٹھی میٹھی فضول لڑائیاں ہیں۔

میری اور تیری محبت ایک گیت کی طرح سادہ ہے

اس میں زمانہ حال سے پرے کوئی راز نہیں۔ ناممکن کے لئے کوئی کوشش نہیں۔ ظاہری جادو کے پیچھے کوئی تاریکی نہیں۔ اندھیرے کی گہرائیوں میں کوئی ٹٹولنا نہیں

میری اور تیری محبت ایک گیت کی طرح سادہ ہے

ہم تمام لفظوں سے گزر کر سدا کی خاموشی میں بھٹک نہیں جاتے۔ ہم امید سے بالاتر چیزیں حاصل کرنے کے لئے اپنے ہاتھ خلا میں نہیں اٹھاتے۔

ہمیں وہی کافی ہے جو ہم دیتے ہیں اور پاتے ہیں!

ہم نے راحت اور خوشی سے درد کی شراب چھین کر اس راحت کو بالکل پھیکا نہیں دیا۔

میری اور تیری محبت ایک گیت کی طرح سادہ ہے!

---

(۷)

جب وہ دونوں بہنیں پانی بھرنے جاتی ہیں۔ وہ اس مقام پر آتی ہیں۔ اور مسکراتی ہیں۔

وہ اس کو ضرور جانتی ہوں گی۔ جو درختوں کے پیچھے کھڑا رہتا ہے۔ جب کبھی وہ پانی بھرنے جاتی ہیں۔

جب دونوں بہنیں اس مقام سے گزرتی ہیں تو آپس میں چپکے چپکے باتیں کرتی ہیں۔

انہوں نے اس شخص کا راز ضرور سمجھ لیا ہوگا۔ جو درختوں کے پیچھے کھڑا رہتا ہے۔ جب کبھی وہ پانی بھرنے جاتی ہیں

جب وہ اس مقام پر آتی ہیں تو ان کی کلسیاں اچانک ڈگمگا جاتی ہیں۔ اور پانی چھلک کے گر پڑتا ہے۔

انھوں نے یقیناً ۔ لوہم کرلیا ہوگا۔ کہ کسی شخص کا دل
دھڑک رہا ہے۔ برہ خنوں کے پیچھے کھڑا رہتا ہے۔ جب
کبھی وہ پانی بھرنے جاتی ہیں۔

جب دونوں بہنیں اس مقام پر آتی ہیں۔ تو ایک
دوسرے پر نگاہ ڈالتی ہیں۔ اور مسکراتی ہیں۔
اُن کے تیز قدم پاؤں میں ایک قہقہہ پوشیدہ ہوتا ہے
جو اس شخص کے دل میں گھبراہٹ پیدا کر دیتا ہے جو درختوں
کے پیچھے کھڑا رہتا ہے۔ جب کبھی وہ پانی بھرنے جاتی ہیں

---

(۸)

میرے دل نے۔ اس بیابان کے پرندے نے۔
آخر تیری آنکھوں میں اپنا آسمان پا لیا
یہ آنکھیں صبح کا گہوارہ ہیں۔ یہ ستاروں کی
سلطنت ہے
میرے گیت ان کی گہرائیوں میں غائب ہو جاتے ہیں!
مجھے اسی آسمان میں۔ اس کی سنسان وسعت میں
پرواز کرنے دے!
مجھے اس کے بادلوں کو چاک کرنے دے۔ مجھے اسی
کی دھوپ میں بازو پھیلانے دے۔

---

(۹)

میری پیاری ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ تیرے
شاعر نے اپنے دماغ میں ایک عظیم الشان جنگی نظم کا خاکہ
تیار کیا۔
افسوس۔ میں نے احتیاط نہ کی۔ میرا وہ خیال
تیرے پازیب کی جھنکار سے ٹکرایا۔ اور غمناک ہو گیا۔
اس خیال کے پرزے ٹوٹ ٹوٹ کر بہت سے
گیت ہو گئے۔ جو تیرے قدموں پر بکھرے ہوتے پڑے
تھے!
پرانے معرکوں کی تمام داستانوں کا جہاز ہنستی
ہوئی موجوں کے تھپیڑوں سے ڈگمگا گیا۔ آنسوؤں میں
تر ہو گیا اور ڈوب گیا۔
میری پیاری۔ تجھے میرا یہ نقصان
پورا کرنا ہوگا!
اگر موت کے بعد میری غیر فانی شہرت کی
امیدیں خاک میں مل چکی ہیں۔ تو مجھے زندگی ہی میں
غیر فانی بنا دے۔
پھر نہ میں اپنے نقصان پر ماتم کروں گا نہ تجھے
الزام دوں گا۔

---

*

رمضید عالم پریس لاہور میں باہتمام لالہ لبھا رام پرنٹر چھپا۔ اور دارالاشاعت ادب لطیف کے ۱۰۱ مرسیل لکھیسر پبلشر و پروپرائیٹر نے چمبرلین روڈ لاہور سے شائع کیا

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۲۱۴

۲۸۶

قیمت سالانہ چھ روپے
قیمت ششماہی ۳ روپے
فی پرچہ ۱۰ر

ھزار داستان

آنریری ایڈیٹر حکیم احمد شجاع بی۔ اے (علیگ)

جائنٹ ایڈیٹرز:۔

سید عابد علی عابد بی۔ اے
محمد ہادی حسین قریشی صدیقی

جلد ۳ | اشاعت ماہ نومبر ۱۹۲۳ء | نمبر ۵

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	اثر خامہ	نمبر صفحہ
۱	خواب طفلی	سید عابد علی عابد بی۔ اے	۲
۲	انجام عشق	جناب اثر صہبائی	۹
۳	ناکامی کی دنیا	سید عابد علی عابد بی۔ اے	۱۷
۴	بہار فردوس	محمد ہادی حسین قریشی صدیقی	۱۸
۵	رشحات جلیل	جناب جلیل قدوائی علیگ	۲۲
۶	انار کلی	جناب افتخار الرسول بدر	۲۳
۷	حشر جذبات	جناب ابو محمد ثاقب کانپوری	۳۶
۸	اس کی آخری محبت	سید عابد علی عابد بی۔ اے	۳۷
۹	غزل	جناب اثر صہبائی	۴۸
۱۰	مے قدیم	جناب تپش	۴۹
۱۱	جذبات	جناب محمد معراج الدین ہاشمی	۵۲
۱۲	دلنواز کا خوان	جناب شیخ محمد فضل حق متعلم بی۔ اے	۵۳
۱۳	نغمے کی تخلیق	سید عابد علی عابد بی۔ اے	۶۵
۱۴	گورا	جناب عبد الستار خاں	۶۶
۱۵	پریشان تمنا	جناب سید راز چاند پوری	۶۷
۱۶	مہر درخشاں کی قسم	فاضل ملت مولنا حسرت موہانی	۷۷
۱۷	نوائے خونیں	جناب حامد علیخاں حامد بی۔ اے	۷۸
۱۸	آئینہ مجاز	جناب اظہر نعمانی ردولوی	״
۱۹	تبصرہ اشاعات جدیدہ	جائنٹ ایڈیٹر	۷۹
۲۰	اشتہارات		۸۱ تا ۸۸

خوابِ طفلی

کس قدر لطیف اور رنگین ہے وہ شفاف اور طلسمی کرّہ جسے عالمِ خواب سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ ایک پرستان ہے جہاں ہمارے تخیل کے تمام نازک اور خوش خرام پریاں ناشگفتہ غنچوں اور معطر پھولوں کو روندتی پھرتی ہیں۔ ہماری اپنی طبیعت وہاں حسب توفیق ومذاق۔ قوس قزح کی تمام مختلف الالوان آب و تاب کو ہمراہ لئے ہوئے ایک بہار آرزو کا لہلہاتا ہوا سبزہ باغ ترتیب دیتی ہے جس کے تمام پھل پھول ہماری ذہنی تخلیق کے ممنون ہوتے ہیں۔

ہم اپنے ان لمحات کو بھی خواب سے تعبیر کرتے ہیں جن میں تکمیلِ آرزو کی سی غیرِ واقعیت اور لطافت ہویدا ہوتی ہے جب ہم تخیل کو زیادہ تیز اور عمیق بنا لیتے ہیں اور اپنی تمام خواہشات کے مجسموں کو آنکھوں کے روبرو کھڑا کرتے ہیں اسوقت کی حالت کو بھی عام طور پر عالمِ خواب ہی کہا جاتا ہے۔

اس نفس الامری حقیقت کی تحلیل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ہمارے ذہن میں خواب اور اُس کے لوازمات کا تصوّر اپنی تمام خواہشوں کی تکمیل سے لازم وملزوم ہے یہی وجہ ہے کہ ہم کسی غیر متوقع خوشخبری یا انوکھے واقعے کو خواب پر محمول کرتے ہیں کیونکہ ہمارے ذہن میں یہ احساس ہمیشہ مستقل طور پر قائم رہتا ہے کہ مادی دنیا میں جن آرزوؤں کا برآنا ناممکن ہے۔ وہ سب خواب میں پوری ہو سکتی ہیں۔

ابتدا ہی سے خواب کی پراسرار مملکت ایک تاریک مگر دلکش لبادے میں ملفوف قدما کی عظیم الشان سے عظیم الشان ہستیوں کو دعوتِ جستجو دیتی رہی ہے۔ اس کے عجیب۔ حیرت انگیز اور بعض دفعہ پیشینگو مظاہر ہمیشہ سے فلسفہ اور نفسیات کے محبوب ترین بحث کا موضوع رہے ہیں۔ نفس انسانی میں یہ بات نقش ہو چکی ہے کہ خواب کی مبہم اور طلسمی زندگی کا انکشاف ناممکن ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ آجتک انسان خواب کے مختلف لوازمات ومظاہر سے وہی جدت آمیز لطف حاصل کرتا ہے۔ جو ایک بالکل نئی اور انوکھی دریافت سے ہو سکتا ہے۔

دنیا کی سب سے قدیم حقیقت یعنی مذہب جس سے ہماری مراد ایک وسیع مشرب ہے۔ جو تمام کائنات کے بنیادی اصول اخلاق کا منبع ہے۔ اور جس کی مختلف شاخیں ہر ایک ملت کی تخلیق میں مشترکہ طور پر پائی جاتی ہیں بھی عالمِ خواب کی پیچیدگی کی افزایش کا باعث ہوتا ہے۔

ادب القدما (کلاسکس) اور تنقیدات عالیہ (ہایئر کریٹیسزم)

نئے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مجذوبین و عارفین کے تمام خصائل امتیازی میں سے ایک علم تعبیر بھی ہے۔ اور بغیر اس کے ان کی تمام صفات ناکمل ہیں۔ علاوہ ازیں تقریباً تمام پیغمبروں کے اوصاف میں بھی جابجا تعبیر کا ذکر آتا ہے۔ انجیل مقدس میں حضرت یوسف کا قصہ محتاجِ تعارف و بیان نہیں۔

اور کچھ نہیں تو ان تمام باتوں سے اس دراز کار مسئلے کا پتہ چلتا ہے۔ کہ عالم خواب میں غیر واقعیت اور تکمیل آرزو کے عنصر کے سوا کچھ نہ کچھ اور بھی موجود ہے۔ جس کے انکشاف سے ہمارے دماغ قاصر ہیں۔ اس بات کا ایک بدیہی ثبوت تو ایک یہ بھی ہے۔ کہ تمام خواب سراسر تکمیلِ خواہشات پر ہی منحصر نہیں ہوتے۔ بلکہ عام طور پر مہیب۔ حیرت انگیز خوفناک اور عجیب و غریب بھی ہوتے ہیں۔

صدیوں کی دوڑ دھوپ اور تجسس کے بعد صرف اسقدر پتہ چل سکا کہ مریض اشخاص کے خواب بعض دفعہ ان کے مرض کی تشخیص میں معاون و مدد ہوتے ہیں۔ لیکن اس انکشاف نے خواب کی پُراسرار شخصیت کو اور بھی پیچیدہ کر دیا۔ یہ حقیقت ایک تازہ انکشاف ہے۔ اور اس کی وجہ سے موجودہ ہسپتالوں اور تربیت گاہوں میں ڈاکٹروں کے کام میں یک گونہ آسانی پیدا ہوگئی ہے۔ لیکن ابتک اس بات کا پتہ نہیں چل سکا۔ کہ خواب کی تمام قسموں کا مخرج اور منبع کیا ہے۔ معمر اور بالغ اشخاص کے خواب تو عام طور پر ایک مقررہ اور مستقل اصول کے تابع نہیں ہوتے۔ مگر بچوں کے خواب ماحول کے زیر اثر ضرور کچھ نہ کچھ ترتیب و تدوین کا عنصر رکھتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ان کے لوازمات زندگی بہت محدود و متعین ہیں۔ اور اسی لئے انکے خواب ایک خاص حلقے اور رفتار سے باہر نہیں جاسکتے۔

یہ موضوع اور بھی دلچسپ ہو جاتا ہے جب ہم اس بات کا خیال کریں کہ عالم طفلی دورِ حیات کا سب سے زیادہ خوشگوار عنصر ہے۔ اور یہی ایک زمانہ ہے۔ جس کی معصوم اور سادہ خوشیاں قوانین فطرت کے عین موافق ہوا کرتی ہیں۔ کون ایسا ہے جو اپنی بچپن کی زندگی کو احساسِ عیش و رشک کے مخلوط جذبات سے متاثر ہوئے بغیر یاد کرتا ہے۔ جو ایک طویل آہِ حسرت کے بغیر اپنی زندگی کے اس گزشتہ سبق کو فراموش کر سکتا ہے۔ یقیناً وہی ایک دور ایسا تھا جب ہماری قوتِ نمو تمام کدورتوں سے غیر متاثر رہ کر شاہراہ حیات پر گامزن ہوتی تھی

پیشتر ازیں کہ ہم خواب طفلی کی تربیت، تدوین، کے مقررہ اصول کی پیروی کریں۔ غالباً خواب کی دریافت شدہ مبہمی حقیقت اور بالغ و نابالغ اشخاص کے فرق کو بیان کر دینا ناگزیر ہے۔

چند ماہرین کا خیال ہے کہ خواب کی غیر شعوری کیفیت تمام تر اسی مواد کی دوبارہ تخلیق ہے۔ جو ذہن انسانی

محض اس لئے فراموش کر دیتا ہے۔ کہ وہ تکلیف دہ اور غم افزا ہوتا ہے۔ یہ فراموش کردہ کیفیت انسان کے شعور سے قطعاً بیگانہ ہو جاتی ہے۔ کہ قانون ایتلاف افکار کے ماتحت بھی ہمارا شعور اس کا ادراک نہیں کر سکتا۔ اسی لئے خواب کی تمام غم افزا کیفیات شعوری حالت کے تاثرات سے بالکل مختلف و بعید ہوتی ہیں لیکن عالم خواب میں ہمیشہ تمام مظاہر شکلیں لیتی ہوئی کونین کی گولیوں کی طرح کچھ نہ کچھ ظاہری شعوری کیفیت لیکر داخل ہوتے ہیں جس کی وجہ سے خواب کے بعد بھی ہمارا ذہن ان کا احساس کر سکتا ہے ہمیں تعبیر میں دقت پیش آتی ہے۔ کیونکہ خواب کے تمام مظاہر کو اس ظاہری کیفیت سے علیحدہ کر کے ذہن کی اصلی حالت کا معائنہ کرنا۔ پھر اسی سے نتیجہ اخذ کرنا قوت استدلال وضبط کا متقاضی ہے۔ جو سوائے معدودے چند ماہرین کے عام انسانوں میں مفقود نظر آتی ہے۔

بعض ماہرین کی رائے ہے کہ تمام خواب خواہشات کی تکمیل کا غیر حقیقی اور خیالی مظہر ہیں لیکن یہ تعریف غلط معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ خوشگوار اور فرحت افزا خواب کے علاوہ جس میں خواہشوں کی تکمیل ہوتی ہے۔ عام طور پر انسان ایسے ایسے ڈراؤنے مہیب اور حیرت انگیز خواب بھی دیکھتا ہے جو اس تعریف کے تحت ... نہیں آسکتے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے کتنی اور بھی ایسے عناصر ہیں جو عالم خواب کی حقیقت کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ورنہ ہمیشہ ایسا ہی ہوا کرتا کہ ہم فرحت انگیز اور روح پرور خواب دیکھا کرتے۔

جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔ بچوں کے خواب عمر آدمیوں کے خلاف ایک پیچیدہ مگر مقررہ اصول کے تحت کیا کام کرتے ہیں۔ بچوں کے خواب میں جزئیات کی صحت اور نفاست کا عنصر غالب رہتا ہے۔ برخلاف اسکے بالغ اشخاص کے خواب محض خاکے ہوتے ہیں شاذونادر ہی ایسا ہوتا ہے۔ کہ بالغ اشخاص ایسا خواب دیکھیں جس کی تمام جزئیات اپنی اپنی جگہ پر قائم ہوں۔ اور جس کا صحیح صحیح نقشہ ان کا دماغ خواب کے بعد بھی قائم کر سکے۔

بچوں کے خواب میں روز گذشتہ کے بہت سے واقعات کا عکس پڑتا ہے۔ مثلاً کھانے پینے کی چیزوں کے متعلق اگر والدین نے انہیں کسی خاص شے سے منع کیا ہے تو خواب میں وہ شے کھانے کو ملیگی۔ اسی طرح بچوں کے مزاج اور فطرت کا اثر بہت جلد خواب کی نوعیت کو متاثر کرتا ہے۔ عام طور پر وہ بچے جن کا نظام عصبی کمزور ہو۔ خوفناک خواب دیکھتے ہیں۔ جن کا متخیلہ تیز اور زبردست ہو۔ ان کے خواب بھی تخیلی اور غیر واقعی ہوتے ہیں ڈرپوک بچوں کو بہت سخت ڈراؤنے خواب آتے ہیں نفسیات کے اسی نکتے پر یہ حقیقت مبنی ہے۔ کہ بچوں کو کبھی چڑیلوں اور بھوتوں کی کہانیاں نہیں سنانا چاہئیں۔ کیونکہ ان کا متخیلہ

ہمیشہ روز گذشتہ کے واقعات کو خواب میں پیش کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ یہ خواب بہم فرسودگی سے ان کے دماغ میں مستقل طور پر جاگزیں ہو جاتے ہیں اور آخرکار ایک وہ وقت آتا ہے کہ ان کے ذہن، اسی طرح کے غیر واقعی خوف سے اس قدر متاثر ہو جاتے ہیں۔ کہ ایک بہت بڑی حد تک ان کے خوف کو رفع کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ بڑے ہو کر بھی انکے نظام عصبی میں اسی خوف کے احساس کی وجہ سے فتور واقع ہوتا رہتا ہے۔

یہ ایک محیر العقول امر ہے کہ وہ بچے جو کبھی جواب مضمون یا کہانی کو لکھنا پسند نہیں کرتے اور جو اگر چاہیں بھی تو ایک سطر تک نہیں لکھ سکتے۔ اپنے خواب بیان کرتے وقت خواب کی جزئیات کو اس نفاست اور ترتیب سے بیان کرتے ہیں کہ وہ من گھڑت معلوم ہوتا ہے۔ مگر ثابت ہو چکا ہے کہ بچوں کے خواب میں جزئیات ہمیشہ سالم رہتی ہیں۔ اور ان کے سلسلے میں کئی کڑیاں آپس میں بہ آسانی مل جاتی ہیں۔ اس قوت بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ خواب میں ذہن کی کوئی نئی قوت کام کرتی ہے۔ جس کی نسبت ابھی تک کچھ معلوم نہیں ہوا۔ لیکن کوشش کی جا رہی ہے کہ اس کی حقیقت بھی دریافت کی جائے

بالغ اشخاص کے لئے تو خواب محض ایک غیر واقعی رتبہ رکھتا ہے۔ اگر بچے اپنی اس خیالی دنیا سے گہری محبت کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ خواب ان کی فرسودہ اور خشک زندگی کو چند لموں کے لئے خوشگوار بنا دیتا ہے۔ اس میں بچوں کی تمام خوشیاں جو انہیں بیداری کے عالم میں مضطرب رکھتی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے تخیلی مجسموں کی صورت میں آموجود ہوتی ہیں۔ فرشتے۔ پریاں۔ جنات۔ باغ۔ فردوس اور دنیا کی ہر ایک جاذب نظر چیز اس وارفتگی کے جلد گزر جانے والے دور میں جمع ہو جاتی ہے۔ اور بچہ ان تمام خوشگوار چیزوں کے درمیان اطمینان سے اچھلتا کودتا ہے

دنیا کی تمام مروجہ زبانوں میں ادب القدر اور کلاسکس کی ورق گردانی سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مصنفین نے بچوں کے جذبات کی تحلیل کرتے وقت، خواب کی زندگی کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ انگریزی علم ادب میں اس قسم کی کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ جن میں بچوں کے عالم خواب کی رنگینیاں جذب کی گئی ہوں۔ مگر افسوس ہے۔ کہ اردو کا مجموعہ اس صنف ادب سے خالی ہے۔

اس کلیے کی ایک عام مثال یہ ہے کہ بہ نسبت ان بچوں کے جن کی پرورش انتہائے ناز و نعم میں ہوتی ہے غریب بچے زیادہ دلفروز اور رنگین خواب دیکھتے ہیں ان کی زندگی جو تکلیفوں اور کلفتوں کا ایک ناقابل برداشت مجموعہ ہوتی ہے۔ عالم خواب میں بالکل تبدیل ہو جاتی ہے۔ وہی چیزیں جو مادی دنیا میں موجود نہ تھیں اس غیر حقیقی اور تخیلی زندگی

ہیں اپنی حیثیت سے زیادہ شیریں و دل آویز ہو کر نظر آتی ہیں۔ یتیم اور غریب بچے جن کا گھر بار ہی کوئی نہیں ہوتا۔ ایک دلکش اور عالیشان گھر دیکھتے ہیں۔ جس میں ان کے اردگرد چاہنے والے بھائی بہنوں کا حلقہ ہوتا ہے اور ان کی پیاری ماں ان کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتی ہے۔ اسی طرح ہر ایک بچہ جن چیزوں کی کمی محسوس کرتا ہے فطرت اسے عالم خواب کی تمام دلکش لوازمات کے ہمراہ رات کے وقت عطا کرتی ہے۔ ان کے لئے صرف خواب ہی ایک وہ شے ہے جسے وہ بیان کرنے سے کبھی نہیں تھکتے۔

بالغ اشخاص کے خواب ان تمام مشقتوں اور تکلیفوں سے غیر متاثر رہتے ہیں جو انہوں نے دن بھر اُٹھائی ہیں لیکن بچے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے ان سے لازمی طور پر متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ تجربہ کر کے دیکھا گیا ہے کہ ماحول کے کئی واقعات سے متاثر کر کے بچوں کو ایک خاص قسم کے خواب دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس میں یک گونہ کامیابی بھی ہوئی ہے۔ ان تمام عناصر میں خوشبو اور رنگ ایسے عنصر ہیں جس سے بچوں کے ذہن بہت جلدی متاثر ہوتے ہیں۔ اور جس کی وجہ سے حیرت انگیز اور خوشگوار خواب پیدا ہو سکتے ہیں۔

ایک دوسری حقیقت کا بیان بھی یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ غالباً عام طور پر مشاہدہ کیا گیا ہوگا۔ کہ پریوں کی کہانیاں اور تمام اس قسم کے افسانے جن میں کسی قسم کی منطقی قید سے افراد قصہ کی سیرت کو محدود کرنے کی کوشش نہ کی گئی ہو۔ بچوں کو بہت پسند ہوتے ہیں۔ یہ بھی خواب ہی کی کشش کا نتیجہ ہے۔ خواب میں علت و معلول کا اختلاف منطق اور عقل کے تمام اصولوں کا فقدان۔ ترتیب و تدوین واقعات کی غیر موجودگی یہ تمام ایسے عناصر ہیں جن سے تخیل کو تگ و تاز کیلئے ایک ایسا وسیع میدان میسر آتا ہے۔ جو اور کہیں نہیں آ سکتا۔ اسی متخیلہ کی قوت تخلیق سے بچے جسقدر خواہشات چاہیں پوری کر سکتے ہیں۔ کیونکہ کوئی بندش قید یا اصول ان کے دانتعاشات کو محدود و متعین نہیں کر سکتا۔ تخیل کی یہ آزادی ہر طرح کی بشریت کی ضامن ہے۔ کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارا متخیلہ کائنات کی ہر ایک شے کو رنگین لطیف اور شفاف بنا کر اس پرستان میں پیش کر سکتا ہے۔ جہاں ہماری آرزوئیں مجسم ہو کر رہتی ہیں۔

یہاں یہ نکتہ قابل لحاظ ہے کہ اس طرح کے تمام تخیلی خوابوں میں جن میں ہیبت یا خوف کا کوئی عنصر نہ ہو۔ اور جو بچے کی زبان سے اس طرح ادا ہوں گویا ان میں تکلیف و کرب کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ شعوری اور غیر شعوری کیفیات میں تمیز کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ بچوں کا ذخیرۂ الفاظ بہت محدود اور

ان کی قوت بیان بہت متعین ہوتی ہے۔ اس لئے جس احساس کو وہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا سمجھنا بہت مشکل ہے۔ ہم کبھی ان خوابوں کی شیرینی اور لطافت کا صحیح اندازہ نہیں قائم کر سکتے۔ بچے خواب بیان کرتے وقت تمام عجیب وغریب اشیا کے احساس کو جو ایک غیر شعوری محض کیفیت ہے۔ معمولی الفاظ میں ادا کرتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ بیداری کی تمام کیفیات کا کچھ نہ کچھ حصہ عالم خواب کے جذبات میں مل جائے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ ان کے تمام خواب شعوری اور غیر شعوری کیفیات کا ایک مخلوط گلدستہ ہوتے ہیں۔ جن میں کوئی حد فاصل یا اختلاف امتیازی قائم کرنا اگر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ ایک خوشگوار خواب کے عناصر میں کرب و اذیت کا بھی ایک خفیف سا شائبہ موجود ہے لیکن شعوری کیفیت اُسے فوراً فراموش کر دیتی ہے۔ اور بچے اس کی جگہ بھی مسرت کے احساس کو بیان کرتے ہیں۔

خاصکر عالم خواب کی گفتگو بہت غلط طریقے سے ادا کی جاتی ہے۔ وہ غیر شعوری الفاظ جو خواب میں سُنے نہیں جاتے بلکہ محسوس ہوتے ہیں کبھی معمولی پیرایہ گفتگو میں ادا نہیں ہو سکتے۔ اور اسکے علاوہ گفتگو ایک خاص مقررہ ترتیب و تدوین کے ماتحت ہوتی ہے۔ اور بچے اس ترتیب کو بھی بگاڑ دیتے ہیں۔ جس سے گفتگو کی نوعیت یا مقصد کا پتہ ہرگز بھی نہیں چل سکتا۔ فطرت کا یہ بھی ایک مقررہ ضابطہ ہے کہ خواب دیکھتے وقت بچوں کی حالت جسمانی بہت کچھ نوعیت خواب میں اختلاف پیدا کر دیتی ہے۔ مثلاً ہر ایک بچے نے ایسے خواب دیکھے ہونگے جیسے وہ تحت الثریٰ کی عمیق گہرائیوں میں اندھا دھند رفتار سے گرتا ہوا یا آسمان کی طرف ایک نہایت ہی سریع پرواز سے بڑھتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ جس کے بعد زبان بند ہو جاتی ہے۔ پتلیاں پھیل جاتی ہیں۔ اور نوعیت نظام عصبی میں فتور واقع ہو جاتا ہے۔ لیکن کوئی بہرا بچہ کبھی اس قسم کے خواب نہیں دیکھتا۔

اسی طرح وہ بچے جن کی پرورش بہت نازونعم سے ہوتی ہے۔ اس قسم کے خوابوں سے بہت زیادہ مانوس ہوتے ہیں۔ مگر ثابت ہوتا ہے۔ کہ جسمانی شفقت کی عادت ان خوابوں میں بہت کچھ کمی پیدا کر دیتی ہے۔

سو جانے سے ذرا ہی پیشتر کسی پریوں کی کہانیوں والی کتاب کا پڑھنا بچے کے خواب کو بہت متاثر کرتا ہے۔ اور صرف اسی پر منحصر نہیں جس کتاب میں بچہ بہت دلچسپی لے۔ اس کے اثرات عالم خواب میں ضرور تبدیلیاں پیدا کرتے اس طرح کے خواب جو بچہ کسی کتاب سے اثر پذیر ہو کر دیکھتا ہے۔ چند خصائل امتیازی رکھتے ہیں پہلی بات تو ان کی

مبہم نوعیت ہوتی ہے۔ کیونکہ بچے کے خواب کی تمام کیفیات کو کتاب کی کہانی سے نسبتاً زیادہ وہ ان میں کوئی رابطہ باہمی پیدا کرنا ہی ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ بچہ اس قسم کے خواب میں خود ایک بہت ہی نمایاں حصہ لیتا ہے۔ جس کی وجہ سے خود اس کے جذبات کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ اس قسم کے خواب سے بچے کے اوضاع و اطوار اور اس کی جبلی و امتیازی خصوصیتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ خواب میں وہ کتاب کے تمام افراد کو حسب مطلب ایک نیا ہی جامہ پہنا دیگا۔ اور خود ان میں وہی حصہ لے گا۔ جس کی طرف اس کی فطرت خاص طور پر مائل ہے۔ ضروری نہیں کہ ایسی حالتوں میں بچہ اپنی ہی جنس کی طرف مائل ہو۔ کئی دفعہ دیکھا گیا ہے کہ اس قسم کے خوابوں میں لڑکا لڑکی کا حصہ لے رہا ہے۔ اور لڑکی لڑکے کا۔

اس کے دوش بدوش ہی اس کے ذہن کی نشوونما کے مدارج کا سراغ بھی لگ سکتا ہے۔ کیونکہ وہ استعداد کے موافق تمام افراد کو ایک مبالغہ آمیز رنگ میں رنگ دیگا۔ جس سے ثابت ہو سکتا ہے کہ اسکے دماغ کا ارتقا کن اصولوں اور کن خطوط کے ماتحت کام کر رہا ہے۔ جن خصائل سے اُسے نفرت ہوگی۔ افراد ان سے بالکل عاری ہونگے۔ اور جن اوصاف کو وہ خود چاہتا ہوگا۔ افراد بھی تمام انہیں اوصاف سے متصف ہونگے اس کا اخلاقی معیار بھی ضمناً معلوم ہو سکتا ہے۔

یہ ایک پر لطف حقیقت ہے کہ کتاب ایک اندھے بچے کو بینا بچے سے بہت زیادہ متاثر کرتی ہے۔ کیونکہ اسکا تخیلہ اور قوت حس بینا بچوں سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہوتی ہے اس کے خواب کی تمام جزئیات صاف روشن اور نمایاں ہوتی ہیں اندھا بچہ اپنے خواب میں کوئی حصہ نہیں لیتا۔ وہ صرف بیٹھا ہوا دیکھتا رہتا ہے۔ اس کی قوت احساس اور بچوں سے بمدارج مختلف بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ اپنے خواب پر قادر ہوتا ہے۔ کیونکہ اُسے تو دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوتی۔ یوں بھی عالم بیداری میں اس کا تخیل خواب ہی کی کیفیت اور پر لطف مناظر کی سیر کرتا رہتا ہے۔ اندھے بچے پر خواب کے مناظر کا اثر بھی بہت کم پڑتا ہے لیکن جب پڑتا ہے تو نہایت شدت اور سرعت سے۔ اسوقت عام طور پر اسکی قوت سامعہ زیادہ اضطراب و کرب محسوس کرتی ہے۔

اس کے علاوہ کچھ بچوں پر ہی منحصر نہیں۔ ہماری اپنی زندگی بھی پر لطف اور خوشگوار خوابوں کے بغیر کرخت اور غیر لطیف ہو جائے۔ کیونکہ یہی ایک ایسی شے ہے جسکی وجہ سے ہم اس زندگی ہی میں ان تمام آرزوؤں سے شاد کام ہو لیتے ہیں۔ جن کے بر آنے کی کبھی امید ہی نہیں۔ سچ تو یوں ہے کہ امید کی طرح خواب نہ ہو تو عناصر حیات میں سے ایک اہم اور خوشگوار عنصر کی کمی ہو جائے

عابد

انجامِ عشق

۴- مارچ ۱۸۶۰ء میں کہ مجھے پچپن سال تھا۔ میں نے ذیل کی چند سطور انتہائی انتشار و پریشانی کے عالم میں سپردِ قلم کیں۔

"نظامِ شمسی دیگر نظامات کے درمیان جو تقریباً اسی قدر بڑے ہیں، ازل سے اس فضا میں نہایت خاموشی کے ساتھ گھوم رہا ہے۔ بڑے بڑے کرتے جن پر یہ نظام مشتمل ہے کس مستعدی سے چکّر لگا رہے ہیں! ان میں سب سے چھوٹا ایک وہ خاک و آب کا مجموعہ ہے جس کو ہم زمین کہتے ہیں۔ یہ زمین میری ولادت سے بہت پیشتر سے ایسے ہی چکّر لگا رہی ہے۔ اور میرے پیوند خاک ہو جانے کے بہت بعد تک بھی اسی طرح چکّر لگاتی رہیگی۔ کسقدر پُر اسرار ہے اس کی ابتدا! اور انتہا! اس کی بیرونی سطح پر لاتعداد مخلوق ہے ان میں سے ایک میں جان۔ ایم۔ وڈی بھی ہوں۔ گویا ایک تنکا سمندر کی موجوں میں وقفِ کشاکش ہے کسقدر ضعیف اور بیکس ہوں! یہ حقیقت ہے مگر میری تمام قوت اور عقل محض اسی لئے صرف ہو رہی ہے۔ کہ میں قوت لایموت بہم پہنچانے کے لئے چند سکّے پیدا کر سکوں۔ میرے پاس اس قدر فرصت اور تخیّل نہیں ہے۔ کہ میں ان اہم مسائل پر غور کر سکوں۔ لیکن اگرچہ میں ایک بیکار اور ناچیز ہستی ہوں پھر بھی گاہے گاہے جب میں اپنی اہمیت پر غور کرتا ہوں تو فرطِ مسرت سے جامے میں پھولا نہیں سماتا۔"

ان الفاظ کو جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں میں نے اپنے روزنامچے میں درج کیا۔ اور یہ الفاظ ان مخفی حسیات کا صحیح نقشہ تھے۔ جن کو میں اپنی رُوح کی عمیق ترین گہرائیوں میں راسخ اور عارضی جذبات و تہیّجات سے غیر متاثر پاتا تھا۔ بالآخر میرا چچا مسٹر ایم وڈی راہیِ مُلکِ عدم ہوا۔ اس نے اپنی کثیر جائداد کو بھتیجوں میں تقسیم کیا اور مجھے بھی اپنی باقیماندہ زندگی کی ضروریات پُورا کرنے کے لئے کافی سرمایہ مل گیا۔ میرے حصّے میں کیتھنس ساحل پر ایک بنجر قطعہ بھی آیا۔ اس وقت تک میں انگلستان کے ایک قصبے میں وکیل تھا۔ میں نے سوچا کہ اب میں اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنا سکتا ہوں۔ اور تمام ادنٰے اور ذلیل مقاصد سے کنارہ کش ہو کر فطرت کے اسرار پر غور کرنے سے اپنی طبیعت کو زیادہ بلند اور پاکیزہ بنا سکتا ہوں۔ انگلستان سے روانگی میں اس لئے بھی بہت عجلت ہوئی۔ کہ میں نے ایک

ہنگامے میں ایک شخص کو تقریباً قتل ہی کر دیا تھا کیونکہ میں بہت ہی آتش مزاج ہوں اور غصے میں اکثر اوقات مجھے اپنے مزدوروں کا خیال کبھی نہیں رہتا۔ اس کے متعلق اگرچہ کوئی قانونی کارروائی تو نہ ہوئی۔ مگر اخبارات بہت غل لائے اور عوام الناس بھی انگشت نمائی کرنے لگے۔

بالآخر میں نے ان کو، وران کے تنگ و تاریک متعفن قصبے کو خیرباد کہا۔ اور اپنی شمالی اراضی کی طرف چل دیا تاکہ وہاں سکون و اطمینان کے ساتھ ان مسائل پر غور و خوض کر سکوں۔ بہت سے آلات جدید اور منتخب فلسفیانہ کتب کی کثیر تعداد بھی ہمراہ لیتا گیا۔

زمین کا یہ قطعہ تنگ اور ریتلا تھا اور خلیج مینسی کے ساحل کے گرد تقریباً دو میل تک پھیلا ہوا تھا۔ اس قطعے پر زرد پتھر کی ٹوٹی پھوٹی عمارت خدا معلوم کب سے کھڑی تھی۔ مرمت وغیرہ کرنے کے بعد مجھ ایسے سادگی پسند انسان کے لئے قابلِ رہائش ہو گئی۔ ایک کمرہ میرے عملی تجربات کے لئے تھا۔ دوسرا بیٹھک کا کام دیتا تھا اور تیسرا سونے کا کمرہ تھا۔ وہاں تین اور کمرے بھی تھے۔ ایک میں میری معمر ملازمہ رہتی تھی۔ اور دو بالکل خالی تھے کئی میلوں تک چند ماہی گیروں کے علاوہ کوئی آبادی نہ تھی۔ مکان کے سامنے خلیج تھی اور اس کے عقب میں دو بنجر پہاڑیاں جن کے درمیان ایک وادی تھی۔ ہوا درختوں کی گھنی شاخوں میں ایک غمگین نغمہ پیدا کرتی ہوئی گزر جاتی تھی۔

مجھے انسانوں سے سخت نفرت ہے۔ اور انصاف کی بات تو یہ ہے۔ کہ وہ بھی مجھے نفرت اور حقارت کی نگاہ سے ہی دیکھتے ہیں۔ ان کی ذلیل روش، ان کی تنگ نظری بیہودہ رسوم و قیود اور مکر و فریب مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے، یہ لوگ میری درشت راست گوئی اور لایعنی تصنعات سے آزادی کا برا مناتے ہیں۔ وہاں میں اپنے تجربات میں مستغرق تھا۔ سیاسی ہنگامہ آرائیوں اور ایجادات و اختراعات کے شور و غوغا کے طوفان میرے پاس سے چلے جاتے تھے۔ اور میں تمام آشوب و اضطراب سے دور نہایت مطمئن اور خوش اپنے دائرہ علم کو وسیع کر رہا تھا۔

تمام دن اجزا کی تحلیل وغیرہ میں صرف ہو جاتا اکثر اوقات کھانا بھی بھول جاتا۔ رات کو سکین ڈی چارٹ کانٹ اور سپانوزا کی تلاوت میں مشغول رہتا۔ ان حضرات نے حقیقت کی چہرہ کشائی اور فطرت کے غیر معلوم اور ناقابل ادراک گتھی کو سلجھانے کی بیکار کوشش کی ہیں ان مساعی لاطائل کے نتائج فقط لفاظی کی بھول بھلیاں ہیں۔ سونے کی تلاش میں جب زمین کھودتے کھودتے ان کو چند کیڑے مکوڑے ملے تو وہ نعرہ فتح بلند

بلند کرتے پکار اُٹھے کہ یہی ہیں وہ جو ... ہیں ۔۔۔ بڑی لی
ہم کو تلاش تھی بعض اوقات مجھ پر جنون سا طاری ہو جاتا۔
اور میں گھنٹوں تیس تیس چالیس میل بغیر سستائے
کے چلا جاتا۔ کبھی کبھی اگر میں کسی گاؤں میں جا نکلتا تو
... سڑکوں میں بھاگ بھاگ کر آتیں۔ اور اپنے بچوں
کو گھسیٹ کر اندر لے جاتیں۔ کتنا ... یہ
خوفناک منظر تھا ۔۔۔ زرد اور دبلا چہرہ بکھرے ہوئے
بال اور بے اندازہ پریشان ریش۔ اہل دیہات گھروں
سے باہر نکل نکل کر مجھے نہایت غور سے دیکھتے تھے۔
میرا خیال ہے۔ کہ میری دور دراز تک شہرت ہو گئی اور
لوگ مجھے "منتہی کا دیوانہ لارڈ" کہا کرتے تھے۔ گاؤں میں
شاذونادر ہی جاتا تھا۔ عموماً سمندر کے کنارے پر ہی
چہل قدمی کر لیا کرتا تھا۔ سگرٹ کی ایک کش تمام اندوہ
اور پریشانی کو رفع کر دیتا تھا۔ سمندر میرا مونس اور رازداں تھا۔

سمندر کی پُر اضطراب موجوں سے بڑھ کر کون بات
مونس و ہمدم ہو سکتا ہے! کونسی انسانی کیفیت ہے جس
کا چارہ ودرماں اس کے ہاں نہیں ہے! موجوں کی طرب انگیز
کشاکش، سبز لہروں کا طویل سلسلہ اور اُن پر سورج کی
زرّیں کرنوں کا رقص کس قدر روح پرور اور نشاط انگیز
ہے۔ مگر جب مہیب اور خوفناک لہریں خشمناک ہو کر
اپنی گردن کو بلند کرتی ہیں۔ اور زنّاٹے بھرتی ہوئی ہوائیں

ان کو زیادہ تند اور پُر شور بناتی ہوئی ان کے اُوپر سے
گزر جاتی ہیں۔ تو مغموم سے مغموم انسان بھی محسوس کرتا ہے
کہ قدرت بھی اسی کی طرح مغموم ہے۔ جب طوفان فرو ہو
جاتا تو خلیج نیسی کی سطح ایک شفاف روپہلی چادر کی
... کنارے سے تھوڑی دور ایک چٹان
تھی جب مشرق کی جانب سے ہوا چلتی تو لہریں اس
کے ساتھ دیوانہ وار ٹکراتیں۔ ان کا کف دُور دُور تک پھیل
جاتا تھا۔ خلیج اگرچہ صاف اور پُر سکون تھی مگر پھر بھی
مشرق کی تند ہواؤں اور اس کی چٹانوں کے خوف
سے لوگ یہاں کشتی بانی سے گریز کرتے تھے۔ یہ قطعہ
پُر اسرار سا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے کئی بار کشتی میں سوار
ہو کر اس کی سیر کی۔ اور ایسی عجیب و غریب مچھلیاں دیکھیں
کہ کسی ماہر فن نے بھی نہ دیکھی ہونگی۔ میں ان کو اس ویران
خلیج کے جنات کہا کرتا تھا۔

ایک دفعہ رات کی خاموشی میں جبکہ میں اس کے
کنارے پر کھڑا تھا۔ مجھے ایک بیکس اور مصیبت زدہ
عورت کی چیخ سنائی دی۔ یہ آواز سمندر کے عین وسط
سے اٹھ کر ہواؤں میں پھیل جاتی۔ اور کبھی دھیمی اور کبھی
بلند ہو جاتی۔ تقریباً تیس سیکنڈ تک میں ہمہ تن گوش رہا۔
اس عجیب وغریب خطے میں جس کے عقب میں
لازوال پہاڑیاں ہیں جس کے سامنے غیر فانی وسیع

سمندر تھا۔ میں نے تقریباً دو سال نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ غور و فکر میں بسر کئے تھے۔ میری ملازمہ بھی اب خاموش رہنے کی عادی ہوگئی تھی۔ میں کچھ ایسے عالم میں تھا کہ گویا انسانی تعلقات اور رسوم و قیود سے یکسر آزاد ہوں۔ اور صرف گزشتہ انسانوں کی صحبت ہی میری صحبت تھی۔ جن کی کتابوں میں ہمہ تن مستغرق رہتا تھا۔ کہ یکایک ایک حادثہ پیش آیا۔ جس نے میرے تمام تخیلات اور جذبات کے عمل کو بدل ڈالا۔

جون کے تین طوفانی دنوں کے بعد ایک صاف اور پُرسکون دن آیا تھا۔ شام کی ہوا پر غشی کا سا سکوت طاری تھا۔ آفتاب مغرب میں ارغوانی بادلوں کے پیچھے غروب ہو رہا تھا۔ پانی کی صاف سطح پر سُرخ ڈورے کھیلے ہوئے تھے۔ ۹ بجے کے قریب سمندر سے ایک مایوس صدا اُٹھی۔ ۱۰ بجے مشرق کی طرف سے تند ہوا چلی۔ ۱۱ بجے وہی ہوا طوفان میں تبدیل ہوگئی۔ اور نصف شب کو وہاں ایسا خوفناک طوفان آیا۔ کہ مجھے آج تک نہیں بھولتا۔

میں بستر پر لیٹا ہوا تھا اور سنگ ریزے میری کھڑکی کے ساتھ زور زور سے ٹکرا رہے تھے۔ ہوا سائیں سائیں کرتی ہوئی جاتی تھی۔ گویا ہر ایک جھونکا کوئی گم شدہ رُوح تھی۔ دُور سمندر کا شور مجھے لوریاں سنا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں تو اپنی پتھر کی عمارت میں محفوظ ہوں۔ میری بلا سے باہر کیا ہو رہا ہے۔ میری ملازمہ بھی میری طرح سخت دل اور سرد مہر ہو چکی تھی۔ مگر اس لئے مجھے سخت تعجب ہوا۔ جب اُس نے علی الصبح تین بجے کے قریب میرے دروازے کو زور زور سے کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ اس کی بھرّائی ہوئی اور پُر اضطراب آواز نے مجھے چونکا دیا۔ بستر سے باہر لپک کر میں نے نہایت درشت لہجے میں پوچھا۔ کہ کیا معاملہ ہے؟

"او میرے آقا! او میرے آقا" اس نے اپنی اکھڑ زبان میں چلّا کر کہا۔ "نیچے دوڑو، نیچے دوڑو" ایک جہاز چٹان کے ساتھ ٹکرا گیا ہے۔ اور بیکس مسافر مدد کے لئے چلّا رہے ہیں۔" ڈر ہے کہ کہیں وہ ڈوب نہ جائیں۔"

"چپ چڑیل کہیں کی" میں نے نہایت غصّے سے چلّا کر کہا۔ "تجھے ان کی موت و حیات سے کیا واسطہ، جا، دُور ہو جا۔ اور مجھے آرام کرنے دے" یہ کہہ کر میں پھر اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔ معاً مجھے یہ خیال آیا کہ وہ لوگ نزع کی تکلیف تو برداشت کر ہی چکے ہیں۔ اگر اب انہیں بچا لیا جائے تو چند سال کے عرصے میں انہیں از سر نو یہی تکلیف برداشت کرنا ہوگی۔ اس لئے وہ اب گزر ہی جائیں تو بہتر ہے۔ کیونکہ نزع کی تکلیف جو خود موت کی تکلیف سے بہت زیادہ ہے۔ وہ برداشت

کر چکے ہیں۔

میرے فلسفے میں موت بھی ان لاتعداد تغیرات میں سے ایک معمولی سا تغیر ہے۔ جو انسانی زندگی میں وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اسی فلسفے کا نتیجہ تھا کہ مجھے دنیا اور اس کے امور سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رہتی تھی۔ مگر۔ اس موقعہ پر پھر وہی پرانا ہیجانِ طبعی اور طوفانِ جذبات بپا تھا۔ میرا فلسفہ اس طغیانِ عظیم کی موجوں کو ساکن کرنے کی بیکار کوششیں کرتا تھا۔ اسی عالم میں مجھے ایک یاس انگیز شور سنائی دیا۔ یہ سگنل گن کی آواز تھی۔ میں اضطراری طور پر اُٹھا۔ کپڑے پہنکر اور سگار کو سلگا کر سمندر کی طرف چل دیا۔

گھٹاٹوپ تاریکی تھی، ہوا اسقدر تند کہ انتہائی زور لگا کر اپنے راستے جا رہا تھا۔ سمندر کے سنگ ریزے زور زور سے میرے چہرے کے ساتھ ٹکراتے تھے۔ اور میرے سگار کی سُرخ چنگاریاں رقص کرتی ہوئی تاریکی میں گم ہو جاتی تھیں بالآخر میں گرجتی ہوئی لہروں کے قریب پہنچا۔ آنکھ دیکھنے کی بیکار کوششیں کرتی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ مگر مہمل صدائیں اور مایوس چیخیں ہوا کے جھونکوں میں مِل مِلا کر میرے کان تک پہنچ جاتی تھیں۔ یکایک مجھے ایک روشنی دکھائی دی۔ اور معاً تمام خلیج اور اس کا وسیع کنارا نیلی روشنی میں ملبوس ہو گئے۔ وہ لوگ جہاز پر سگنل لائٹ دکھا رہے تھے۔ جہاز چٹان کے نزدیک ڈگمگا رہا تھا۔ اس نے دیکھے گھٹاٹوپ تاریکی میں سے لہروں کا لا انتہائی سلسلہ جاری تھا۔ جہاز کے قریب پہنچکر ہر ایک لہر ایک طوفانِ عظیم بنکر اس پر جھپٹ پڑتی تھی۔ اور جہاز کے ٹوٹنے کی آواز دُور دُور تک سنائی دیتی تھی۔ اس دھیمی روشنی میں خوفزدہ ملاحوں نے مجھے دیکھا اور نہایت لجاجت کے ساتھ میری طرف ہاتھ چِلائے۔ مجھے ان کی اس ذلیل اور بزدلانہ حرکت پر سخت طیش آیا۔ وہ لوگ اس راستے سے گریز کرتے تھے۔ جس پر نوعِ انسان کی عظیم الشان سے عظیم الشان ہستی کو بھی چلنا پڑا۔ البتہ ان میں سے ایک شخص کو میں نہایت اشتیاق کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ وہ شکستہ جہاز کے تختوں پر ڈگمگا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پیچھے کی طرف تھے۔ اور سر سینے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ مگر اس پُر خطر حالت میں بھی اس کے چہرے پر سکون اور مستقل مزاجی کے آثار نمایاں تھے۔ ناامیدی اس کو مغلوب کرنے میں بے بس تھی۔ اگرچہ گاہے گاہے وہ اِدھر اُدھر دیکھتا تھا۔ کہ بچاؤ کی کوئی سبیل نکل آئے۔ مگر اس کی خودداری میری طرف دیکھنے سے مانع تھی۔ وہ نہایت سنجیدگی اور خاموشی کے ساتھ تاریک سمندر کو دیکھ رہا تھا اور سکون و استقلال سے پیامِ تقدیر کا منتظر تھا۔

میں نے ... پایا۔ اس کا فیصلہ تو بہت جلد ہو جائیگا دیکھتے ہی دیکھتے ایک زبردست لہر نے تمام جہاز کو نیست لیا۔ سامنے کا مستول چکنا چور ہو گیا۔ اور تمام لوگ جو اس کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے۔ آناً فاناً طعمۂ نہنگ موج ہو گئے جہاز تڑاق تڑاق ٹوٹ گیا۔ وہ شخص ڈک کی طرف بھاگا۔ اور ایک سفید سی گٹھڑی کو اٹھا لایا میں اس کو پہلے سے بھی دیکھ رہا تھا۔ مگر تمیز نہیں کر سکتا تھا۔ کہ کیا ہے جب اس نے اس کو اوپر اٹھایا۔ تو روشنی میں معلوم ہوا۔ کہ وہ ایک عورت تھی نوجوان نے اس کو نہایت محبّت کے ساتھ پہلو میں لے لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ اس کو جہاز کی پرخطر حالت سے آگاہ کر رہا تھا اور اس کو وہاں سے باہر نکالنا چاہتا تھا۔ مگر عورت کا جواب بھی عجیب تھا۔ اس نے اس کے چہرے پر زور سے طمانچہ رسید کیا۔ نوجوان چند لمحوں کے لئے جزبز سا ہو گیا۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر اس سے مخاطب ہوا۔ غالباً وہ اس کو سمندر کی لہروں میں تیرنے کے متعلق ہدایات دے رہا تھا۔ عورت گریز کر رہی تھی۔ مگر اس نے اس کو اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ جھک کر اس کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ اور پھر ایک بلند لہر کی چوٹی پر اس طرح لٹا دیا جس طرح بچے کو گہوارے میں لٹا دیتے ہیں۔ روشنی آہستہ آہستہ مدھم ہو گئی۔ اور شکستہ جہاز اور اس کے بیس مسافر میری نظروں سے پنہاں ہو گئے۔

ان واقعات کو دیکھ کر میری مردانگی میرے فلسفے پر غالب آگئی۔ اور میری رگ و پے میں جوش عمل کی ایک لہر دوڑ گئی۔ تمام فلسفیانہ موشگافیوں کو بالائے طاق رکھ کر دیوانہ وار اپنی کشتی کی طرف لپکا۔ کشتی کچھ کچھ ٹوٹ پھوٹ چکی بھی تھی۔ مگر ع۔ ہرچہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم۔ لنگ کشتی کو کھینچ گھسیٹ کر سمندر میں ڈال دیا۔ موجوں کی گرج میں ہر لمحہ یہی اندیشہ تھا کہ چشم زدن میں یہ بھی اسی آبی مرقد میں مدفون ہو جائیگی۔ مگر خیریت گزری کشتی صاف نکل گئی۔ اگرچہ پانی سے نصف تر تھی۔ اب میں سمندر کی موجوں کے عین درمیان میں تھا۔ ہنڈولے کی طرح کبھی نیچے اور کبھی اوپر چلا جاتا تھا۔ سمندر کا کف مجھے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھا۔ میرے پیچھے بہت دور میری ملازمہ چلا رہی تھی۔ اس کو یقین تھا کہ میرے سر پر جن سوار ہو گیا تھا۔ میں کشتی چلا رہا تھا کہ یکایک مجھے ایک عورت کا جسم نظر آیا۔ میں نے پکڑ کر اپنی کشتی میں رکھ لیا۔ اب کشتی چلانے کی بھی چنداں ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ لہروں کے ایک ہی ریلے میں ہم کنارے پر جا پڑے۔ میں نے عورت کو اٹھا لیا۔ اور گھر کا راستہ لیا۔ میری ملازمہ میرے پیچھے فرط مسرّت سے تالیاں بجاتی ہوئی شور و غل مچا رہی تھی۔

[redacted]

اس اہم کام کے انجام پر میں نے اپنے جذبات کی رو میں پھر ردِّ عمل محسوس کیا۔ میں نے اس کو اپنے چولھے کے قریب نہایت بے اعتنائی سے لکڑی کے گٹھے کی طرح پھینک دیا۔

طوفان کے بعد صبح نہایت پُرسکون، صاف اور خوشگوار تھی۔ سمندر کے کنارے پر میں حسبِ معمول خرامان تھا۔ اس کی تھکی ہوئی سانس کی آواز آ رہی تھی۔ پانی چٹان کے گرد جوشِ محبت سے لپٹ رہا تھا۔ مگر کنارے پر اس کی لہریں نہایت نرمی اور آہستگی سے ٹکرا ٹکرا کر کھیل رہی تھیں، جہاز کا کوئی نشان باقی نہیں تھا کیونکہ اب وہ سمندر کے نہاں خانوں میں محفوظ تھا۔ مرغابی کا جوڑا شکستہ جہاز کے مقام کے اُوپر نہایت سکون کے ساتھ فضا میں تیر رہا تھا۔ گویا اُنہیں لہروں کے نیچے عجیب و غریب چیزیں دکھائی دیتی تھیں۔ کبھی کبھی اس منظر کے متعلق ان کی سرگوشیوں کی آواز میرے کانوں تک بھی پہنچ جاتی۔

جب میں سیر سے واپس آیا تو وہ لڑکی دروازے پر میری منتظر کھڑی تھی۔ اس کو دیکھ کر میرے دل میں یہی خیال پیدا ہوا۔ "کاش! میں اس کو نہ بچاتا، اب میری تنہائیوں اور عزلت گزینیوں کا آخری لمحہ آ پہنچا ہے۔" وہ نہایت نوخیز تھی —— بمشکل انیس سال کی، چہرہ زرد مگر دلکش، بھورے بھورے بال، رسیلی نیلگوں آنکھیں اور چمکدار دانت　・　اس کا حسن لطافت سے لبریز تھا۔ وہ اسقدر سفید اور نازک اندام تھی کہ سمندر کی پری معلوم ہوتی تھی۔ اس نے میری ملازمہ کے کپڑے ہی اپنے گرد لپیٹے ہوئے تھے۔ مگر وہ بھی اس کے جسم پر نہایت ڈھیلے تھے ابھی میں دروازے سے کچھ دُور ہی تھا۔ کہ وہ اپنے ہاتھوں کو ہلاتی ہوئی میری طرف دوڑتی ہوئی آئی۔ وہ میرا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔ مگر میں اس کو ایک طرف جھٹک کر چل دیا۔ اس کے دل پر چوٹ سی آئی کیونکہ وہ آبدیدہ ہو کر میرے پیچھے پیچھے میری بیٹھک میں آ کر بیٹھ گئی۔ اور مجھے نہایت تعجب آمیز اور پُرحیرت نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ میں نے دفعتہً پوچھا۔ "تم کونسے ملک سے آئی ہو۔" اس نے مسکرا کر اپنے سر کو ہلایا۔ گویا وہ کچھ بھی نہیں سمجھتی تھی۔

میں نے کئی ملکوں کے نام لئے مگر ہر بار اس نے اپنے سر کو نفی میں ہلا دیا۔ پھر اس کے لبوں سے الفاظ کی ایک لطیف اور شیریں لہر جاری ہو گئی۔ مگر افسوس میں کلّی طور پر لذّت اندوز نہ ہو سکا۔ کیونکہ وہ ایسی زبان تھی جس کا میں ایک حرف تک نہ سمجھ سکتا تھا۔

ناشتے کے بعد مجھے اس کی قومیت کا کچھ سُراغ ملا کنارے پر گزرتے ہوئے چٹان کے ایک رخنے میں مجھے

ندی کا ایک ٹکڑا نظر آیا۔ کشتی پر سوار ہو کر میں اُسے کنارے پر لے آیا۔ اس پر عجیب و غریب حروف میں آرچینجل کا لفظ منقوش تھا۔ میں نے خیال کیا۔ کہ لڑکی روسی ہے۔ جب میں گھر واپس آیا۔ تو میں نے آرچینجل کو بھی با تختلف اصوات و تلفظات میں ادا کیا۔ مگر وہ اس کو بالکل نہیں سمجھتی تھی۔

تمام صبح میں اپنے تجربات میں منہمک رہا۔ جب دوپہر کو کھانے کے لئے گیا۔ تو میں نے دیکھا کہ وہ اپنے کپڑوں کو رفو کر رہی ہے۔ مجھے اس کی موجودگی سخت ناگوار گزرتی تھی۔ مگر اس کو گھر سے باہر کیسے نکال سکتا تھا۔ اس نے پہلے اپنی طرف اور پھر غرق شدہ جہاز کے مقام کی طرف اشارہ کر کے ایک انگلی کھڑی کر دی۔ غالباً اسکا سوال یہ تھا۔ کہ کیا اس ایک کے علاوہ تمام مسافر ہلاک ہو گئے تھے۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ کرسی پر سے اُچھل پڑی۔ اور ایک نعرۂ مسرت بلند کر کے ناچنے لگی اسی بیخودی کے عالم میں وہ رقص کرتی ہوئی کمرے سے باہر سورج کی روشنی میں آگئی۔ ساتھ ساتھ وہ ایک پُرتاثیر آواز میں گیت بھی گاتی جاتی تھی۔ جو اس کے جذباتِ انبساط و مسرت کا صحیح ترجمان تھا۔ میں نے اس کو خاموش رہنے کے لئے ڈانٹا۔ مگر وہ بدستور اپنے رقص و سرود میں مشغول رہی۔ دفعتہً میری طرف دوڑ کر اُس نے میرا ہاتھ چوم لیا۔

دورانِ طعام میں اس نے میری پنسل لیکر کاغذ کے ایک پرزے پر سوفیا ریموزینی لکھ دیا۔ اور پھر اپنی طرف اشارہ کیا۔ گویا یہی اس کا نام تھا۔ پھر اُس نے پنسل میرے ہاتھ میں دے دی۔ تاکہ میں بھی اپنا نام لکھوں۔ مگر میں نے اسے جیب میں ڈال دیا۔ میں گفت و شنید کے سلسلے کو منقطع کرنا چاہتا تھا۔

ہر لحہ اب مجھے یہی پشیمانی تھی۔ کہ میں نے اسکو کیوں بچایا۔ مجھے اس کی موت و زیست سے کیا سروکار تھا۔ میں کوئی شوریدہ سر نوجوان بھی نہیں تھا کہ ان باتوں میں دلچسپی لیتا۔ خود میری ملازمہ کی موجودگی میرے لئے بارگراں تھی۔ مگر خیر اس کو تو نظر انداز کیا جا سکتا تھا کیونکہ وہ سالخوردہ اور قبیح المنظر تھی۔ مگر یہ نوخیز اور دلفریب نازنین تو میرے لئے پیغام انتشار و پریشانی تھی۔ مگر میں کیا کر سکتا تھا۔ گاؤں میں اطلاع دیتا تو حکام اور دیگر حضرات آکر خواہ مخواہ ادھر آکر جھانکتے اور بیہودہ بکواس سے میرا سر کھپاتے۔ بالآخر میں نے اس کی موجودگی کو ہی برداشت کرنے کا فیصلہ کیا۔

قہر درویش بر جانِ درویش۔

(باقی)

اثر صہبائی

ناکامی کی دنیا

یہی جرأت ہی باقی جو شوقِ بے محابا ہیں
تو اب دامن اُن کا ہو دامن آئے گا دستِ تمنا میں

ابھی خیر کیجو اُن کو مجھ سے انس کیوں ہوتا
ابھی کیوں مسعول ہوتے یوں نوازش ہائے پیدا میں

ذرا دیکھے تو اوئی سیر سے عشق کا رہنما کو
کہ خود منزل کھنچی آتی ہے پائے دشت پیما میں

اگرچہ خواہشِ دیدار پردہ چھپیں ہر اک جو ہیں
مگر رنگِ تبسم بھی ہے اس تمکینِ حجابا میں

خدا کی شان ہے تکمیل ہے اب دلربائی کی
شبابِ حسن کی رنگینیاں ہیں روئے زیبا میں

گئے وہ دن کہ شب تھی پردہ دارِ بیمِ رسوائی
کہ اب تو ہم پہ خم پیتا ہوں روزِ آشکارا میں

ہمارے عشق کی آشفتگی ہے ذرے ذرے میں
تمہارے حسنِ پنہاں میں تمہارے رنگ پیدا میں

ہمیں کیا عیش و راحت سے کہ ہم واقف نہیں اس سے
گزاری نوجوانی ہم نے ناکامی کی دنیا میں

امیدِ وعدۂ دیدار پھر وہ بھی قیامت پر
کہاں سے آ گیا یہ صبرِ جانِ ناشکیبا میں

بچا سکتی میری بدنامی کو تجھ سے کیا تعلق ہو
تیری بے پردگی کو دخل کیا ہو عشقِ رسوا میں

یہ کس کی یاد نے ذوقِ تپش میں آکر دل نوازی کی
کہاں سے آئی لذت اضطرابِ ناگوارا میں

وہ دن ہیں اب کہ خونِ بیکسی کے گھونٹ پیتا ہوں
وہ راتیں خوب تھیں جو کٹ گئیں آغوشِ مینا میں

تماشا ہے کہ اس آئینے میں دو چاند روشن ہیں
شبِ مہتاب ہے مسرور ہیں وہ سیرِ دریا میں

وہ رسوائی وہ چرچے عاشقی کے یاد آتے ہیں
ہمیں لاہور یاد آتا ہے عابد کوہ و صحرا میں

عابد

بہارِ فردوس

ہر روز سہ پہر کے وقت، جب بچے مدرسے سے چھٹی پاکر واپس آتے تو وہ دیو کے باغ میں چلے جاتے۔ اور کھیلا کودا کرتے۔

یہ باغ ایک خوشنما اور کشادہ باغ تھا۔ اس کی ہری ہری دوب میں کھلے ہوئے پھول یوں معلوم ہوتے تھے کہ گویا آسمان پر ستارے جگمگا رہے ہیں۔ اس میں آڑو کے بارہ درخت تھے۔ بہار آتی تو وہ درخت گلابی رنگ کے ننھے ننھے شگوفوں سے لد جاتے، اور خزاں کے دنوں میں ان کی شاخیں میٹھے اور رس بھرے پھلوں سے جھک جاتیں۔ خزاں ہو کہ بہار، وہاں ہر وقت بہار تھی۔ پرندے شاخوں پر بیٹھ بیٹھ کر جھولا جھولتے اور ایسے سُریلے گیت گاتے کہ بچے اپنے کھیل بھول کر اُن کے سُننے میں محو ہو جاتے۔ اور ایک دوسرے سے ہنس ہنس کر کہتے "ہم یہاں کیسے خوش ہیں!"

ایک دن دیو واپس آگیا۔ وہ اپنے ایک دوست سے ملنے گیا تھا۔ اور سات برس تک اس کے ہاں رہا تھا۔ جب سات برس ہو چکے، تو وہ، اپنے دوست سے جو کچھ کہنا سننا چاہتا تھا۔ کہہ سنکر اور اُس سے رُخصت ہو کر، اپنے قلعہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب وہ اپنے قلعہ میں آکر پہنچا، تو اس نے دیکھا کہ بچے اُس کے باغ میں کھیل رہے ہیں۔

اُس نے ایک درشت لہجے میں اُن سے پوچھا "یہ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" اور وہ ڈر کر بھاگ گئے۔

"یہ باغ میرا باغ ہے، اور صرف میرا، اس لئے میں اپنے سوا کسی اور کو یہاں کیوں کھیلنے دوں؟" یہ سوچ کر دیو نے اپنے باغ کے اردگرد ایک اونچی دیوار بنادی۔ اور اُس پر ایک اشتہار چسپاں کر دیا۔

"بلا اجازت اندر آنا منع ہے"

وہ ایک نہایت خود پسند دیو تھا۔

اب غریب بچوں کے کھیلنے کی کوئی جگہ نہ رہی۔ وہ سڑک پر کھیلنے کی کوشش کرتے، لیکن سڑک پر گرد و غبار تھا۔ اور نکیلے پتھر اُن کے پاؤں میں چبھتے تھے۔ اس لئے وہ وہاں نہیں کھیل سکتے تھے۔ بیچارے مدرسے سے دن بھر کے تھکے ہارے آتے، اور کوئی مشغلہ نہ پاکر باغ کی دیواروں کے گرداگرد گھوما کرتے۔ وہ ہر وقت باغ کے تذکرے کیا کرتے اور ایک دوسرے

سے کہتے۔ "ہم وہاں کیسے خوش تھے!"

پھر بہار آئی۔ چمن چمن پھول کھلنے اور پرندے گانے لگے لیکن دیو کے باغ میں ابتک جاڑے تھے جب کوئی دیکھنے اور سننے والا نہ رہا تو درختوں نے اپنی سج دھج ترک کر دی۔ اور پرندوں نے اپنے گیت بن گائے چھوڑ دیئے۔ ایک بار ایک خوبصورت پھول نے گھاس میں سے سر نکال کر اپنی پنکھڑیاں کھولیں۔ لیکن جب اُس کو وہ اشتہار نظر پڑا تو اُسے اتنا رنج ہُوا کہ اُس نے پھر اپنا سر چھپا لیا۔ اور بچّوں کی حالت پر افسوس کرتے کرتے گہری نیند سو گیا۔ بچوں کا نہ آنا اگر کسی کو پسند تھا۔ تو وہ صرف دو لوگ تھے؛ برف اور کہر۔ وہ خوش خوش ہو ہو کر ایک دوسرے سے کہتے۔

"بہار اس باغ میں آنا بھول گئی ہے۔ اس لئے اب ہم بارہ مہینے یہاں رہینگے"؛ برف نے اپنی سفید چادر گھاس پر بچھا دی، اور کہر نے بیل بوٹوں پر میناکاری کر دی۔ پھر اُنہوں نے بادِ شمال کو اپنے ساتھ رہنے کے لئے بلا بھیجا۔ اُس نے اُن کا بلاوا منظور کر لیا۔ اور اُن کے پاس آگئی۔ دن بھر وہ باغ کے آس پاس شور و غل مچاتی اور کھلے بندوں بربادی پھیلاتی پھرا کرتی۔ اُس کو یہ باغ اتنا پسند آیا کہ وہ تعریف کے جوش میں بول اُٹھی "آہا یہ کیسی اچھی جگہ ہے! آؤ اولوں کو بھی بلالیں"۔ چنانچہ اولے بھی آگئے۔ ہر روز وہ قلعہ کی چھت پر ٹوٹ پڑتے اور تین گھنٹوں تک اپنی موسلا دھار بارش کا تار باندھے رکھتے یہانتک کہ اُنہوں نے تمام کھپریلوں کو چکنا چُور کر دیا۔ اور پھر وہ باغ کے چاروں طرف ایک دوسرے کے اُوپر دھڑا دھڑ گرا کرتے۔ وہ بھورے رنگ کے کپڑے پہنے رہتے تھے اور اُن کی سانس برف کی طرح ٹھنڈی تھی۔

خود پسند دیو جب اپنی کھڑکی میں بیٹھ کر اپنے باغ کا یہ بگڑا ہُوا نقشہ دیکھتا تو وہ سوچا کرتا۔ "کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ ابھی تک بہار کیوں نہیں آئی . . . . . خیر تھوڑے دنوں میں رُت بدل جائیگی"؛

بہار آئی اور گزر گئی، اور خزاں جا کر پھر آگئی، لیکن اُس باغ کے دن نہ بدلے۔ دوسرے باغوں میں خزاں نے زرد زرد پھلوں کا سونا لٹایا، لیکن دیو کے باغ کی طرف اُس نے آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا۔ وہ یہ کہہ کر اُس کے پاس سے گزر گئی کہ "یہ دیو بڑا خود پسند ہے" اس لئے وہاں بارہ مہینے جاڑے رہتے تھے۔ بادِ شمال اور کہر اور برف اور اولے بے روک ٹوک لُوٹ مار مچاتے پھرا کرتے

ایک دن صبح سویرے دیو اپنے بستر پر نیم بیداری کے عالم میں لیٹا تھا۔ کہ اُس نے ایک دلکش راگ سُنا جو اُس کے کانوں کو ایسا بھایا کہ اُس نے خیال کیا کہ ضرور بادشاہ کے سازندے اپنے ساز بجاتے اُس کی کھڑکی

کے نیچے سے گزر رہے ہیں یہ راگ ایک چڑیا کا راگ تھا۔ جو باغ میں بیٹھی اپنی بولی بول رہی تھی۔ لیکن دیو کو کسی پرندے کا راگ سنے اتنی مدت ہو گئی تھی کہ اُس نے اس معمولی راگ کو دُنیا کا بہترین نغمہ سمجھا۔ پھر اولوں نے اُس کے سر پر اپنی بوچھاڑ بند کر دی اور بادِ شمال نے اپنا شور بند کر دیا۔ اور کھلی کھڑکی میں سے اُسے ایک بھینی بھینی خوشبو آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ خوشی سے پکار اٹھا "معلوم ہوتا ہے بہار آ گئی" اور وہ اپنے بستر سے اچھل کر اٹھا۔ اور کھڑکی میں سے جھانکنے لگا۔

جو کچھ اس نے دیکھا وہ ایک عجیب و غریب منظر تھا۔ دیوار کے ایک چھوٹے سے سوراخ میں سے بچے اندر گھس آئے تھے اور درختوں کی شاخوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ ہر درخت کی شاخوں میں اُسے ایک ننھا منھا گلاب سا چہرہ مسکراتا ہوا نظر آیا۔ اور درخت بچوں کی اس بازگشت پر کچھ ایسی خوشیاں منا رہے تھے کہ شگوفوں کے ہار گلے میں سجے کھڑے تھے۔ اور اپنے عزیز مہمانوں کے سر پر آہستہ آہستہ اپنی ہری بھری ٹہنیوں کا چھتر ملا رہے تھے۔ پرندے ڈال ڈال پات پات پھدکتے پھرتے تھے۔ اور خوشی کے مارے چہچہا رہے تھے۔ اور پھول گھاس کی پتیوں میں سے جھانک جھانک کر اپنے ان پیارے ہمجولیوں کو دیکھتے تھے۔ اور رہ رہ کر مسکراتے تھے مگر تو باغ کا ایک کونہ اس جشنِ عالمگیر سے ناآشنا تھا۔ یہ کونہ باغ کا ایک دور افتادہ کونہ تھا اور اُس میں ایک ننھا سا بچہ کھڑا تھا۔ وہ ایسا چھوٹا تھا کہ اُس کا ہاتھ ٹہنیوں تک نہ پہنچتا تھا۔ اور وہ ہاتھ اُوپر کو اُٹھائے درخت کے چاروں طرف پھر رہا تھا۔ اور اپنی بے بسی پر رو رہا تھا۔ غریب درخت ابتک برف اور کہر سے جکڑا ہوا تھا۔ اور بادِ شمال اُس کے اردگرد غل مچاتی پھر رہی تھی۔ وہ اپنی شاخیں جھکا جھکا کر بچے سے کہتا "آؤ ننھے میاں مجھ پر سوار ہو جاؤ" لیکن وہ بالکل زمین سے پیوست تھا۔ اور اُس کا ہاتھ شاخوں تک نہ پہنچتا تھا۔

اور جب دیو نے یہ منظر دیکھا تو اُس کا دل پسیج گیا۔ اُس نے اپنے کو بہت برا بھلا کہا اور سوچنے لگا "اب معلوم ہوا کہ بہار کیوں نہیں آتی تھی میں اس ننھے بچے کو درخت پر چڑھا دونگا۔ پھر اس دیوار کو گرا دونگا۔ اور میرا باغ ہمیشہ کے لئے بچوں کا ہو جائیگا۔ وہ اپنے کئے پر بہت پشیمان ہوا۔

اس لئے وہ سیڑھیوں سے اترا اور گھر کا دروازہ کھول کر باغ میں گیا لیکن جب بچوں نے اُسے آتے دیکھا۔ تو وہ ایسے ڈرے کہ بدحواس ہو کر بھاگ گئے اور باغ پر پھر جاڑوں کا تسلط ہو گیا۔ صرف وہ چھوٹا سا بچہ وہاں کھڑا رہ گیا۔ کیونکہ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے

تھے اور وہ دیو کو نہ دیکھ سکا تھا۔ دیو دبے پاؤں اُسکی پشت کی جانب سے اُس کے پاس پہنچا۔ اور اُسے چپکے سے اُٹھا کر ایک ٹہنی پر بٹھا دیا۔ درخت پر آن کی آن میں شگوفے ہی شگوفے نظر آنے لگے۔ اور پرندوں نے آ آ کر اپنی راگنیاں چھیڑ دیں۔ اور ننھّے بچے نے دیو کے گلے میں باہیں ڈالکر اس کی پیشانی پر پیار کا ایک بوسہ دیا جب دوسرے بچّوں نے دیکھا کہ دیو اب پہلے کی طرح ظالم نہیں رہا۔ تو وہ دوڑتے ہوئے واپس آ گئے۔ اور اُن کے ساتھ ہی بہار آ گئی۔ دیو نے اُن سب کو مخاطب کر کے کہا "میرے بچّو! اب یہ باغ تمہارا باغ ہے"! اور اس نے ایک بڑی سی کُدال اُٹھائی۔ اور دیوار کو گرا کر زمین کے برابر کر دیا۔ اور جب لوگ دن کے بارہ بجے بازار جا رہے تھے۔ تو وہ یہ دیکھ کر متعجب ہو گئے۔ کہ ایک دیو ایک ایسے باغ میں جس کی نظیر انہوں نے کبھی نہ دیکھی تھی ننھے ننھّے بچّوں کے ساتھ کھیل رہا ہے۔

دن بھر وہ وہاں کھیلا کئے۔ اور جب شام ہوئی تو وہ دیو کو خدا حافظ کہنے کو آئے۔

اُس نے پُوچھا "تمہارا وہ ننھّا ہمجولی کہاں ہے جسے مَیں نے درخت پر چڑھایا تھا؟" دیو کو وہ سب سے زیادہ پیارا تھا۔ کیونکہ اس نے اُسے پیار کا ایک بوسہ دیا تھا۔

بچّوں نے جواب دیا "ہم نہیں جانتے۔ شاید وہ چلا گیا ہو گا" دیو نے اُن سے کہا۔ "اُس سے کہنا کہ کل یہاں ضرور آئے" اور اُس نے اُنہیں بہت تاکید کی۔ مگر بچّوں نے جواب دیا۔ "ہمیں معلوم نہیں کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ ہم نے اُس کو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا" اور دیو پر غم کی افسردگی چھا گئی۔

ہر روز سہ پہر کے وقت جب بچّے مدرسے سے چھٹی پا کر واپس آتے۔ تو وہ دیو کے باغ میں چلے جاتے اور اس کے ساتھ کھیل کود کیا کرتے۔ مگر وہ ننھّا بچّہ جو دیو کو سب سے پیارا تھا پھر کبھی نظر نہ آیا۔ دیو بچّوں سے بڑی محبّت کرتا تھا۔ مگر وہ آہیں بھر بھر کر اپنے بچھڑے ہوئے دوست کو یاد کیا کرتا۔ اور اکثر کہا کرتا۔ "آہ میرا جی اُس سے ملنے کو کس قدر چاہتا ہے!"

کئی برس گزر گئے۔ اور دیو پر بڑھاپے کی کمزوری غالب آ گئی۔ اب وہ پہلے کی طرح بچّوں کے ساتھ نہ کھیل سکتا تھا۔ اس لئے وہ ایک بڑی سی آرام کرسی پر بیٹھ کر اُنہیں کھیلتے دیکھا کرتا۔ اور اپنے باغ کی تعریفیں کیا کرتا۔ وہ اکثر کہا کرتا "میرے باغ میں طرح طرح کے خوبصورت پھول ہیں، لیکن یہ بچّے اُن سب سے خوبصورت ہیں"۔

جاڑوں کی ایک صبح کو وہ اپنی کھڑکی میں کھڑا اپنے باغ کے نکھرے ہوئے جوبن کا نظارہ کر رہا تھا۔ اب اُسے جاڑوں

سے نفرت نہ تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ سردی کا موسم بہار اور بہار کے پھولوں کے آرام کا وقت ہے۔

یکایک وہ حیران ہو کر اپنی آنکھیں ملنے لگا۔ کیونکہ جو کچھ اُسے نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک عجیب و غریب منظر تھا۔ باغ کے بعید ترین کنارے میں ایک درخت تھا۔ جو پھولوں کا نولکھا ہار پہنے کھڑا تھا۔ اس کی شاخیں سنہری تھیں اور اُن پر چاندی کے پھل پھول لٹک رہے تھے۔ اور درخت کے نیچے وہ ننھا بچہ کھڑا تھا۔ جو دیو کو سب بچوں سے پیارا تھا۔

خوشی کے مارے دیو بھاگا بھاگ سیڑھیوں سے اُتر کر باغ میں گیا۔ اور گھاس پر لمبے لمبے قدم دھرتا بچے کے پاس پہنچا۔ اور جب وہ بالکل قریب پہنچ گیا۔ تو اُس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور وہ بولا "تجھے زخمی کرنے کی کس کو جرأت ہوئی ہے؟" کیونکہ بچے کی ہتھیلیوں میں ناخنوں کے نشان تھے۔ اور ایسے ہی ناخنوں کے نشان اُس کے ننھے ننھے پاؤں پر تھے۔

اُس نے پوچھا "تجھے زخمی کرنے کی کس کو جرأت ہوئی ہے؟ مجھے بتا تاکہ میں اپنی تلوار سے اُس کا سر اڑا دوں"

بچے نے جواب دیا۔ "آہ، یہ زخم نہیں محبت کے داغ ہیں"

دیو نے پوچھا۔ "تو کون ہے؟" اور اُس پر ایک پُراسرار خوف چھا گیا۔ اور وہ مرعوب ہو کر بچے کے سامنے دوزانو ہو گیا۔

اور بچہ دیو کو دیکھ کر مسکرا دیا۔ اور کہنے لگا "آج کے دن تم مجھے اپنے باغ میں رہنے دو۔ کل میں تمہیں اپنے باغ میں لے جاؤں گا۔ جسے جنت کہتے ہیں"

اور جب اُس دن سہ پہر کے وقت بچے باغ میں دوڑتے ہوئے آئے۔ تو انہوں نے دیکھا کہ درخت کے نیچے اُن کا پیارا دیو مرا پڑا ہے۔ اور اُس کی لاش پر سفید شگوفوں کا ایک کفن ہے۔

(آسکر وائلڈ) محمد ہادی حسین

رشحاتِ جلیل

دل کی قسمت میں تھا لذت کشِ حرماں ہونا
خون ہو کر بھی نہ زیبِ سرِ مژگاں ہونا

عشق میں راس نہیں صاحبِ ارماں ہونا
شرط پہلے ہے یہاں سوختہ ساماں ہونا

اللہ اللہ رے پاسِ غمِ مجبوریِ عشق
ہم نے جانا نہ کبھی ہجر میں نالاں ہونا

وحشت دشت نہیں کوئی بہ قدرِ ہمت
چاہیئے سینۂ عاشق کو بیاباں ہونا

حیف اس ذرۂ خاکِ دلِ عاشق پہ جلیل
جس کی قسمت میں ہو شمعِ شبِ ہجراں ہونا

جلیل

انارکلی

(۱)

نادرہ جو انارکلی کے نام سے موسوم ہے۔ اکبر کے حرم سرا کی ایک لونڈی کی لڑکی تھی۔ ایک بار بادشاہ نے اُسے اس نام سے یاد کیا تھا۔ اور آج تک اس کا یہ نام چلا آتا ہے۔ انارکلی ایک بھولی بھالی کمسن معصوم اور خوبصورت لڑکی تھی۔ وہ بیگمات شاہی کی خاص طور پر منظور نظر تھی اور شاہی حرم سرا کے احاطے کے اندر ایسے پھرا کرتی تھی جیسے ایک چمکدار تتلی باغ میں کلیوں کی بہار لوٹتی ہے۔

آخر کب تک ایک کلی ناشگفتہ رہ سکتی ہے؟ آفتاب کی سُنہری کرنیں اُسے چھونا شروع کرتی ہیں اور حسن اور خوشبو کے خزانے کو کھول دیتی ہیں۔ یہی حال انارکلی کا تھا۔ زندگی کے موسم بہار کی آمد نے اُس کے حسن میں شباب کی رُوح پھونک دی تھی۔ کمسن سے جوان ہو جانا کیا ہی عجیب تغیر ہے۔ بچپن کی وہ شوخی رخصت ہو چکی تھی اور جوانی کی متانت اور سنجیدگی نے اس کی جگہ لے لی تھی۔ اُس کے سادے اور صاف تبسم میں مسحور کرنے کی طاقت پیدا ہو گئی تھی۔ اُس کی سیاہ اور چمکدار آنکھیں جن میں متانت اور پاکیزگی کا سرور تھا۔ محبت کا سرچشمہ تھیں۔ شباب کے جوش نے اُس کو اور بھی شوخ بنا دیا تھا اور ہر لحظہ وہ منتہائے کمال پر پہنچ رہی تھی۔

حرم شاہی کی سن رسیدہ عورتیں انارکلی کے حسن کے نکھار کو دیکھ دیکھ کر آہیں بھرتی تھیں۔ اور اپنے عہد گزشتہ کو یاد کیا کرتی تھیں۔ کبھی اُس کی سہیلیاں اُسے چلتے دیکھ کر بے اختیار کہہ اٹھتی تھیں "آہ! اب کلی بھی کھل چلی"۔ اس کا جواب انارکلی ایک دلفریب تبسم کے ساتھ یوں دیا کرتی تھی "پھر کیوں نہ کھلے!"

اب انارکلی وہ بھولی بھالی لڑکی نہ تھی۔ بلکہ جوان عورت بن چکی تھی۔ حرم شاہی کے اندر پر وہ کی قید نہ تھی۔ اس لئے سب سے پہلے جس نے اُس کے حسن اور جوانی کا خیر مقدم کیا۔ وہ شہنشاہ اکبر کا بیٹا اور سلطنت کا جانشین شہزادہ سلیم تھا۔

(۲)

انارکلی کے حسن میں غضب کی تاثیر تھی۔ جو اُسے ایک بار دیکھ پاتا۔ دل و جان سے فریفتہ ہو جاتا۔ آخر اس کے حسن نے سلیم پر بھی اپنا اثر ڈالنا شروع کیا۔ وہ انارکلی سے اپنی محبت کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ مگر کیونکر کرتا؟

شام کا وقت تھا چاندنی نکھری ہوئی تھی۔ دونوں خلوت میں تھے۔ بارش کے زبردست چھینٹوں نے باغ کے پتوں کو دھو دیا تھا سوندھی سوندھی بھینی بھینی خوشبو سے ارد گرد کی تمام فضا معطر ہو رہی تھی۔ درختوں کے پتوں سے پانی ٹپک ٹپک کر ایک ہلکی سی سریلی آواز پیدا کر رہا تھا۔ آسمان صاف ہوتا جا رہا تھا۔ چاند کی خوشگوار روشنی درختوں کی چوٹیوں پر پھیل رہی تھی۔ انارکلی سنگ مرمر کے بھیگے ہوئے فرش پر ٹہل رہی تھی اور اپنی چھوٹی سی ہرنی کی منتظر تھی۔

"آرا! آرا!"

یہ الفاظ ایک سریلی موسیقی کی طرح ہوا میں گونج رہے تھے۔ اور شام کی خاموشی میں خوش آیند معلوم ہوتے تھے۔

"آرا! آرا!"

پھر وہی جھنکار پیدا ہوئی۔ مگر بہت مدھم اور دبی ہوئی۔ کبھی تو وہ دور سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور کبھی نزدیک سے سنائی دیتی تھی۔ مگر یہ ظاہر تھا کہ ہرنی اس کی آواز سنتی ہے ورنہ وہ کیسے جواب دیتی۔ لیکن وہ کہاں تھی؟ ہرنی تو پہلی ہی آواز سے آجایا کرتی تھی۔

انارکلی نے پھر آواز دی۔ اور وہی جواب پایا۔ وہ بہت جلدی باغ کے اس حصہ میں جا پہنچی جدھر سے یہ آواز آرہی تھی اور دردناک آواز میں کہا "آرا! اب تک تو کہاں تھی"

ہرنی فوراً ایک درخت کے نیچے سے چھلانگیں مارتی ہوئی آموجود ہوئی۔

شام کی خاموشی میں اس کے گھونگروؤں کی آواز دور ہوا میں گونجتی ہوئی چلی گئی۔ انارکلی نے جھک کر اپنی گداز باہیں اس کے گلے میں ڈال دیں اور پیار کے لہجے میں بولی۔ "کیوں ری ساحرہ! اب تک تو کہاں تھی اور تجھے کس نے روک رکھا تھا؟"

"میں نے"

انارکلی چونک پڑی اور پیچھے مڑ کر دیکھنے لگی وہ گھبرا گئی جب اس نے دیکھا کہ سلیم اس کے پیچھے کھڑا ہوا اس کی باتیں سن رہا ہے۔

سلیم نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں تمہاری ہرنی کو نہ جانے دونگا۔"

انارکلی کے چہرے پر شرم کی سرخی دوڑ گئی اس نے جلدی سے اپنا نقاب سنبھالا اور تعظیم کے لئے جھک گئی۔ اور پھر رکتے ہوئے کہا۔ "حضور میرا قصور معاف کریں مجھے معلوم نہ تھا۔"

الفاظ اس کے ہونٹوں پر آکر رک گئے۔

شہزادے نے مسکراتے ہوئے بات کاٹ کر کہا۔
"نہیں مجھے آپ سے معافی مانگنا چاہیئے۔ کیونکہ میں نے آپ کی اجازت کے بغیر آپ کی ہرنی کو روک رکھا تھا۔
شہزادے کی اس بات نے انارکلی کو اور بھی شرمندہ کر دیا۔
سلیم نے پھر کہا "کیا آپ کو معلوم ہے۔ کہ میں نے اسے کیوں روک رکھا تھا" یہ کہتے ہوئے وہ ذرا آگے بڑھا اور اس کے کان میں آہستہ سے کہا۔ "اس لئے کہ اس کی آنکھیں تمہاری آنکھوں سے مشابہ ہیں"
انارکلی نے سُنا۔ عرصہ سے اُسے معلوم تھا کہ شہزادہ اس سے محبّت کرتا ہے۔ آج اس کو اس بات کا یقین ہو گیا۔ اس کا دل خوشی سے معمور تھا۔ مگر اسکے لب کلمۂ محبّت سے ناآشنا
سلیم انارکلی کے پاس کھڑا ہوا تبسّم آمیز نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ انارکلی نے بھی اپنی شرمگیں نگاہیں اوپر اُٹھائیں۔ گردشِ چشم کے لحۂ محبّت نے دو دلوں کے خون میں ایک ہی موج مرتعش اور دو روحوں میں ایک ہی شورشِ التہاب نمایاں کر دی۔ دونوں کی آنکھیں ملیں۔ انارکلی کے ہونٹوں پر بھی ایک غیر معمولی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ سلیم نے آہستہ سے نادرہ کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنی آغوش میں کھینچ لیا۔
"میری جان! تم میری ہو اور فقط میری"
پہلی بار اُنہوں نے ایک دوسرے کے ہونٹوں کی گرمی محسوس کی۔ انارکلی سلیم کے آغوشِ محبّت میں کھڑی کانپ رہی تھی۔
ہرنی چونک کر چل دی۔ جیسے ابھی کسی خوابِ پریشان سے بیدار ہوئی ہو اور جب وہ چلی تو اس کی موٹی موٹی آنکھوں سے دو بڑے بڑے موتی آنسو بن کر نکلے۔ اور چاندی کی نکھری ہوئی چاندنی میں زمین پر گر کر ہمیشہ کے لئے مٹ گئے۔

(۳)

اس رات انارکلی کو خوشی کے مارے نیند نہ آئی۔ اُسے رہ رہ کر شام کے واقعات یاد آتے تھے۔ جو اُسے سونے نہ دیتے تھے۔ سلیم کی زبان سے اچانک محبّت کے الفاظ سُنکر اُسے بے انتہا مسرت ہو رہی تھی۔ وہ آنکھیں بند کئے اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ مگر سو نہ سکتی تھی۔ اور اس بیخوابی کی حالت میں اس لطفِ خاص کا مزہ لے رہی تھی۔ جو اس کی رگ رگ میں پیدا ہو گیا تھا۔
وہ شام کے تمام واقعات کو مفصل طور پر اپنے دماغ میں دہرا رہی تھی۔ سلیم کی گفتگو اس کی پیار بھری اور مترنم آواز، وہ آنکھوں کا چار ہونا اور اس کا شرم سے

آنچل میں منہ چھپا لینا شہزادے کی آنکھوں کا وہ رسیلا پن ان تمام باتوں کی یاد اس کے دل میں عجیب کیفیتیں پیدا کر رہی تھیں۔

ان کے علاوہ بے حد دل خوش کن وقت وہ تھا۔ جب ان کے ہونٹوں نے ایک دوسرے کی شیرینی چکھی تھی۔ اور دل بھی ملنے کی کوشش کر رہے تھے اس کی یاد نے اس کے بیتاب دل میں ایک حرارت پیدا کر دی بھلا وہ کیسے سو سکتی ہے جس کے دل میں اس قسم کے خیالات جاگزیں ہوں۔

عشق! محبت! ہاں شہزادے کو اس سے محبت تھی کیسی عجیب بات تھی انارکلی کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ یہ بات کیا ہے؟ کیا وہ واقعی حسین و خوبصورت تھی؟ ہاں اب اُسے یقین آچلا تھا کہ وہ ضرور ہوگی

ان تمام خیالات نے جمع ہو کر اس کے دل پر ایک پردہ سا ڈال دیا۔ کسی کے آغوش محبت میں مسرت و انبساط کی زندگی بسر کرنا! اس کے ساتھ ہی مستقبل کے خیالات اُس کی آنکھوں میں پھر گئے۔ یہ خیالات کہ سلیم اس سے شادی کریگا۔ اور اس خواب راحت کی حالت میں وہ کتنی منازلِ اُلفت طے کریں گے۔ کیا ہی اچھا ہوگا۔ کاش وہ وقت جلد تر آتا۔

وہ ایسے ہی خیالات میں محو تھی۔ اور ایسی ہی آرزوؤں سے اس کا پیمانہ محبت لبریز ہو رہا تھا۔ وہ بار بار انہیں دُھراتی تھی اور ہر مرتبہ ایک نیا لطف محسوس کرتی تھی۔

ادھر سلیم بھی بیقرار تھا۔ وہ ابھی نوعمر ہی تھا۔ میدانِ محبت میں پہلا قدم تھا۔ اس عمر میں محبت برے بُرے خیالات سے پاک، آرزوؤں سے پُر اور دل کی گہرائیوں میں گھر کرنے والی ہوتی ہے۔ انارکلی نے جو اثر اس کے دل پر ڈالا تھا۔ اس سے پہلے کبھی اُس نے محسوس نہ کیا تھا۔ وہ اس کی پیاری اور دلکش آنکھوں رسیلی آواز، گلابی ہونٹوں اور محبت میں سرشار گفتگو کے مزے لیتا ہوا آخرکار سو گیا۔

(۴)

کچھ دنوں کے بعد زنانخانہ میں رقص و سرود کی ایک محفل کا انعقاد قرار پایا۔ اکبر اس فن کا دلدادہ اور سرپرست تھا۔ شام کا وقت اکثر ایسی ہی محفلوں میں گزارا کرتا تھا۔ اس محفل میں انارکلی گل سرسبد تھی۔ اُس نے اپنی دلکش آواز سے بادشاہ کے دل میں جگہ پالی تھی۔ کوئی محفل انارکلی کے بغیر پُرلطف نہ ہوتی تھی۔ اور خود بادشاہ کی منظورِ نظر ہونے کے باعث وہ اور کسی جگہ نہ گا سکتی تھی۔ یہانتک کہ جب کبھی بادشاہ بیگمات میں وقت گزارنے کا قصد کرتے تو انارکلی وہاں بھی موجود ہوتی۔

شیش محل روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ مختلف اقسام کے جھاڑ فانوس چھت میں لٹکے ہوئے تھے۔ جن کی روشنی آئینوں سے ٹکرا کر ایک عجیب کیفیت پیدا کر رہی تھی۔ کمرہ ایک جڑاؤ زیور کی طرح جو بے شمار جواہرات سے مزین ہو جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ فرش پر قیمتی قالین بچھے ہوئے تھے۔ اور صدر میں بادشاہ مسند زریں پر رونق افروز تھے۔ فرش پر بیگمات ملائم گدے اور تکیے لگائے بیٹھی ہوئی تھیں۔ گانا شروع ہو چکا تھا۔ کئی خواتین اپنا گانا ختم کر چکی تھیں۔ مگر انارکلی ابھی تک نہیں آئی تھی۔ کچھ دیر کے بعد اُس کی باری آئی۔ وُہ حاضر ہوئی اور جھک کر تعظیم بجا لائی۔ پھر چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔ وہ ارغوانی رنگ کے لباس میں ملبوس تھی جس پر زر دوزی کا کام کیا ہوا تھا۔

اس کے بالوں میں، سینہ پر، گلے اور کلائیوں میں جواہرات پوری آب و تاب سے چمک رہے تھے آج ان زیوروں نے اس کے حسن کو دوبالا کر رکھا تھا کسی نے آج تک اُسے اس سے قیمتی لباس میں نہ دیکھا تھا بادشاہ نے اس کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "بدرِ کامل کو تاروں پر فتح پانے کے لئے آرائش کی ضرورت نہیں۔ تم نے یہ پوشاک تو بے فائدہ پہنی"۔ انارکلی نے شرم سے سر جھکا لیا۔ جو کچھ اُس کے دل میں مستور تھا بادشاہ سے کیسے کہتی۔ سلیم وہاں موجود تھا پھر آج وہ کیوں اعلےٰ سے اعلےٰ پوشاک زیب تن نہ کرتی۔

سارنگی کی مدھم مگر کانپتی ہوئی آواز محل میں پیدا ہوئی۔ انارکلی کھڑی سنتی رہی۔ جونہی تمہیدی راگ ختم ہوا اُس نے اُستاد کی طرف دیکھ کر بجانے کا اشارہ کیا۔ اور اپنا دایاں پاؤں ناچنے کے لئے بڑھایا۔ اُس کے پاؤں کے گھونگروں کی آواز سے ایک قسم کی خاموشی طاری ہو گئی۔ اور تمام محفل میں سناٹا چھا گیا۔ اس خاموشی میں انارکلی کے پاؤں کی آواز ناچتی ہوئی سنائی دی۔ اور وہ اس طرح ناچتی ہوئی آگے بڑھی۔ جس طرح کوئی انسان خواب میں حرکت کرتا ہے۔ پھر گھونگروؤں کی آواز پیدا ہوتی۔ اور سارنگی کی آواز کے ساتھ مل کر فنا ہو گئی۔ اب آہستہ آہستہ اُس نے گانا شروع کیا۔ اس کی دبی ہوئی مگر نغمہ کی لطافت سے مالا مال آواز موسیقی کے ساتھ مل کر کمرے میں گونجنے لگی۔ کبھی وہ اس قدر مدھم آواز میں گانے لگتی تھی۔ کہ اُس کے گانے کا یقین صرف اُس کے ہلتے ہوئے ہونٹوں سے ہوتا تھا۔ کچھ دیر بعد آواز سنائی دینے لگتی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا جس طرح چاندنی رات میں کوئی پرندہ سریلی آواز میں گا رہا ہے۔

آج انارکلی گانے میں ایک خاص قسم کی خوشی محسوس کر رہی تھی۔ اسے اس طرح معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی

خوشگوار خواب دیکھ رہی ہے جس میں سوائے سلیم کی محبت کے اور کوئی چیز نہ پائی جاتی تھی۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور اُسکی آنکھیں سلیم کی آنکھوں سے چار ہوئیں۔ وہ بھی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کی موٹی موٹی آنکھوں میں ایک دلفریب محبت جھلک رہی تھی۔ انارکلی کے دل میں گزشتہ دنوں کی یاد دفعتہً تازہ ہو گئی۔ کیونکہ اس شام کے بعد وہ کئی بار مل چکے تھے۔ انارکلی بے حد خوش تھی۔ اور اس کی آنکھیں جوش مسرت سے چمک رہی تھیں۔

انارکلی آج حسن کی دیوی بنی ہوئی تھی۔ سلیم نے دل میں کہا:" کتنی پیاری صورت اور کتنی دلکش ادائیں ہیں!" اس کی نگاہیں سلیم کے دل پر اپنا اثر کر رہی تھیں۔ اُس نے بلند آواز سے گانا شروع کیا ؎

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

غزل کے الفاظ نے اس کے دل میں ایسے خیالات پیدا کر دئے۔ جو آج تک کبھی اس کے خواب و خیال میں بھی نہ آتے تھے۔ اپنے عاشق کے سامنے گانا اور اپنے پوشیدہ جذبات کا اظہار کرنا اس سے اچھا موقع اور کونسا ہو سکتا تھا۔ وہ دیوانخانے کو دیوان خانے کی ہر ایک چیز کو بھول گئی۔ یہاں تک کہ اُسے یہ بھی خیال نہ رہا کہ وہ بادشاہ کے حضور میں کھڑی گا رہی ہے اُس کے دماغ میں اس وقت ایک ہی خیال تھا۔ وہ اپنے آپ کو اس وقت ایک ایسی محفل میں سمجھ رہی تھی جس میں وہ اور اس کا عاشق زار سلیم کے سوا اور کوئی موجود نہ تھا۔ اُس نے دزدیدہ نگاہوں سے سلیم کی طرف دیکھا۔ مسرت نور بن کر اُس کی آنکھوں میں نمایاں تھی۔ اس کے ہونٹوں سے ایک عجیب مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اور آنکھیں سلیم کے چہرے پر جم گئیں۔

یکایک ایک غصہ سے بھری ہوئی آواز نکلی۔ یہ بادشاہ کی آواز تھی" گانا بند کرو"۔ گانا فوراً بند ہو گیا۔ اور ایک مکمل خاموشی چھا گئی۔

بادشاہ غصہ سے کانپ رہا تھا۔ اُس کی بھویں تن گئی تھیں۔ اور اس کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔

اس نے سامنے والے آئینہ میں تمام راز و نیاز کی باتیں جو سلیم اور انارکلی کے درمیان اشاروں میں ہو رہی تھیں۔ دیکھ لی تھیں۔ اور اب تک بھی برابر آئینے پر نظر جمائے اُن کے خیالات کا اندازہ لگا رہا تھا۔ اُدھر ان کی آنکھیں اُن کے دلی جذبات اور کیفیات کا پتہ دے رہی تھیں۔ جن کی اُن دونوں کو مطلق خبر نہ تھی۔ بادشاہ اُن کا بنظر غور مشاہدہ کر رہا تھا۔ ہر لحہ اُس کا شبہ یقین کے درجے کو پہنچ رہا تھا۔ یہاں تک کہ انارکلی سلیم کو دیکھ کر مسکرا دی۔ اور سلیم نے بھی اس کا جواب تبسم میں دیا۔ اب بادشاہ کو

[illegible] ہو گیا کہ انارکلی شہزادے کو [illegible] کرنے کی [illegible] کوشش کر رہی ہے۔

بادشاہ اگرچہ بہت نیک اور متحمل مزاج واقع ہوا تھا۔ مگر آج وہ بہت غضبناک بن گیا تھا۔ کیا شہزادہ ایک غلام زادی کے جال میں پھنس کر خراب ہو جائیگا؟ وہ جانتا تھا کہ سلیم کو اس آنے والی بلا سے بچانے کے لئے صرف زبان کا ہلانا کافی ہے۔ اُس نے خواجہ سرا کے افسر کو بلایا۔ غصّہ سے کانپتی ہوئی اُنگلی سے انارکلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بادشاہ نے کہا "اس عورت کو لے جاؤ۔ اور کال کوٹھری میں بند کر دو۔ کل اس کی زندہ کھال کھنچوائی جائیگی۔ یہ اُن کمظرف عورتوں کی سزا ہے جو بڑا امتیاز اپنی اداؤں کے جال بچھانا چاہتی ہیں"

بادشاہ کے الفاظ کمرے کی خاموشی میں گونج اُٹھے اور ہر شخص اپنی جگہ دم بخود ہو گیا۔

ادھر انارکلی نے مُنہ پھیرا اور حیران و ششدر ہو کر بادشاہ کی طرف دیکھنے لگی۔ لیکن جب اُسے معلوم ہوا۔ کہ بادشاہ کا اشارہ اس کی طرف ہے۔ تو اُس کا خون رگوں میں منجمد ہو گیا۔ وہ سوچنے لگی۔ کہ بادشاہ کا اس سے کیا مطلب ہے۔ کیا بادشاہ کا اشارہ اس کی طرف ہے۔ کمرے میں ایک خوفناک آواز پیدا ہوئی۔ ابھی وہ اچھی طرح نہ سمجھ سکی تھی کہ کمرہ کی روشنی گل ہو گئی۔

[illegible] کی [illegible] انارکلی کے [illegible] ما۔ وہ چونکی دیکھا تو خواجہ سرا اُسکی کلائی میں ہاتھ ڈالے اُسے لے جلنے کو کھڑا ہے۔ اس کی آنکھوں اور چہرہ سے ایک قابلِ رحم مایوسی برس رہی تھی۔ وہ دبی آواز میں رونے لگی۔ اور اپنا ہاتھ خواجہ سرا کی گرفت سے چھڑا کر بادشاہ کے قدموں پر اس طرح گر پڑی۔ جیسے کسی نے ایک پھول کو مسل کر پھینک دیا ہو۔

(۵)

فضا پر خاموشی اور تاریکی مسلط تھی۔ ایسی تاریکی جسے ایک بُجھے ہوئے لیمپ کی ٹمٹماتی ہوئی لو اور بھی نمایاں کر رہی تھی۔ ایسی خاموشی جسے کسی آوارہ طائر کی ہلکی آواز نے اور بھی خوفناک بنا دیا تھا۔

روشنی تاریکی میں جذب ہو کر رہ گئی۔ آواز ہوا میں تحلیل ہو گئی۔ اور عین اس مہیب اور گہرے اندھیرے میں انارکلی کو ہوش آیا۔

انارکلی چاروں طرف حیرت زدہ ہو کر دیکھ رہی تھی کہ وہ کہاں ہے۔ کچھ دیر تک وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔ اب پھر وہ اپنے خیال میں داخل ہو گئی۔ وہ ایک نوگرفتار بلا قیدی کی مانند تھی۔ اس کا دل آنے والی موت کے خوف سے بیٹھا جا رہا تھا۔ صرف چند گھنٹے باقی تھے۔ اور بعد اس کے اس کی رُوح ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جانیوالی

تھی۔ موت! بے رحم موت جو ہر ایک چیز کا خاتمہ کر دینے والی ہے۔ آہستہ آہستہ اُس کے نزدیک پہنچ رہی تھی۔ اور اُسے ایسے معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی طاقتور بھیڑیا اپنی چمکدار آنکھوں سے اُس بھولی بے بس بکری کے بچے کو گھور رہا ہو۔ موت یوں بھی خوفناک ہوتی ہے۔ مگر موت کے لمحوں کو گننا ہزار چند زیادہ خوفناک ہوتا ہے۔

انارکلی اُٹھ بیٹھی اس کا سر چکرا رہا تھا۔ وہ ایک مجروح جانور کی طرح زمین پر گر پڑی۔ اور اپنی حالت پر آنسو بہانے لگی آہ! کیا وہاں اس کی مدد کرنے والا اس کو تسلی دینے والا کوئی نہ تھا؟ آہ سلیم! سلیم کہاں ہے۔ جس کی خاطر اُسے یہ دن دیکھنا پڑا۔ انارکلی رونے لگی۔ اور روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

انارکلی بہت دیر تک روتی رہی۔ یہانتک کہ اُسکی آنکھیں خشک ہوگئیں۔ جب ذرا ہوش آیا۔ تو پھر وہی خیالات اُس کے دل میں آنے شروع ہوئے۔ جن کے لئے وُہ اس مصیبت میں گرفتار ہوئی تھی کیا یہ شہزادے سے دل لگانے کی سزا ہے؟ کیا یہ تعذیر بے جرم ہے؟ وُہ نہ سمجھ سکتی تھی۔ کہ اُس نے کیا غلطی کی ہے کبھی کبھی اس کی معصومیت اُس کو اپنی مصیبت یاد دلاتی تھی۔ اور وُہ رونے لگ جاتی تھی۔ "یا اللہ! پھر کیوں تو ایسے خواب دکھاتا ہے جن کی اصلیت کچھ نہیں ہوتی۔ کیوں تو ایسی خواہش پیدا کرتا ہے جس کا پُورا ہونا مشکل ہوتا ہے۔ بتا ہاں بتا! کیوں" مگر وہ کچھ نہ سمجھ سکتی تھی۔ کسی خیال سے بھی اُسے اطمینان حاصل نہ ہوتا تھا۔ کوئی چیز اُس کا غم غلط نہ کر سکتی تھی۔ اب اُس کے خیالات سلیم کی جانب منتقل ہو رہے تھے "کیا وہ مجھے موت سے نہیں بچا سکتا؟ ایک تازہ خیال اس کے دل میں پیدا ہوا۔ "کیا شہزادہ واقعی مجھ سے محبّت کرتا ہے یا میں محض ایک دل لگی کا سامان ہوں؟" یہ خیال کہ سلیم اُس سے محبّت نہیں کرتا اُس کے لئے موت سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھا۔

وہ انہی خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کہ کسی کے پاؤں کی آہٹ سُنائی دی۔ دروازہ کُھلا اور ایک سنتری مشعل لئے ہوئے داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک اور شخص تھا۔ یہ سلیم تھا۔ انارکلی نے آنکھ اُٹھائی اور سلیم کو دیکھتے ہی اس کی چیخ نکل گئی۔ فوراً وہ ایک دوسرے کے آغوش میں تھے۔ سنتری مشعل کو ایک کونے میں کھڑا کر کے چلا گیا۔

انارکلی اور سلیم بڑی دیر تک خون کے آنسو رویا کئے۔

جب وہ ذرا بولنے کے قابل ہوئے تو سلیم نے کہا۔

"میری جان دل مضبوط کرو۔ میں تمہیں اب بھی بچا سکتا ہوں۔ چلو"

انارکلی نے متعجب ہو کر سلیم کی طرف دیکھا۔

سلیم۔ میں نے یہاں سے نکل جانیکا مکمل انتظام کر رکھا ہے۔ جلدی کرو وقت گزر رہا ہے۔ گھوڑے تیار ہیں صبح ہونے سے پہلے ہی ہم کوسوں دور نکل جائینگے۔ ہم بھیس بدل لینگے۔ تاکہ کوئی پہچان نہ سکے۔

انارکلی۔ "ہم بچ کر نہیں جا سکتے۔ لوگ ضرور ہمارا تعاقب کرینگے۔ اور پکڑے جائینگے۔ آپ میری خاطر اپنی جان کو خطرے میں نہ ڈالیں۔

سلیم۔ "میری جان! میرے بہت سے دوست ایسے ہیں۔ جو تعاقب کرنے والوں کو غلط راستے پر لگا دینگے ہمارے گھوڑوں کے سُم ربڑ سے منڈھے ہُوتے ہیں۔ اُن کی آواز کوئی بھی نہ سُن سکیگا۔ اُٹھو جلدی کرو وقت قیمتی ہے اور گزرا جا رہا ہے۔"

انارکلی نے توقف سے کام لیا۔ اور سوچنے لگی کہ اُسے سلیم کی جان کو خطرے میں ڈالنے کا کوئی حق نہیں۔ اور ساتھ ہی وہ جانتی تھی۔ کہ یہاں سے بچ کر نکل جانا تقریباً ناممکن ہے۔

انارکلی۔ "سلیم پیارے! قسمت کا لکھا نہیں ٹلتا خُدا اور خُداوند نعمت بادشاہ کی مرضی یہی ہے کہ میں زندہ نہ رہوں۔ میرے لئے یہی اچھا ہے۔ کہ میں قیدخانہ ہی میں پڑی رہوں۔ اور موت کی گھڑی کا خاموشی سے انتظار کروں۔

سلیم نے پریشان ہو کر کہا۔ "میں تمہیں ظالم بادشاہ کے ہاتھوں مارے جانے کے لئے نہیں چھوڑ سکتا۔ تم کیوں دیوانی ہو گئی ہو؟"

یہ کہتے کہتے اس نے انارکلی کو اپنی جانب کھینچا لیکن وہ تیار نہ تھی۔

انارکلی نے مدھم اور کانپتی ہُوئی آواز میں کہا۔ "میری جان کے مالک! میری زندگی کے دن ختم ہو چکے ہیں۔ موت سے کوئی انسان نہیں بچ سکتا۔ یہ میری غلطی ہوگی۔ اگر میں یہاں سے بھاگ جانے کی کوشش کروں شہنشاہ کے الفاظ قانون کا حکم رکھتے ہیں۔ آپ بھلا میرے ساتھ کس طرح چل سکینگے؟ ہم یقیناً تعاقب کئے جاکر پکڑے جائینگے۔ کیا آپ نے یہاں سے فرار ہو کر پکڑے جانے کے نتائج پر غور کیا ہے؟ میرے لئے کوئی جائے پناہ نہیں۔ موت کا حکم صادر ہو چکا ہے۔

سلیم نے بیتاب ہو کر کہا۔ "آخر میں کہاں تک تجھے سمجھاؤں۔ وقت تھوڑا ہے اور نصیحت کارگر ہوتی نظر نہیں آتی۔ میں تمہیں ظالم بادشاہ کے پنجہ میں نہیں چھوڑ سکتا۔ مجھے سوائے اس کے حکم کی نافرمانی کرنے کے اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ دہلی کی سلطنت عمر بھر کے لئے کسی کو نصیب نہ ہوئی ہے نہ ہوگی۔ کل یا آج آخر مجھے تخت کا مالک ہونا ہے۔"

انارکلی چپ چاپ بیٹھی سُنتی رہی۔ شہزادہ حیران تھا۔ کہ کیوں انارکلی فرار ہونے کے لئے تیار نہیں۔ آخر کیوں وہ قید خانہ سے چھٹنا نہیں چاہتی؟

وقت تو یوں ضائع ہوتا دیکھ کر سلیم نے بہتیری کوشش کی کہ کسی طرح انارکلی اس کی تجویز پر کاربند ہو۔ مگر کچھ سود نہ ہوئی۔ وہ اپنی تقدیر پر شاکر تھی۔ اور نہ چاہتی تھی کہ سلیم بادشاہ کے خلاف مرضی کام کرے۔ سلیم جوشِ محبت سے چلّا اُٹھا۔ "انارکلی! آخر تم کیوں انکار کر رہی ہو۔ میری زندگی میری مسرت آفرینیاں، اور اُس کا سارا شیرازہ صرف تمہارے ہی دامنِ حیات سے وابستہ ہے اگر تم نہ ہوگی تو میں دُنیا میں رہ کر کیا کرونگا۔ اگر تم نہ چلوگی تو میں بھی قید خانہ سے باہر نہ جاؤنگا۔"

اب انارکلی کے ارادے میں ایک فوری تغیر پیدا ہُوا اور اُس نے کانپتی ہُوئی آواز میں پُوچھا۔ "کیا ابھی وقت ہے۔ کیا اب بھی ہم بھاگ کر کہیں جا سکتے ہیں؟"

سلیم نے اُسے اطمینان دلایا اور کہا۔ کہ ہاں اب بھی وقت ہے۔ یہ کہکر اس نے انارکلی کا ہاتھ پکڑا اور باہر لے جانا چاہا۔

چشم زدن میں دروازہ کُھلا اور ایک خوفزدہ شخص کوٹھری میں داخل ہُوا۔ ذرا دم لینے کے بعد کہنے لگا "حضور! جہاں پناہ ادھر تشریف لا رہے ہیں۔"

سلیم چونک پڑا اور پُوچھنے لگا۔ "پھر اب کیا کرنا چاہیئے۔"

حضور فوراً کوٹھری سے باہر تشریف لے جائیں اور جب بادشاہ سلامت چلے جائیں۔ تو آپ تشریف لے آئیں۔"

سلیم۔ "رحیم خاں! تم باہر میرا انتظار کرو میں ابھی آتا ہوں۔ تیار ہو جاؤ۔"

سلیم نے حسرت بھری نگاہوں سے جن میں وداع کی جھلک رونما تھی۔ انارکلی کی طرف دیکھا۔ اس وقت اس کی مایوسانہ حالتِ دماغی ایک طوفان میں مبتلا تھی۔ اُس نے جھک کر انارکلی کا بوسہ لیا۔ ایک لمحہ کے بعد اُس نے مشعل گُل کر دی۔ اور وہاں سے چلا گیا۔

انارکلی زبان سے کچھ نہ کہہ سکی۔ یہانتک کہ سلیم کے بوسے کا جواب بھی نہ دے سکی۔ شہزادے کے جانے کے بعد اس کی رہی سہی امیدیں خاک میں مل گئیں۔ اب وہ تنہا تھی اور چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

(۶)

انارکلی کی کوٹھری میں کوئی نہ آیا تھا۔ رحیم خاں نے جھوٹ بولا تھا۔ نہ بادشاہ تھا نہ کوئی اور، وہ سلیم ہی کے چند ساتھی تھے۔ جنہوں نے بلکہ بغاوت کرنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ رحیم خاں بھی اُن میں سے ایک تھا۔ جنہوں نے شہزادے کے ساتھ تادمِ زیست وفادار رہنے کا وعدہ

[redacted]

کیا تھا۔ رحیم خاں جیلخانہ کا داروغہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سلیم انارکلی سے آخری بار ملنے اور الوداع کہنے آیا ہے۔ مگر اسے معلوم نہ تھا۔ کہ وہ اُس کو نکال لے جانے کی کوشش کر رہا ہے۔

جب سلیم انارکلی کی کوٹھری میں داخل ہوا تو رحیم خاں اُن کی گفتگو سننے کے لئے کواڑ کے پیچھے چھپا کھڑا رہا۔ اور جب اسے معلوم ہوا کہ شہزادہ اُسے وہاں سے لے جانے کے درپے ہے۔ تو اُس نے انہیں دوستانہ طریق پر روک دینا چاہا۔

وہ اور کیا کر سکتا تھا؟ اگر قیدی فرار ہو جاتا تو اُس کی جان خطرے میں ہوتی مگر ساتھ ہی وہ شہزادے کو بھی ناراض نہ کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا۔ کہ بادشاہ ضعیف العمر ہے اور سلیم تخت نشین ہونے والا ہے۔ چنانچہ اُس کے دماغ میں فوراً یہ تجویز آئی۔ جس سے کام بھی نکل آیا۔ اور شہزادہ بھی ناراض نہ ہوا۔

جونہی شہزادہ باہر آیا۔ رحیم خاں نے دُور دو مشعلیں جلتی ہوئیں دکھائیں۔ وہ اُس کے اپنے ہی آدمی تھے۔ مگر شہزادے نے دوسری دفعہ اُن کو نہ دیکھا۔ کیونکہ بادشاہ کا ڈر اُسے بیحواس کر رہا تھا۔

رحیم خاں نے چپ چاپ شہزادے کو گلیوں اور سڑکوں سے لیجا کر محل تک پہنچا دیا۔

سلیم۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ بادشاہ سلامت ہی تھے۔

رحیم خاں۔ ہاں حضور!

سلیم۔ مگر بادشاہ وہاں کیسے آ گئے۔

رحیم خاں۔ "حضور آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ جہاں پناہ اکثر رات کے وقت خفیہ طور پر جیل خانہ کا معائنہ کرنے آیا کرتے ہیں۔ آج بھی اتفاقاً تشریف لائے ہونگے۔"

سلیم (مسکراتے ہوئے) ہاں اتنے دنوں تو بادشاہ نے لوگوں کو پریشان کیا ہے کل وہ خود پریشان ہوگا"

کچھ دیر گزر گئی۔ رحیم خاں سخت بیکل تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ تھوڑی دیر میں شہزادہ انارکلی کو لے جانے کی غرض سے پھر وہاں جائیگا۔ اب وہ کیا کرتا؟ وہ یہ بھی نہ چاہتا تھا کہ قیدی فرار ہو جائے۔ یہ اُس کی موت کا پیش خیمہ تھا۔ فوراً اُس کے دماغ میں ایک تجویز سمائی۔

رحیم خاں کیا حضور تھوڑی سی شراب نوش فرمائیں گے

سلیم کا حلق خشک ہو رہا تھا بولا "ہاں تھوڑی سی شیرازی لاؤ"

رحیم خاں ساتھ والے کمرے میں شراب لینے گیا یہ بہت اچھا موقع تھا۔ اُس نے ایک پڑیہ کمر بند سے نکال کر شراب میں حل کر دی۔ یہ سفید رنگ کا ایک سفوف تھا۔ جھاگ اُبھری مگر بیٹھ گئی۔ سلیم منتظر تھا۔ رحیم خاں نے شراب پیش کی اور سلیم فوراً پی گیا۔ اور تھوڑی سی اور مانگی

رحیم خاں ایک گلاس اور لایا۔ تھوڑی دیر میں شراب نے اپنا اثر جمانا شروع کیا۔ سلیم نے خمار کی حالت میں کہا۔

"رحیم خاں! اب مجھے انارکلی کے پاس پہنچا دو"

رحیم خاں "حضور۔ مجھے کوئی عذر نہیں لیکن . . "

سلیم "لیکن کیا؟"

رحیم خاں "ممکن ہے کہ بادشاہ سلامت ابھی وہیں ہوں"

سلیم "بادشاہ کو تو کسی چوبدار کے گھر پیدا ہونا چاہئے تھا۔ وہ بادشاہی کے قابل نہیں۔ جاؤ دیکھو آیا وہ ابھی تک وہیں ہے۔

رحیم خاں "بسر و چشم"

رحیم خاں تعظیم کے لئے جھکا۔ اور وہاں سے نکل آیا۔ اسے یقین تھا۔ کہ شہزادہ دن چڑھے تک ہوش میں نہ آئے گا

(۷)

انارکلی انتظار کی گھڑیاں گنتی رہی۔ مگر سلیم نہ آیا۔ اس شش و پنج کی حالت میں بھی امید نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا اُسے یقین تھا کہ شہزادہ ضرور اُسے وہاں سے نکال کرلے جائیگا۔ صبح ہونے کو آرہی تھی۔ اور قید خانہ کی تاریکی سپیدۂ صبح کی روشنی میں غائب ہوتی جاتی تھی اچانک اس کو قریب ہی کوئی چیز چمکتی ہوئی نظر پڑی۔ یہ وہی انگوٹھی تھی جس میں ایک چمکتا ہوا ہیرا جڑا ہوا تھا۔ اور جو انارکلی کی ماں نے اُسے مرتے دم دی تھی۔ اور کہا تھا "بیٹی! خدا نہ کرے تجھے اس کی ضرورت پڑے۔ مگر انتہائی مصیبت کے وقت جب اور کوئی صورت اُس سے رہائی کی نہ ہو۔ اس کو چاٹ لینا" انارکلی کو اپنی ماں کے وہ الفاظ یاد آگئے۔ اُس نے ہیرا نکال کر اپنے منہ میں رکھ لیا بچپن کے خیالات ماں کی تصویر، سلیم کی محبت سب اس کی آنکھوں میں پھرنے لگے۔ اس کے بعد بدن میں رعشہ شروع ہوگیا۔ وہ رعشہ جو موت سے پہلے انسان میں پایا جاتا ہے اپنا سر ہاتھ پر رکھے انارکلی ٹھنڈے فرش پر لیٹ گئی۔ اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ اور اُس کی آنکھیں نیم وا تھیں۔

جب بادشاہ کے آدمی موت کا پروانہ لئے ہوئے اُسے لے جانے کے لئے آئے تو ذرا رک گئے۔ دروازہ کھلا۔ آفتاب عالمتاب کی سنہری کرنیں اس کے چہرے کے ارد گرد حلقہ کئے ہوئے تھیں۔ وہ ایک حسن کی دیوی معلوم ہوتی تھی۔ وہ واقعی انارکلی تھی۔ یہ نام اُس کے ہونٹوں اور رخساروں کے لئے نہایت موزوں تھا۔

(۸)

بابر کے زبردست گھرانے کا سب سے شاندار بادشاہ اکبر اب ابدی نیند کے مزے لے رہا ہے۔ اور سلیم نورالدین جہانگیر کے نام سے سریر آرائے سلطنت ہے۔ انارکلی کی موت کا واقعہ اب اس کے دل سے مٹ

[redacted]

چکا ہے۔ مہرالنسار کی محبت کے مقابلہ میں انارکلی کا عشق اتنا ہی بے حقیقت ہے جیسے آفتاب کی روشنی میں جگنو کی چمک۔ یہ وہی مہرالنسا ہے۔ جو دُنیا میں نورجہاں کے نام سے مشہور ہے۔ بادشاہ کے دل و دماغ پر سوتے جاگتے اس کا قبضہ ہے۔

شام کا وقت تھا۔ جہانگیر شاہی باغ میں ٹہل رہا تھا۔ مہرالنسار کی محبت اس کے دل میں چٹکیاں لے رہی تھی۔ کہ یکایک اس کی نظر انار کے ایک درخت کے نیچے جو پھولوں سے لدا ہوا تھا۔ ایک قبر پر پڑی۔ یہ اُس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ حیران تھا کہ یہاں کون دفن ہے۔

ایک سن رسیدہ مالی کچھ فاصلے پر ایک پھلواری میں کام کر رہا تھا۔ جہانگیر نے اُسے بلایا۔ اور پوچھا "یہ قبر کس کی ہے"

مالی نے ایک حسرت بھری نگاہ قبر پر ڈالی۔ پھر بادشاہ کی طرف دیکھ کر چپ ہو گیا۔

بادشاہ نے پھر پوچھا۔ "یہاں کون دفن ہے؟"

مالی نے رُکتے رُکتے جواب دیا:۔
"انارکلی بیگم"

انارکلی! گزشتہ واقعات کی یاد جہانگیر کے دل میں تازہ ہو گئی۔ اس نے مغرب کی طرف ایک چمکتے ہوئے ستارے کو دیکھا۔ اور ساتھ ہی انارکلی کی یاد چٹکیاں لینے لگی۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ مہرالنسا کو بھول گیا۔ اُس نے انارکلی کو تصور میں اسی طرح دیکھا۔ جیسے کئی سال پہلے دیکھا تھا۔ اس کی موت کا واقعہ اُس کی آنکھوں میں پھر گیا۔ اُس کو انارکلی کا وہ تبسم یاد آگیا۔ جس کی ادنےٰ قیمت سلیم کی جان تھی۔ جہانگیر ایک گہری سوچ میں پڑ گیا۔ اور آہستہ آہستہ محل کی طرف چلدیا۔

دوسرے ہی دن میرِ عمارات کو حکم ہوا۔ اُس فراموش شدہ انار کے پھولوں کی رانی کی قبر کے اُوپر ایک عالیشان مقبرہ تعمیر کرایا جائے۔ اور ایک قیمتی پتھر کا کتبہ نصب کیا جائے۔ جس پر یہ شعر کندہ ہو۔ ؎

تا قیامت شکر گویم کردگارِ خویش را
آہ اگر من باز بینم روئے یارِ خویش را
سلیم

(سر بیندر ناتھ گپتا) مترجمہ افتخار الرسول بدر

حشرِ جذبات

شاں ہے حقیقت آشنا جلوہ گہِ مجاز میں
حسنِ ازل ہے مستتر عشق کے سوز و ساز میں

دل کو ہے نازِ عشق پر رہگذرِ مجاز میں
سینکڑوں جلوے ہیں نہاں حُسنِ نظر نواز میں

خواہشِ علم ہے فضول حرفِ غلط ہے انکشاف
ایک طلسمِ راز ہے ہستیٔ کارساز میں

آہ یہ بیخودیٔ عشق آہ یہ سادگیٔ دل
لُطف و کرم کی ہے تلاش حسنِ جفا طراز میں

دل ہے کہ وقفِ بیخودی جلوۂ رنگ رنگ سے
مَیں ہوں کہ سجدہ ریز ہوں کعبۂ خانہ ساز میں

تیری تجھ سے ہے بلند ہستیٔ رازِ کائنات
عقل پہ کر نہ جبر تو کوششِ امتیاز میں

گو ہے سکوں بھی ایک چیز پر وہ تڑپ تھی جانفزا
ہائے وہ سوز اب نہیں پردۂ دل کے ساز میں

ہُو چکا دردمند دل ذوقِ تپش سے آشنا
اب تو کبھی کمی نہ ہو میری شبِ دراز میں

رحم کر اپنے حال پر چھیڑ نہ مجھ کو ہمنفس
نالۂ غم ہے مضطرب دل کے شکستہ ساز میں

موت اب اختصار کر کشمکشِ حیات کو
یاس کا رنگ ہے عیاں کوششِ چارہ ساز میں

ثاقب محوِ بیخودی تجھکو تلاش ہے کہاں
سُن وہ صدائے دلفریب اپنے ہی دل کے ساز میں

ابو محمد ثاقب

اس کی آخری محبّت

(۱)

مشرف آج بےچین تھا۔ اس انگریزی سامان سے آراستہ کمرے میں جس کی ہر ایک چیز آرام پہنچانے کے لئے خلق کی گئی تھی۔ اسے آرام نصیب نہ تھا۔ خوشنما کوچ کے وہ مخملی گدیلے جن پر بیٹھنا ایک غریب کے لئے فردوس احساس تھا۔ اسے چبھ رہے تھے وہ اپنا بایاں ہاتھ ایک گول میز پر رکھے ہوئے ایک چھوٹے سے کاغذ کے ٹکڑے کو [illegible] میں تھام کر بغور پڑھ رہا تھا۔ ایک دفعہ اس نے اپنا ۔ اٹھایا اور سامنے ایک کھڑکی کی طرف دیکھا جس میں سے ایک رفیع المنزلت مکان کا صحن اور نیلے آسمان کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نظر آ رہا تھا۔ پھر اسی پرزہ کاغذ پر جھکا لیا۔ خدا جانے اس کاغذ میں کیا تاثیر انجذاب تھی۔ کہ باوجود ایک زبردست ذہنی کوشش کے وہ اپنی آنکھیں اس ٹکڑے سے نہ ہٹا سکتا تھا۔ سگرٹ جل کر اس کی لمبی اور نازک انگلیوں تک آ پہنچا۔ لیکن اس کی گہری محویت اس کے خاموش استغراق میں خلل انداز نہ ہو سکا۔ اس کی دماغی تکلیف اس کی جسمانی اذیت سے ہزارہا درجے بڑھ کر تھی۔

خط کے الفاظ اسے خونی حروف سے مرکب نظر آتے تھے۔ اور اس کے قوائے ذہنی میں بھی جو کثرت شراب نوشی سے معطل ہو چکے تھے۔ ایک لرزش سی پیدا کر رہے تھے وہ حیران تھا۔ اور بجا طور پر کہ اتنے عرصہ کے بعد آج کیوں اس کے دل میں ایک احساس ندامت۔ ایک اشتباہ ذلت پیدا ہو رہا ہے۔ کیا وہ بوڑھا ہو چلا تھا؟ کیا اس کی جوانی بجلی کی طرح چشم زدن میں رخصت ہو چکی تھی؟ کیا وہ تمام عشرت کے ہنگامے جن سے اس کے تھکے ہوئے اعضا میں بھی ایک عارضی حرارت پیدا ہو جاتی تھی۔ سرد ہو جائیں گے؟ کیا ان تمام بدکاریوں کا نتیجہ جو اس نے انجام سے بے نیاز ہو کر کی تھیں نکلنے والا تھا؟ مگر نہیں اس نے اپنے اعصاب قوت ارادی کی ایک زبردست تحریک سے متہیج کرنا چاہا۔ وہی قوت ارادی جو گناہ کے پیہم اقدام سے کمزور ہو چکی تھی۔ اب اسے محسوس ہوا۔ کہ سگرٹ اس کے ہاتھ کو جلا رہا ہے۔ ایک اضطراری حرکت سے اس نے سگرٹ کو ایک سونے کی طشتری میں پھینک دیا۔ اور اس پرزہ کاغذ کو اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پھاڑنا چاہا۔ مگر کوئی باطنی قوت جس کا وہ احساس کرتا تھا اور جو اس پر لحظہ بہ لحظہ غالب آتی چلی جا رہی تھی۔ اس حرکت مذبوحی کی مدافعت کرنے لگی۔

اس نے اپنے دانت بھینچ لئے اور پھر کاغذ کو میز پر رکھ دیا۔ بہت عرصہ وہ چپ رہا۔ اس کی پیشانی کے شکن اور ابروؤں کا سکیڑا جانا اس کے اندرونی ہیجان کا پتہ دیتا تھا۔ گویا اس کے نفس میں کوئی کشمکش ہو رہی تھی۔ جس کے آئندہ اثرات اس کی زندگی کے ذمہ دار ہونے والے تھے۔ وہ گزشتہ زمانے کی نسبت سوچ رہا تھا اس کا پریشاں دماغ حافظہ کی مدد سے صرف اتنا کر سکتا تھا۔ کہ اس کی گزشتہ زندگی کے نہایت ہی اہم واقعات متحرک تصویروں کی طرح مبہم صورتوں میں اس کے سامنے آنے اور غائب ہو جانے وہ اب ایک تیس سالہ نوجوان تھا اگر اس شخص کو جوان کہہ سکتے ہیں جس کی صحت کی بنیادیں بد عادیوں کے ہجوم نے کھوکھلی کر دی ہوں لیکن اسے اب تک وہ بے فکری کا زمانہ یاد تھا۔ جب اس کا چہرہ خبث انگیز خوبصورتی کے نشانات سے پاک تھا۔ جب اسکی آنکھیں ناجائز خواہشات کے سیلاب سے خالی تھیں جب اس کا دل باطنی آلائشوں کی کدورت سے مبرا تھا۔ وہ ایک شریف گھرانے کی عزت ایک بوڑھے باپ کا سہارا۔ ایک شریف ماں کی راحت۔ ایک باعصمت بہن کی واحد خوشی۔ ایک محبت کرنے والی بیوی کی تنہا دولت رہ چکا تھا۔ مگر آہ۔ اب یہ تمام خیالات خواب پریشاں کی طرح وہم کی صورت آفرینیاں معلوم ہوتے تھے۔ اس کے حافظے نے دردانگیز صحت کے ساتھ یاد دلایا۔ کہ وہ عین جوانی کے آغاز میں کتنا فرشتہ خصلت۔ نیک سیرت انسان تھا دُنیا کو ہمیشہ اچھے رنگ میں دیکھتا تھا۔ ہر ایک چیز کے تاریک پہلو کو روشن سمجھتا تھا۔ اور اپنے نقطۂ نگاہ سے ہر بدی کے لئے ایک تاویل ہر جرم کے لئے ایک عذر تلاش کر لیتا تھا۔ بنی نوع انسان سے اسے قلبی محبت تھی۔ وہ تمام کتابیں جن میں اخلاقیات کی تعلیم و تلقین کی جاتی ہے۔ اس کے دل پر ایک گہرا نقش چھوڑ گئیں تھیں کالج کی زندگی میں اس نے فلسفہ کے خیالی میدان کو طے کرتے ہوئے فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ دُنیا سے بہتر کوئی دارالسرور نہیں۔

اس کا سلسلۂ خیالات یہیں تک پہنچا تھا کہ اس کی نظر اُٹھکر سامنے ایک تصویر پر پڑی۔ جو چاندی کے ایک خوبصورت فریم میں جڑ دی گئی تھی۔ اور جو اس کمرے کی بہترین آرائش تھی۔ نقاش نے ایک دوشیزہ کی تصویر کھینچی تھی۔ جس کے انداز نشست سے یہ ثابت کرنا چاہا تھا کہ اس کا بھولپن بدی کے ہر ایک خیال سے پاک ہے اس کی لبریز نور آنکھیں جو آسمان کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں صانع المخلوقات کی خاموش تعریف کر رہی تھیں۔ اس کے ننگے بلوریں پاؤں پھولوں کے ایک انبار پر رکھے ہوئے تھے۔ جن سے غالباً نقاش کا یہ مدعا تھا۔ کہ دنیا کی لطافت

خوشبو اور رنگینی دوشیزہ کے قدموں کے نیچے ہے۔ صنعت کے اس بدیع المثال نمونہ کے نیچے صرف ایک لفظ ثبت تھا۔ "معصومیت"

"معصومیت! معصومیت"! اشرف نے یہ لفظ اپنے دل میں کئی دفعہ دُہرایا۔ وہ بھی اُن دنوں ہر ایک عورت کو معصوم سمجھتا تھا۔ تخلیق کائنات کا سب سے بہتر عنصر نسوانی حسن کا سب سے اچھا مظہر۔ از تقدس اخلاق کا سب سے مکمل ثبوت۔ اس کا کتابی علم جو عمل کی کشاکشوں سے ناواقف تھا کیا سمجھ سکتا تھا۔ کہ کالج کی زندگی کے باہر بہت سے اخلاقیات کے اصول غلط ثابت ہو چکے ہیں۔ ہاں۔ وہ غور کر رہا تھا۔ اپنی جہالت پر غور کر رہا تھا۔ اب وہ اپنے خیالات میں بالکل غرق ہو چکا تھا۔ اس کی حرکات اب بے اختیارانہ سرزد ہونے لگی تھیں۔ وہ ایک بے ہوشی کے عالم میں اُٹھا۔ اور کمرے کے عین وسط میں جا کر ایک میز کے چھپے ہوئے خانے میں سے کاغذوں کا ایک پلندا نکال لایا۔ ان کی ہیئت پُرانے کاغذوں کی سی تھی جن کو امتدادِ زمانہ نے میلا اور بھربھرا کر دیا ہو۔ یہ پلندا ایک سُرخ ریشمی فیتے میں لپٹا ہوا تھا۔ جس کی نفاست اور خوشنما ترتیب ظاہر کرتی تھی۔ کہ وہ کسی عورت کے نازک ہاتھوں کا ممنونِ احسان ہے۔

مشرف نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے فیتے کو کھولا۔ اور تمام کاغذات کو اپنے سامنے کی میز پر پھیلا دیا۔ وہ ایک ایک خط کو اُلٹتا پلٹتا۔ گویا کسی خاص چیز کی تلاش کر رہا تھا۔ آخرکار اسے مطلوبہ چیز مل گئی۔ کیونکہ اس نے ایک چھوٹی سی تصویر کو کاغذوں سے الگ کرتے ہوئے دیکھنا شروع کیا۔ یہ ایک بلند بالا نوجوان شخص کی تصویر تھی۔ جس کی عمر بیس بائیس برس کے درمیان معلوم ہوتی تھی۔ ہنس مکھ چہرہ۔ موٹی موٹی آنکھیں۔ لبوں پر ایک دلآویز تبسم۔ مشرف نے گزشتہ زمانے کے اس آئینہ میں اپنے آپ کو پہچاننے کی ناکام کوشش کی۔ اب اسے معلوم ہوا۔ کہ وہ حقیقی خوشی جو معصومیت کا خاصہ ہے روپیہ دے کر نہیں خریدی جا سکتی۔ تھوڑے عرصہ کے بعد اس نے تصویر کو آہستہ سے انہیں کاغذوں میں رکھ دیا۔ اور ایک ایک کاغذ کو دیکھنے لگا۔ یہ اس کی مرحوم بیوی کے خط تھے اس نے بغیر کسی انتخاب کے ایک خط اُٹھا لیا۔ اور اس کی تہوں کو کھول کر جن میں ابھی تک ایک ہلکی سی خوشبو باقی تھی۔ پڑھنے لگا۔

میرے پیارے

تم نے لکھا ہے کہ ابھی ایک سال اور باقی ہے۔ مجھے تم سے کسی قسم کی شکایت نہیں۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ جس طرح میرے تم پر کئی حق ہیں۔ اسی طرح تم پر اپنے والدین کے بھی فرائض ہیں۔ تم نے اُن کو خوش کرنے کے لئے

انگلستان کا سفر لیا تو مجھے شکایت کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ تم روزانہ نہیں تو ہفتہ ہی میں ایک خط لکھ دیا کرو تاکہ میرے ترستے دل کو تسلی ہوتی رہیگی۔ تم نے لکھا ہے کہ ڈاک کی مجبوریاں خطوں کے جلدی آنے جانے میں مانع ہیں۔ جس طرح میں تمہاری ہر ایک بات پر اعتبار کرتی ہوں۔ اسی طرح مجھے تمہارے اس عذر پر بھی پورا یقین ہے۔

پیارے میں نے سنا ہے کہ ولایت کی دلچسپیاں بہت سے لوگوں کو محو کر لیتی ہیں مگر مجھے یقین ہے کہ دنیا کی کوئی دلچسپی ایسی نہیں جو سعیدہ کے مشتاق دل کو اس سے جدا کر سکے۔ کتنے تعجب کی بات ہے۔ کہ ان تمام جذبات کو جنہیں میں تم سے کہنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتی۔ انہیں میں خط میں کس بیباکی سے لکھ جاتی ہوں۔ ان دنوں یہاں برسات کی رت ہے۔ اور میں نہیں سمجھ سکتی کہ وہاں کیا موسم ہوگا۔ مگر تم خود ہی خیال کر لو۔ کہ یہ خوشگوار رت میرے لئے کتنی ناخوشگوار ہوگی۔ کمرے کی کھلی کھڑکی میں سے ساون کی ٹھنڈی ہوا آ رہی ہے اور میں تمہیں بیٹھی خط لکھ رہی ہوں۔ اگر حقیقت میں دل کا جذبہ کوئی چیز ہے۔ تو تم پر بھی ضرور اس وقت یہی کیفیت طاری ہوگی جس سے میں بے چین ہوں۔ اور گھنٹوں بے چین رہونگی

تمہاری "سعیدہ"

خط پڑھتے پڑھتے مشرف کے خیالات نئی فضاؤں میں پرواز کرنے لگے۔ اس کے تخیل کا سلسلہ ہندوستان سے منتقل ہو کر انگلستان جا پہنچا۔ اس کے ضعیف باپ نے تکمیل تعلیم کی غرض سے اپنے جوان بیٹے سے جدائی اختیار کی تھی۔ وہ کتنی نیک امیدوں کتنی پاک آرزوؤں کے ساتھ عازم سفر ہوا تھا۔ وہاں پہنچکر اول اول اس کی دلچسپی کالج کی پڑھائی اور اپنی بیوی کے خطوط تک محدود تھی۔ مگر رفتہ رفتہ وہاں کی عشرت پسندی نے اسے متاثر کرنا شروع کیا وہ اس سنہرے جال میں پھنستا گیا۔ حتےٰ کہ اس کے بند بند مضبوط کڑیوں میں کس دئے گئے۔ وہ اندھا دھند ذلت کی خوفناک گہرائیوں میں جا پڑا۔ اور نیک نفسی کے وہ جذبات جن کو اس نے محنت شاقہ سے پال پوس کر آسمان تک پہنچا دیا تھا۔ عشرت کے سیلاب میں بہ گئے۔ فنا ہو گئے پھر بھی ان دنوں اس کی بیوی کے خطوط جن سے یہ ٹپکتا تھا کہ کم از کم ایک پاک باطن عورت اس کو آزمائش سے بالا سمجھتی ہے اس کی نیک نیتی پر پورا اعتماد رکھتی ہے۔ اسے اپنے آپ سے نفرت دلانے لگے اس نے ان خطوط کو کھولنا چھوڑ دیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ اس حالت کی یاد دلاتے ہیں جب وہ معصوم تھا۔ فرشتہ خو تھا۔

یہ سب کچھ تو ہوا لیکن جب مطلب کی تکمیل کے لئے وہ

گناہ میں مبتلا ہوا تھا پورا نہ ہوسکا۔ اُسے محبت کی توقع تھی اور پہلے وہ بھی خیال کرتا تھا کہ وہ ایک دوشیزہ کی آرزوؤں کا مرکز ہے۔ مگر ایک تلخ تجربے نے اُسے عورت کے نام سے بیزار کر دیا۔ اسے معلوم ہوا۔ کہ اس کی محبت سے کھیلا جا رہا ہے۔ اس سے دغا کی جا رہی ہے۔ اب وہ غضب کی ہوگیا۔ یکلخت اس کے زاویہ نگاہ میں تبدیلیاں واقع ہوئیں پہلے وہ عورت کو آفرینش کی بہترین خلقت سمجھتا تھا۔ مگر اب اُسے معلوم ہوا کہ اس کتاب میں کئی باب ہیں۔

(۲)

وہ ہندوستان واپس آیا۔ مگر ایک مجسم شیطان بنکر اس دو سال کے عرصے میں دنیا نے کئی ورق اُلٹ دیئے تھے۔ مشرف کا باپ۔ ماں اور بیوی تینوں مر چکے تھے۔ اس کی نیکی کا آخری سہارا جاتا رہا۔ اب وہ آزاد تھا ہر ایک قید سے آزاد تھا۔ اور بدکاری پر آمادہ فطرت نے اسے خوبصورت پیدا کیا تھا۔ اور تمام دنیوی نعمتیں جو خوبصورتی کو عارضی طور پر زیادہ نمایاں کر دیتی ہیں۔ بخشی تھیں۔ اس کا انداز تکلف جس میں مشرق و مغرب کی مخلوط نفاست تھی۔ ہر ایک شخص کو موہ لینے کے لئے کافی تھا۔ اس کی ظاہری خوبصورتی نے کئی گھر تباہ کئے لیکن اس کا دل اسی طرح بیرحم تھا۔ وہ ایک عورت کا انتقام ساری نسوانی نسل سے لینا چاہتا تھا۔ اس نے اپنا اصول بنالیا۔ کہ چُن چُن کر شریف خاندانوں کی عزّت کو خاک میں ملا دینا۔

اس کے عالیشان مکان کے سامنے نواب ذوالقدر جنگ کا مکان تھا۔ جن کی اکلوتی لڑکی خوبصورتی کے لحاظ سے شہر کی تمام لڑکیوں پر فائق تھی۔ مشرف کی حریص نگاہیں جن میں ہر ایک عورت کے لئے پیام دعوت تھا۔ اس معصوم پر بھی پڑنے لگیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محبت سے وارفتہ لڑکی تباہ ہوگئی۔

وہ ابھی تک اپنے خیالات میں غرق تھا۔ یکایک اُس نے اپنے آپ کو ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ کاغذات کو پھر فیتے میں باندھا۔ اور اسی خانے میں رکھا واپس آکر اُس نے کاغذ کا وہی پرزہ پھر اُٹھا لیا۔ جو اس قدر اضطراب کا باعث ہو رہا تھا۔ مگر اب اس کے لبوں پر ایک زہریلا تبسم تھا۔ اس نے مختلف تاویلوں سے اپنے افعال کی ذمہ داری کو اپنی دغابازی کے انتقام پر ٹال دیا۔ اب اس نے اس کاغذ کے پُرزے کو پھر پڑھنا شروع کیا۔

"میں تمہیں آخری خط لکھ رہی ہوں۔ تم یہ نہ سمجھنا۔ کہ میں تمہیں ملزم قرار دیتی ہوں۔ کیونکہ میری فطرت کی اپنی کمزوریاں بھی اس غلطی کا باعث ہیں۔ لیکن مشرف مجھے یقین نہیں آتا کہ تم اپنے وعدے سے پھر جاؤ گے

کیا محبت کے وہ تمام اقرار جھوٹے تھے؟ کیا تمہارا عشق صرف ہوس کا ابال تھا۔ کہاں ہے تمہاری وہ مردانہ خصوصیت جو تمہیں مجبور کرے کہ مجھ پر رحم کرو۔ میری حالت پر رحم کرو۔ کیا تم نے کبھی اپنے دل میں نہیں سوچا کہ میں تم سے کس قدر محبت کرتی ہوں۔ مگر آہ۔ مرد نہیں سوچا کرتے۔ اب بھی سب کچھ تمہارے اختیار اختیار میں ہے۔ تم میری شرافت نفس۔ میرے باپ کی عزت۔ اور میرے خاندان کی وقعت کو بچا سکتے ہو۔ مشرف یاد رکھو۔ مظلوم کی آہ بُری ہوتی ہے۔ اگر تم نے اس خط کا جواب نہ دیا۔ تو میں زہر پھانک لونگی اور میرا خون تمہاری گردن پر ہوگا۔

یہ پڑھ کر مشرف نے پہلے خط کا اور اس خط کا مقابلہ کرنا شروع کیا۔ اس کی بیوی کا خط کتنا پُر درد تھا۔ اسے مشرف کی نیک نیتی پر کتنا یقین تھا۔ وہ اسے کتنا شریف سمجھتی تھی۔ پھر اس نے اس خط کو دیکھا جس کے بین السطور میں اس کی ذلیل حالت کا تمسخر کیا گیا تھا۔ الفاظ وہی تھے۔ مگر ان کے معانی میں طعنوں کی بوچھاڑ تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا۔ گویا وہ باطنی قوت جو اب تک اسے روکے ہوئے تھی۔ یکایک غارت ہوگئی۔ وہ اپنی اصلی حالت پر آگیا۔ اس نے خط کو چاک چاک کر ڈالا۔ اور اضطراب و پریشانی کی اس شدت کے بعد اسے آرام کی ضرورت محسوس ہوئی۔

وہ ایک کوچ پر لیٹ گیا۔ نرم گدیلوں کے سکون کو پاکر اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ وہ خود خاموش تھا۔ مگر اس کا دماغ ایک نئے خیال کے ساتھ مصروف جنگ تھا۔ پہلے تو اس نے اس خیال کو معمولی سمجھ کر ٹالنا چاہا۔ مگر وہی خیال بار بار اس کی خواہشات میں تلاطم پیدا کرتا رہا۔ وہ ان معمولی محبتوں سے تنگ آچکا تھا۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ کسی ایسی ہستی سے محبت کرے جس کے جذبات تند و تیز ہوں۔ جس کے عشق میں ایک مضطرب ارتعاش ہو۔ جسے اگر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے تو اپنے محبوب کو تباہ کر دے۔ مار ڈالے۔ مگر کسی دوسرے سے محبت کرنے کی اجازت نہ دے اب تک اس کے معاشقے کے عنصر سکون کی طرف زیادہ مائل تھے۔ اب وہ چاہتا تھا۔ کہ ان میں بیقراری ہو۔

یکایک اُسنے کمرے کے دروازے میں سے اپنے ایک پرانے دوست کو آتے ہوئے دیکھا۔ جسکی نسبت اُسے خیال تھا۔ کہ وہ مر چکا ہے۔ اسے یوں محسوس ہوا گویا وہ پوری طرح بیدار ہے۔ اور اس سے ہاتھ ملا رہا ہے۔ اس کے حواس جو ابھی تک ذہنی تکلیف کی وجہ سے شست سے ہو رہے تھے۔ اتنی اجازت نہ دے سکے کہ وہ پوچھتا۔ کہ تمہاری موت کی خبر کیسے مشہور ہوئی۔

وہ دونوں بیٹھ گئے۔

مشرف کو کمرے کی ہر ایک چیز مبہم سی دکھائی دے رہی تھی۔ مگر اس کے دوست نے جو ایجاد کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس کے شانے پر تھپکی دی۔

"مشرف کیا بات ہے تم مضمحل سے کیوں ہو؟"

مشرف نے جواب دیا۔ اور اُسے یوں معلوم ہوا۔ گویا اس کی آواز بیٹھی جاتی ہے۔ اسے خود اپنے الفاظ سُنائی نہ دیتے۔ مگر ایجاد نے مشرف کا شانہ پکڑ کر اسے اُٹھایا۔ اور اسے اپنے ساتھ لیتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ اسے خبر نہ ہوئی۔ کہ وہ کون سے راستے نکلا۔ اور کدھر چلا۔ ہاں صرف اسے اتنا محسوس ہوا۔ کہ یکایک ایجاد نے اسے ایک تھیٹر میں لیجا کر کھڑا کر دیا۔ وہ کچھ اس طرح کا کھویا سا گیا تھا۔ کہ اسے معلوم نہیں کہ وہ بیٹھا یا کھڑا ہی رہا۔

مگر ہاں اتنا ہوش ضرور تھا۔ کہ سامنے سٹیج پر ایک حسین عورت نہایت کافرہ جس کا شباب تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ اور جس کی آنکھیں شعلے کی طرح چمک رہی تھیں رقص کر رہی تھی۔ وہ رقص کر رہی تھی۔ اور مشرف کی خواہشات کا ذرّہ ذرّہ اس کے ساتھ رقص کر رہا تھا۔ اس کے دل میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ اس کی آنکھیں ہوس کی چمک سے مرتعش ہو گئیں۔ خدا جانے وہ کبتک اپنی مسحور نگاہوں سے اس ہوشربا نظارے کی سیر کرتا رہا۔ کیونکہ اس عورت کے اضطراب انگیز رقص کو دیکھ کر مشرف بیخود ہوتا چلا جاتا تھا۔ گویا اس نے شراب پی لی ہو۔ اُسے معلوم نہ تھا۔ کہ تھیٹر کے وسیع ہال میں اور کون کون موجود ہے۔ اور اگر وہ کسی طرف دیکھنا بھی تو اس کی آنکھیں جو رقاصہ کے حسن کی تابش کو دیکھ کر خیرہ ہو گئی تھیں۔ کسی کو پہچان نہ سکتیں۔ وہ گا رہی تھی۔ مگر اس کے گانے کی آواز مشرف کے کانوں سے زیادہ اس کی آنکھوں کو بھلی لگتی تھی۔ اسے ہوش نہیں کہ وہ کتنا عرصہ کھڑا دیکھتا رہا۔ ہاں اتنا یاد ہے۔ کہ یکایک یہ سماں اُس کی آنکھوں کے آگے سے طلسمی محفل کی طرح غائب ہو گیا۔ اور کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اندھیرے اور پرپیچ راستوں میں سے گزار کر اسے ایک وسیع کمرے میں لا کر کھڑا کر دیا۔

(۴)

مشرف کی آنکھیں اس انتقال مقامی سے بیکار ہو گئیں۔ اسے یوں معلوم ہوتا تھا۔ گویا کمرہ خوفناک گہرے اندھیرے میں لپٹا ہوا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کی آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو گئیں۔ اور وہ چیزوں کے خاکوں کو شناخت کرنے لگا۔ یکایک اس تمام اندھیرے میں ایک نور کا بقعہ گردش کرنے لگا۔ مشرف نے آنکھیں پھاڑ

کر دیکھا۔ اس کی حسین رقاصہ جس کے کپڑوں پر سچے جواہرات جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ اس تاریکی کے مقابلہ میں یہ ضوفشانی اپنی اصلی حیثیت سے بڑھ کر نمایاں ہو رہی تھی۔ وہ دو قدم آگے بڑھا۔ مگر پھر ٹھٹھک گیا۔ کیونکہ رقاصہ پاؤں کی چاپ سن کر جھجک سی گئی تھی اور اس کی آنکھیں جن میں اب خوف مرتعش تھا۔ اندھیرے میں ڈوبتے ہوئے انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ نووارد کی آمد سے باخبر ہوگئی۔ کیونکہ اس نے ذرا آگے جھک کر غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "آپ کو معلوم نہیں۔ کہ میرے کمرے میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔"

مشرف جو اس وقت اپنے آپ کو بالکل بے پروا محسوس کرتا تھا۔ اور آگے بڑھا۔ اور کہنے لگا۔ "عشق اور جنگ میں تمام طریقے مستحسن ہیں۔"

اب مشرف کمرے کی ہر ایک چیز کو اچھی طرح سے دیکھ سکتا تھا۔ اس نے رقاصہ کی طرف دیکھا وہ محبت کے اس اچانک اظہار سے پریشان معلوم ہوتی تھی۔ اور اس کے چہرے پر مختلف جذبات کے آثار نقش چھوڑتے چلے جاتے تھے۔ مشرف کے دل میں خیال پیدا ہوا۔ کہ وہ اس کی طرف تعجب آمیز اشتیاق سے دیکھ رہی ہے۔ مگر یہ خیال پیدا ہونے کے ساتھ مٹ بھی گیا۔ کیونکہ اب اس کی آنکھوں سے خوف کی جگہ خفگی کا اظہار ہوتا تھا۔ اس نے مشرف کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اور کمرے کے دوسرے کونے میں ایک آئینہ کے سامنے بظاہر اپنے لباس کو درست کرنے میں مشغول ہوگئی۔ پھر خدا جانے وہ کیا سوچ کر تیزی سے مڑی۔ اور عین مشرف کے قریب آکھڑی ہوئی۔ اس کے گلابی ہونٹوں پر ایک تبسم کھیل رہا تھا۔ مشرف اس فوری انقلاب سے خوش ہوا۔ کیونکہ اب وہ سمجھ چکا تھا۔ کہ اس نے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔

اسے ایک ایسی ہی عورت سے سابقہ پڑ گیا۔ جس کا وہ خواہشمند تھا۔ جس کے جذبات کبھی ساکن نہ رہ سکتے تھے۔ فطرت نے اسے شوخ ادا اور شوخ کلام پیدا کیا تھا۔ اس کی افتاد طبیعت کسی قاعدے کسی قانون کسی رسم کی پابند نہ تھی۔ وہ مستقل مزاجی۔ جو ایک مرد کی خصلتوں کا جوہر ہے۔ یہاں بالکل مفقود تھی۔ اس کی نسوانیت کا یہی اقتضا تھا۔

وہ بہت جلد بے تکلف ہوگئے۔ [illegible] ایک ہی قسم کا جذبہ متحرک تھا۔ [illegible] سے بیقرار تھے۔ پھر مشرف [illegible] کے انداز میں اس کی گذشتہ [illegible] پایا۔ کس طرح شروع ہی سے [illegible]

تماشاگاہوں کی عشرتوں سے بیتاب و بےچین ہوجایا کرتی
کس طرح اسے پردوں کے پیچھے جاکر تمام
اسراروں کو سمجھنے کی خواہش دیوانہ بنا دیا کرتی۔ کس طرح
وہ ایکٹروں کو کامیاب ہوتے ہوئے دیکھ کر بوجہ رشک
سے پیچ و تاب کھانے لگتی۔ کس طرح جوان ہوکر اس کی
آزاد خیالی اسے تماشا گاہ میں لے گئی۔ کس طرح رفتہ رفتہ
ترقی کرکے وہ اپنے فن کی ماہر گنی جانے لگی۔ ادھر
گویا اس نے اس تمام سلسلہ واقعات کو ایک خاتمہ تک
پہنچاتے ہوئے کہا۔" اب میں اس شہر کی مشہور ترین
رقاصہ ہوں۔ اور ایک شہزادی کا پارٹ ادا کرنے میں
کمال رکھتی ہوں۔

لیکن میری امیدیں جو ایک طلسمی محل کی طرح شفاف
بلند اور رنگین تھیں۔ تماشا گاہ کی غیر واقعی زندگی سے
ٹکرا کر چور چور ہوگئیں۔ ۲۴ گھنٹوں میں میری زندگی صرف
ایک [illegible] کے لئے خوشگوار ہوتی ہے۔ جب میں اپنے کمال
سے تمام لوگوں کو مسحور کر دیتی ہوں۔ اور وہ مجھے مخمور نگاہوں
سے دیکھنے لگتے ہیں۔ اس وقت میں ان کی تمام امیدوں
کا مرکز بن جاتی ہوں۔ اور حقیقت میں ایک شہزادی
کی طرح ان کی حسیات پر حکومت کرتی ہوں۔ وہ میرے
ایک اشارے پر اپنی جانیں قربان کرنے کے لئے تیار
ہوتے ہیں۔ لیکن بعد میں اس غیر واقعی زندگی سے میری
پریشانی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔" اس کی عجیب و غریب
کہانیوں نے میری تمناؤں کے دریا کو اتنا وسیع کر دیا
تھا کہ میں بھی اپنے لئے ایک ایسا عاشق چاہتی ہوں
جو ڈراموں کے عاشقوں کی طرح اپنی بہادری کے ثبوت
دے۔ وہ دیوتاؤں کی طرح خوبصورت اور جوان ہو اور
اتنا بہادر کہ اس کی بہادری بیوقوفی کی حد تک پہنچ جائے
وہ خاموش ہوگئی۔ لیکن بہت کھوئی ہوئی معلوم ہوتی
تھی۔ گویا وہ تخیل کے اڑن کھٹولے پر بیٹھ کر عاشقی کے
رنگین بادلوں میں سے گذر رہی ہو۔ جو اسے عیش کے
پرستان میں پہنچا دے۔ آخرکار اس نے اپنے ہاتھوں
کی ایک حرکت سے ان تمام پریشان کن خیالوں کو رفع
کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"یہ ہے میری زندگی"

مشرف جو رقاصہ کی تقریر کے ہر ایک لفظ میں
اپنے جذبات کو منعکس کر رہا تھا۔ خاموش رہا۔ لیکن
تھوڑے عرصہ کے بعد اس نے رازداری کے عہد میں
خود بھی بہک بہک کر اپنی مصیبتوں کو بیان کرنے کی
کوشش کی۔" میں ایک شریف خاندان سے ہوں۔ وہ شخص
جس کا دماغ کبھی ایک جوہر قابل تھا۔ جس کی صحت
کبھی قابل رشک تھی۔ اور جسے میں نے ایک استغنا کی
شان سے تباہ کیا ہے۔ مجھ میں کام کرنے کی قوت موجود

تھی لیکن میں نے یہ نہیں کیا۔ میں بارسوخ ہوں۔ روپیہ والا ہوں اور دنیا کے نشیب و فراز سے واقف۔ تمام مردوں کے لئے یا اگر زیادہ صحیح الفاظ کی ضرورت ہے۔ تو تمام انسانوں کے لئے میرے دل میں نفرت اور حقارت کے جذبات موجود ہیں۔ میں اپنے افعال کی غیر ذمہ داری کا معترف ہوں۔ اور دوسروں کی بیوقوفی پر خندہ زن لوگ مجھے صاف دل اور روشن دماغ کہتے ہیں۔ اور اوران تمام باتوں کے بعد آپ کا سچا عاشق"

(۴)

خلاف توقع مشرف رقاصہ سے بہت جلد تنگ آگیا۔ اس نے محبت آمیز الفاظ میں اپنے عشق کی تکان کو چھپانا چاہا۔ مگر عورت کی رقیبانہ محبت بہت جلد تہ کو پہنچ جاتی ہے۔ مشرف نے بہت کوشش کی۔ کہ زندگی کے اس احساس کو نام نہاد محبت میں فنا کردے۔ مگر وہ سمجھ گئی۔ مرد کی زبان دھوکہ دے سکتی ہے۔ آنکھیں نہیں دے سکتیں۔ یہ عورت ہی کا حصہ ہے۔ کہ وہ آنکھوں میں بھی مصنوعی محبت کو متحرک کرسکتی ہے۔ شبہات کے یہ پہلے دن رقاصہ نے اسی مبہم سی تکلیف میں گزارے۔ جیسے کوئی شخص بیماری سے پہلے اپنی طبیعت میں ایک نامعلوم کسل کے نشان ایک تاریک سے خطرے کا احساس پاتا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کے شبہات قوی ہوتے گئے

اب وہ مشرف کو کچھ نہ کہتی۔ مگر اس کی طرف ستم رسیدہ نگاہوں سے دیکھتی رہتی۔ اسی طرح دیکھتی رہتی جس طرح کوئی مجروح پرندہ اپنے شکاری کی طرف دیکھتا ہے۔ اس کے بازو ٹوٹ چکے تھے۔ وہ چل سکتی تھی۔ مگر اڑنے سے مجبور تھی وہ ایک زخمی کبوتر کی طرح تھی جس کے پر کاٹ ڈالے گئے ہوں۔

مشرف کو اس خاموش التجا۔ اس گم سم تمنّا پر رحم کی بجائے غصّہ آنے لگا یہ عورت کون تھی۔ جو اس کی دن بھر کی خوشیوں کو اپنی غمگین نگاہوں کے تیروں سے چھلنی کر دیتی۔ اسے کیا حق تھا۔ کہ وہ اس حسرت انداز سے اس کی طرف دیکھ دیکھ کر پرانے زخم ہرے کیا کرے وہ اس سے جھگڑتا۔ اور اسے مارتا۔ اسے بولنے پر مجبور کرتا۔ مگر وہ خاموش رہتی۔ اور مشرف کے اس بیجا ستم پر اس کی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ نہ گرتا۔ یک لخت وہ اپنے ہر ایک مقصد میں ناکامیاب رہا۔ اور تھک کر گھر آیا۔ اس وقت مشرف کو یوں محسوس ہوا گویا رقاصہ کی آنکھیں اس کی حالت کا مضحکہ کر رہی [illegible] رقاصہ کو بالوں سے پکڑ لیا۔ اور [illegible] چاہا مگر وہ [illegible] بھڑکے ہوئے سانپ کی طرح اس کی طرف شدید نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ مشرف کانپ کر پیچھے ہٹ [illegible]

اس سے دوسری رات کا واقعہ ہے وہ اسی [illegible]

کی طرف چلا جا رہا تھا۔ جہاں اس نے پہلے حسین رقاصہ سے ملاقات کی تھی۔ وہ تمام پچھلے واقعات کو اپنے ذہن میں دہرا رہا تھا۔ یکایک اسے یوں محسوس ہوا۔ گویا کسی نے کند نشتروں سے اس کا چہرہ کرید دیا ہو۔ پھر اس نے اپنے پیچھے تیز قدموں کی آہٹ سنی۔ اور وہ بیہوش ہو گیا۔

رقاصہ نے تیزاب سے اس کے چہرے کو ہمیشہ کے لئے بدہیئت کر کے اپنا انتقام لیا تھا

مشرف کو ہوش نہیں کہ وہ کتنا عرصہ بیمار پڑا رہا۔ اس بیہوشی کے عالم میں اسے عجیب وغریب خواب دکھائی دیتے۔ دوزخ کے خوفناک مناظر ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے رہتے۔ وہ ہر وقت فرشتوں کو آتشیں کوڑوں سے گناہگاروں کی سزا پوری کرتے ہوئے دیکھتا۔ اور کانپ جاتا۔ کیونکہ کوئی آواز اسکے کان میں کہتی تھی۔ "تجھے بھی یہیں آنا ہو گا۔ یہیں آنا ہو گا۔"

جب وہ یہ آواز سنتا تو گھبرا کر چیخیں مارنے کی کوشش کرتا لیکن اس کا دل اندر سے بیٹھا جاتا۔ اور اس کی چیخ لبوں تک آ کے خاموشی میں تبدیل ہو جانے پر مجبور ہو جاتی۔ آخر کار ایک عظیم ذہنی تکلیف کے بعد اسے پوری طرح ہوش آیا۔ اور ہوش میں آ کر پہلی فرمائش جو اس نے اپنے تیمارداروں سے کی وہ آئینہ دیکھنے کی خواہش تھی۔

آئینہ منگوایا گیا۔ اس نے اپنے چہرے کو دیکھا۔ اور ایک دلدوز چیخ مارتی ۔ ۔ ۔

اس کا بند بند کانپ رہا تھا۔ وہ بستر پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے نمودار ہو گئے۔ اور اس کی آنکھیں اس جانکاہ عذاب سے متاثر ہونے کا پتہ دے رہی تھیں۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اور اس ہولناک حادثے کو حقیقت سمجھتا ہوا اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ مگر اس کی قوتِ حس کو اپنی گالوں کی سطح پر کوئی کھردرا پن، کوئی بدہیئتی کا نشان نہ معلوم ہوا۔ اب اس کے دماغ نے اسے سمجھانا شروع کیا۔ کہ یہ تمام خواب تھا۔ اسکے عجوبہ کار وہم کا کرشمہ۔ کمرے کی ہر ایک چیز اسی ترتیب سے رکھی ہوئی تھی۔ اس کی کوچ کے نزدیک میز کے نیچے ایک خط کے پرزے پڑے ہوئے تھے۔ اس نے انہیں بڑی آہستگی سے اٹھایا۔ اور آنکھوں سے لگا لیا۔

دوسرے دن اخبارات نے یہ خبر شائع کی

"کل نواب ذوالقدر جنگ کی دختر نیک اختر اور مرزا مشرف کو نکاح کے پاک رشتہ میں منسلک کر دیا گیا۔ اس تقریب سعید پر شہر کے تمام رؤسا موجود

تھے۔ پچھلے دنوں سے جو بے سر و پا افواہیں مرزا صاحب کی نسبت مشہور ہو رہی تھیں۔ یہ واقع اُن کی تردید کر رہا ہے۔ اور ہمیں امید ہے کہ آئندہ حاسدوں کو کبھی ایسی باتوں کے کہنے کا موقعہ نہ ملیگا۔ جن کی وجہ سے اتنا عرصہ مرزا صاحب پر حرف آتا رہا۔

یہ اُس کی آخری محبّت تھی

عابد

غزل

اب دل بھی ہے مہماں کسی کا
ہونا ہے کوئی کہاں کسی کا

کعبے میں ہو یا کہ بتکدے میں
ہر سنگ ہے آستاں کسی کا

کیوں ناز ہے حُسنِ عارضی پر؟
ہوتا نہیں آسماں کسی کا

مٹ جائے فلک سے غیر ممکن
یہ داغ ہے جاوداں کسی کا

اب دل کی خرابیاں نہ پُوچھو
ناخواندہ ہے مہماں کسی کا

کانوں میں مرے اثرؔ ابھی تک
ہے نغمۂ جاوداں کسی کا

اثر صہبائی

مئے قدیم

(گزشتہ سے پیوستہ)

نہ ہو سرمست تو اے بے خبر سودائے راحت میں ۔۔۔ ملیگی عافیت کیا تنگنائے رنج و محنت میں
جو پیتا ہے دما دم جام مے تو بزم عشرت میں ۔۔۔ خمارِ دردِ بے درماں ہے آخر تیری قسمت میں

رہی یوں ہی تری او دیدۂ مخمور گر مستی !
کسی دن اشک حسرت بن کے نکلیگی یہ سرمستی !

گلِ عشرت ریاضِ دہر میں کیا خاک ہو بو یا ۔۔۔ بشر جس وقت آیا اس جہاں میں آتے ہی رو یا
جہاں کو جان لیں دار المحن آرام کے جو یا ۔۔۔ لسان الغیب ہے معصوم بچّوں کی زباں گویا

بجا ہے حق ہے جو کچھ کو دکان خام کہتے ہیں
کہ طفلی میں یہ سب آرام کو "آلام" کہتے ہیں

صحیح العقل کو عیش و طرب دنیا میں کلفت ہے ۔۔۔ کہ لفظِ عیش کا دل دیکھئے خود حرف علّت ہے
مسرت میں شمولِ حرفِ مدغم عین حکمت ہے ۔۔۔ یہ معنی اس کے ہیں یعنی خوشی میں غم کی شرکت ہے

جہاں میں خوشدلی تحریک غم سے غیر ممکن ہے
وہ دل ہونے کو ہے زیر و زبر جو آج ساکن ہے

بہت بھڑکے رہے جذباتِ نفسانی ترے دل میں ۔۔۔ رہا تو ایک مدّت منہمک امید باطل میں
یہ سستی ! حیف کی جا ہے حریفوں کے مقابل میں ! ۔۔۔ نہ ہو واماندہ تو پرواز سے قطع مراحل میں

قوی بالان صحت کیا رکینگے چرخ دائر سے
فلک تک اُڑکے او شہباز ا بڑھ جا نسر طائر سے

چلے کیا اہل ہمت پر فلک کی فتنہ پردازی   بدل دیتی ہے عالی ہمتی قسمت کی ناسازی
طلبگارِ ترقی کے لئے ہے شرطِ جانبازی   نہیں بے دردِ سر ملتی زمانے میں سرافرازی
کیا قبضہ گلوں نے سر بکف ہوکر خزانے پر
ہوا ہے نام روشن شمع کا بھی سر کٹانے پر

جہاں میں نعمتیں ملتی ہیں ساری کدوکاوش سے   ہوس نعمت کی بے سعیِ طلب ہے دور دانش سے
مہ کامل کی پہلے ابتدا ہوتی ہے کاہش سے   زمیں کسبِ ضیا کرتی ہے روز و شب کی گردش سے
شجر پاتے ہیں برگ و بر چمن میں پا بگل ہوکر
شگفتہ ہوتے ہیں غنچے بھی آخر تنگ دل ہوکر

ترے پیش نظر ہر وقت اگلوں کے فسانے ہیں   سلف کے کارنامے بہر عبرت تازیانے ہیں
چمن میں وہ عنادل ہیں نہ اُنکے آشیانے ہیں   مگر کانوں میں ابتک گونجتے انکے ترانے ہیں
یہ مانا پہلے سے بھی گرم تر اب نغمہ خوانی ہے
نئے پردے نئے نغمے ہیں لیکن لے پرانی ہے

وہ سرخیلِ بنی نوع بشر تھے جاہ و عزت میں   تعالی اللہ رفیع الشان تھے اقبال و ثروت میں
کئے وہ کام اُنھوں نے کارگاہِ علم و حکمت میں   کہ فیض ان کا ہے جاری آجتک ہر قوم و ملت میں
جہاں میں فیض بار ابتک وہی فیضانِ کامل ہے

ریاضت اس زمانے کی فقط تحصیل حاصل ہے

شگفتہ آج جن پھولوں سے گلزار مجازی ہے
وہ موجودہ ترقی آج جس کی ترک تازی ہے
جن ایجادوں کے باعث موجدوں کو سرفرازی ہے
یہ سب اگلے بزرگوں کی ہمارے کارسازی ہے
وہی بو آج تک گلہائے جدت سے نکلتی ہے
پرانی روشنی ان تازہ فانوسوں میں جلتی ہے

ہوئی ہیں محو گو لوح جہاں سے اُن کی تصویریں
جہاں میں بانیٔ نظم و نسق ہیں اُن کی تدبیریں
مگر ان مصلحوں کی ضوفشاں ابتک ہیں تنویریں
بناؤں پر انہیں کی آجکل ہوتی ہیں تعمیریں
تمدن کی عمارت پہلے تھی پادر ہوا قائم
انہیں نے کی اصولِ فن سے پھر اسکی بنا قائم

وہ تھے کار آزمودہ کارگاہِ تیر و خنجر میں
ودیعت تھی غضب کی آنچ ان تیغوں کے جوہر میں
قیامت خیز حملے ان کے تھے دشمن کے لشکر میں
لگادی آگ جس نے رفعتِ عالم کے دفتر میں
کسی کی ایسی شمشیرِ ظفر دنیا میں کب چمکی
ہوئی چو رنگ دنیا ان کی جب تیغ دو دم چمکی

صفوفِ جنگ میں وہ لوگ نام آور سپاہی تھے
وہ عینِ علم و فن سرچشمہ عالم پناہی تھے
طریقِ صلح میں بھی آیۂ لطفِ الٰہی تھے
کمالِ عقل سے شیرازہ بندِ فقر و شاہی تھے
نکالا مشربِ پاکیزہ سے اوہام بے جا کو
کیا شیر و شکر ان رہبروں نے دین و دنیا کو

ہزار افسوس الیسوں کے خلف کی ہو یہ بدحالی
جُدا ہم سے ترقی دُور ہم سے فارغ البالی

وہ مے جس کی بدولت آج تک دُنیا ہے متوالی
اُس آبِ آتشیں سے جام اپنا ہو گیا خالی!

دماغ اہلِ دُنیا آگیا تھا جس سے چکّر میں
خُدا کی شان وہ مے آج ہے غیروں کے ساغر میں

تپش

جذبات

بیاں ہو گا نہ مجھ سے وصف کچھ حسنِ خود آرا کا
کہوں کیا یہ کہ وارفتہ ہوں کس برقِ تجلی کا

بہت آساں ہے گلشن میں گلوں کا پھولنا پھلنا
مگر مشکل ہے ہونا بارور نخلِ تمنّا کا

بیاضِ عارضِ پُر نور عنوانِ قیامت ہے
طرازِ فتنۂ محشر ہے نقش اُس کے کفِ پا کا

خُدا جانے سرِ عشاق پر کیا آفتیں لاتے
یہ جُھک جُھک کر گلے مِلنا زمیں سے چرخِ مینا کا

شرابِ لالہ گوں ہم کو نہیں درکار اے رندو
ہماری بزم میں کچھ اور ہی ہے رنگ صہبا کا

کسی سے لو لگا کر فارغِ ہر دو جہاں ہوں مَیں
مجھے کیا فکر دُنیا کی مجھے کیا غم ہو عقبےٰ کا

مجھے وہ ہے بہت کچھ تو نے تعلیم شکیبائی
کروں کس مُنہ سے شکوہ تیری رنجش ہائے بے جا کا

مریضانِ محبّت کی شفا ممکن نہیں شامی
کہ رنگ اُڑنے لگا ہے دیکھ کر مجھ کو مسیحا کا

محمد معراج الدین شامی

دلنواز کا خون

(۱)

ریاست بام گڈھ ان ریاستوں کے مجموعہ میں سے ایک تھی، جن کے سلاطین قرونِ اولیٰ سے اپنی رواداری نجابت، شجاعت اور رعایا پروری کے لئے تمام مُلک میں مشہور تھے۔ جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں، بدقسمتی سے بام گڈھ کے تخت پر سلطان صفدر جنگ متمکن تھے۔ جو بظاہر نہایت عابدانہ و زاہدانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن جو لوگ محرمانِ اسرار تھے ان کو معلوم تھا کہ سلطان شرابخوار، عیش پسند، ظالم اور تند خو ہیں۔ جو امراء نیک طینت اور پختہ سیرت تھے۔ وہ چُن چُن کر سلطنت سے بدر کئے جاتے تھے۔ اکثر تلوار کے گھاٹ اُتار دیے گئے۔ کبھی اپنے گھر سے نکلے اور بعد میں ان کا پتہ نہ چلا خدا جانے انہیں زمین کھا گئی، یا آسمان نے کھینچ لیا۔ اور بعض زہر ہلاہل کے ذریعے سے کانٹے کی طرح نکال کر پھینک دیے گئے۔

سلطان صفدر جنگ کا ولیعہد شہزادہ دلنواز ایک نہایت شریف، متین، متدین غرض اپنے بزرگوں کی میراث کا جائز اور پورے طور پر وارث تھا۔ لیکن چھوٹا بیٹا محمود باپ کے زیر اثر پرورش پا کر جوان ہوا۔ جتنا بڑا لڑکا خوبصورت، شکیل اور وجیہ تھا۔ اتنا ہی چھوٹا کریہ المنظر تھا۔ بڑا رحمدل تھا تو چھوٹا نہایت سنگدل غرض محمود ہر بات میں اپنے بڑے بھائی کی ضد تھا۔ دلنواز ایک تو ولیعہد دوسرے اپنی رعایا کا منظور نظر تھا۔ بڑے بھائی کی اسقدر قدر و منزلت دیکھ کر محمود دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ جاتا تھا

سُلطان صفدر جنگ کے محل میں کہرام مچا ہُوا تھا۔ ولیعہد سلطنت کو کسی شقی القلب نے حالتِ خواب میں ہلاک کر دیا تھا۔ اس کی نعش پر چار بہت گہرے زخم تھے جن سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ قاتل نے بہت اطمینان اور دلجمعی سے اقدام جرم کیا ہے۔ تجربہ کار لوگوں اور بدبخت باپ کو معلوم تھا۔ کہ وارث تاج تخت کا قاتل کون ہے لیکن وہ سب خاموش تھے۔ رفتہ رفتہ یہ خبر اُڑی کہ چھوٹے بھائی نے تاج و تخت کی ہوس میں اپنے بڑے بھائی کا خاتمہ کر دیا ہے۔ لیکن کیا مجال جو کوئی اُف بھی کرے لوگ جا بجا سرگوشیاں کرتے تھے لیکن کسی کی جُراَت

نہ تھی۔ کہ خیالات کو الفاظ کا جامہ پہناتے۔ بظاہر سلطان بہت رنجیدہ تھے۔ لیکن درپردہ خوشیاں مناتے تھے کیونکہ انہیں ہر وقت یہی خدشہ رہتا تھا۔ کہ کہیں لوگ ان سے بیزار ہو کر شہزادہ دلنواز کو تخت نشین نہ کر دیں۔ کچھ مدت تک اس قتل کا خوب چرچا رہا۔ لیکن جس طرح برسات کی ہوائیں حبس کی جانگداز تکلیف کو خواب کی طرح بھلا دیتی ہے اسی طرح زندگی کے معمولی واقعات نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اور یہ واقعہ دیگر حادثات میں دبتا گیا۔ سلطان لاولد نہیں تھا۔ شہزادہ محمود اپنے ظلم و ستم کے باوجود اپنی رعایا کا محبوب ہو گیا۔ اور لوگ اسے ہی غنیمت سمجھنے لگے۔

(۲)

فردوسی ایک حکیم حاذق اسی سلطنت کے پایہ تخت میں اقامت پذیر تھا۔ وہ صرف طبیب ہی نہیں تھا۔ فلسفی علم نباتات کا ماہر ہونے کے علاوہ ایک عالم جید تھا۔ کئی ملکوں کی زبانیں اپنی مادری زبان کی طرح بولتا تھا اور علم تاریخ اور فلسفہ مذاہب میں اس کا تبحر ضرب المثل تھا۔ اس کے بشرے پر نور برستا تھا۔ اس کی سفید ڈاڑھی ناف تک پہنچتی تھی۔ اس کی وجہ سے اس کے چہرہ سے بزرگی اور جلال ٹپکتا تھا۔

بعض لوگ اسے جادوگر سمجھتے تھے لیکن اس میں کلام نہیں کہ وہ شخص نہایت دانا تھا۔ اگر یہ بوڑھا قرون وسطیٰ میں یورپ میں نمودار ہوتا۔ تو سلطنت اسے مکار جادوگر سمجھ کر زندہ آگ کی نذر کر دیتی۔ یا وہ کھولتے ہوئے پانی میں اُبال دیا جاتا۔ یا سینہ پر پتھر باندھ کر اسے دریا برد کر دیا جاتا۔

اکثر نامراد اس سے اپنی مرادوں کے بر آنے کے لئے دعا کی استدعا کرتے تھے۔ اور عشاق کا بھی جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ جو اس سے حب و تسخیر کے عملیات طلب کرتے تھے۔

بوڑھا فردوسی مختلف قسم کے زہروں کا بیوپار بھی کرتا تھا۔ جن کے علاج سے روئے زمین کے اطبا قاصر تھے۔ کوئی نہ معلوم کر سکتا تھا۔ کہ فلاں شخص کو زہر دیا گیا ہے۔ ان زہروں کے تریاق صرف فردوسی ہی کو معلوم تھے۔ جن کو کیمیاوی طریقوں سے وہ اپنے مفید مطلب بیان کرتا تھا۔

ایک دن سلطان کی سواری شہر میں سے گزرنے والی تھی۔ تمام شہر جھنڈیوں اور بیرقوں سے سجایا گیا تھا۔ لوگ سڑکوں پر دو رویہ قطاریں باندھے کھڑے تھے۔ اور کمال احترام سے منتظر تھے۔ ایک جگہ ہمارا فردوسی بھی اپنے مقتدیوں کے جھنڈ میں کھڑا تھا

صاف گو اور درشت مزاج تھا۔ اس لئے غیر ہر دلعزیز تھا لیکن اس وقت وہ ایک خستہ حال لڑکے سے گفتگو کر رہا تھا۔ جس کے بدن پر چیتھڑوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ اور وہ چیتھڑے اس کی عریانی کو اور بھی نمایاں کر رہے تھے۔ فردوسی بادشاہ کی شان میں گستاخانہ کلمات کہہ رہا تھا۔ لڑکا کبھی تو اس کی تائید میں اپنا سر ہلا دیتا اور کبھی بے پروائی سے دوسری طرف دیکھ کر ہنس دیتا۔ اس وقت ایک "شاہ پرست" بڑھیا نے فردوسی کی گفتگو سُنی۔ تو بڑے غصّے میں بولی۔ "بے ایمان تجھے شرم نہیں آتی۔ یہ کیا بکواس کر رہا ہے۔ کچھ ہوش کی دوا کر۔ عقل کے ناخن لے۔ جس ٹہنی پر بیٹھنا اسی کو کاٹنا۔ تجھے معلوم نہیں۔ کہ بادشاہ خُدا کا سایہ ہے۔ اور تجھے خُدا کے بعد اس کا احترام کرنا چاہیئے۔"

فردوسی نے بہت اطمینان سے جواب دیا۔

"یہ سب کچھ ٹھیک ہے لیکن جس شخص کو کسی کی عزّت کا خیال نہ ہو۔ وہ شہنشاہ ہو کر بھی میری نظروں میں کشتنی گردن زدنی ہے۔ بادشاہ کی شرافت ہی ہے کہ وہ رعایا پرور ہو۔ اُن کو اپنے بچّوں کی طرح جانے۔ اپنے آبا و اجداد کے وقار کو قائم رکھے۔ اور خاندانی روایات کا احترام کرے نہ کہ ان کی بہو بیٹیوں کی عصمت کے درپے رہے۔"

بُڑھیا نے غصّہ سے لال پیلی ہو کر جواب دیا۔ "او کلہ دراز۔ ذرا چونچ سنبھال۔ ورنہ میں تیرا مُنہ نوچ لوں گی۔"

یہ جھگڑا طول کھینچتا لیکن اس وقت باجوں کی آواز اور ہتھیاروں کی جھنکار سے معلوم ہُوا۔ کہ بادشاہ کی سواری قریب آ رہی ہے۔ جونہی شاہی گھوڑا بڑھا تمام لوگ زمین بوس ہو گئے۔ لیکن فردوسی اور وہ لڑکا اسی طرح کھڑے رہے۔ جب بادشاہ کی سواری اس مقام سے گزر گئی۔ تو وہی بڑھیا لاٹھی لے کر نمودار ہوئی۔ اور بیچارے فردوسی پر دھاوا بول دیا۔ آخر کب تک فردوسی کو بھی غصّہ آ گیا۔ اس نے لکڑی ہاتھ سے چھین، توڑ پھوڑ کر پھینک دی۔ بڑھیا کی چیخ و پکار سے لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے۔ اور لڑائی شروع ہو گئی تمام لوگ فردوسی پر جوتوں۔ پتھروں اور لکڑیوں کی بوچھاڑ کر رہے تھے۔ اس لڑکے نے جب اس کی حمایت کرنی چاہی تو اس کی بھی خوب مرمت ہُوتی۔ قریب تھا کہ یہ دونوں لوگوں کے غُصّہ کا شکار ہو جاتیں۔ اتنے میں ایک بانکا جوان ایک عالیشان رہوار پر سوار ہاتھ میں تلوار لئے آ پہنچا۔ اور للکار کر بولا۔ "یہ کیا بیہودگی ہے؟" اور گھوڑے کو لوگوں کے ہجوم میں کدانا شروع کیا

لوگ ایک بہادر آدمی کے ہاتھ میں ننگی تلوار دیکھ کر بھاگ گئے نوجوان گھوڑے سے کودا۔ بُوڑھے فردوسی اور نوجوان لڑکے کو زمین پر سے اُٹھا کر گھوڑے پر سوار کیا۔ اور فردوسی کے مکان پر چھوڑ آیا۔ فردوسی نے اظہار تشکر کے طور پر اس کے ہاتھ چوم لئے۔ اور بولا۔ تم نے آج میری جان بچائی ہے۔ فردوسی اپنے محسن کو فراموش نہیں کریگا۔

(۳)

کبیر نگر ایک ہمسایہ سلطنت تھی۔ جس کا سلطان آصف جاہ اپنی شان و شوکت، طاقت اور انصاف پسندی کے لئے مشہور تھا۔ بام گڈھ کے سلطانوں کی ہمیشہ سے یہی خواہش تھی۔ کہ کسی طرح ان دونوں سلطنتوں کے مابین خوشگوار تعلقات قائم ہو جائیں۔ اس وقت سلطان صفدر جنگ والئے بام گڈھ کی اکلوتی بیٹی عتیرہ حسن و جمال سلیقہ شعاری اور فن و صناعت میں بے مثل تھی۔ اکثر شہزادے اور اُمرا اس کوشش میں تھے۔ کہ کسی طرح وہ سونے کی چڑیا ہاتھ آئے۔ سلطان بام گڈھ کو خفیہ طور سے معلوم ہو گیا۔ کہ شہزادہ سلیم ولیعہد کبیر نگر کو عتیرہ سے غائبانہ عشق ہے۔ اس وقت سے سلطان صفدر جنگ اس کوشش میں تھے۔ کہ جس طرح بن پڑے اپنے بزرگوں کی وصیت پر عمل کیا جائے۔ ابھی خط و کتابت جاری تھی۔ کہ ولیعہد بام گڈھ قتل ہو گیا۔ اور محمود کے حالات بھی کبیر نگر پہنچے لیکن مصیبت یہ ہوئی کہ عتیرہ پر بھی اعانت قتل کا الزام عاید کیا گیا تھا۔ یہ خبریں سلیم کے لئے واقعی تشویشناک تھیں۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کیا۔ کہ قاصدوں۔ سفیروں یا سراغرسانوں پر اعتبار کرنے کی بجائے وہ خود بھیس بدلکر وہاں جائے اور حالات معلوم کرے۔

دوران سفر میں وہ بام گڈھ کے قریب ایک گھنے اور سنسان جنگل میں داخل ہوا کہ ذرا سستا لے۔ جھٹپٹے کا وقت تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی رعد کی چمک اور بادلوں کی گرج سے طبیعت پر وحشت طاری ہو جاتی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا کے چلنے سے گنجان درختوں میں سائیں سائیں کی آواز بہت وحشتناک تھی۔ عین اس وقت سلیم کو ایک طرف روشنی نظر آئی۔ یہ پُرشوق قدموں سے اس طرف بڑھا جب نزدیک پہنچا تو چند برقعہ پوش خواتین نظر پڑیں جو ایک جگہ حلقہ باندھے کھڑی تھیں۔ سلیم اور آگے بڑھا اور ایک درخت کی آڑ میں کھڑا ہو کر دیکھنے لگا۔ اسے ان میں سے ایک سب سے زیادہ ممتاز معلوم ہوئی۔ کیونکہ دوسری خواتین اس سے نہایت عزت و احترام سے پیش آرہی تھیں۔ وہ ایک قبر کے گرد کھڑی تھیں۔ اور رقت انگیز آواز میں مرثیہ پڑھ رہی تھیں۔ وہ لڑکی

زار و قطار رو رہی تھی۔ اور سہیلیاں اس کو تسلّی دے رہی تھیں۔ ایک خواص نے چند فقرے کہے جس سے تمام حقیقت ظاہر ہو گئی۔

"دیکھو پیاری عنیزہ صبر کرو۔ خدا کو جو منظور ہوتا ہے۔ آخر وہی ہوتا ہے۔ تقدیر کے ساتھ انسان لڑ نہیں سکتا۔ میں جانتی ہوں کہ آپ کو دلنواز سے بہت اُلفت تھی ایک بڑا بھائی دوسرے ولیعہد . . ."

یہ سُنکر سلیم کا سانس پھول گیا۔ قریب تھا کہ بڑھے کہ اچانک کسی خیال نے اسے اس ارادے سے باز رکھا اور وہ بہت مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالتا ہوا واپس بھاگا۔ اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ تمام افواہیں غلط تھیں اور صرف اس پاکدامن لڑکی کو بدنام و رسوا کرنے کے لئے۔ اسکی محبت دوبالا ہو گئی۔ وہ اس وقت کے لئے بیقرار تھا جب وہ اسے اپنے سینہ سے لپٹا سکے۔ اور اسے "میری اپنی" کہہ سکے۔

دوسری صبح سلیم شہر میں داخل ہوا یہی وہ بانکا جوان تھا جس نے فردوسی کو کتّے کی موت مرنے سے بچایا۔

(۴)

اس وقت ہم ناظرین کو فردوسی کے مکان میں یہ دکھانے لیجاتے ہیں کہ وہ اپنا وقت کس کام میں صرف کرتا ہے۔

یہ مکان ایک خوشگوار مقام پر واقع ہے۔ اس قماش کے لوگ عام طور پر آبادی سے الگ تھلگ خاموش رہکر زاہدانہ اور حکیمانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ تاکہ لوگ انہیں دق نہ کریں۔ مکان کا پھاٹک لوہے کا تھا جس کو توڑنا محض ایک وہم باطل اور خیالِ خام تھا۔ اس کے باہر کی طرف نوکدار سلاخیں لگی ہوئی تھیں جو نہی ایک سلاخ کو چھوا جاتا تھا آناً فاناً ایک سو برچھیاں چھونے والے کے جسم میں پیوست ہو جاتی تھیں۔ پھاٹک سے دس گز باہر کی جانب دیوار میں ایک میخ گڑھی تھی جسے چھوتے ہی مکان میں ایک گھنٹی بجتی تھی۔ اور اندر سے ایک شخص آکر چپکے سے دیکھتا تھا کہ آنیوالا خطرناک تو نہیں اور پھاٹک کو اتنا ہی کھولتا تھا جس میں سے بمشکل صرف ایک ہی شخص داخل ہو سکے۔

شہزادہ سلیم کے رخصت ہوتے ہی فردوسی نے پھاٹک کی ایک خاص سلاخ کو چھوا۔ پھاٹک کھل گیا اور یہ داخل ہوئے۔ کئی کمروں سے گزرتے ہوئے وہ ایک کمرے میں پہنچے۔ جو گول تھا۔ اور جس کی چھت گنبد دار تھی۔ یہ کمرہ خاص طور پر قابلِ ذکر تھا۔ جا بجا مردوں کی کھوپریاں اور ڈھانچے بکھرے پڑے تھے کئی جگہ مینڈک پنجروں میں بند تھے۔ ایک جگہ ایک بھیڑ الٹی ٹنگی ہوئی تھی۔ جسکے سر میں سے خون کے قطرے ٹپک

رہے تھے۔ ایک جگہ آگ سلگ رہی تھی۔ اور ایک بہت بڑا قبطی زمانے کا برتن اس پر گرم ہو رہا تھا۔ طاقوں اور الماریوں میں بڑے بڑے شیشے مختلف قسم کی زہروں اور دوائیوں سے بھرے رکھے تھے۔ اس کمرے میں ایک نہایت ہی بیش قیمت ایرانی قالین بچھا تھا۔ اور چند مصری وضع کی کرسیاں پڑی تھیں۔ جن پر فراعنہ کے زمانے کی مختلف تصاویر منقش تھیں۔ اور مختلف بیل بوٹوں میں قبطی زبان میں کچھ حروف لکھے تھے جن کو فردوسی کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ کئی ایک ممی شدہ نعشیں بھی رکھی تھیں۔ فردوسی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور چاندی کے تاروں کو کھینچ تان کر پتلا کرنے لگا۔ لڑکا قریب ہی زمین پر بیٹھ گیا۔ کچھ عرصہ تک بوڑھا حکیم چاندی کے تاروں سے ایک قسم کا جال تیار کرتا رہا۔ آخر اس خستہ حال لڑکے سے مخاطب ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ جیسے ذرا بلند آواز میں سوچ رہا ہو۔

"تم جیسے بیوقوف اور آوارہ لوگ کیا جانیں کہ میں ان چاندی کے تاروں سے کیا چیز بنا رہا ہوں عقلمند اور فاضل لوگ بھی اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ آہ! میں انتقام کی تیاری میں مشغول ہوں۔ میرے بیٹے! تیرے خون کا عوض ایک شخص کا قتل ادا نہیں کر سکتا۔ تمام خاندان کو اس کی پاداش بھگتنی پڑیگی۔ روئے زمین کی کوئی طاقت مجھے میرے انتقام سے باز نہیں رکھ سکتی میں نے انتقام کی آگ کے لئے پچیس برس سے ایندھن بہم پہنچایا ہے۔ لیکن میرے لخت جگر! تیرے قتل نے تو تیل کا کام دیا ہے۔ اور اب یہ شعلہ بھڑک اٹھا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تو مجھے خواب میں انتقام انتقام پکارتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یاد رکھ کہ تیری خواہش پوری کی جائیگی۔ اجل! اے او بیوقوف تو کیا سمجھا۔ افسوس تو نہیں جانتا کہ میں کیا ہذیان بک رہا ہوں اس راز کو دو آدمیوں کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ میں بھی کسی زمانے میں خوش و خرم تھا۔ جوان تھا۔ شکیل تھا۔ بہادر انسان اور جری سپاہی تھا۔ دیانتدار تاجر تھا۔ اور رحمدل اور بیوقوف شوہر تھا۔ اب میں بوڑھا، بدصورت ہوں۔ غم نصیب ہوں، بزدل ہوں لیکن عقلمند اور ظالم میرے پہلو میں گوشت کے ٹکڑے کی بجائے پتھر کا ڈلہ ہے۔ میرا کلیجہ جلتا ہے۔ اور زخموں کی وجہ سے چھلنی ہو رہا ہے۔ میرے انتقام کی چنگاری صرف دشمن کے خون سے ہی بجھ سکتی ہے۔

اب سے پچاس برس پہلے جب میری عمر صرف دس برس کی تھی۔ میں غریب تھا لیکن مسرور۔ ایک حکیم کے ہاں نوکر تھا۔ اور اکثر بازاروں اور گلی کوچوں میں آوارہ پھرا کرتا تھا۔ ایک دن تھک کر شہر پناہ کے

پھاٹک کے ایک طرف بیٹھ گیا۔ اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نوجوان عورت ایک بچہ کو سینہ سے لپٹائے دیوانوں کی طرح بھاگتی ہوئی آ رہی ہے۔ اور چند بدمست سپاہی برچھیاں سنبھالے اس کا تعاقب کر رہے ہیں۔ عورت تھک کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے بچہ کو میری طرف پھینک دیا۔ اور خود چند منٹوں میں موت کی گھاٹ اُتر گئی۔ میں بچہ کو لیکر بھاگا۔ اور اسے اپنے مربی کے حوالے کر دیا تو ایک خوبصورت چار سالہ لڑکی تھی میرے مربی نے ہم دونوں کی پرورش کا ذمہ لیا۔ وہ لاولد تھا۔ اور اس نے ہمیں اپنے بچوں کی طرح لاڈ پیار سے پالا۔ ہم دونوں میں اسقدر محبت تھی کہ ایک منٹ کی جدائی شاق گذرتی تھی۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتے تھے۔ آخر وہ دن آیا۔ جب یہ بچپن کی پاک محبت جذبۂ عشق میں تبدیل ہو گئی۔ میں نہ رہ سکا۔ اور ایک دن اپنے مربی سے خلوت میں تمام واقعہ کہہ دیا۔ میرے دوبارہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ پہلے ہی سے اس سوچ میں تھا۔ وہ بوڑھا تھا اور دم بدم موت کے دن قریب آ رہے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنی جائداد اور مطلب کو کسی کے ذمہ وار ہاتھوں میں چھوڑے۔ ایک سال کے بعد ہماری شادی ہو گئی۔ اور ہم خوش و خرم زندگی بسر کرنے لگے۔ آخر ایک دن بڑے میاں کو پیغام اجل آ گیا۔ اور نہایت مختصر سی علالت کے بعد راہیٔ ملکِ بقا ہوئے۔

مجھے کاروبار کے متعلق ملک سے باہر جانا پڑا میری بیوی کو میری مفارقت گوارا نہ تھی۔ وہ بہت روئی چلائی میں مجبور تھا۔ آخر رخت سفر تیار کر اور جلد واپس آنے کا وعدہ کر کے روانہ ہوا۔ چھ مہینے تک خط و کتابت رہی اس کے بعد خطوط میں کمی واقع ہو گئی۔ اور ان میں سے روکھے پن کی جھلک نظر آنے لگی۔ آخر خطوں کا آنا بند ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ وہ حاملہ تھی اس لئے علالت کی وجہ سے تاخیر ہو رہی ہے۔ جب میں اپنے کاروبار کے بعد واپس آیا۔ تو دیکھا کہ مکان گرا ہوا ہے۔ اور اس کے مکین کا پتہ نہیں۔ خفیہ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ سلطنت مام گڈھ کا ایک امیر زادہ اسے لے اڑا ہے میں ان کی جستجو میں وہاں پہنچا۔ تو معلوم ہوا کہ میری بیوی نے ایک لڑکا جنا تھا۔ جسے امیر نے اپنا بیٹا قرار دے لیا تھا۔ وہ امیر اسقدر طاقتور تھا کہ میری اس تک رسائی بھی ناممکن تھی۔ ایک دو عرضیاں بادشاہ کی خدمت میں بھیجیں لیکن داد رسی نہ ہوئی۔ وقت گذرتا گیا اور اس امیر کے ہاں میری بیوی سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ جب میرا پیارا بیٹا میرا جگر گوشہ پچیس برس کا جوان رعنا تھا۔ اور میں اس کو پھلتا پھولتا دیکھ کر خوش

ہوتا تھا۔ اس وقت رئیس کے چھوٹے بیٹے نے اپنی بہن کی اعانت سے اُسے قتل کر دیا۔ آہ! میری تمام امیدیں ملیامیٹ ہو گئیں۔ اور میں کہیں کا نہ رہا۔

خداوندا! کیا تو نے امیروں کو اس غرض سے پیدا کیا ہے کہ وہ غریبوں کو تباہ و برباد کر دیں۔ ان کے ننگ و ناموس کا مطلقاً خیال نہ کریں۔ اور ان کی بہو بیٹیوں کی عصمت ان کی نظروں میں کچھ نہ ہو۔ امیر لوگ مشقت کئے بغیر محلوں میں عیش سے زندگی کے مزے اُڑاتے ہیں۔ لیکن بیچارے غریب اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی تک ان کے حوالہ کر دیتے ہیں۔ اور اپنی شومیٔ قسمت پر نالاں خون کے سے گھونٹ پی کر رہ جاتے ہیں۔ آہ افلاس تیرا ستیاناس!"

بوڑھا فردوسی اس وقت غصّے سے کانپ رہا تھا اس کے بازو ہوا میں حرکت کر رہے تھے۔ سانس پھولا ہوا تھا۔ اور آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ لڑکا خوف کے مارے دوسرے کمرے میں بھاگ گیا۔ عین اس وقت کمرے میں گھنٹی بجی۔ جس سے فردوسی کو کسی ملاقاتی کے آنے کی اطلاع ہوا کرتی تھی۔

شہزادہ سلیم فردوسی کے کمرے میں داخل ہوا۔ اور علیک سلیک کے بعد یوں گویا ہوا۔ "مجھے آپ سے ایک بات معلوم کرنی ہے۔ میں بہت حیران و پریشان ہوں۔ شہزادی عنیزہ کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا وہ واقعی اپنے بھائی کے قتل میں شریک تھی؟ یہ ایک عقدہ ہے اسے کھولئے۔"

بوڑھے حکیم نے اس کی طرف ایسی عمیق نظروں سے دیکھا۔ گویا اس کے دل کی گہرائیوں کو ٹٹول رہا ہے اور متانت سے جواب دیا۔ "بھلا میں غریب بادشاہوں کے حالات کیا جانوں۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک مجھے اتنی ہی خبر ہے جتنی لوگوں کو اطلاع ہے۔ میرے ذاتی خیال میں اس کا اس قتل سے ضرور تعلق تھا لیکن آپ ہراساں کیوں ہیں؟"

سلیم نے جواب دیا۔ "میں سلطان کبیر نگر کا سفیر ہوں۔ اور شہزادی عنیزہ کی شادی کے متعلق کام سرانجام دے رہا ہوں۔ مجھے شہزادہ سلیم کی طرف سے خاص ہدایت تھی۔ کہ میں یہ حالات معلوم کر کے چھوڑ دوں۔ لوگ تو کہتے ہیں کہ وہ بھی قتل میں شریک تھی لیکن کل شام کے واقعہ نے میری رائے بدل دی ہے۔" اور اُس نے جنگل کا واقعہ فردوسی کو سنا دیا۔

چونکہ شام ہو رہی تھی۔ فردوسی اور سلیم گھوڑوں پر سوار ہو کر مزید تحقیقات کے لئے جنگل میں پہنچے۔ اور تمام واقعہ دوبارہ دیکھا۔ یہ بھی معلوم ہوا۔ کہ شہزادی ہر روز

جاتی ہے۔ فردوسی بولا "عورت! عورت انسانی فطرت کا ایک عجیب مجموعہ ہے۔ جو چیز اسے آج رنجیدہ کرتی ہے وہی کل اس کی خوشی کا باعث ہوگی اگر آج محبت ہے۔ کل وہ نفرت سے تبدیل ہو جائیگی۔ خیر میں پوری تحقیق سے کام لونگا"

(۵)

اسی طرح ایک ہفتہ گزر گیا۔ اور بوڑھا فردوسی چاندی کی تاروں کا جال بنتا رہا۔ آخر وہ مکمل ہو گیا۔ اور اس نے اطمینان کا ایک لمبا سانس بھرا۔ اور بولا "میرا کام ختم ہو گیا ہے۔ اور انتقام کا وقت آپہنچا ہے۔ لیکن میری وہاں تک رسائی کیونکر ہو؟" وہ اس سوچ میں تھا۔ کہ کمرے میں گھنٹی بجی۔ اور اجمل ملازم نے وزیر معین الملک کے آنے کی اطلاع دی۔ وزیر لکڑیوں کے سہارے لنگڑاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ بڈھے فردوسی کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ وہ اٹھ کر زمین بوس ہوا۔ چند لمحوں کے بعد وزیر بولا "میں مرض وجع المفاصل میں مبتلا ہوں۔ اس نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔ کئی قسم کے علاج کئے لیکن آرام نہیں ہوا۔ اب آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں خدارا میرے حال پر رحم فرمایئے"

بوڑھا حکیم جھپٹ کر ایک الماری کی طرف گیا۔ اور ایک پیالے میں دوائی تیار کر کے لے آیا۔ وزیر نے ابھی نصف دوائی پی ہوگی۔ کہ اس کے تمام جسم میں سنسنی محسوس ہوئی۔ اور ایک لہر سی دوڑ گئی۔ وہ جوش میں کھڑا ہو گیا اس کا مرض کافور ہو چکا تھا۔ اور وہ بالکل تندرست تھا۔ وزیر نے اپنے گلے سے موتیوں کا ہار اتارا اور بوڑھے کے گلے میں ڈال کر بولا "آپ نے مجھے خرید لیا ہے۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو فرمایئے"

فردوسی ایسے موقع کے لئے اپنی بقیہ عمر کے دس سال تک دینے کو تیار ہو جاتا۔ اس نے دست بستہ عرض کی "یہ سب آپ کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔ میری عرصہ سے تمنا ہے۔ کہ ایک رات بادشاہ کے محل میں قیام کروں۔ مجھے شہزادہ دلنواز مرحوم سے انتہا الفت تھی۔ میرا جی چاہتا ہے کہ ایک رات ان کے کمرے میں بسر کر کے دعا مانگوں"

وزیر نے متفکرانہ انداز سے اس کی طرف دیکھا۔ اور بولا "آجکل شہزادہ محمود بہت پریشان ہے۔ دشمن چاروں طرف سے اس کے ملک کو گھیرے ہوئے ہیں۔ اس لئے فکر کے مارے سوتا بھی نہیں۔ وقت گزارنے اور رنج کو دور کرنے کے خیال سے تمام رات شراب پیتا رہتا ہے۔ کھانا بھی نہیں کھاتا۔ صبح کو نشہ ٹوٹتا ہے تو بیحد وحشیانہ حرکات کا مرتکب ہوتا ہے ابھی آج اس نے بیس آدمیوں کی کھالیں کھنچوا دی ہیں

اس کی آخری امید اس میں ہے۔ کہ شہزادی عنبو کی شادی ولیعہد کبیر نگر سے ہو جائے تو دشمنوں کو خود بخود شکست ہو جائیگی۔ شہزادی کا کمرہ ولیعہد مرحوم کے کمرے کے بالمقابل ہے اور صرف ایک پردہ ان دونوں کے درمیان حائل ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہ کہیں آپ کو اپنی زندگی سے ہاتھ نہ دھونے پڑیں۔"

فردوسی بولا۔ "مجھے زندگی کے متعلق کوئی ڈر نہیں۔ اب جی لگ گیا تو کیا آپ میری اس ایک خواہش کو رد کر دینگے؟"

وزیر پر اس آخری فقرہ کا بہت اثر ہوا۔ اور اس نے کہا۔ "بہت بہتر ہے کل رات آپ کا انتظام کر دونگا۔"

(۶)

دوسرے دن صبح کے وقت شہزادہ سلیم کو جو بادشاہ کے محل میں کبیر نگر کے سفیر کی حیثیت سے فروکش تھا۔ اور اسے محل میں سوائے محلسرا کے پھرنے کی عام اجازت تھی۔ ایک خط ملا۔ مہر کو توڑ کر پڑھا۔ لکھا تھا۔

"اگر آپ کو اس عورت سے محبت ہے تو آپ مجھے آدھی رات کے وقت ولیعہد مرحوم کے کمرے میں ملیں۔

آپکا مخلص

فردوسی"

شہزادہ سلیم پہلے تو گھبرایا لیکن گھبراہٹ صرف چند لمحوں تک رہی۔ عاشق اپنے معشوق کے لئے جان تک کو جوکھوں میں ڈال دیتا ہے۔ وقت مقررہ پر وہاں پہنچا۔ اور خاموشی سے انتظار کرنے لگا۔ ساتھ کے کمرے میں کسی کے اضطراب زدہ قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔ سلیم دبے پاؤں پردے کی طرف گیا۔ اور اس میں سوراخ کرکے دیکھنے لگا۔ محمود کمرے میں ٹہل رہا تھا اس کا چہرہ راتوں کو جاگنے کی وجہ سے پیلا ہو رہا تھا آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ میز پر شراب کی بوتلیں خالی پڑی تھیں۔ اتنے میں محمود کے پیچھے دیوار کے پاس ایک پرنور مجسم ظاہر ہوا جو سر سے پاؤں تک نورانی چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ اور چہرے سے ہلکی ہلکی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ پھر ایک آہستہ مگر صاف اور واضح آواز سنائی دی۔ "اے بھائی کے قاتل! احسان فراموش۔ بدکار۔ بدطینت تیار ہو جا۔ میرے انتقام کا وقت آپہنچا۔ اب کوئی طاقت تجھے میرے چنگل سے نہیں چھڑا سکتی کوئی بات نہیں سنی جائیگی بس تیار ہو جا۔"

محمود اس طرف پھرا اور چیخ مار کر پلنگ پر گر گیا۔ قاعدہ ہے کہ سنگدل سے سنگدل شخص کے دل میں بھی بعض مخصوص مواقع پر خوف پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ پکارا "اے ولیعہد کی روح! تو پھر آپہنچی۔ تو نے اللہ ظاہر ہو کر مجھے بڑے بڑے معرکوں میں شکست کھانے پر

مجبور کیا ہے۔ اب تو باز آ۔ دفع ہو جا۔ تیرے آباؤ اجداد کی سلطنت کا دار و مدار صرف میری زندگی پر منحصر ہے۔"

روح نے جواب دیا۔ "مجھے سلطنت سے کیا سروکار؟ رموز حکمرانی، فتح و شکست سے کیا تعلق، عیش و عشرت سے کیا کام۔ میں انتقام کا فرشتہ ہوں۔ بس جہنم میں جانے کی تیاری کر۔" یہ کہہ کر وہ روح آگے بڑھی۔ اور محمود کے قریب آکر اپنا ہاتھ بلند کیا۔

محمود چلایا۔ "رحم۔ خدا کے واسطے رحم۔ میں بے قصور ہوں۔"

روح نے جواب دیا۔ "کیا تو موت کے قریب پہنچ کر بھی جھوٹ سے باز نہیں آتا۔ تجھے تو موت کا بہادرانہ مقابلہ کرنا چاہئے۔ تو نے اپنے بھائی کو قتل کیا ہے۔ اور اپنی بہن . . . "

محمود نے بھرائی آواز میں جواب دیا۔ "ہاں ہاں میں نے تجھے قتل کیا تھا۔ لیکن خدا کی قسم عزیزہ بالکل بیگناہ ہے۔ لوگ اس پر مجھ سے دشمنی کی وجہ سے الزام عائد کرتے ہیں۔ اسے تو تجھ سے بیحد محبت تھی۔ اب تک تیرے فراق میں روتی ہے۔ اور ہر روز شام کو تیری قبر پر فاتحہ خوانی کے لئے جاتی ہے . . . "

ابھی آخری فقرہ ختم ہوا ہی تھا کہ روح محمود کے بالکل قریب آگئی۔ محمود کی حالت اس وقت اس ہرن کی سی تھی۔ جسے شکاری کتوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہو۔ وہ خنجر نکال کر اس نورانی جسم پر جھپٹا جونہی اس نے اس کی چادر کو چھوا۔ محمود چیخ مار کر بیہوش ہو گیا۔

پردہ اٹھا اور سلیم نے دیکھا کہ بوڑھا فردوسی اسکی طرف آ رہا ہے۔ سلیم نے اسے پکڑ لیا۔ اور پوچھا۔ "اس عیاری کا کیا مطلب ہے؟"

بوڑھے حکیم نے ملامت بھرے الفاظ میں جواب دیا۔ "یہ وقت گفتگو کا نہیں ہے" اور غائب ہو گیا۔

(۷)

دوسرے دن صبح کو شہزادہ سلیم فردوسی کے مکان کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے ایک بہت بڑا ہجوم دیکھا۔ جس کے درمیان اسے فردوسی اور اس کا ملازم اجمل بھی دکھائی دیا۔ ان کو سپاہی گرفتار کر کے لئے جا رہے تھے۔ سلیم نے سوچا "شاید گزشتہ رات کا واقعہ کسی طرح معلوم ہو گیا ہے۔" لیکن دریافت سے معلوم ہوا کہ بادشاہ نے اسے محمود کے علاج کے لئے بلا بھیجا تھا۔ اس کے انکار پر سپاہی اسے گرفتار کر کے لئے جا رہے ہیں۔

سلیم بھی ان کے ساتھ روانہ ہوا۔ محل کے نزدیک مجمع منتشر ہو گیا۔ فردوسی بادشاہ کے روبرو لایا گیا سلطان سکندر بیگ محمود کے سرہانے کی طرف بیٹھا

تھا۔ امرا و وزرا ارد گرد کھڑے تھے۔ بادشاہ نے فردوسی کی طرف دیکھا اور ہاتھ پھیلا کر بولا "خدا کے واسطے میرے اکلوتے بچے کو بچا لو"۔

فردوسی آگے بڑھا۔ اور بولا "میں اس گنہگار کو نہیں بچا سکتا۔ یہ بھائی کا قاتل ہے"۔

بادشاہ نے کڑک کر کہا "یہ کیا بیہودگی ہے؟ تم جانتے ہو محمود میرا اکلوتا بچہ ہے"۔

فردوسی نے بہت اطمینان سے جواب دیا "میرا بھی اکلوتا بچہ تھا۔

آہ! بادشاہ سلامت ذرا غور فرمائیے یہ آپ کے گناہوں کی سزا ہے۔ آپ ایک بدنصیب شخص کی بیوی کو بھگا کر لے گئے تھے۔ اس کا گھر برباد ہو گیا۔ جب اس عورت کے ہاں اس کے پہلے خاوند کا بچہ پیدا ہوا تو آپ نے کمال مہربانی سے اُسے اپنا ولیعہد بنایا۔ یہاں تک تو خیر تھی۔ پھر یہ مار آستین پیدا ہوا۔ اس نے اپنے باپ سے بھی بڑھ کر سفاکی کی۔ اس نے اپنے بھائی کو قتل کیا۔ ابھی بیہوش ہے بہت جلد کیفر کردار کو پہنچیگا"۔

بادشاہ کا چہرہ زرد ہو گیا۔ وہ کانپ رہا تھا پسینہ کے بڑے بڑے قطرے اس کی پیشانی پر نمودار تھے۔ اس نے رکتی ہوئی آواز میں پوچھا "بتاؤ تم کون ہو؟"

فردوسی بڑی تمکنت سے بولا "میرا نام عزادار مرزا ہے۔ دلنواز میرا بیٹا۔ میرا جگر گوشہ تھا۔ میں نے اپنے بیٹے کا انتقام لے لیا ہے۔ محمود ابھی زندہ ہے۔ عنقریب بہت تکلیف سے جان دیگا"۔

امرا و وزرا حیران تھے۔ اچانک فردوسی نے اپنی جیب سے چاندی کے تاروں کا جال نکالا۔ اور اُسے اپنے چہرہ پر نقاب کی صورت میں پڑھا کر بولا "اس طرح میں نے انتقام لیا ہے۔ اب میرا کلیجہ ٹھنڈا ہے"۔

بادشاہ نے حیرت آمیز خوف سے کہا۔ دلنواز! یہ نقاب دلنواز کی شکل کا ہے۔ توبہ! اور چیخ مار کر بیہوش ہو گیا"۔

اتنے میں محمود نے آنکھ کھولی۔ اور ایک چیخ ماری۔ اس کے منہ سے نکلا۔

"دلنواز" اور وہ بے جان تھا!

بادشاہ اس کے بعد زیادہ عرصہ زندہ نہ رہا۔ مرنے سے چند روز پیشتر اس نے شہزادی عنبرہ کا عقد شہزادہ سلیم سے پڑھوا دیا۔ اور اپنی سلطنت بھی انہیں کو سونپی بڑھا فردوسی سلطان سلیم کا مشیر خاص بنا۔

معتصم

نغمے کی تخلیق

بہارِ خلد میں اک حور تھی شفق پیکر
کہ جس کا حسن نمونہ تھا دلکشی کے لئے
وہ خوش خرام تھی یکسر نگار خانۂ چین
بنا ہو جو چمنستانِ آذری کے لئے
فسونِ حسن کی وُہ دلفروز رنگینی
ہوئی ہو باعثِ غیرت جو سامری کیلئے
وُہ تھی اداؤں میں پروردۂ نگارِ ازل
ہر ایک شے نے سبق اُس سے دلبری کیلئے
مگر وہ دور بھی آیا کہ اس تسلسل میں،
وہ بیقرار ہوئی غم کی تازگی کے لئے
فرازِ عرش سے آئی زمینِ خاکی پر
کہ مضطرب تھی وہ لطفِ فتادگی کے لئے
ریاضِ دہر میں وُہ بیقرار ہو کے پھری
مزے تلاش میں اس نے کلی کلی کے لئے
اسی کی رُوح پہ یہ اضطراب طاری ہے
اسی کی رُوح سے نغموں میں بیقراری ہے

عابد

گورا

مصنفہ رابندرا ناتھ ٹیگور . . . . مترجمہ عبدالستار خاں

باب (۷) ساتواں

بی نتے نے صبح اُٹھ کر دیکھا کہ رات ہی کو بادل بالکل چھٹ گئے۔ سیاہ بادلوں کا کہیں نام و نشان بھی نہیں۔ البتہ سفید بادلوں کے چند ٹکڑے اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے تھے۔ صبح کی صاف شفاف روشنی چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ اور ایسی خوشنما معلوم ہوتی تھی۔ جیسے نومولود بچے کا ہنسنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔

بی نتے اپنے برآمدے میں کھڑا خوشنما منظر کا لطف اُٹھا رہا تھا۔ کہ اُسے پریش بابو اپنے ایک ہاتھ میں چھڑی اور دوسرے ہاتھ سے ستیش کا ہاتھ پکڑے ہوئے آہستہ آہستہ آتے ہوئے دکھائی دیے۔

جیسے ہی ستیش کی نگاہ بی نتے پر پڑی اس نے تالی بجائی۔ اور زور سے بی نتے کو آواز دی۔

پریش چندر نے بھی سر اُٹھا کر بی نتے کی طرف دیکھا۔

بی نتے فوراً نیچے اُتر آیا۔ اور انہیں راستہ ہی میں مل گیا۔

ستیش نے بی نتے کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "آپ نے اُس دن ہمارے ہاں آنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر آپ ابتک کیوں نہ آئے صاحب۔"

بی نتے ستیش کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگا

پریش بابو نے اپنی چھڑی میز سے لگا کر رکھ دی اور اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گئے۔ اُنہوں نے کہا۔ "اگر آپ اس روز یہاں نہ ہوتے تو ہماری بڑی درگت ہوتی۔ آپ نے ہم پر بڑا احسان کیا۔"

بی نتے نے کسی قدر لجاجت کے لہجہ میں "یہ آپ کیا فرماتے ہیں مَیں کس قابل ہوں۔ کہ احسان کروں۔ اس کا ذکر چھوڑتے۔"

ستیش بول اُٹھا۔ "بی نتے بابو! بی نتے بابو مَیں کتا ہوں۔ آپ کے یہاں کُتا نہیں۔"

بی نتے ہنس کر "نہیں تو مَیں نے کوئی کُتا نہیں پال رکھا۔"

ستیش "کیوں آپ کُتا نہیں پالتے۔"

بی نتے۔ مَیں کُتّا پالنا پسند نہیں کرتا۔

پریش بابو۔ مَیں نے سُنا ہے کہ اسی دن ستیش آپ کے یہاں آیا تھا۔ اُس نے آپ کو بہت دق کیا ہوگا۔ یہ بڑا بکی ہے۔ اسی لئے اس کی بہن نے اس کا نام بختیار خلجی رکھا ہے۔

بی نتے۔ مَیں بھی بہت باتیں کرتا ہوں اسی وجہ سے ہم دونوں میں خوب نبھتی ہے۔ کیوں ستیش بابو ہے نا۔

ستیش یوں بہت سی باتیں پوچھتا رہا۔ اور بی نتے جواب دیتا گیا۔ پریش بابو کہیں کہیں مُسکرا کر موقع موقع سے دو ایک لفظ کہہ دیتے تھے۔

رخصت ہونے وقت اُنہوں نے کہا کہ میرا مکان اسی سڑک پر داہنی طرف تھوڑے فاصلے پر ہے۔ مکان کا نمبر ۷۸ ہے۔

ستیش بیچ میں بول اُٹھا۔ اُن کو تو ہمارا مکان معلوم ہے۔ اس دن میرے ساتھ اپنے مکان کے دروازہ تک گئے تھے۔

یہ کوئی بات نہ تھی۔ کہ جس سے شرمندگی ہوتی تاہم بی نتے کچھ شرمندہ سا ہوا۔ اُسے کچھ ایسا معلوم ہوا کہ اس کی کوئی پوشیدہ بات ظاہر ہوگئی ہے۔

پریش بابو۔ ”آپ تو ہمارا مکان بھی دیکھ چکے ہیں جب آپ کو . . . . . “

بی نتے۔ اب اس کے کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ جب مجھے

پریش بابو۔ میرا اور آپ کا مکان تو ایک ہی محلہ میں ہے۔ لیکن ہماری ابتک ملاقات ہی نہ ہوئی۔

بی نتے پریش بابو کو سڑک تک پہنچا آیا اور اپنے پھاٹک پر کھڑا ہو کر انہیں دیکھنے لگا۔ پریش بابو ہاتھ میں چھڑی لئے ہوئے آہستہ آہستہ چلے جاتے تھے۔ اور اُن کے ہمراہ ستیش باتیں کرتا جاتا تھا۔ بی نتے اپنے دل میں کہنے لگا۔ ”پریش بابو جیسا نیک آدمی نہ دیکھا جی تو چاہتا ہے کہ اس کے قدموں کی خاک پیشانی پر مل لوں۔ ستیش بھی بڑا ذہین نکلے گا۔ اگر زندہ رہا تو بڑا عقلمند اور صاحب اقبال ہوگا۔ جیسا وہ ذہین ہے ویسا ہی ستودہ صفات بھی ہے۔“

یہ پیر مرد اور یہ لڑکا خواہ کتنے ہی نیک اور لائق کیوں نہ ہوں لیکن ان کی خوبیوں کا اندازہ اس ذرا سی ملاقات میں کر لینا کوئی آسان بات نہ تھی۔ مگر چونکہ بی نتے کی دلی کیفیت کچھ اور تھی۔ اس لئے اس نے ان کے متعلق اتنی جلدی ایسی رائے قائم کر لی۔

اس نے اپنے دل میں سوچا۔ کہ پریش بابو کے یہاں نہ جانا سخت بد اخلاقی ہے لیکن فوراً ہی گورا کے معنوی ہندوستان نے اسے بہوت سا کر دیا اور پکار کر کہا ”خبردار

وہاں ہرگز نہ جانا'

بی نے ہمیشہ اور ہر قدم پر اسی معنوی ہندوستان کے ہر اشارے پر سر تسلیم خم کیا کرتا تھا۔ جہاں کہیں اُسے شکوک اور اوہام ہوتے وہاں بھی اپنی رائے کو دخل نہ دیکر اطاعت ہی کو ترجیح دیتا۔ لیکن اب اس کی طبیعت میں غدر کا مادہ جوش زن ہونے لگا۔ اور اس ہندوستان کی وقعت اس کی نظروں میں بالکل موہوم سی ہوگئی۔

اتنے میں ملازم نے اطلاع کی کہ کھانا تیار ہے لیکن بی نتے نے آج اس وقت تک غسل بھی نہ کیا تھا اور وہ بارہ بج چکے تھے۔ اس نے گھر میں کھانا نہ کھانے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ اور ملازم سے کہہ دیا۔ کہ تم لوگ کھانا کھاؤ۔ میرا انتظار نہ کرنا۔ بغیر کاندھے پر پٹکہ ڈالے ہوئے چھتری لیکر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

اس نے سیدھا گورا کے گھر کا راستہ لیا۔ وہ جانتا تھا۔ کہ گورا اس وقت اہرسٹ اسٹریٹ میں جہاں ہندو حزب وطنی کا دفتر ہے گیا ہوگا۔ گورا روز دوپہر کو وہاں جاتا اور تیسرے پہر تک اس مجلس کے ممبروں کو جو مختلف مقامات میں ہیں خطوط لکھ کر اپنا وقت صرف کیا کرتا تھا۔ وہیں اس کے احباب اور ثنا خواں حضرات اُس کی تلقین اور نصیحت سُننے آتے اور اُس کو مدد دینے میں فخر کرتے۔

جب بی نتے گورا کے یہاں پہنچا تو گورا حسب امید دفتر گیا ہوا تھا۔ بی نتے اندر جا کر انندامائی کے کمرے میں جا کر کھڑا ہوا۔ اس نے ابھی کھانا کھانا شروع ہی کیا تھا۔ اور لچھمنیا پاس بیٹھی ہوئی پنکھا جھل رہی تھی۔ انندامائی نے حیرت سے کہا۔ کہو بی نتے کہاں سے آرہے ہو۔ اور کیسے آئے۔

بی نتے بیٹھ گیا اور جواب دیا۔ اماں جان بڑی بھوک لگی ہے کھانا کھلایئے

انندامائی نے گھبرا کر کہا۔ "تم نے بڑی مشکل میں ڈال رکھا ہے۔ کھانا پکانے والا برہمن تو چلا گیا اب تمہیں کون کھانا کھلائیگا؟"

بی نتے:- مجھے برہمن کے ہاتھ کا کھانا کھانا ہوتا تو میں اپنے گھر ہی نہ کھا آتا۔ میرے برہمن باورچی نے کیا قصور کیا تھا۔ میں تو ان کے ہاتھ کا کھانا کھاؤں گا۔ لچھمنیا ایک گلاس پانی تو لاؤ۔

لچھمنیا کے ہاتھ کا لایا ہوا پانی بی نتے نے پی لیا۔ انندامائی نے بڑی محبّت سے اپنے برتن کا تھوڑا سا کھانا ایک دوسری رکابی میں لیکر بی نتے کے سامنے رکھ دیا۔

بی نتے نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔

آج انندامائی کے دل کا غبار ہلکا ہوا۔ اور ان کو

خوش دیکھ کر بی نئے کو بھی بڑی مسرت ہوئی۔

کھانا کھانے کے بعد اننداماتی سینے بیٹھ گئی۔ بی نئے بھی اُن کے قریب اپنے ہاتھ پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ قریب کے کمرے میں کیوڑے کے پھول کتھا بسانے کے لئے رکھے تھے۔ اُن کی بھینی بھینی خوشبو آرہی تھی۔ بی نئے بیفکر لیٹا ہوا بچپنے کی سی باتیں کر رہا تھا۔

باب (۸) آٹھواں

اس قید کے ٹوٹتے ہی بی نئے کی طبیعت میں بغاوت کی نئی نئی لہریں اُٹھنے لگیں۔ جب وہ گورا کے یہاں سے چلا تو اس کی طبیعت بہت ہلکی معلوم ہوتی تھی۔ اور یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ گویا وہ ہوا میں اُڑ رہا ہے۔ بار بار اس کا جی چاہتا تھا۔ کہ لوگوں سے کہتا پھرے۔ کہ اس نے ان قیود کو بالآخر توڑ ہی ڈالا۔ جو اسے اب تک جکڑے ہوئے تھیں۔ اور جو اس کے لئے سوہان روح تھیں۔

وہ مکان نمبر ۷۸ کے پھاٹک کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ کہ اُس نے سامنے سے پریش بابو کو آتے ہوئے دیکھا۔

پریش بابو۔ "آیئے آیئے تشریف لایئے۔ بی نئے بابو! آپ کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔" یہ کہکر پریش بابو بی نئے کو ساتھ لئے ہوئے باہر کے کمرے میں داخل ہوئے۔

اس کمرے کا دروازہ سڑک کی طرف تھا۔ کمرہ میں ایک چھوٹی سی میز رکھی ہوئی تھی۔ اس کے قریب ایک نشست دار بنچ تھی۔ اور دوسری طرف دو بید سے بنی ہوئی کرسیاں رکھی تھیں۔ ایک دیوار سے حضرت مسیح کی رنگین تصویر لٹک رہی تھی۔ اسی کے مقابلہ میں دوسری دیوار پر کیشب چندر سین کا فوٹو آویزاں تھا۔ میز پر چند اخبار رکھے ہوئے تھے۔ ایک کونہ میں ایک الماری تھی۔ جس میں تھیوڈر پارکر کی تصنیفات صف میں سلسلہ وار رکھی تھیں۔

بی نئے بیٹھ گیا۔ اس کا دل خدا جانے کیوں دھڑک رہا تھا۔ اس کے دل میں خیال پیدا ہونے لگا کہ گویا کوئی پیچھے کے دروازے سے اندر آگیا ہے۔

پریش بابو نے کہا۔ "سوچترا ہر دوشنبہ کو میرے ایک دوست کی صاحبزادی کو پڑھانے جایا کرتی ہے اُن کے یہاں ستیش کا ہم عمر ایک لڑکا ہے۔ اس لئے وہ بھی اپنی ہمشیرہ کے ساتھ وہیں گیا ہوا ہے۔ میں ان کو پہنچا کر ابھی واپس آرہا ہوں۔"

اس خبر کے سنتے ہی بی نئے پر ایک سکون آمیز یاس سی طاری ہوگئی۔

پریش بابو سے وہ بے تکلفی سے باتیں کرنے لگا۔

باتوں ہی باتوں میں اُنہوں نے اس کا سب حال دریافت کر لیا۔ انہیں معلوم ہوگیا۔ کہ وہ یتیم ہے۔ اس کے چچا کسی گاؤں میں رہتے ہیں۔ اور جائداد کا انتظام کرتے ہیں۔ اس کے دو چچا زاد بھائی کلکتہ میں اس کے ساتھ پڑھتے تھے۔ ایک نے ہیضہ میں وہیں قضا کی۔ دوسرا آجکل اپنے یہاں کی ضلع کچہری میں وکالت کرتا ہے۔ اس کے چچا کی خواہش ہے۔ کہ وہ ڈپٹی مجسٹریٹی کے لئے کوشش کرے لیکن اس کی طبیعت اس طرف راغب نہیں ہے۔ اور وہ اپنا وقت زیادہ تر غیر منفعت بخش کاموں میں صرف کیا کرتا ہے۔ ان ہی باتوں میں قریب ایک گھنٹہ ختم ہوگیا بغیر کسی ظاہری سبب کے زیادہ دیر ٹھیرنا کج خلقی سمجھ کر بی نتے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور اجازت چاہی۔ اور جلتے جاتے کہا۔ کہ افسوس ہے کہ ستیش بابو سے ملاقات نہ ہوئی۔ وہ جب آئیں تو کہہ دیجئے گا کہ میں حاضر ہوا تھا"

"اگر آپ ذرا سا اور ٹھیر جائیں تو اُن سے بھی ملاقات ہو جائیگی۔ وہ لوگ آتے ہی ہونگے۔" پریش بابو نے جواب دیا۔ بی نتے کو محض ملاقات ہی کی غرض سے رُکتے ہوئے شرم سی معلوم ہوئی۔ اگر زور دیکر اصرار کیا گیا ہوتا تو وہ ضرور رُک جاتا لیکن پریش بابو کم سخن آدمی تھے۔ اور اُنکی عادت نہ تھی کہ لوگوں کو اُن کی مرضی کے خلاف روکنے کے لئے اصرار کریں۔ غرضکہ وہ اُن سے رخصت ہو کر باہر نکلا۔

چلتے وقت پریش بابو نے کہا "آپ تشریف لایا کیجئے۔ آپ کے آنے سے مجھ کو بہت خوشی ہوئی"

بی نتے کو کوئی خاص کام تو تھا نہیں۔ وہ اخبارات میں اکثر مضامین لکھا کرتا تھا۔ اس کی انگریزی کی بڑی تعریف ہوتی تھی۔ لیکن چند دنوں سے اس کی طبیعت مضمون نگاری میں بھی نہ لگتی تھی۔ جب کبھی وہ لکھنے بیٹھتا تو اس کے خیالات منتشر ہو جاتے۔ اور وہ اُکتا کر قلم رکھ دیا کرتا تھا۔ چنانچہ وہ بلا کسی ارادہ کے دوسری طرف آہستہ آہستہ جانے لگا۔

چند ہی قدم آگے بڑھا ہوگا کہ اس نے کسی لڑکے کی آواز سُنی۔ مڑ کر دیکھا کہ ستیش گاڑی سے سر نکالے ہوئے اُسے دیکھ رہا ہے۔ اور اُس کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ ساتھ ہی اس کو ساڑی اور قمیص کی سفید آستینوں کی جھلک دکھائی دی۔ جس سے یہ اندازہ کرنا کہ اندر کون بیٹھا ہوا ہے مشکل نہ رہ گیا۔

گاڑی کی طرف دیر تک ٹکٹکی لگا کر دیکھنا ہندوستانی رسم و رواج اور آداب مجلس کے خلاف ہے۔ چنانچہ بی نتے ادھر دیر تک نہ دیکھ سکا۔ لیکن ستیش فوراً ہی گاڑی سے کود پڑا۔ اور بی نتے کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا۔

"بی نتے بابو چلئے ہمارے گھر چلئے"

بی نتے نے کہا۔ "میں ابھی وہیں سے تو آرہا ہوں"

"میں تو گھر میں نہیں تھا۔ اس لئے آپ کو پھر چلنا ہو گا۔" ستیش نے اصرار کیا۔

ستیش کے اصرار کو بی نتے رد نہ کر سکا۔ ستیش اپنے اسیر کا ہاتھ پکڑے ہوئے گھر میں داخل ہوا۔ اور پکار کر کہا۔ "ابّا جان دیکھئے میں بی نتے بابو کو واپس لے آیا۔"

پریش بابو اپنے کمرے سے نکل آئے۔ اور مسکرا کر کہا۔ "اب تو بی نتے بابو آپ ایک زبردست کے پالے پڑے ہیں۔ اب آسانی سے آپ نہ بھاگ سکینگے۔ ستیش جاؤ اپنی ہمشیرہ کو بلا لاؤ۔"

ستیش نے جب اپنی ہمشیرہ کا ہاتھ پکڑے ہوئے کمرے میں قدم رکھا تھا۔ تو بی نتے کا دل دھڑکنے لگا تھا۔ پریش بابو نے کہا۔ "آپ کی سانس کیوں پھول رہی ہے ستیش حقیقت میں بڑا شریر ہے۔"

ان دونوں کے کمرے میں قدم رکھتے ہی پہلے تو بھینی بھینی خوشگوار خوشبو کی لپٹ آئی۔ اور پھر اس نے پریش بابو کو کہتے ہوئے سنا۔ "رادھا! دیکھو بی نتے بابو آئے ہیں۔ تم ان کو جانتی ہو نا۔"

بی نتے نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سوچترا نے اس کو سلام کیا۔ اور سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس مرتبہ بی نتے سلام کا جواب دینے سے نہ چوکا۔

"جی ہاں۔ بھلا میں بی نتے بابو کو نہ پہچانوں گی۔"

سوچترا بولی۔ "آپ چلے جا رہے تھے۔ جیسا ہی ستیش نے آپ کو دیکھا۔ گاڑی سے کود پڑا۔ اور آپ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ بی نتے بابو غالباً آپ کسی کام سے کہیں تشریف لیے جا رہے تھے۔ آپ کا حرج تو بالکل نہیں ہوا۔"

بی نتے کو یہ امید نہ تھی کہ سوچترا خود اس سے باتیں کریگی۔ وہ بہت متحیر ہوا۔ اور جلدی میں جواب دیا۔ "نہیں تو مجھے کوئی کام نہ تھا۔ مجھے کچھ تکلیف نہیں ہوئی۔"

ستیش نے اپنی بہن کا پلو کھینچ کر کہا۔ "آپا جان چابی تو دیجئے۔ میں بی نتے بابو کو اپنا ارگن دکھلاؤنگا۔"

سوچترا نے ہنس کر کہا۔ "تم نے اپنی بکواس شروع کر دی۔ بختیار خلجی کے دوستوں کو کبھی ارگن نہیں مل سکتا۔ ان کی پریشانیاں ارگن سننے سے شروع ہوں گی۔ اور پھر ان کی انتہا نہیں رہ جائیگی۔ بی نتے بابو میں آپ کو بتلائے دیتی ہوں۔ کہ آپ کے دوست کی داستان درازیاں ایسی نہیں جنہیں آپ برداشت کر سکیں۔"

بی نتے سوچترا کی طرح بے تکلفانہ انداز میں جواب دینے سے قاصر تھا۔ اس نے اپنے دل میں تہیہ کر لیا کر لیا تھا۔ کہ اسی طرح اس کا جواب دے۔ مگر اس کے منہ سے پورا جملہ ادا ہی نہ ہو سکا۔ "نہیں نہیں۔۔۔ آپ نا۔۔۔ مجھ کو اس سے خوشی ہوتی ہے۔"

ستیش اپنی بہن سے چابی لیکر ارگن لے آیا۔ یہ ایک

کا نچ کا صندوقچہ تھا اس کے اندر ریشمی پردے لگے ہوتے ہوتے تھے اور ان پر ایک چھوٹی سی کشتی جمی ہوئی تھی۔ جب چابی دی جاتی تو یہ کشتی اُن پردوں پر سرک سرک کر اپنا دباؤ ڈالتی۔ اور اُن سے نہایت سُریلی اور دلکش آواز نکلتی تھی۔

ستیش کی نگاہیں کبھی کشتی پر اور کبھی بی نتے کے چہرہ پر پڑتی تھیں۔ ارگن کو بجتے ہوئے دیکھ کر بہت خوش ہوتا۔ اور اپنی خوشی کا اظہار بی نتے کو دیکھ کر رہا تھا۔

ستیش کی موجودگی سے بی نتے کو یہ فائدہ ہوا کہ اُس کا حجاب آہستہ آہستہ ٹوٹ گیا۔ اور وہ سوچترا سے آنکھیں ملا کر بے تکلفی سے باتیں کرنے لگا۔

تھوڑی دیر میں لیلا جو پریش باؤ کی سب سے چھوٹی لڑکی تھی۔ آئی اور کہا۔ "چلئے آپ لوگوں کو اماں جان کوٹھے پر بُلا رہے ہیں۔

باب (۹) نواں

بالاخانہ پر چھجّے کے سامنے والے دالان میں ایک میز سفید میز پوش سے ڈھکی ہوئی بچھی تھی۔ اس کے چاروں طرف قرینہ سے کرسیاں جمی ہوئی تھیں۔ باہر پھولوں کے گملے ایک قطار میں رکھے ہوتے تھے۔

اس دالان سے سڑک کنارے کے درختوں کی پتیہ سے دھلی ہوئی چمکدار سبز پتیاں دکھائی دیتی تھیں۔ چھجّے کے ایک کونہ پر غروب ہونے والے آفتاب کی زرد اور طلائی شعاعیں پڑ رہی تھیں۔

جب پریش باؤ بی نتے کو ساتھ لیتے ہوئے اُوپر آئے تو وہاں کوئی نہ تھا۔ چند منٹ کے بعد ستیش ایک کتّا لیے ہوئے آپہنچا۔ اس کتّے میں جتنی کراماتیں تھیں۔ وہ سب بی نتے کو دکھلائی گئیں۔ اُس نے اپنا ایک پیر اُٹھا کر سلام کیا۔ سر جُھکایا اور اپنے پچھلے پیروں پر بیٹھ کر اگلے پیر اُٹھا کر بسکٹ کے ٹکڑے مانگے۔ غرضیکہ کتّے نے جو کچھ کیا۔ اور جو اس کی تعریف کی گئی اُن سب کا ستیش اپنے آپ کو مستحق سمجھ کر مارے خوشی کے پھولا نہ سماتا تھا۔ کتّا ان تعریفوں کی کچھ پروا نہ کرتا تھا۔ اس کا خیال تو بسکٹ کے ٹکڑے کی طرف تھا۔

پاس کے کمرے سے لڑکیوں کی باتیں کرنے اور ہنسنے کی دلکش آوازیں سُنائی دیتی تھیں۔ انہی آوازوں کے ساتھ کبھی کبھی کسی مرد کی آواز بھی سُنائی دیتی تھی۔ اِن مسلسل اور خوشگوار و دلکش آوازوں کے نغمہ سے بی نتے کے دل میں ایک لطیف خوشی کی لہر پیدا ہوئی جو رقابت کے درد سے بھی مملو تھی۔ اپنی عمر میں غریب بی نتے کو کبھی لڑکیوں کو اس طرح کلیلیں کرتے ہوئے

دیکھنے کا اتفاق ہی نہ ہوتا تھا۔ یہ کلیلیں اسقدر فربہ ہو رہی تھیں کہ بی نیئے کے تمام خیالات انہی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اور وہ ستیش کی باتیں بالکل نہ سن سکا۔

اتنے میں پریش بابو کی بیوی اپنی تینوں لڑکیوں کو لئے ہوتے وہاں آن پہنچی۔ ان کے ساتھ انکا کوئی دور کا رشتہ دار بھی تھا۔ پریش بابو کی بیوی کا نام بارودا تھا۔ اور اس کا سن کم نہ تھا۔ دیکھنے ہی سے یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس نے بڑی احتیاط سے اپنے کپڑے پہنے ہیں۔

اس نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ نہایت سادگی سے گزارا تھا۔ لیکن بعد میں اسے یکایک نئی روشنی کے اثر سے یہ خواہش پیدا ہوئی۔ کہ وہ بھی اسی سوسائٹی میں شریک ہو جائے۔ اسی وجہ سے اس کی ساڑی میں چلتے وقت شکن پڑتی تھی۔ اور اس کے اونچی ایڑی کے جوتوں سے زور زور کی آواز آتی تھی۔ اسے برہمو سماجی اور غیر برہمو سماجی کا امتیاز ہر جگہ قائم رکھنے کا بڑا خیال رہتا تھا۔ اسی وجہ سے اس نے سوچترا کے اصلی ہندوانی نام رادھارانی کو تبدیل کر کے سوچترا رکھا تھا۔

اس کی بڑی لڑکی کا نام لیبونیا تھا۔ وہ بہت موٹی اور ہنس مکھ تھی طبیعت زینت پسند تھی۔ اور بہت باتیں کرتی تھی۔ اس کا چہرہ گول تھا۔ گال ابھرے ہوئے اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ رنگ سانولا تھا۔ کپڑے پہننے اور بناؤ سنگار کرنے میں کچھ لاپرواسی تھی۔ لیکن اس کی ماں کو اس کا بہت خیال رہتا تھا۔ وہ اونچی ایڑی کا جوتہ پہننا ناپسند کرتی تھی۔ لیکن ماں کا اصرار اور حکم ایسا تھا کہ بغیر پہنے چارہ نہ تھا۔ ماں کو اس کا اتنا خیال رہتا کہ وہ خود اس کے چہرہ پر غازہ ملتی اور پوڈر لگاتی تھی۔ بغیر پوڈر لگاتے ہوئے اُسے باہر ہوا خوری کو نہ جانے دیتی تھی۔ جب وہ کپڑے پہن کر باہر نکلتی تھی تو اس کے موٹاپے کی وجہ سے کپڑے بدن پر غلاف کی طرح تنگ ہو کر لپٹ جاتے۔ اور معلوم ہوتا کہ گویا کسی لکڑی کے کندے کو غلاف پہنا دیا گیا ہے یا پریس سے کوئی گٹھا دبا کر نکالا گیا ہے۔

منجھلی لڑکی کا نام للیتا تھا۔ اُس کو اپنی بڑی بہن سے کچھ بھی مناسبت نہ تھی۔ قد لمبا تھا۔ بدن چھریرا۔ رنگ کچھ کالا تھا۔ سنجیدہ مزاج اور کم سخن تھی۔ اُسے اپنی طبیعت پر بڑا قابو تھا۔ لیکن موقع بموقع چست فقرے کہہ جاتی تھی۔ اُس کی ماں کو ہمیشہ خیال رہتا تھا کہ کہیں اُسے غصہ نہ آ جائے۔

چھوٹی لڑکی کا نام لیلا تھا۔ اُس کی عمر دس گیارہ سال کی تھی۔ بڑی شریر تھی۔ ہمیشہ ستیش سے لڑا کرتی تھی۔ ان

دونوں کے جھگڑے کی جڑ ان کا کُتّا تھا اگر کُتّے سے پُوچھا جاتا کہ تو کس کے پاس رہنا چاہتا ہے۔ تو شاید وہ دونوں میں سے ایک کو بھی پسند نہ کرتا۔ کہیں اُس کا رجحان ہوتا بھی تو شیش کی طرف ہوتا کیونکہ اس کی تعلیم وہ کسی نہ کسی طرح برداشت کر سکتا تھا لیکن لیلا کا پیار بالکل ناقابلِ برداشت تھا۔

جب بارودا وہاں آئی تو بی نتے کھڑا ہو گیا۔ اور ادب سے اس نے سلام کیا۔ پریش بابو نے ان الفاظ کیساتھ اس کا تعارف کرایا۔" یہی ہمارے وہ کرمفرما ہیں جن کے مکان اس دن . . . . "

اس اظہار تشکر کو دیکھ کر بی نتے کچھ محجوب سا ہو گیا اور جواب نہ دے سکا۔

اس کا تعارف اس نوجوان سے بھی کرایا گیا جو لڑکیوں کے ساتھ تھا۔ اس کا نام سدھر تھا۔ اور بی۔ اے میں پڑھتا تھا۔ وہ خوشرو جوان تھا۔ گو رانگ چشمہ لگاتا تھا مونچھیں ترشی ہوئی چھوٹی چھوٹی تھیں۔ طبیعت بڑی چلبلی پائی تھی۔ وہ ایک منٹ بھی نچلا نہ بیٹھ سکتا تھا۔ لڑکیوں کو ستانے اور ان سے مذاق کرنے میں اُسے بڑا لطف آتا تھا لڑکیاں اس پر جھنجلاتیں اور خفا ہوتیں مگر پھر بھی انھیں اپنے سدھر کے بغیر چین نہ تھا۔ یہ حضرت اُن کا سب سامان بازار سے لا دیتے۔ اور ان کے ساتھ سرکس اور چڑیا گھر وغیرہ کو جایا کرتے تھے سدھر کی لڑکیوں سے یہ بے تکلفیاں اور یہ اختلاط دیکھ کر بی نتے کو کچھ غُصّہ آیا۔ اور نفرت سی ہوئی۔ لیکن فوراً ہی اس کے دل میں رقابت پیدا ہونے لگی۔ جس سے غُصّہ کم ہو گیا اور نفرت زائل ہو گئی۔

" مجھ کو کچھ ایسا خیال ہوتا ہے کہ میں نے آپ کو برھمو سماج مندر میں دو ایک مرتبہ دیکھا ہے۔" بارودا نے ازراہ تعارف کہا۔

بی نتے کو کچھ ایسا معلوم ہوا کہ گویا وہ کسی جرم کا ارتکاب میں پکڑا گیا ہے۔ اس لئے کچھ محجوب ہو کر اُس نے جواب دیا۔" جی ہاں دو ایک مرتبہ میں کیشب بابو کا وعظ سُننے گیا تھا۔

بارودا۔" غالباً آپ کالج میں پڑھتے ہیں"

بی نتے۔ جی نہیں۔ میں کالج چھوڑ چکا ہوں۔

بارودا۔ آپ نے کہاں تک پڑھا ہے۔

بی نتے۔ میں نے ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا ہے۔

اس لائق لڑکے کو دیکھ کر بارودا کے دل میں اس کی عزت کا احساس پیدا ہو گیا۔ اور ساتھ ہی اُسے اپنے لڑکے کی یاد آ گئی۔ اس نے ایک آہ سرد کھینچی اور پریش بابو کی طرف دیکھ کر کہا۔" آج اپنا منو بھی ایم۔ اے ہو جاتا۔ افسوس اُس کی زندگی اتنی ہی تھی۔"

بارودا کا پہلا لڑکا منورنجن ۹ برس کی عمر میں مرگیا تھا۔ لیکن جب کبھی وہ سُنتی کہ کسی نوجوان نے اعلےٰ امتحانات پاس کئے ہیں۔ یا کسی کو کوئی اچھی ملازمت ملی ہے یا جب اُسے معلوم ہوتا کہ کسی نے کوئی نئی کتاب تصنیف کی ہے۔ تو یہ کہا کرتی تھی کہ اگر میرا منو زندہ ہوتا تو وہ بھی یہی کرتا۔ غرضیکہ اس کے بعد اب وہ ہمیشہ اس بات میں کوشاں رہتی تھی کہ ہر موقع پر اپنی لڑکیوں کی خوبیوں سے لوگوں کو مطلع کرتی رہے اور ہمیشہ اُن کی تعریف کے گیت گایا کرتی تھی لوگوں سے کہا کرتی۔ کہ میری لڑکیاں پڑھنے کی بڑی شوقین ہیں۔ سینا پرونا اور کشیدہ کاڑھنا بہت اچھا جانتی ہیں۔ اس نے یہی بی نتے کے بھی ذہن نشین کرانے کی کوشش کی۔ اور یہ بھی کہہ دیا۔ کہ اُن میم صاحبہ نے جو اس کی لڑکیوں کی نگران کار ہیں۔ ان کی بڑی تعریف کی ہے۔ اور اُن کی اعلےٰ خوبیوں کی بہت زیادہ ثناخواں ہیں۔ لڑکیوں کے سکول میں جس دن انعام تقسیم ہونے والا تھا۔ اُس دن لفٹنٹ گورنر اور ان کی میم صاحبہ بھی وہاں تشریف فرما تھیں۔ اُن کو ہار پہنانے کے لئے لیبونیا ہی کو منتخب کیا گیا تھا۔ اور جو تعریف لیبونیا کی لفٹنٹ گورنر کی میم صاحبہ نے کی تھی بعینہٖ اُنکے وہی الفاظ بی نتے کو سُنائے گئے۔

آخر کار اُس نے لیبونیا سے کہا۔ "بیٹی جاؤ تو اپنا وہ کشیدہ لاکر بی نتے بابو کو دکھاؤ جس کے لئے تمہیں انعام ملا تھا"

لیبونیا نے کئی مہینے محنت کرکے اپنی گورنس کی مدد سے ایک طوطے کی تصویر کاڑھی تھی۔ اس تصویر کے کاڑھنے میں سب سے زیادہ مدد اسکی گورنس کی تھی۔ اور اصل میں اسی کے ہاتھ کا کام زیادہ تھا۔ مگر ہر آنے جانیوالے کو یہ طوطا ضرور دکھایا جاتا تھا۔ پہلے اس نمائش پر پریش بابو اکثر اعتراض کیا کرتے تھے لیکن جب اُنھوں نے دیکھا کہ اُن کے اعتراض کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے تو خاموش ہوگئے۔ بی نتے اس طوطے کو غور سے دیکھ کر اپنی حیرت اور قدردانی کا اظہار کر رہا تھا کہ ملازم نے پریش بابو کو ایک رقعہ لاکر دیا۔ پریش بابو رقعہ دیکھ کر خوش ہوگئے۔ اور ملازم سے کہا۔ اُنکو یہاں لے آؤ۔

بارودا۔ کون صاحب آئے ہیں۔

پریش بابو۔ میرے ایک پرانے دوست کرشن دیال بابو کے صاحبزادے مجھ سے ملنے آئے ہیں۔

یہ سُنتے ہی بی نتے کا دل دھک سے رہ گیا۔ اور چہرہ زرد ہوگیا۔ لیکن وہ اس خیال سے کہ گورا ان لوگوں کو حقارت سے دیکھیگا۔ اور ان کے متعلق کوئی اچھا خیال قائم نہ کرے گا۔ ان کی طرفداری کرنے کی غرض سے سنبھل بیٹھا۔

(باقی دارد)

پریشانِ تمنّا

میں کہ تھا اِک عمر تک سرمایہ دارِ آرزو
میں کہ مُدت تک رہا ہوں کامگارِ آرزو

آرزو ہی آرزو میں عمر گذری اس طرح
آرزو تھی مجھ پہ قرباں، مَیں نثارِ آرزو

میری ہستی اس طرح پامالِ مایوسی نہ تھی
رات دن رہتا تھا میں امیدوارِ آرزو

تھیں کبھی سر سبز میری آرزو کی کھیتیاں
آبیاری کرتا تھا ابرِ بہارِ آرزو

کامیابِ آرزو میرا دلِ ناشاد تھا
آرزوؤں کا بھرا گھر بھی کبھی آباد تھا

یاد آیا ہے کہ تھا دل میں نہ مایوسی کا نام
دل بھی تھا وقفِ مسرت اور میں بھی شادکام

مَیں کلیجے سے لگا لیتا تھا ہو کر مضطرب
جب کوئی تازہ تمنّا کرتی تھی آکر سلام

گرم رہتی تھی ہمیشہ خلوتِ راز و نیاز
رات دن میری تمنّائیں تھیں مجھ سے ہمکلام

دیکھ کر مجھ کو ہمیشہ تشنہ کامِ آرزو
خود۔ مجھے فطرت پلاتی تھی تمنّاؤں کے جام

رات دن رہتا تھا دل میں اضطرابِ آرزو
اور مَیں ہر وقت مخمورِ شرابِ آرزو

مَیں وہی اب ہوں کہ ہوں منّت کشِ صد اضطراب
مَیں وہی اب ہوں کہ ہر صورت سے ہوں خانہ خراب

اب کہاں وہ آرزو کا جلوۂ حسن آفریں
اب کہاں زلفِ تمنّا کا وہ دل میں پیچ و تاب

اب کہاں آغوش میں میری عروسِ آرزو
اب کہاں کاشانۂ دل میں تمنّا بے نقاب

اب کہاں وہ کیف افزا آرزوؤں کا ہجوم
مَیں بھی افسردہ ہوں اب دل بھی ہے وقفِ اضطراب

آرزوئیں مٹ چکیں، دل وقفِ حرماں ہو گیا
ہائے کیسا میری بربادی کا ساماں ہو گیا

خیر جو کچھ آج تک ہونا تھا وہ تو ہو چکا
سوگ اب میں کیوں مناؤں حسرتِ ناکام کا

یاد میں ماضی کی اب کیوں موردِ آلام ہوں
کیوں کروں میں فکرِ مستقبل میں دل کو مبتلا

حال سے قطعِ نظر کر لوں یہ ممکن ہے ابھی
دل کو سمجھا لوں میں اپنے، ترک کر دوں مدعا

کیا ملے گا مجھ کو بن کے سوگوارِ آرزو
سُن لے اے داغِ تمنا! میرے دل کا فیصلا

اب تری دل سوزیاں وجہِ شکیبائی نہیں
دُور ہو تو دل سے، میں تیرا تمنائی نہیں

راز

مہرِ درخشاں کی قسم

بارہا کھائی ہو جس نے لبِ جاناں کی قسم
خضر کھاتے ہیں یہ کیا چشمۂ حیواں کی قسم

آج تو مُنہ لبِ ساغر سے بھڑا دے میرا
ساقیا تجھ کو مری سستئ پیماں کی قسم

زعفراں زارِ مسرت ہے مری کشتِ امید
تیری تقریر سے تیرے لبِ خنداں کی قسم

عالمِ حسن میں یکتا ہے ترا جلوۂ نور
ماہِ تاباں کی قسم مہرِ درخشاں کی قسم

آج تک یاد ہیں صدمے جو دئے تھے تُو نے
اے ستمگار تری کثرتِ احسان کی قسم

نُزہتِ خُلد نے اے نامۂ جاناں تیری
بارہا کھائی ہے دلچسپیٔ عنواں کی قسم

سُن کے انکار مرا ہجر میں کیا کیا حسرت
ساغرِ مے نے دلائی لبِ جاناں کی قسم

حسرت

مرسلہ بیگم حسرت موہانی

نوائے خونیں

میں قتیلِ حسنِ ازل ہوں کیا تجھے مجھ سے بلبل زار ہے؟
تو ہوا اور نشیمنِ شاخِ گل مرا شاخسار تو دار ہے

کہوں کس سے میں کہ کھٹک رہی ہے بہار میری نگاہ میں؟
کروں کس سے میں یہ بیاں کہ گل بھی مری نگاہ میں خار ہے!

وہ قدم اٹھا کے رکھیں جہاں میں بچھاؤں دیدہ و دل وہاں
مجھے اُن پہ کتنا غرور ہے مرا اُن سے کتنا وقار ہے

وہ خوشی کا عہد گزر گیا وہ زمانہ خواب و خیال ہے
نہ وہ ہم رہے نہ وہ تم رہے نہ وہ رنگ لیل و نہار ہے

یہ کہاں تھی شرطِ وفا تم آئے بھی اور خموش گزر گئے
یہی پوچھتے کہ یہ مٹ رہا سر راہ کس کا مزار ہے

نہ وہ دل رہا نہ وہ غم رہا نہ وہ آرزوؤں کا جوش ہے
نہ چمن رہا نہ خزاں کا ڈر نہ امیدِ فصلِ بہار ہے

حامد

آئینۂ مجاز

ذہن ہے حیرت آفریں قدرتِ حق کے راز میں
عقل کو دخل ہی نہیں مرضیِ کارساز میں

چیں بجبیں بہت ہوتے سُن کے وہ عرضِ مدّعا
پڑ گئی بے طرح شکن اُن کی جبین ناز میں

کاوشِ الفتِ بتاں وجہ سکونِ دل ہوئی
جلوۂ حق تھا کارگر آئینۂ مجاز میں

طولِ شکیب کی نہ تاب تھی دلِ بیقرار کو
پھنس گیا اُن کی زلف کے سلسلۂ دراز میں

آتے اجل کسی طرح فیصلۂ حیات کو
کاہشِ آرزو غضب ہے دلِ بے نیاز میں

میری حدیثِ غم کو وہ سُن نہ سکے کسی طرح
یعنی بلا کا درد تھا قصّۂ جانگداز میں

وصل بھی ہو تو کیا مزا جب نہ حواس ہوں بجا
جب نہ گزر ہو عقل کا اُن کی حریم ناز میں

اُن کی نشیلی آنکھ نے بیخود و مست کر دیا
یعنی بلا کا کیف تھا نرگس نیم باز میں

اظہرِ بد نصیب کا ورد یہی ہے رات دن
موت جو آئے ایخدا آئے رہِ حجاز میں

اظہر

تبصرہ اشاعات جدید

افادات مہدی۔ ایم مہدی حسن مرحوم افادی الاقتصادی (جنہیں مرحوم لکھنے کو جی نہیں چاہتا) کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ جسے بیگم مہدی نے گورکھپور سے شایع کیا ہے مجموعہ ۵۰ سو پچاس صفحات پر ختم ہوا ہے۔ اول سے لیکر قیمت تک کوئی صفحہ ایسا نہیں، جو ادب عالیہ کہلانے کا حقدار نہ ہو۔ مضامین کے موضوع تمامتر ادب کے انتہائی عروج کے مظہر ہیں۔ اور جو اہل نظر مرحوم کے مضامین سے مذاق سلیم کی تشنگی کو سیراب کرتے رہے ہیں۔ ان کے سامنے اس کتاب کی شستہ ورفتہ زبان، شوخ کلامی، سلیس عبارت، ندرت ادائے مطالب اور موقع بموقع ظرافت کے چٹخاروں کی تعریف کرنا تحصیل حاصل ہے۔

حسن انشا کی اعلیٰ تریں ادامیں علمی مضامین کے مختلف شعبوں کو روشناس کرایا گیا ہے۔ جن سے اردو دنیا بالکل نامانوس تھی۔ "مولنا شبلی کے ساتھ آدھ گھنٹہ" "نقاد پر ایک غیر متناسبی جنبش لب" "جدید ایرانی شاعری" "تمدن عرب" "تنقیدات عالیہ" ایسی کامیاب علمی اور تخیلی تصاویر ہیں، جن کی مثالیں آجتک صرف انگریزی ہی میں دیکھنے میں آتی رہی ہیں۔ تحریر میں اس قسم کی مخلوط شیرینی ہے جس کو فصاحت وبلاغت کے موجودہ ومقررہ اصول سے جانچنا یقیناً مرحوم کی روح پر ظلم ہوگا۔ یہ کتاب اُسی قسم کی اُردو کے باقیات الصالحات میں سے ہے جسے اُردو ادب کے عناصر خمسہ۔ سرسید۔ نذیر احمد۔ حالیؔ شبلیؔ اور آزاد رواج دے گئے تھے۔ وہ تصنع اور تکلف جو مروجہ ادب کی امتیازی خصوصیت ہے۔ اور جو نفاست تو ضرور لئے ہوئے ہے۔ مگر زبان کی حقیقی سادگی اور شیرینی سے عاری سا ہے۔ اس مجموعے میں کہیں نہیں پایا جاتا۔

لیکن کتاب میں سب سے زیادہ دلچسپ وہ مضامین ہیں جنہیں اردو ادب کے مشاہیر کی دماغی تاریخ لکھنا چاہئے مرحوم نذیر احمد۔ حالی شبلی اور آزاد سے ذاتی طور پر واقف ہیں اور ضمناً جس انداز میں مشاہیر مذکورہ کی سیرت کا تذکرہ کرتے ہیں وہ حسن ادا کا کامیاب تریں نمونہ ہے۔ اس قسم کے مضامین قوم کے ادبی اور تمدنی ارتقا کی ایک مجمل تاریخ ہوا کرتے ہیں کیونکہ مصنف انہیں خود ذاتی مشاہدات وتجربات کی بنا پر سپرد قلم کرتا ہے۔ وہ اس وقت اور نمایاں اصناف ادب میں دب جاتے ہیں لیکن بعد ازیں ایک وہ دور بھی آتا ہے جب زمانہ ایسے مشاہیر کے حالات کو انتہائی کوشش سے دریافت کرتا ہے۔ اور ان کے مضامین کو آنکھوں سے لگاتا ہے۔

اس سے پہلے یہ جواہر مختلف رسائل میں بکھرے پڑے

تھے جنہیں اب بیگم مہدی نے ایک جگہ ترتیب دیدیا ہے۔ اور اب انکی آب و تاب کا اور ہی عالم ہے۔ شروع میں مولانا عبدالماجد بی۔ اے "مصنف فلسفۂ جذبات" کا ایک مختصر دیباچہ ہے۔ جس کے بعد بیگم مہدی کے قلم سے مرحوم کی زندگی کے کچھ ادبی سوانح کا تذکرہ ہے۔ کہیں کہیں شوخ کلامی حدود سے متجاوز ہو کر عریاں جذبات نگاری کی حد تک پہنچ گئی ہے لیکن ان میں بھی ایک حسن ہے۔ اور ابتذال کا نام تک بھی نہیں۔ یہ امر اور چند اسی قسم کی معمولی فروگذاشتیں ہیں مگر یہ تقاضائے بشر بہت ہے۔ اور اس سے کتاب کی قدر و قیمت میں کوئی فرق نہیں آسکتا۔

ادبی چاشنی اور محاوروں کی لذت کتاب کے بین السطور میں روح رواں کی طرح ساری و جاری ہے۔ اور جس طرح مرحوم نے علمی مضامین کے خشک مواد کو عوام کے لئے ادب کی خوشگواری میں خلط ملط کر دیا ہے۔ اس کی نظیر بہت کم نظر آتی ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔ یہ وہی مہدی حسن تو ہیں جن کی نسبت شبلی ایک خط میں رقمطراز ہیں۔

"کاش اس قسم کی اُردو شعر العجم کے لکھنے والے کو نصیب ہوتی"۔

کتاب نہایت اعلٰے دبیز کاغذ پر خوشخط شائع کی گئی ہے۔ اور بیگم مہدی، محلہ بسنت پور، گورکھپور سے حاصل کیجا سکتی ہے۔ قیمت درج نہیں۔

بنگال میں اُردو کے رسالے

جادو یہ ماہوار رسالہ اپنی اوّلیت اور اپنی مخصوص خوبیوں کے لحاظ سے اپنے بنگالی معاصرین میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ بنگال کی اُردو کا اپنی نشو و ارتقا کے اولین ایام میں ایک ایسے رسالے کا پیدا کرنا اُس کے مستقبل کی نسبت ایک نیک شگون ہے۔ اس رسالے نے اپنی گیارہ مہینوں کی گذشتہ زندگی میں نہ صرف زبان اُردو کی نشر و اشاعت کی خدمت انجام دی ہے بلکہ اُسکے علمی ادبی ذخیرے میں بھی ایک معتدبہ اضافہ کیا ہے۔ "اسلام اور فنون لطیفہ" جو متعدد اشاعتوں میں بالاقساط شائع ہوتا رہا ہے۔ مفید معلومات اور لطیف طرز انشا کا ایک اعلٰے نمونہ ہے۔ اور آسکر وائلڈ کے اخلاقی اقوال زرین حروف میں لکھنے کے قابل ہیں۔ تقطیع ۱۸×۲۲ ۱/۸ ۔ قیمت سالانہ دو روپے چھ آنے مع محصولڈاک۔ ملنے کا پتہ دلکشا رمنا ڈھاکہ۔

الرفیق مضامین متفرقہ کا مجموعہ ہے جن میں سے اکثر و بیشتر مضمون علمی و اخلاقی ہوتے ہیں۔ اور بالخصوص عربیت اور عربی علم و ادب کے متعلقات کا عنصر غالب ہے۔ اپنے مخصوص حلقۂ اثر میں ایک کامیاب رسالہ ہے کتابت و طباعت گوارا ہے۔ سالانہ چندہ عوام سے چار روپے۔ روسا و اُمرا سے چھ روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ نمبر ۱۵۔ جوگی پاڑہ۔ باقی لین۔ مانک تلہ روڈ۔ ڈاکخانہ شملہ۔ کلکتہ

جائنٹ ایڈیٹر

(مفید عالم پریس لاہور میں باہتمام لالہ لبھا رام پروپرائیٹر کے چھپا اور دارالاشاعت ادب لطیف کے لئے ایم محمد اسمٰعیل کھیسہ پبلشر و پروپرائیٹر نے چیمبرلین روڈ لاہور سے شائع کیا)

ادبِ لطیف

مندرجہ ذیل تصانیف کاغذ نفیس کتابت و طباعت دلفریب اور ٹائیٹل نہایت خوشنما ہیں

بازارِ حسن ملک کے مشہور افسانہ نویس منشی پریم چند کا وہ بے نظیر ناول جو ملک کے نامور اخبارات و رسائل اور انشاپردازوں سے داد و تحسین حاصل کر چکا ہے + ایک حسین اور نازو نعم میں پلی ہوئی لڑکی کی سرگذشت جسے حالات و کیفیات نے بازارِ حسن کی زینت بنا دیا + پلاٹ کی عمدگی۔ اشخاص قصہ کی سیرت۔ اندازِ تحریر نازک مطالعہ فطرت اور اعلیٰ خیالات کے لحاظ سے ادب اردو کا بہترین ناول۔ رسالہ ہمایوں اس کے متعلق لکھتا ہے اس میں حسن و عشق کے معرکے سلیس زبان میں دکھائے گئے ہیں + رسالہ نگار لکھتا ہے۔ یہ ناول اپنے موضوع کے لحاظ سے بہت مفید اور پلاٹ کے لحاظ سے نہایت دلچسپ ہے" رسالہ دین و دنیا لکھتا ہے۔ اگرچہ منشی پریم چند مختصر افسانے لکھنے میں کمال رکھتے ہیں۔ مگر یہ طویل ناول نہایت خوب لکھا ہے"۔ اخبار مدینہ لکھتا ہے۔ منشی صاحب کی محنت قابلِ داد ہے" قیمت حصہ اول ایک روپیہ چار آنے (عہ) حصہ دوئم صرف .. .. .. (عہ)

شیخ حسن ایک نہایت دلچسپ اور جدید رنگ کا ناول جسے ہندوستان کے نامور انشاپرداز جناب مولوی سید ممتاز علی صاحب نے ایک انگریزی کتاب سے اخذ کیا ہے + شیخ حسن کی دردناک داستان۔ رشیدہ کا الم ناک انجام اور عالم ارواح کا بیان + روزانہ زمیندار اس کے متعلق لکھتا ہے۔ ناول کے مختلف کیرکٹر نہایت خوبی و خوش اسلوبی سے دکھائے گئے ہیں" رسالہ زمانہ لکھتا ہے" یہ ناول ملک کے مشہور انشاپرداز کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے" رسالہ نگار لکھتا ہے" کتاب بے انتہا دلچسپ ہے + قیمت بارہ آنے . . ۱۲/

ثالث بالخیر ایک دلاویز ترکی فسانہ جسے سید سجاد حیدر بی اے (یلدرم) نے ترجمہ کیا + زمیندار لکھتا ہے۔ یہ ناول اگرچہ چھوٹا سا ہے مگر جذبات لطیفہ کے لئے اپنے اندر بہت سا سامان رکھتا ہے" قیمت صرف آٹھ آنے ۸/

چترا بنگال کے مایۂ ناز شاعر افسانہ نگار اور ڈراما نویس ڈاکٹر ٹیگور کی مشہور تصنیف کا نہایت دلفریب ترجمہ از مولانا سالک سابق اڈیٹر زمیندار + رسالہ ہمایوں لکھتا ہے" ٹیگور کی تصنیفات کا ترجمہ حضرت سالک سے بہتر کوئی کم کرسکے گا" نگار لکھتا ہے" حضرت سالک نے نہایت صاف اور سلیس زبان میں ٹیگور کو پیش کیا ہے + رسالہ زمانہ لکھتا ہے" اس کی اشاعت سے مترجم نے اردو علم ادب میں ایک بیش بہا اضافہ فرمایا ہے" + زمیندار لکھتا ہے۔ نہایت قابلیت اور حسن ادب سے ترجمہ کیا گیا ہے" قیمت بارہ آنے . . ۱۲/

جمیا اور دوسرے افسانے از فدائے ملت مولانا سالک سابق اڈیٹر زمیندار + اس کے متعلق اخبار البرید لکھتا ہے اگر دنیا میں کوئی چیز انسانی زندگی میں کوئی انقلاب پیدا کرسکتی ہے تو وہ اسی قسم کے افسانے ہیں" رسالہ دین و دنیا لکھتا ہے" چند افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جو دلچسپ اور مفید ہیں" + رسالہ نگار لکھتا ہے" افسانے حد درجہ دلچسپ اور اپنی ادبی خصوصیات کے لحاظ سے قابلِ قدر ہیں" + زمیندار لکھتا ہے۔ یہ امرِ واقعہ ہے کہ قصوں میں خاص شان دلاویزی موجود ہے۔ پڑھنے والا اس کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتا" + کتاب کیا ہے افسانوں کا نایاب خزانہ ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے . .. . عہ

باپ کا گناہ ایک نہایت دلچسپ۔ عبرت خیز۔ سلاست زبان اور ضروری شاعری سے مرصع ڈراما مصنفہ حکیم احمد شجاع اڈیٹر ہزار داستان۔ اخبار مدینہ اس کے متعلق لکھتا ہے" نہایت پُر درد اور عبرت انگیز پیرایہ میں دکھایا گیا ہے۔ کہ کس طرح ماں باپ کے گناہوں کا اثر اولاد تک پہنچتا ہے" رسالہ شباب اردو لکھتا ہے۔ یہ کتاب حکیم صاحب کے روشن دماغ کا ظہور ہے" قیمت .... .. (عہ)

ملنے کا پتہ - دارالاشاعت ادبِ لطیف چیمبرلین روڈ - لاہور

[redacted]

ناظرین ہزار داستان کیلئے نادر دلچسپ مفید کتابیں

گلہائے بہار ہمارے پاس وہ الفاظ نہیں جن میں ہم بتا سکیں کہ اس کتاب میں کیا ہے۔ اور یہ کیسی ہے مختصر یہ ہے کہ اس میں سات پھولوں موتیا۔ نرگس۔ عشق پیچاں۔ نارنج یاسمن۔ گلاب۔ اور لالہ کی نہایت ہی دلکش اور دلچسپ کہانیاں درج ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کیوں ایسے ہیں جیسے کہ ہیں لیکن کتاب دیکھنے سے ہی تعلق رکھتی ہے سب طلباء مڈل اور مدرسین اور دیگر قدرت کی خوبیوں کے دلدادگان کو اس کتاب کا مطالعہ کر کے حظ اور فائدہ حاصل کرنا چاہیئے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ بے مثل ہے۔ ایڈیشن ختم ہونے کو تیا ہے جلد جلد فرمائشیں آنی چاہئیں قیمت صرف ۱؎ ر

زرداد۔ زرداد بابر کا بچپن کا ساتھی تھا اس نے بابر کی امداد میں جو کارہائے نمایاں کئے۔ وہ نہایت دلچسپ ہیں۔ اس کتاب میں زرداد اور بابر کے سولہ سال کی عمر تک کے حالات کو ایسے دلچسپ پیرایہ میں ظاہر کیا گیا ہے کو ایک دفعہ شروع کر کے ختم کئے بغیر چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ ہمارے خیال میں تاریخی کہانی اس سے زیادہ دلچسپ آجتک کوئی نہیں لکھی گئی لکھائی چھپائی اور کاغذ کے لحاظ سے بھی یہ کتاب اپنی نظیر آپ ہے جملہ طلباء جماعت پنجم ششم ہفتم ہشتم۔ کو اس کا مطالعہ کر کے فائدہ اور حظ حاصل کرنا چاہیئے۔ قیمت صرف ۸ ر

شہر شہری اور شہریت۔ اس دلچسپ مفید کتاب میں نہایت دلچسپ پیرائے میں بتایا گیا ہے کہ آغاز عالم سے لیکر اب تک انسانوں نے عقل۔ تجربہ اور علم و عمل میں کس طرح ترقی کی اور وہ خانہ بدوش جنگلی باشندگی سے کس طرح موجودہ حالت کے نہایت مہذب شہری بن گئے۔۔۔۔۔ اس کتاب کا مطالعہ بھی طلباء لوئر و اپر مڈل کے لئے اشد ضروری اور مفید ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ زرداد کی طرح بینظیر ہے قیمت صرف ۶ ر

جنگ فرنگ۔ حکیم احمد شجاع صاحب بی۔ اے نے جنگ یوروپ کے واقعات کو ایک دلچسپ ڈرامے کی صورت میں لکھا ہے قریب قریب تمام ہندوستان کے تعلیمی محکموں نے اس کو سکولوں کے کتبخانوں اور انعامی کتابوں کے لئے تجویز کیا ہے۔ رعایتی قیمت ۸ ر

ملنے کا پتہ:۔ **منیجر اردو ہاؤس لاہور**

مینا منتوش تارا

یہ تینوں ڈرامے بنگال کی موجودہ معاشرت کا مرقع ہیں۔ بنگال کے قابل ڈراما نویس بابو کشور دیپ چند چٹرجی کی بہترین تصانیف ہیں جس کو حکیم احمد شجاع صاحب نے اپنی شستہ و رفتہ قدرت تحریر کو کام میں لا کر ترجمہ کیا ہے۔ عام فہم اور دلچسپ اردو کا جامہ پہنایا ہے تینوں افسانوں کا پلاٹ از بس نتیجہ خیز اور عبرت آموز ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ لائق ...... مصنف کس طرح ایک کتاب کو کامیاب بنا سکتے ہیں اور مترجم کی قابلیت کس طرح ایک زبان کے مفہوم کو دوسری زبان میں ادا کر سکتی ہے لکھائی چھپائی دیدہ زیب قیمت حسب ذیل ہے مینا ۱ منتوش ۸ تارا ۱

ان کتابوں کے ملنے کا

منیجر رسالہ ہزار داستان چیمبرلین روڈ لاہور

دیکھو! دیکھو!! دیکھو!!!

چہرے کو خوبصورت اور چمکیلا بنانے والا پاؤڈر اگر آپ استعمال کریں تو دہلی سے

پری جمال صابن (رجسٹرڈ)

جو خوبصورتی پیدا کرنے اور چہرے کا رنگ نکھارنے میں بے مثل ہے منگا کر استعمال کیا کریں جو چہرے کے داغ دھبے چھائیاں آدھا سیسی دور کر کے چہرے اور تمام جسم کو گورا اور خوبصورت کر دیتا ہے نفیس خوشبو سے تیار ہوا ہے فی بکس تین ٹکیہ صابن والی ایک روپیہ

زنانہ سنگھار بکس (رجسٹرڈ)

نقلی سے بچو اصلی رجسٹری شدہ خرید و جو مستورات کے بناؤ سنگار کے لئے بنایا گیا ہے اس بکس میں پانچ چیزیں اور انعام ہے (۱) پری جمال صابن ایک ٹکیہ (۲) پری بہار ہیئر آئل (۳) بال صفا صابن ایک ٹکیہ (۴) پان کی بہار ایک ڈبیہ (۵) خوشبودار مسی اور ۶ ماشہ سرمہ نور نظر مفت ملتا ہے فی بکس عہ

المشتہر حکیم محمد یعقوب خاں دواخانہ نور تن دہلی

ابا جان آپ کی لڑکی زنانہ بستہ پڑھے گی

میرے پیارے ابا جان آج کل تمام قومیں ترقی کر رہی ہیں لیکن مسلمان پستی میں پڑے ہیں ہم کو بھی تعلیم حاصل کر کے ترقی کرنی چاہیئے آج مجھکو دہلی سے زنانہ بستہ جو لڑکیوں کے لیئے بہت کار آمد ہے منگا دیجئے جس میں (۱) بسم اللہ کی کتاب (۲) کہانیوں کی کتاب (۳) تفسیر کی کتاب (۴) سینے کی کتاب (۵) نماز کی کتاب (۶) کھانا پکانے کی کتاب (۷) تندرستی کی کتاب (۸) تہذیب کی کتاب (۹) پردہ کی کتاب (۱۰) خانہ داری کی کتاب۔

مجموعہ قیمت عہ مجلد عمہ محصول ۸ عاقلہ بیگم۔ اس کتاب میں نہایت موثر پیرایہ میں یہ بات دکھائی گئی ہے کہ ایک سلیقہ مند و کفایت شعار بیوی مصیبت میں مبتلا ہو کر بھی ممتاز درجہ پر پہنچ سکتی ہے قیمت غیر مجلد ۸ مجلد ۸ ر

آفتاب زندگی۔ قیمت ۸ر خوان نعمت قیمت غیر مجلد مجلد عہ

ملنے کا پتہ: **محمد یوسف خاں منیجر شہرت بخش کتب خانہ دہلی**

چھپ کر تیار ہے

بار زندگی

اور دیگر افسانے

مصنفہ

سید عابد علی صاحب عابد۔ بی۔ اے

موثر اور دلکش مختصر افسانوں کا ایک حیرت انگیز مجموعہ ہے جس میں فطرت انسانی کے مختلف غوامض ورموز کو ایک جدید اور رنگین انداز بیان میں منکشف کیا گیا ہے نیز ان پر اسرار حقیقت و اس کے تمام لوازمات کا اثر جس طرح انسانی حواس کو متاثر کرتا ہے ان کی ایک مکمل تشریح ہے جو اقرار واقعہ کی زبانی فصیح و بلیغ عبارت میں بیان کی گئی ہے۔ قیمت ۱۲؍

زندگی کے حقایق و دقایق کا مرقع دیکھنا چاہو تو عجاب زندگی پڑھو جو ۱۹۲۳ء کی کامیاب ترین تصنیف ہے

ملنے کا پتہ

منیجر دی اردو ہاؤس چیمبرلین روڈ لاہور

تاج دین کاتب کوچہ ڈوگراں لاہور

علمی لوٹ ایک پچاس صفحہ کا ماہوار رسالہ تفریح ہندوستان بھر میں سستا خوبصورت اور دلچسپ باتصویر لطیفے کہانیاں مذاقیہ مگر سبق آموز مضامین نظم و نثر سلسلہ عزیز سانی کے حیرت انگیز قصے سرورق پر ہاف ٹون کی رنگین تصویر چندہ سالانہ صرف ۱عہ؍ وی پی پرچار آنے زاید شیخ چلی کی باتصویر کہانیاں ۳ یورپ کا شیخ چلی ۱ محصول ڈاک ذمہ خریدار ملنے کا پتہ

[illegible]

قومی کتابیں

مرغوب جنتری سنہ ۱۹۲۲
چھپکر تیار ہے
۲ر

کیلنڈر سنہ ۱۹۲۲
مفت

منظوم و غیر منظوم جو ہر پہلو سے لاجواب ہونے کے باعث علمی دنیا میں مقبول ہو رہی ہیں ایکدفعہ ضرور منگائیں

سر ڈاکٹر محمد اقبال

شکوہ (از ڈاکٹر اقبال) ۲ر
جواب شکوہ (" ") ۴ر
ترانہ (" " ") ۱ر
مکمل ترانہ (" ") ۲ر
فریاد امت (" ") ۳ر
نالہ یتیم (" " ") ۲ر
اکبری اقبال (" ") ۳ر
تصویر درد (" ") ۴ر
بلال (" " ") ۲ر
خضر راہ (" " ") ۴ر
شمع اور شاعر (" ") ۴ر
طلوع اسلام (" ") ۴ر
مثنوی اسرار خودی ۱۰
رموز بیخودی (فارسی مجلد) ۱۲
پیام مشرق (فارسی مجلد) ۲

کلام شبلی (باتصویر)

اس مجموعہ میں مولٰنا شبلی (مرحوم) کی قومی اور تاریخی نظمیں درج کیگئی ہیں۔ لکھائی چھپائی عمدہ سرورق رنگدار قیمت صرف ۱۲ر

رباعیات سرمد مجلد

سرمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی رباعیات کا مجموعہ ہے جو بڑی تلاش سے دستیاب ہوئی ہیں۔ اور شروع میں سوانحعمری بھی دیگئی ہے۔ لکھائی چھپائی عمدہ کاغذ ولایتی پاکٹ سائز قیمت مجلد ۱۲

رباعیات اردو

شعرائے متقدمین اور موجودین میں سے چار برگزیدہ اور مانے ہوئے شعراء کی چیدہ چیدہ رباعیات کا مجموعہ ہے۔ انیس۔ دبیر۔ حالی اکبر۔ جو اصنیف رباعی میں مشہور اور استاد مانے گئے ہیں قیمت ۱۲

قومی ترانے

یعنی نامی گرامی شعراء کے قومی جذبات کا مجموعہ ہے اسمیں مشہور و معروف شعراء کے قومی ترانے درج کئے گئے ہیں۔ باوجود اتنی خوبیونکے قیمت صرف ۸ر

انتخاب جدید (کامل)

یہ مختلف قومی نظموں کا مجموعہ ہے۔ جتنی بھی قومی نظمیں آجتک ایجنسی ہذا میں چھپی ہیں۔ ان میں سے اس مجموعہ میں کوئی نظم نہیں ہے۔ یہ جداگانہ ہیں۔ حصہ اول ۹ر حصہ دوم ۹ر حصہ سوم ۶ر آنہ دے۔

غزلیات اردو

یہ مجموعہ اپنی خوبیوں میں لاجواب ہے۔ اس میں مشہور و معروف شعراء کی چیدہ چیدہ غزلیات درج ہیں۔ مثلاً اقبال۔ حالی۔ اکبر وغیرہ اس مجموعہ کی ایک ایک غزل قابلدید ہے۔ حصہ اول چھپ کر تیار ہے۔ قیمت ۸ر

شرط زندگی

نیرنگ صاحب نے فتنہ ارتداد کے متعلق لکھی۔ اور انجمن حمایت اسلام لاہور کے ۳۶ سالانہ جلسہ پر پڑھی۔ اور اسکی ایک ایک کاپی ہر مسلمان کے پاس ضروری ہونی چاہیئے۔ نظم قابل دید ہے۔ قیمت ۳ر

آہنگ عمل

یہ نظم نیرنگ صاحب وکیل انبالہ نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ۳۶ ویں اجلاس منعقدہ شہر سورت میں پڑھی تھی۔ قیمت صرف ۳ر

دردپنہاں۔ یہ نظم نیرنگ صاحب نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ستیسویں اجلاس منعقدہ شہر امروتی (برار) پڑھی۔ قیمت ۳ر

مسدس حالی

(مصنفہ الطاف حسین صاحب حالی پانی پتی) کا یہ مجلد پاکٹ ایڈیشن بنہایت خوبصورت چھپے اسمیں سب موقع رنگین نقشے بھی چسپاں کئے گئے ہیں شروع میں مولانا کا فوٹو دیا ہے ۱۲

شکوہ ہند ۴ر
تحفۂ اخوان ۲ر
مناجات بیوہ ۳ر
حب کی داد ۲ر
درد دل ۲ر
حب وطن ۳ر
پھوٹ اور ایکے کا
مناظرہ ۳ر
مناظرہ رحم و
انصاف ۳
مناظرہ تعصب
انصاف ۳ر
کلام نیرنگ ۱۰
پیام عمل ار
فریاد جرس ار
نوائے انقلاب ۲ر
شرط زندگی ۳ر
آہنگ عمل ۳ر

درد پنہاں ۴ر
العروۃ توحید ۲ر
دربار رسول ۲ر
پیکر نور ۳
قبلہ نما ۲ر
ایثار مسلم ۲
خطاب مسلم ۲ر
پیام دل ۳
ستارہ و نکالیت ۲ر
ہمارا خدا ار
ہمارا رسول ۲ر
ہمارا قرآن ۲ر
اخوت ار
خیرات ار
میرا خواب ۲ر
تصور بہتی ۲ر
نغمۂ غیب ار
خیالی محفل ۳ر

دعوت حالی ۲
تصویر یادداری ۲ر
قومی ترانے ۸
غزلیات اردو
باتصویر ۲ر
عقد شکوہ ۳ر
کتب نثر
لکچر اقبال ۱۲ر
السطر ار
ایثار حسین ۳
فال مع قرآن مجید
قاعدۂ مرغوب
قومی زندگی
یادگار حسین ار
نکتۂ آزادی ار
عقد نال ار
فن شاعری ۱۲
زبان ۲

درخواستیں بنام مینیجر مرغوب ایجنسی لاہور چوک متی آنی چاہئیں

ڈاکٹر ایس کے برمن کی بنائی ہوئی دوائیں

فصلی بخار و طحال کی دوا

فصلی بخار و طحال کے لیے یہ ایک ہی دوا ہے۔ آج کل سینکڑوں اشتہار فصلی بخار و طحال کی دوا کے آپ دیکھتے ہونگے مگر ان میں عموماً کونین جز ہوتی ہے۔ اسلیے یہ دوائیں بخار کو کچھ وقت تک تو روک دیتی ہیں مگر جڑ سے آرام نہیں کر سکتی ہیں ایسے بند کے لیے ڈاکٹر ایس کے برمن کی فصلی بخار و طحال کی دوا چند روز میں ایک دم آرام کرنے کا خاص دعوےٰ رکھتی ہے اور عوام کے فائدہ کو مدنظر رکھ کر قیمت بھی بہت ہی کم رکھی گئی ہے اس میں تین خاص صفتیں ہیں (۱) یہ ملیریا کے کیڑوں کو مار دیتی ہے اس لیے چار پانچ ہی خوراک کے استعمال سے بخار کا آنا بند ہو جاتا ہے۔ (۲) یہ خون کو گاڑھا کرتی ہے۔ اور اس کی خرابیوں کو مٹاتی ہے (۳) یہ طحال کو گلاتی ہے قیمت فی شیشی کلاں عمہ خورد ۱۰ر محصولڈاک شیشی کلاں ۸ر اور خورد ۶ر

پرانے ملیریا بخار کی گولیاں

لرزہ بخار پرانے ہو جانے پر باری سے نہ آکر دن رات تھوڑا بہت چڑھا رہتا ہے جسم کا خون پانی سا ہو جاتا ہے۔ اور آدمی کا رنگ پھیکا میلا ہو جاتا ہے تھوڑی محنت سے کلیجہ کانپنے لگتا ہے سانس پھولتی ہے کھانے کی خواہش اور قوت بہت ہی گھٹ جاتی ہے۔ تلی کے بڑھنے سے پیٹ نکل آتا ہے۔ کبھی منہ اور ہاتھ پاؤں میں ورم آ جاتا ہے اور زندگی وبال ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ گولیاں فائدہ کرتی ہیں۔ اور چار پانچ ہی خوراک میں بخار کا آنا بند ہو جاتا ہے قیمت پچیس گولیوں کی ڈبیہ کی ۱۰ر محصول ڈاک ایک سے دو ڈبیہ تک ۶ر

کونین کی گولیاں

یہ چار گرین کی خوبصورت چھوٹی چھوٹی ٹکلیاں شکل میں بنتی ہیں اور سنہرے پیٹنٹ ڈبیہ میں ہوتی ہیں کونین استعمال کرنا ہو تو یہ گولیاں پاس رکھیے اس میں نہ وزن کی ضرورت ہے نہ کھانے میں تلخ ہے قیمت پچیس گولیوں کی ڈبیہ ۳ر محصول ڈاک ۶ر

ایجنٹ: مینیجر صاحب پیسہ اخبار لاہور

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ تارا چند دت اسٹریٹ کلکتہ

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۴۱۴

۷۸۶

قیمت سالانہ چھ روپیہ [illegible]

قیمت ششماہی ۳ روپیہ فی پرچہ ۸/

ہزار داستان

آنریری ایڈیٹر حکیم احمد شجاع بی اے (علیگ)

ایڈیٹرز سُدرشن محمد اسمٰعیل نعیم

جلد ۳ اشاعت ماہ دسمبر ۱۹۲۳ء نمبر ۶

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	اثر خامہ	نمبر صفحہ	نمبر شمار	مضمون	اثر خامہ	نمبر صفحہ
۱	صفحہ ادارت	آنریری ایڈیٹر	۲	۱۱	بیراگی	جناب گیان چند	۴۷
۲	محبت کی قربانی	"	۴	۱۲	عرش پیمائی	جناب عرش	۵۰
۳	شکر	جناب نور الٰہی محمد عمر	۱۰	۱۳	پائے حنا طراز	جناب جمیل قدوائی	"
۴	نوائے راز	جناب سید راز چاندپوری	۱۷	۱۴	ہار جیت	جناب افتخار الرسول بدر	۵۱
۵	انجام عشق	جناب اثر صہبائی	۱۸	۱۵	کلام حسرت	فدائے ملت مولانا حسرت موہانی	۵۵
۶	غزل	جناب محمد معراج الدین شامی	۲۶	۱۶	باغبان	سُدرشن	۵۶
۷	تمدن	جناب محمد امیر الحسن بی۔ اے۔	۲۷	۱۷	قرضخواہ	سُدرشن	۶۳
۸	نغمہ دلگداز	جناب اثر صہبائی	۳۲	۱۸	جذبات ہادی	جناب ہادی	۶۸
۹	ماسٹر شامی	جناب محمد شاہ ولی مینی		۱۹	حسرت	فدائے ملت مولانا حسرت موہانی	"
۱۰	حشر جذبات	جناب سید ابو محمد ثاقب	۴	۲۰	گورا	جناب عبد الستار خاں	۶۹

صفحۂ ادارت

آج کتنے مہینوں کے بعد ناظرینِ ہزار داستان کو صفحۂ ادارت کی وساطت سے مخاطب کر رہا ہوں۔ ضروری اطلاعات و بیانات کی عدم موجودگی میں صفحۂ ادارت ایک رسمی ضرورت تھی۔ جسے نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ اور اب بھی محض رسمی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے نہیں؛ بلکہ ایک فرض کی ادائیگی کی غرض سے یہ گنجائش نکالی گئی ہے۔

اس اشاعت کے ساتھ رسالے کی تیسری جلد ختم ہوتی ہے۔ ہزار داستان اپنی زندگی کے اٹھارہ مہینے جس کامیابی سے بسر کر چکا ہے اس پر اس کا قیام اور استحکام گواہ ہے۔ اس عرصہ میں کوئی کوشش ایسی نہ تھی؛ جو ہزار داستان کو حقیقی معنوں میں ایک کامیاب ادبی رسالہ بنانے کے لئے نہ کی گئی ہو۔ اور خدا کا شکر ہے کہ ہزار داستان کے اصلی مقاصد کو مدِّنظر رکھتے ہوئے آج مجھے یہ کہنے کا موقع حاصل ہے کہ اس کا ماضی' اس کے مستقبل کی خوش بختی کے لئے ایک کافی ضمانت ہے۔

میرا تعلق اب اس رسالہ سے محض اعزازی ہے۔ اعزازی ان معنوں میں نہیں کہ میری وجہ سے اس رسالہ کو کوئی اعزاز حاصل ہے۔ بلکہ ان صحیح معنوں میں کہ میں اس ادبی خدمت کو کسی ذاتی منفعت کی ممکنات کے بغیر اپنے لئے باعثِ اعزاز سمجھتا ہوں۔

پچھلے چھ مہینوں سے ادارت کا بارگراں جناب سیّد عابد علی صاحب عابدؔ اور جناب ہادی حسین صاحب قریشی صدیقی کے بلند ہمّت اور قابلِ قدر شانوں پر رہا ہے۔ وہ میرے عزیز اور محترم دوست ہیں۔ اور اپنی مسلّمہ علمی قابلیتوں کی وجہ سے ادبی حلقوں میں سرفراز۔ میں اس موقع سے فایدہ اُٹھا کر ان کی بے غرض' صادق' اور اہم ادبی خدمات کا اعتراف کرتا ہوں' جو انہوں نے میرے دست و بازو بنکر ہزار داستان کے متعلق انجام دیں۔ افسوس ہے کہ ان کی ذاتی مصروفیتیں اب ان کو اجازت نہیں دیتیں۔ کہ وہ ہزار داستان سے کوئی باقاعدہ تعلق رکھ سکیں۔ تاہم مجھے ان کے خلوص' اور ادبی شغف پر اعتماد ہے۔ اور میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ دنیائے ادب ان کی خدمات سے محروم نہ رہیگی۔

جناب محمد اسمٰعیل صاحب نعیمؔ جواب ہزار داستان کے مالک و مختار اور مہتمم ہیں۔ اپنے ادبی ذوق' اور تجربہ کی بناء پر ہر طرح سے ادارت کی ذمہ واریوں کو اُٹھانے کے اہل ہیں۔ اور میں خوش ہوں کہ اُنھوں نے اس اہم خدمت کو انجام دینے کا تہیّہ کر لیا ہے۔ وہ اس فرض کی انجام دہی کو کچھ مشکل نہ پائیں گے۔ کیونکہ ملک کے مشہور افسانہ نویس جناب سدرشن

جن کی معاشرتی کہانیوں اور اخلاقی افسانوں کا عام چرچا ہے۔ باضابطہ طور پر ان کے شریکِ کار رہیں گے۔ اِن ہر دو احباب کا ممنونِ منت ہوں کہ انہوں نے میرے مشورے کو قبول کر کے اپنے وقت کا ایک بیش قیمت حصّہ اس کام کے لئے وقف کر دیا۔

ہزار داستان اپنی نوعیت کے لحاظ سے سارے ہندوستان میں ایک ہی رسالہ ہے۔ اور اسے کسی مذہب و ملت سے کوئی خاص تعلق نہیں اس لئے عہد ادارت میں جنابِ محمد اسمٰعیل نعیم کے ساتھ ساتھ جناب سُدرشن کی موجودگی ہزار داستان کی آئندہ زندگی کے لئے بہت وسیع اور مفید ممکنات کی تمہید نظر آتی ہے۔ خُدا کرے میرے اندازے صحیح نکلیں اور میری امیدیں بر آئیں۔

جہانتک مجھے اطلاع ہے۔ رسالے کی اشاعت دن بدن خاطر خواہ ترقی کر رہی ہے۔ اور ہزار داستان کے ناظرین رسالے سے مطمئن ہیں۔ تاہم یہ عرض کرنے کی جُرأت کروں گا۔ کہ ابھی رسالہ کو ضرورت ہے۔ کہ معاونینِ ہزار داستان اِس کی اشاعت میں بیش از بیش حصّہ لیں۔ اور منتظمین رسالہ کو اپنے مشوروں سے مستفید فرمائیں۔

وہ مضامین نگار حضرات جو کسی معاوضہ کے بغیر ہزار داستان کی امداد فرماتے ہیں خصوصاً قابلِ شکریہ ہیں۔ مَیں خود ان حضرات کا اپنے ذاتی تعلقات کی بنا پر ممنون ہوں۔ اور مجھے امید ہے کہ وہ اپنے الطاف و اکرام کو جاری رکھیں گے۔

رسالہ کے انتظامی معاملات کے متعلق خط و کتابت اور ترسیلِ زر و مضامین جناب محمد اسمٰعیل صاحب نعیم ایڈیٹر و مالک ہزار داستان کے پتہ سے ہونی چاہیئے۔ کیونکہ وہ دفتر میں قیام رکھتے ہیں۔ اور بحیثیت ایک مستقل اور ذمہ وار مالک کے ہر معاملہ پر غور و فکر کر سکتے ہیں کسی دوسری صورت میں مضامین ضائع ہونے اور فرمائشات کی تعمیل نہ ہونے کا اندیشہ ہے۔ خدا کرے سال آئندہ ناظرینِ ہزار داستان کے لئے بہت سی خوشیوں، مُرادوں اور ترقیوں کا گنجینہ ثابت ہو۔ آمین۔

آنریری ایڈیٹر

شمسہ تو میری بھانجی ہے۔ اس کا تو مجھ پر حق ہے۔ میں کیسے برداشت کر سکونگا۔ کہ نواب اکبر مرزا کی نواسی اب کرائے کے مکان میں رہے۔ للّٰہ اس ضد سے باز آؤ۔"

نواب امیر حسن خاں کے دل پر آخری فقرے سے کچھ چوٹ سی لگی۔ کہنے لگے۔ "ہاں بھئی اگر نواب ثریا جاہ کی پوتی کرایہ کے مکان میں رہ سکتی ہے تو اکبر مرزا کی نواسی کے لئے یہ بات باعث عار نہیں ہو سکتی۔"

فرخ مرزا کو اپنی غلطی کا اندازہ ہو گیا۔ انہوں نے بات کاٹکر جوابدیا۔ "استغفراللہ مطلب یہ نہ تھا۔ کہ میرا خاندان تمہارے خاندان سے بڑا ہے۔ یا شمسہ کے نانا شمسہ کے دادا سے بڑا رتبہ رکھتے تھے۔ میرا تو اس سے صرف یہ مقصد تھا کہ میری نظر میں شاہرخ اور شمسہ دونہیں جس خون کے رشتہ سے شاہرخ اپنے دادا کی جائداد کا حقدار ہے اسی تعلق سے شمسہ کو اپنے نانا کی جائداد پر حق حاصل ہے۔"

اس پر نواب امیر حسن خاں کو پچھلے تمام واقعات یاد آگئے انہوں نے کسی قدر حسرت بھرے انداز سے کہا۔

"بھائی اگر تمہیں صرف اسی تعلق کا خیال ہوتا تو شمسہ اپنے کی جائداد کھو کر بھی ایک مکان کے لئے محتاج نہ ہوتی"

فرخ مرزا کو موقع ہاتھ آگیا۔ فوراً بولے۔ "میں نے یہ جائداد سنبھال سنبھال کر کس کے لئے رکھی ہے۔ میں اپنی جان کو دُکھ دے دے کر دُنیا کے طعنے سُن سُن کر روپیہ پیسہ کس کے لئے جمع کر رہا ہوں۔ شاہرخ اور شمسہ کے سوا میرا وارث کون ہے۔ اب آؤ ان قصوں کو جانے دو۔ تراب ہے میں جو حویلی میں نے ابھی ابھی بنوائی ہے تمہارے لئے بہت موزوں ہوگی۔ وہیں اٹھ چلو۔ باقی رہا تمہارے قرضے کی ادائیگی کا سوال اور اس حویلی کا جھگڑا۔ اس کی طرف سے تم بے فکر رہو۔ میں ان لوگوں سے خود ہی نپٹ لونگا"

فرخ مرزا خوب جانتا تھا کہ اگر امیر حسن اپنے مکان میں رہے یا اس کے قبضے سے باہر کسی دوسرے مکان میں تو وہ اس شیر کے مانند ہونگے جو اپنی کچھار میں ہو۔ وہ انہیں اپنے مکان میں لاکر ان کی آزادی، خود پسندی اور غیرت کو مغلوب کرنا چاہتا تھا۔ اسے تجربہ تھا۔ کہ احتیاج ہی ایک ایسی مصیبت ہے۔ جو ایسے لوگوں کی گردن جُھکا سکتی ہے وہ بغیر کسی قسم کا ظاہری اشارہ کئے امیر حسن کو اپنا محتاج بنانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس کا جادو چل گیا۔ امیر حسن اُس کی باتوں میں آگئے۔ اور اپنی شرافت پر قیاس کرکے صرف یہی سمجھے کہ فرخ مرزا آخر خاندانی آدمی ہے۔ بھائی اور بھانجی کو اس مصیبت میں نہیں دیکھ سکتا۔

امیر حسن دوسرے ہی دن فرخ مرزا کی عظیم الشان حویلی میں اُٹھ گئے۔

فرخ مرزا ایک ہی کایاں تھا۔ اُس نے بات بھر میں حویلی کو فرش فروش، جھاڑ فانوس اور ہر قسم کے سامان آرائش

سے آراستہ کر دیا۔ اور داروغہ کو حکم دے دیا۔ کہ نواب کی خاطرداری کے معاملے میں مہمان نوازی کے معمولی معیار کو بھلا دے اور قارون کے بخل کو حاتم طائی کی سخاوت سے بدل ڈالے۔

دو چار دن اسی طرح آرام و آسائش میں گذر گئے۔ فرخ مرزا ہر روز صبح و شام آتے اور اپنے بہنوئی کی مزاج پرسی کر کے چلے جاتے۔ ان کی عنایتیں خلاف توقع تھیں اور انکی فیاضی اور ہمدردی خلاف معمول۔ نواب امیر حسن نے مجبور ہو کر سوچنا شروع کیا۔ کہ آخر فرخ مرزا اتنا تو برا نہ نکلا جتنا وہ اُسے سمجھتا تھا۔ افلاس میں کسی کی معمولی ہمدردی وہ اثر رکھتی ہے۔ جو تمول کی حالت میں غرض والوں کی جھوٹی خوشامد میں بھی نہیں ہوتا۔

امیر حسن اب فرخ مرزا کی شرافت کا قائل تھا۔ اور اپنے دل کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کہ اُس کا بخل اور کینہ پن اہل غرض لوگوں کے لئے ہے جو یقیناً ایسے ہی سلوک کے قابل ہیں۔ اس کو اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر دنیاداروں کے خلوص کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اور جبکہ وہ ان سے انتقام نہ لے سکتا تھا۔ وہ فرخ مرزا کے ناروا سلوک کے جواز کے لئے بہانے ڈھونڈھ رہا تھا۔ مگر طبیعت کا اصلی جوہر لاکھ پردوں میں بھی نہیں چھپتا۔ فرخ مرزا مطلب کی بات کو بہت دیر تک نہ چھپا سکے۔ ایک دن مغرب کی نماز سے فراغت پانے کے بعد نواب امیر حسن کے ہاں آئے۔ اور بڑی محبت اور خلوص سے کہنے لگے۔ "بھئی اب تو مجھ سے تنہا کھانا بھی نہیں کھایا جاتا۔ نماز پڑھتے ہی تمہارے ہاں چلا آیا۔ میرا کھانا بھی یہیں آتا ہوگا۔ مل کر کھائینگے۔ تمہارے کھانے کا وقت تو نہیں ہوا؟"

امیر حسن کسی قدر محجوب ہو کر کہنے لگے۔ "یہاں بھی تمہارا ہی کھانا پکتا ہے۔ پھر اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟"

فرخ مرزا نے فوراً جواب دیا۔ "نہیں بھائی اس کا کبھی ذکر بھی نہ کرنا۔ اب جو کچھ یہاں ہے تمہارا ہے۔ میں تو ذکر نہ کرنا چاہتا تھا۔ مگر اب ذکر آ ہی گیا۔ تو خیر یہ لیجئے بیس ہزار روپیہ فی الحال میں نے آپ کے نام بنک میں جمع کرا دیا ہے پانچ ہزار روپے داروغہ کے پاس گھر کا خرچ چلانے کے لئے موجود ہیں۔ دو ایک روز میں تمہارا مکان بھی واگذار ہو جائیگا۔ ہنڈیوں اور دوست گردان قرضوں کا حساب تو کل بیباق ہو گیا۔ اب یہ جو کچھ ہے تمہارا ہے۔"

امیر حسن متحیر ہو کر سوچنے لگے کہ فرخ مرزا کتنا مہربان ہے۔ کیسا فیاض ہے۔ اس کے ساتھ کس قدر ظلم کیا۔ کاش کہ میں اس کی خوبیوں کو اس وقت جانتا۔ جب میرے پاس بھی اس کے احسانوں کا قرض ادا کرنے کے لئے کچھ تھا۔

آخر سوچ سوچ کر بولے۔ "نہیں بھائی میں اتنا بڑا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ اس لئے نہیں کہ میں اٹھانا نہیں چاہتا۔ بلکہ اس لئے کہ اب مجھ میں طاقت نہیں۔ احسان کا

بار اُٹھانے کے لئے بڑی طاقت کی ضرورت ہے۔ مَیں اپنی کمزوری سے واقف ہوں۔ اور ناشکرگذار کہلانا نہیں چاہتا

نواب نے یہ تقریر جب ختم کی تو ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ فرخ مرزا کو شکرگذاری کی تصویریں آنسوؤں میں جھلکتی نظر آئی۔ مقصد براری کے لئے اس سے زیادہ اچھا موقع اور کیا ہوتا کہنے لگے۔

"بھائی میری مدت سے آرزو تھی کہ میرا اور تمہارا گھر ایک ہوجائے۔ اور جو ساکھ ہمارے خاندانوں کی دُنیا میں ہے قائم رہے۔ آخر شمسہ پر میرا بھی کوئی حق ہے۔ ہم دونوں اپنی عمریں کھا چکے ہیں۔ بہن کے بعد تمہارا گھر برباد ہے۔ اور تمہاری بھابی کی وفات نے مجھے تو بالکل بے خانماں کردیا ہے۔ خیر سے شمسہ اب شادی کے قابل ہے۔ شاہرخ تمہارا اپنا بچہ ہے خیر سے خوبصورت ہے جوان ہے۔ تعلیمیافتہ ہے۔ ہونہار ہے رئیسوں کے بیٹوں کی طرح آوارہ مزاج نہیں۔ ہروقت کتابوں کے مطالعہ میں غرق رہتا ہے مَیں نے ابھی اسے کسی کام میں نہیں لگایا اور میری خواہش بھی یہی ہے کہ وہ اپنی پسند کا کوئی کام خود ہی کرے۔ اس کے لئے روپیہ پیسہ اتنا جمع کردیا ہے کہ اگر کام نہ بھی کرے۔ تو اپنا خاندانی ٹھاٹھ قائم رکھ سکتا ہے پھر آخر تمہیں اس کو اپنی فرزندی میں قبول کرنے میں کیا عذر ہوسکتا ہے۔ دیکھو میری شرم اب تمہارے ہاتھ میں ہے۔ مجھے اتنا مایوس نہ کرو۔"

امیر حسن نے آجتک فرخ مرزا کو کبھی اجازت نہ دی تھی کہ اسقدر صاف الفاظ میں شمسہ کا رشتہ مانگنے کے درپے ہوجاتا بلکہ یہ کہنا شاید زیادہ درست ہوگا۔ کہ فرخ مرزا کو کبھی اتنا حوصلہ ہی نہ ہوا تھا۔ یہ پہلی قیمت تھی جو امیر حسن کو فرخ مرزا کے احسانوں کے عوض میں ادا کرنی پڑی۔ اُنھوں نے ایک آہ بھری اور کہنے لگے۔

"بھائی تم مجھے کیوں مجبور کر رہے ہو۔ شاہرخ سے بہتر میرے لئے اور کون ہوسکتا تھا۔ مگر دیکھو شریف وہی ہے جسے لفظ کا پاس ہو۔ مَیں شمسہ کے رشتہ کا وعدہ اپنی بہن سے کرچکا ہوں۔ اسی خیال سے اس بیچاری نے اپنا گھربار بیچکر اس کو اعلےٰ تعلیم کے لئے ولایت بھیج رکھا ہے۔ اگر مَیں نے انکار کردیا تو اُس بیچاری کا دِل ٹوٹ جائیگا۔ میری مجبوری کو تُم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو۔"

فرخ مرزا کب چوکنے والے تھے۔ اُنھوں نے محبت و خلوص سے بھرے ہوئے لہجہ میں جواب دیا۔ "بھائی اس میں کچھ شک نہیں کہ وعدے کا ایفا بہت اچھی بات ہے اس میں بھی مجھے کلام نہیں کہ ناصر اپنا ہی لختِ جگر ہے۔ مگر ذرا غور تو کرو ناصر کی اعلےٰ تعلیم کو شمسہ اوڑھے گی کہ بچھائیگی۔ فرض کیجئے کہ ولایت سے ناصر بیرسٹری کے امتحان میں کامیاب ہوکر آ بھی گیا تو کیا تم نے بیرسٹروں کا حشر نہیں دیکھا۔ کتنے ہیں جن کو شروع شروع میں پیٹ بھر کر کھانا نصیب ہوتا ہے۔ ابھی تو کئی برس تک قوت لا یموت

بھی ملنی مشکل ہے پھر شمسہ ایک امیر گھر میں پلی ہے۔ اس کا مذاق مہذب ہے۔ اس کی عادتیں رئیسانہ' وہ ایک غریب گھر میں کیا دو دن بھی زندہ رہ سکتی ہے۔ بابا میں تو محض تمہارے ایک لفظ کی خاطر اپنی بیٹی کی زندگی قربان نہ ہونے دونگا۔ اس کے نازک نازک ہاتھ کیا جھاڑو دینے' برتن صاف کرنے' روٹیاں پکانے کے لئے ہیں۔ اسکا نازوں میں پلا ہُوا جسم کیا کھدر پہننے کے لئے ہے

امیر حسن ذرا بگڑ کر بولے "تو شریف لوگوں کی بہو بیٹیاں اور کس مرض کی دوا ہیں۔ اگر کوئی نئے فیشن کا رذیل دولتمند یہ باتیں کہتا تو مجھے تعجب نہ ہوتا لیکن تمہارے منہ سے یہ باتیں سُنکر مجھے صدمہ ہُوا۔ بھئی تمہاری بہن نے ساری عمر کیا کیا۔ ہماری والدہ کیا کرتی رہیں۔ کیا گھر میں دولت کی کمی تھی ماماتیں نہ تھیں۔ یا کوئی اور آسائش نہ تھی۔ ہم نے تو اُنہیں دن بھر گھر کے کام دھندوں میں مصروف دیکھا۔"

فرخ مرزا نے جواب دیا۔ "بھئی اب وہ زمانہ نہیں رہا ان وقتوں کو بُھلا دو۔ اب تو عورتیں اپنے حقوق طلب کرتی ہیں۔

امیر حسن نے برانگیختہ ہوکر کہا۔ "شمسہ کی رگوں میں ایک شریف خاندان کا خون ہے۔ وہ اپنے باپ کی مرضی اور شوہر کی رضامندی پر جان تک قربان کردینا جانتی ہے۔ اور کریگی میں آگے ہی اپنی مصیبتوں سے پریشان ہو رہا ہوں للہ مجھے اور پریشان نہ کرو میں تمہارا ممنون ہوں مگر مجھے یقین ہے کہ تم اپنے احسان کے بدلے میں مجھ سے یہ قیمت طلب نہ کروگے۔"

فرخ مرزا پر نواب کی بے بسی کا کچھ ایسا اثر ہُوا کہ چُپ ہو گیا۔ اور دل میں یہ سوچکر کہ زخمی شیر چھیڑنے سے اور بھڑکے گا۔ بات کو ٹالنے کے لئے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔

"اب رات بھی زیادہ جا چُکی ہے۔ اور آپ کے آرام کا وقت ہے۔ مَیں رخصت ہوتا ہوں۔ انشاء اللہ کل کسی وقت حاضر ہونگا۔ خدا حافظ۔"

ادھر فرخ مرزا رخصت ہُوا۔ اُدھر نواب زنانے میں داخل ہُوئے۔ سچ ہے مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی قسمت کو ابھی نواب کی غیرت اور مردانگی کے اور امتحان کرنے تھے۔ گزشتہ زمانہ کی غلطکاریاں مختلف مصیبتوں کے روپ دھار کر پیش کرنے والی تھیں۔ ابھی نواب نے پلنگ پر بیٹھ کر حُقّہ کی نے ہاتھ میں سنبھالی ہی تھی کہ شمسہ دوڑتی ہُوئی خوابگاہ میں داخل ہُوئی۔ اور کہنے لگی۔

"ابّا میاں یہاں پھوپھی امّاں آئی ہیں۔ کہئے تو بُلا لوں۔"

نواب کو یہ اطلاع سُنکر حیرت سی ہُوئی۔

"کون زمانی؟ اسوقت؟ اچھّا بُلا لو بیٹا۔"

نواب کی بہن کمرے میں داخل ہُوئیں۔ انکی شکل پر بدحواسی اور پریشانی کی گھٹا چھائی ہُوئی تھی۔ وہ سنبھل کر سلام تک نہ کرنے پائی تھیں کہ نواب نے گھبرا کر پُوچھا۔ کیوں زمانی خیر تو ہے۔ تم اسقدر گھبرائی ہوئی کیوں ہو۔"

(باقی آئندہ)

آنریری ایڈیٹر

شلر

(بحیثیت ایک ڈراما نویس کے)

جوزف کرسٹوفر یڈرک شلر علاقہ ورٹم برگ کے ایک چھوٹے سے قصبہ موسومہ مارباچ میں ۱۰ نومبر ۱۷۵۹ء کو پیدا ہوا۔ اس کا باپ کسپر شلر بویریا کی فوج میں سرجن کے عہدہ پر ممتاز تھا۔ وہاں سے قطع تعلقات کر کے واپس آیا۔ تو نشتر کو بالائے طاق رکھ تلوار سنبھال خدمتِ ملک کے لئے کمربستہ ہو گیا۔ ۱۷۶۳ء میں عہدنامہ پیرس مرتب ہوا۔ اور جنگ کے ساتھ کسپر کی ملازمت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اِن خدمات کے صلہ میں اسے کپتان کا اعزازی عہدہ عطا ہوا۔ مگر اعزاز سے پیٹ نہیں بھرتا۔ ڈیوک نے اسے اپنے ملازموں میں داخل کر لیا۔ اور باغوں کی نگہداشت کا کام اس کے سپرد ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈیوک نے سرپرستی کا خوب حق ادا کیا۔ اور اس محبِ وطن کی آسائش میں خلل نہ آنے دیا۔ شلر کے والدین دیندار۔ متقی اور وفاشعار تھے لیکن شلر نے اولین فیض اپنی ماں سے پایا۔ یہ خاتون کوئی بڑے پایہ کی عالمہ نہ تھی۔ مگر ذہانت اور فراست رجحانِ طبع کی شناخت میں اپنا جواب نہ رکھتی تھی۔ نظم سے اسے خاص شغف تھا۔ اور جملہ اصنافِ کلام کے محاسن اور معائب اس خوبی سے بیان کرتی تھی کہ سامع اس کی خوش ذوقی سے حیران رہ جاتا تھا۔ اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ ڈراما اور نظم شلر کی گھٹی میں پڑے تھے۔ شلر کے باپ کی عمر گو معرکہ آرائیوں میں گزری اور تلوار کی جھنکار سے اس کی سمع نوازی ہوتی رہی۔ پھر بھی وہ ادب کی چاشنی سے ناآشنا نہ تھا۔ جب تلوار ہاتھ سے چھوٹ گئی تو اُس نے کتاب اُٹھائی۔ اور اس شد و مد سے مطالعہ شروع کیا کہ تھوڑے عرصہ میں وہ ایک مُصنّف کی حیثیت سے عوام کے سامنے آیا۔ جنگلات کی پرورش پر وہ کتاب لکھی کہ اُس کی اور اُس کے نامور بیٹے کی وفات کے بعد طبعِ ثانی کی نوبت آئی۔ اس لئے یہ کہنا بے محل نہ ہو گا۔ کہ تصنیف و تالیف کا شوق شلر نے ترکہ میں پایا تھا۔

شفیق اور خدا ترس والدین کی گود میں شلر کا بچپن بڑے مزے سے گزرا اور کوئی ایسا واقع رونما نہ ہوا۔ جسے اِس کا سوانح نگار رونقِ محفل بناتا۔ وہ قوم بڑی خوش نصیب ہے۔ جس کے مورخ کو بہت کچھ قلمبند نہ کرنا پڑے کیونکہ واقعات کا فقدان امن اور اُس کی

بیہودگی پر دلالت کرتا ہے۔ وہ بچہ خوش نصیب ہے جس کی اوائل عمر کے تجربات دلچسپی سے معرا ہوں۔ چونکہ یہ اس بات کی شہادت ہے۔ کہ اس کا عہد مصائب و آلام سے آلودہ نہیں ہوا۔ شلر ۱۴ سال کی عمر میں اس خواب راحت سے چونکا۔ تو اس نے محسوس کیا۔ کہ عرصہ حیات میں اترنے سے بیشتر کن ہتھیاروں سے مسلح ہونا ضروری ہے۔ اس کی تعلیم اس اسلوب سے ہوئی تھی۔ کہ کبھی ماں نے کچھ پڑھا دیا۔ اور کبھی باپ نے کچھ بتا دیا۔ یا بعد میں لڈ ویگ برگ سے لاطینی سکول میں نام پیدا کیا۔

اسی عرصہ میں ڈیوک آف ورٹمبرگ نے سیاسی خرخشوں سے تنگ آکر اپنے علاقہ کا صدر مقام بدل ڈالا۔ اور سٹٹ گارٹ کی بجائے لڈویگ برگ کو مستقر بنایا۔ اور لوگوں کی توجہ سیاسی تنازعات سے ہٹانے کے لئے تھیٹر قائم کر دیا۔ یہاں اس نے دو مدرسے قائم کئے۔ ایک علمی (لاطینی) اور دوسرا حربی۔ جب شلر اول الذکر مدرسہ کی تعلیم ختم کر چکا۔ تو ڈیوک نے اس کے والدین سے تحریری اقرار لیا کہ فارغ التحصیل ہونے پر وہ صرف حکومت ورٹمبرگ کی خدمت کرے گا۔ اُسے مدرسہ حربیہ میں داخل کر دیا۔ اور اخراجات کا خود کفیل ہوا۔ اور ۱۷ جنوری ۱۷۷۳ء کو شلر سالی ٹیوڈ کی ملٹری اکاڈمی (مکتب حربیہ) میں داخل ہو گیا۔ اب اس نے الٰہیات سے اعراض کر کے قانون اور فقہ کے مطالعہ کی طرف توجہ کی۔ وہ ہر کام نہایت محنت تن دہی اور شوق سے سرانجام دیتا تھا۔ لیکن بار بار وردی تبدیل کرنا اور قواعد پر پابند ہیں حاضر ہونا اُسے بہت شاق گزرتا تھا۔ اس کے بعد جب سٹٹ گارٹ میں مدرسہ حربیہ کھلا۔ جس میں سالی ٹیوڈ سکول کے لڑکے ۱۷۷۵ء میں نقل کئے گئے۔ تو اس نئے مدرسہ میں طب کی تعلیم کا بھی اہتمام کیا گیا۔ اور جو لڑکے اس تعلیم کے لئے نامزد ہوئے۔ ان میں شلر بھی شامل تھا لڑکپن ہی میں اسے الٰہیات کو قانون سے اور قانون کو طب سے تبدیل کرنا پڑا۔ اسی تعلیم کے دوران میں شلر نے ۱۷۷۷ء میں اپنا پہلا ڈرامہ "قزاق" لکھنا شروع کیا۔

شلر اور گوئٹے کی ملاقات ایک جلسہ تعلیم انعامات مدرسہ حربیہ میں ہوئی۔ جس میں گوئٹے ڈیوک کے پاس بیٹھا انعامات کی تقسیم کا نظارہ دیکھ رہا تھا۔ اس جلسہ میں شلر کو جملہ اصناف طب میں اول رہنے کے صلے میں مختلف انعامات ملے۔ گوئٹے جو اتفاقاً وہاں آن نکلا تھا اس غیر معمولی قابلیت کو دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ ۶ فٹ ۴ انچ لمبا جوان انعام پر انعام چھین رہا ہے

دسمبر ۱۷۸۰ء میں جب شلر نے بائیسویں سال میں قدم رکھا۔ تو اس نے مدرسہ حربیہ چھوڑا۔ اور سٹٹ گارٹ کی ایک پلٹن میں ڈاکٹر مقرر ہوا۔ ۱۷۸۱ء میں شلر نے "قزاق"

اپنے خرچ پر چھپوا کر شائع کیا۔ یہی ڈرامہ اس کی لازوال شہرت کا سنگِ بنیاد ہے۔ اور اسی ڈرامہ نے اس کی زندگی کی کایا پلٹ دی۔ ایسا طوفان خیز اور آتش فشاں ڈرامہ اس سے پیشتر نہ لکھا گیا تھا۔ خود شلر اسے مہیب خیال کرتا تھا۔ اور حقیقت میں ایسا لرزہ بر اندام کرنیوالا ڈرامہ شاید ہی کوئی اور ہو۔ جو نوجوانوں کے دلوں میں ذہنی ولولہ جوش اور اُمنگ پیدا کرنے کا عجیب آلہ ہے۔ نوجوانوں نے بڑی گرمجوشی سے اس کا خیر مقدم کیا۔ خود پڑھا اور وں کو سُنایا۔ اور اُس کی فروخت کا بازار گرم کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ لیکن یہ محض افترا ہے۔ کہ "قزاق" کے مطالعہ سے بہت سے اچھے گھرانوں کے نوجوان وارداتیں کرنے لگے۔ جنوری ۱۷۸۲ء میں مانہیم کے تھیٹر کے ڈائرکٹر نے اس ڈرامے کو سٹیج کرنے کا اعلان کیا۔ اور شلر نے ضروریاتِ سٹیج کو ملحوظ رکھ کر اس میں جا بجا کانٹ چھانٹ کر دی۔ اسی اثنا میں علاقہ گریسان کے مجسٹریٹ نے ڈیوک کے پاس شکایت کی کہ اس ڈرامہ میں گریسان کو چوروں کا ایشنز کہا گیا ہے۔ ڈیوک نے شلر کو خوب ڈانٹا ڈپٹا اور اسے اس قسم کی تصنیفات سے منع کر دیا۔ مگر جرمنی کی شلر فہمی ورٹم برگ کے نقاد سے مختلف تھی ستی ۱۷۸۲ء میں "قزاق" مانہیم میں بڑی شان سے سٹیج ہوا۔ اور نہایت کامیاب رہا۔ شلر کے لئے محال تھا۔ کہ

اس کا ڈرامہ سٹیج ہو رہا ہو اور وہ دیکھنے کے لئے نہ جائے اس لئے بھاگ نکلا۔ اور مانہیم سے جب ڈرامہ دیکھ کر لوٹا۔ تو اُسے ۱۴ دن تک زیر حراست رہنا پڑا۔ اور رہا ہونے پر یہ حکم ملا۔ کہ وہ کبھی ورٹم برگ کی حدود سے باہر نہ جائے اور صرف طبی مضامین لکھا کرے۔ اس جبر و استبداد کا یہ نتیجہ نکلا۔ کہ شلر ستمبر ۱۷۸۲ء میں بھاگ کر مانہیم چلا گیا۔ انگریزی میں اس کے چار ترجمے ٹیلر۔ لارڈ ڈوسل۔ پادری رنڈر اور کرسٹو فربان کے قلم سے شائع ہوتے ہیں۔ اسی سال شلر نے اپنا دوسرا ڈرامہ " فائیضو" تیار کیا۔ مگر مانہیم تھیٹر کے ڈائرکٹر نے اسے سٹیج کے قابل خیال نہ کیا۔ اور اُس نے مسودہ ایک کتب فروش کے پاس فروخت کر دیا۔ اور لنگنن میں ایک دوست کے ہاں چلا گیا۔ جہاں اس نے اپنے تیسرے ڈرامہ موسومہ "ڈان کارلو" کے ابتدائی سین لکھے۔ جولائی ۱۷۸۳ء میں شلر مانہیم میں واپس آیا اور ایک سال کے لئے بطور ڈرامہ نگار پانسو فلورنس ماہوار پر مانہیم تھیٹر میں ملازم ہو گیا۔ اور ۱۷۔ جنوری ۱۷۸۴ء کو " فائیضو" سٹیج پر آیا۔ اور یورپ بھر میں دھوم مچ گئی۔ برلن میں سٹیج ہوا۔ اور قبول عام کا خلعت ملا۔ ڈاتٹنا پایۂ تخت آسٹریلیا میں خود شہنشاہ جوزف دوم نے ایکٹروں کے لئے پارٹ مرتب کئے۔ مگر شلر اور اس کے احباب نے اسے ناکام قرار دیا۔ " فائیضو" کے بعد اس کا ڈرامہ "لوئی مدرن" بہت سے

رد و بدل کے بعد "قابیل اور محبت" کے نام سے ۹ مارچ ۱۷۸۴ء کو سٹیج پر آیا۔ شلر ایک پرائیویٹ بکس میں بیٹھا نہایت توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ "فائیضو" کی ناکامی کا گھاؤ تازہ تھا۔ اور اسے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ کہ کہیں اس ڈرامہ کا بھی وہی حشر نہ ہو۔ جب ڈرامہ ختم ہوا۔ تو تمام حاضرین نے سروقد کھڑے ہو کر خراج تحسین ادا کیا۔

اور شلر کو جلوت میں آکر شکریہ ادا کرنا پڑا۔ ۱۷۹۵ء میں پیٹر گولباتن نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔ ۱۷۹۶ء میں لیوسن نے دستور اعظم کے نام سے بہتر ترجمہ پیش کیا۔ فروری ۱۷۸۴ء میں شلر نے اپنا وہ معرکۃ الآرا مضمون شائع کیا۔ جو "سٹیج کے اخلاقی اثر" کے موضوع پر اس نے ایک سوسائٹی میں پڑھا تھا۔

۱۷۸۷ء میں شلر کا ڈرامہ "ڈان کارلو" پریس سے نکلا۔ اور ۳۰ اگست ۱۷۸۷ء میں ہمبرگ تھیٹر میں سٹیج ہوا۔ اس سے پہلے انکے تمام ڈرامے نثر میں تھے۔ یہ پہلا ڈرامہ ہے جو شلر نے نظم کے سانچے میں ڈھالا۔ برلن کے ایک مینجر نے اسے سٹیج کے لئے خریدا۔ مگر وہ اچانک اپنے عہدہ سے معزول کیا گیا۔ اور ایک اور مینجر نے ہانور کے لئے معاملہ طے کیا۔ مگر بیچارا رقم ادا کرنے سے قاصر رہا۔ یہ ڈرامہ ایک منظوم ٹریجڈی ہے۔ جس میں محبت اور دوستی کو حریت کے جذبات میں سمو کر ایک خاص رنگ پیدا کیا گیا ہے۔

نقادوں نے اس پر یہ اعتراض کیا کہ ایک تو یہ ڈرامہ ازحد طویل ہے۔ دوسرے ایکٹ سوم کے بعد مارکوئس پوسا "ڈان کارلو" کی نسبت زیادہ توجہ کا مستحق ہو جاتا ہے۔ اس پر بحث شروع ہوئی۔ اور شلر نے مکتوبات بابت "ڈان کارلو" میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ شلر کا جواب تھا کہ اس ڈرامے میں اس کا مقصد اولین خود اپنے دل کا حال کہہ سنانا تھا۔ اور اس میں وہ کامیاب ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ تو شلر کی کسی اور تصنیف نے اور نہ جرمن لٹریچر کی کسی اور کتاب نے جرمن قوم پر وہ اثر کیا۔ جو "ڈان کارلو" کی قسمت میں تھا۔ آج تک اہل جرمنی اس کے مطالعہ سے حیات تازہ حاصل کرتے ہیں۔ شلر معترف ہے کہ ایکٹ سوم کے بعد مارکوئس پوسا زیادہ جاذب توجہ ہو گیا ہے اور اس کی وجہ یہ بیان کرتا ہے۔ کہ چار سال کی تیاری کے عرصہ میں اس کے خیالات کارلو کے دل کی سطح سے بلند ہو گئے۔ اور اس لئے اسے مارکوئس پوسا کو اپنا نفس ناطقہ بنانا پڑا۔ ۱۷۹۸ء میں نورن اور سٹوڈارٹ نے اسے زبان انگریزی میں منتقل کر دیا۔ اور اسی سال لارڈ ڈاسل نے اس کا ترجمہ شائع کیا۔ ۱۸۰۲ء میں اس کا ترجمہ سٹیج کے نکتہ نگاہ سے کیا گیا۔ اس کے بعد ۱۸۳۶ء میں بالٹی مور سے ایک ترجمہ نکلا۔ ۱۸۳۷ء میں بروس نے مانہیم سے ایک نیا ترجمہ بھیجا۔ ۱۸۴۳ء میں کوٹرل نے طبع آزمائی

کی اور اسی سال ڈولنٹر نے اس کا ترجمہ پیش کیا۔

۲۱- جولائی ۱۷۸۷ء کو شلر ویمر پہنچا لیکن ڈیوک ملک کے دورہ پر گیا تھا۔ ڈچز بھی موجود نہ تھی۔ اور گوئٹے اٹلی کی سیاحت میں مشغول تھا۔ اس نے ایک مکان کرایہ پر لیا۔ اور ان کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ اسی اثنا میں اُسنے لینگ فیلڈ خاندان سے رسم و راہ پیدا کی۔ ماہ ستمبر میں گوئٹے اٹلی سے واپس آیا۔ تو شلر سے ایک طویل ملاقات کی۔ اور دونوں باکمال گھنٹوں باتوں میں مشغول رہے۔

۸- دسمبر کو گوئٹے نے ڈیوک کے پاس سفارش کی کہ شلر کو فلسفہ تاریخ کا پروفیسر مقرر کیا جائے۔ جس کیلئے وہ تاریخ انقلاب نیدرلینڈ کے مصنف ہونے کی حیثیت سے بہت موزوں ہے۔ ۱۷۸۹ء میں وہ اس عہدے پر بغیر کسی تنخواہ یا حق الخدمت کے مقرر ہو گیا لیکن اس تقرر میں سوائے عزت کے اور کچھ نہ تھا۔ اس لئے مالی مشکلات جنھوں نے کبھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا رونما ہو گئیں۔

۲۲- فروری ۱۷۹۰ء کو شلر نے ۳۰ سال کی عمر میں شادی کی۔ اور اسکی بیوی کی دُور اندیشی اور وفا شعاری نے تنگدستی کی خلش کو بہت کچھ کم کر دیا۔ اور ڈیوک نے بھی ۶۷ پونڈ (۲۰۰ تھیلر) سالانہ پنشن مقرر کر دی مگر شادی کے پہلے ہی سال میں اس کی صحت بگڑ گئی۔ اور سینہ میں ہوک اُٹھنے لگی۔ لیکن باوجود ناسازی طبع وہ اپنے کام میں بشوق تمام مشغول رہا۔ اور بیوی پر اپنی بیماری کا خطرہ ظاہر نہ ہونے دیا۔ مگر روپیہ کی قلت نے انہیں بہت پریشان کیا۔ ادھر ڈاکٹر سمندر کے کنارے تبدیل آب و ہوا کے لئے جانے پر مصر تھا۔ آخر ڈنمارک کا ایک شاعر باگی سن بروئے کار آیا اور اس کی توجہ سے ۳ سال کے لئے ایک ہزار تھیلر سالانہ پنشن مقرر ہو گئی۔ اب شلر کو ذرا چین کا پہلو نصیب ہوا۔ اور اس نے کانٹ کے فلسفہ کا مطالعہ شروع کیا۔ اور ساتھ ساتھ مذکورہ بالا تاریخ کا کام بھی ہوتا رہا۔ جو ۱۷۹۲ء میں سرانجام ہوا۔ جب شلر کا ہاتھ اس کام میں لگا تھا تو اس کا دل و دماغ ولمن سٹین کی سوانح حیات کو ڈرامہ کی طرز پر ترتیب دینے میں مشغول تھا۔

۱۷۹۳ء سے مئی ۱۷۹۴ء کے وسط تک شلر مختلف شہروں میں پھرتا رہا۔ اسی زمانے میں اس کا پہلا بیٹا تولد ہوا۔ اور انہیں دنوں میں اس کا معاملہ فریڈرک کوٹا نامی ایک الوالعزم کتب فروش سے ہو گیا۔ اور معقول آمدنی کی صورت بن گئی۔

اب شلر نے "ڈان ہیرن" نام ایک ماہوار ادبی رسالہ نکالا۔ اور تمام مشہور ادیبوں نے اس میں مضامین ارسال کرنے کا وعدہ کیا۔ لیکن گوئٹے کے سوا کوئی مرد میدان ثابت نہ ہوا۔ اور مدت تک صرف شلر اور گوئٹے کے مضامین پر اس کی بقا کا انحصار رہا۔ شلر اور گوئٹے پبلک

کی ناقدری اور کم ذوقی سے جل اُٹھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ رسالہ کی اشاعت برائے نام رہ گئی ہے۔ تو دونوں نے ملکر ایک سلسلہ مضامین شروع کیا جسمیں مصنفوں کی بد مذاقی پر حملہ کیا گیا تھا۔ اُنھوں نے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ ایک اچھا خاصہ معرکہ شروع ہوا۔ جس میں گوئٹے اور شلر نے تھیٹر لٹریچر کو رواج دینے کے لئے جان لڑا دی۔

۱۷۹۰ء میں "ڈان ہیرلن" کی ادارت سے کنارہ کش ہوکر ڈرامہ "ولین ہینسٹین" کی طرف متوجہ ہوا۔ اور اُسے تین حصّوں میں تقسیم کیا۔ اسی عرصہ میں گوئٹے ویمر کے تھیئٹر کا ڈائرکٹر ہو گیا۔ اور اُس نے ڈرامہ مذکور کا پہلا حصّہ ۱۲ اکتوبر ۱۷۹۸ء دوسرا حصّہ ۳۰ جنوری ۱۷۹۹ء کو اور تیسرا حصّہ ۲۵ اپریل ۱۷۹۹ء کو سٹیج کیا۔ تاریخ ادبیاتِ جرمن میں ان ڈراموں کی بدولت یہ سال خاص اہمیت رکھتا ہے۔

شلر کا نام اقصائے جرمن میں گونج رہا تھا۔ کہ انگلستان کے دو سربر آوردہ شاعر ورڈس ورتھ اور کولرج سیر کے لئے جرمنی میں آئے ہمبرگ سے کولرج ورڈس ورتھ سے علیحٰدہ ہوکر ویمر پہنچا۔ اور ولین ہنسٹین کو سٹیج پر دیکھ کر کمال محظوظ ہوا۔ انگلستان لوٹا تو اس نے اس وقت تک دم نہ لیا۔ جبتک دو حصّوں کا ترجمہ انگریزی میں نہ کر ڈالا۔ جو ۱۸۰۲ء میں چھپا تیسرے حصّے کا ترجمہ ۱۸۳۰ء میں لارڈ السمیر نے کرکے اس کتاب کو انگریزی میں مکمل کر دیا۔

اب شلر نے ویمر میں مستقل سکونت اختیار کی۔ وال ہنسٹین کی عدیم النظیر کامیابی نے اس کا حوصلہ بڑھا دیا اور اس نے ایک اور ڈرامہ تیار کرنے کا تہیہ کیا۔ مضمون کے لئے اس کی نگاہِ انتخاب سکاٹ لینڈ کی بدقسمت ملکہ میری سٹوارٹ پر پڑی۔ اور باوجود مرض کی صعوبت کے میری سٹوارٹ کی سوانح حیات کا مطالعہ شروع کیا۔ ڈیوک آف ویمر فرانسیسی ڈراموں کے ترجموں کو بہت پسند کرتا تھا۔ شلر نے ڈیوک کی توجہ کسی دوسری طرف مبذول کرنے کے لئے شیکسپیئر کے "میکبتھ" کو جرمن میں ترجمہ کیا۔ جو ۱۴ مئی ۱۸۰۰ء کو ویمر کے سٹیج پر آیا۔ ڈرامہ میری سٹوارٹ ۹ جون ۱۸۰۰ء کو لکھا گیا۔ اور ۱۴ جون کو سٹیج ہوا۔ اس ڈرامہ کی کامیابی نے شلر کو یقین دلا دیا۔ کہ وہ واقعی ڈرامہ نگار ہے۔ شلر کی خواہش تھی۔ کہ یہ ڈرامہ انگلستان میں سٹیج ہوجائے۔ جی سی ملیش نے ۱۸۰۲ء میں اس کا انگریزی ترجمہ شائع کیا۔ دونوں نے ملکر ایک انگریزی کے تھیئٹر کے ڈائرکٹر سے اس کے سٹیج کرنے کے لئے خط و کتابت کی۔ مگر کچھ فیصلہ کن بات نہ ہوئی ۱۸۰۵ء میں شلر نے اپنا ڈرامہ "میڈ آف آولینز" شائع کیا۔ جو ۱۶ اپریل ۱۸۰۱ء کو ختم اور ۱۷ ستمبر ۱۸۰۱ء کو سٹیج ہوا۔ اس ڈرامہ میں گوئٹے خاص دلچسپی لیا کرتا تھا۔ انگریزی

میں اس کے ترجمے "ڈرنک واٹر" (۱۸۴۳ء) لوکس (۱۸۴۱ء) ٹامسن (۱۸۴۵ء) نے کئے۔ مگران سب سے بہتر ترجمہ مس سوانوک کا ہے۔ جو ۱۸۴۶ء میں شائع ہوا۔ جس کا حق تصنیف ابتک محفوظ ہے۔ اس کے بعد شلر نے ڈرامہ "مینا کی دلہن" لکھا۔ جو ۱۹۔ مارچ ۱۸۰۳ء کو ویمر میں سٹیج ہوا۔ اور کامیاب رہا۔ اس کے پہلے ترجمے کے لئے انگریزی زبان ولیم ہٹر کی مرہون منت ہے۔ ازاں بعد اوان نے ۱۸۴۷ء میں اور لاج نے ۱۸۴۲ء میں اس کے تراجم پریس کے حوالے کئے۔ اسی شغل کے درمیان ڈیوک آف ویمر کی سفارش پر شہنشاہ نے اسے طبقۂ اُمرا میں داخل کیا۔ اور اس کا نام وان کے لقب سے مزیّن ہوا۔ اب اس کا نام فریڈرک وان شلر ہو گیا۔ یہ ۱۸۰۲ء کا واقعہ ہے۔

ڈیوک کی خوشنودیٔ مزاج کے لئے تفریحاً دو فرانسیسی کامڈیوں کا ترجمہ کرنے کے بعد ۲۵۔ اگست ۱۸۰۳ء کو ڈرامہ "ولیم ٹل" شروع کر کے ۱۸۔ فروری ۱۸۰۴ء کو ختم کیا۔ یہ ڈرامہ ۱۷۔ مارچ ۱۸۰۴ء کو کھیلا گیا۔ اور مُصنّف کے شایانِ شان رہا۔ اس ڈرامہ سے زیادہ شلر کی کسی تصنیف کے ترجمے نہیں ہوتے۔ رابنسن نے ۱۸۲۵ء میں ٹالبٹ نے ۱۸۴۶ء میں ولیم پیٹر نے ۱۸۴۸ء میں بان فیلڈ نے ۱۸۳۱ء میں مس ملون اور برکس نے ۱۸۴۷ء میں انگریزی میں اپنے ترجمے شائع کئے۔

۱۸۰۴ء میں شلر برلن گیا۔ جہاں اس کے تمام ڈرامے یکے بعد دیگرے سٹیج ہوتے۔ اور شلر کی بہت قدر و منزلت ہوئی۔ جب ویمر میں واپس آیا تو دیرینہ مرض عود کر آئی۔ اور شلر ایسا چارپائی پر پڑا۔ کہ پھر نہ اُٹھا۔ جب ذرا افاقہ ہوا تو قلم اُٹھایا۔ اور کچھ نہ کچھ لکھ ڈالا۔ جس کا نتیجہ ریسے ساین کے ایک ڈرامہ کے ترجمہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ انہیں دنوں گوئٹے بھی بیمار ہوا۔ اور اس کی جان کے لالے پڑ گئے۔ شلر عیادت کو گیا۔ اور دو بیمار شاعر بغلگیر ہوئے اور انہوں نے ایکدوسرے کی پیشانی پر بوسے دیئے۔ مگر شلر نے گوئٹے کو مایوس پایا۔ اس کی حالت واقعی شلر کی نسبت زیادہ خطرناک تھی۔ مگر قدرت کے کھیل عجیب ہیں۔ گوئٹے بچ نکلا۔ اور شلر چل بسا۔ یکم مئی ۱۸۰۵ء کو پھر شدّت سے بُخار چڑھا۔ اور ۹۔ مئی ۱۸۰۵ء کو سپردِ لحد ہوا۔

شلر نے صرف ۴۵ سال کی عمر میں وہ کمال حاصل کیا کہ آج تک اُس کا نام محفلِ ادب میں نہایت عزّت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ اِس کا جنازہ اس دھوم دھام سے اُٹھا کہ فرمانروایانِ مُلک کے ماسوا کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ ہم نے شلر کو محض

ایک ڈرامہ نگار کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اور اس لئے اس کے فلسفۂ نظم اور دیگر ادبی کاوشوں کی طرف توجہ نہیں کی۔ ہم اس مضمون کو یہ لکھنے پر ختم کرتے ہیں۔ کہ اس نے کبھی ماسوا ترجموں کے کامیڈی کی طرف مطلق توجہ نہ کی۔

نور الٰہی
محمد عمر

نوائے راز

اپنی خودی کو پھونک دے، حاصل سوز و ساز بن　　محفل حسن و عشق میں پردہ کشائے راز بن
صرف خرام ناز ہو، گردِ رہِ نیاز بن　　پھر ہے ترے لئے بقا موجب امتیاز بن
توڑ یہ قفل خامشی، آہ سے رُوح پھونک دے　　سازِ نفس کو چھیڑ کر نغمۂ جاں نواز بن
نالۂ غم میں ہے نہاں، سوز بھی اور ساز بھی　　آپ ہی نغمۂ سرور، آپ ہی نے نواز بن
شرط ہے سعیِ مستقل فکرِ حصول کار میں　　اپنے ہر ایک کام کا آپ ہی کارساز بن
کون یہ جلوہ بار ہے، کون و مکاں میں ہر طرف　　چشم حقیقت آشنا! پردہ درِ مجاز بن
ہاں کبھی اس طرف بھی آ، جلوہ فزائے بزم طوز　　مجھ کو بھی اِک جھلک دکھا میرا بھی دلنواز بن
سرد ہے بزمِ عاشقی، چھیڑ دے داستانِ حسن　　پیکرِ غزنوی میں آ، شیفتۂ ایاز بن

راز

انجامِ عشق

گزشتہ سے پیوستہ

کچھ مدت کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میرے سر پر بلاؤں کا ایک ہجوم منڈلا رہا ہے۔ نوعِ انسان کے شیطانی لشکر کے شور و غُل اور طوفانِ بدتمیزی سے کہیں بھی نجات نہیں ملتی۔ شام کو حسبِ معمول مَیں سمندر کے کنارے پر ٹہل رہا تھا۔ آفتاب پہاڑیوں کے پیچھے غروب ہو رہا تھا۔ ذرات ریگ زرّیں تھے۔ اور سمندر شوکت و جلال میں ملبوس تھا میرے پاس ایک کتاب بھی تھی۔ ابھی میں نے ایک ورق بھی نہیں اُلٹا تھا کہ مجھے کسی شخص کا سایہ دکھائی دیا۔ مَیں نے سخت متعجب ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ چند گز کے فاصلے پر ایک دراز قامت اور تنومند انسان میری جانب سے بالکل بے خبر اور بے پروا منیسی کی چٹان پر ٹکٹکی باندھے کھڑا تھا۔ سیاہ رنگ، سیاہ بال، گھنگریالی ڈاڑھی، عقاب کی سی ناک اور کانوں میں سونے کے بالے مل جل کر اس کو ایک وحشی مگر عالی ظرف، اور شریف الطبع انسان ظاہر کر رہے تھے۔ مَیں نے ایک ہی نظر میں پہچان لیا۔ یہ وہی شخص تھا جس کو پہلی رات میں نے اُس شکستہ جہاز پر دیکھا تھا۔

"ایں!" مَیں نے تعجب کی آواز میں کہا۔ "کیا تم صحیح سلامت کنارے پر پہنچ گئے تھے۔"

"ہاں"، اُس نے انگریزی زبان میں کہا۔ "اس میں میرا کوئی کمال نہ تھا۔ موجوں نے دھکیل کر پھینک دیا تھا اے کاش! میں بھی غرق ہو گیا ہوتا، دو ماہی گیروں نے مجھے کھینچ کر باہر نکالا اور میری تیمارداری بھی کی بلکہ سچ پوچھو تو مَیں ان کو شکریے کا مستحق ہرگز نہیں سمجھتا۔"

"ہا ہا" یہ تو میرے ہی دل گردے کا انسان ہے" مَیں نے پوچھا۔ "مگر آپ غرق ہونے کے کیوں آرزومند ہیں؟" "کیونکہ" اُس نے چیختی ہوئی آواز میں کہا۔ "وہاں وہاں، اس نیلگوں خلیج میں میری رُوح، میرا خزانہ —— آہ! میرا تمام سرمایۂ حیات جس کے لئے مجھے زندگی عزیز تھی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مدفون ہے۔"

"ہر روز کروڑوں زندگیاں تباہ ہوتی رہتی ہیں تو پھر اس لایعنی آہ و زاری اور شور و شغب سے کیا حاصل! تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہ زمین جس پر تم کھڑے ہو میری ہے۔ اور مَیں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ یہاں سے فوراً نکل جاؤ میرے لئے تم لوگوں میں سے ایک کا بوجھ ہی کافی ہے۔"

"ہم میں سے ایک"!

"ہاں — اور اگر اس کو بھی ساتھ لے جاؤ تو یہ اور بھی بہتر ہے۔"

ایک لمحے کے لئے وہ میری طرف نہایت غور سے دیکھتا رہا۔ اور پھر چیخیں مارتا ہوا دیوانہ وار میرے مکان کی طرف بھاگا۔ میں غصے سے آگ بگولا ہو کر اس کے پیچھے بھاگا۔ مگر میرے پہنچنے سے پیشتر وہ دروازے کے اندر داخل ہو کر میری نظروں سے غائب ہو چکا تھا۔ اندر سے مجھے چیخ پکار کی آواز سنائی دی۔ اور جب میں قریب پہنچا۔ تو وہ شخص نہایت زور اور تیزی کے ساتھ بول رہا تھا۔ اندر داخل ہو کر دیکھا کہ ریوزینی دبک کر کمرے کے ایک کونے سے لگی ہوئی ہے۔ اور اس کے چہرے سے خوف ودہشت اور نفرت وحقارت کے آثار نمایاں ہیں۔ دوسرے شخص کے دل میں جذبات کا تلاطم بپا ہے۔ اُس کی آنکھوں سے سُرخ انگارے نکل رہے ہیں۔ اس کے ہاتھ جوشِ جذبات سے کانپ رہے ہیں۔ اور وہ بھرّائی ہوئی اور پُرجوش آواز میں اس کی منت سماجت کر رہا ہے۔ جب میں داخل ہوا۔ تو وہ شخص سوفیا کی طرف بڑھا۔ سوفیا کے مُنہ سے اس خرگوش کی طرح کی چیخ نکلی جس کی گردن شکاری کتے کے دانتوں میں ہوتی ہے۔

میں نے اس کو پیچھے ہٹا کر کہا۔ "واہ! خوب" "ایں چہ معنی وارد کیا اسے مہمان سرائے سمجھ رکھا ہے؟"

"معاف کیجئے یہ میری بیوی ہے مجھے ڈر تھا کہ وہ غرق ہو گئی ہے۔ میں آپ کا کس مُنہ سے شکریہ ادا کروں کہ آپ نے مجھے دوبارہ زندگی بخشی ہے۔"

میں نے کڑک کر پوچھا "مگر تم کون ہو؟"

"میں آچینجل کا باشندہ یعنی روسی ہوں۔"

"تمہارا نام؟"

"اورگینف"

"اورگینف! — اور اس کا نام سوفیا ریوزینی! وُہ تمہاری بیوی نہیں ہے۔ اس کے پاس کوئی انگوٹھی بھی نہیں۔"

آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "آسمانی بادشاہت کے نزدیک ہم خاوند اور بیوی ہیں۔ ہماری رُوحیں ارضی قوانین سے بالا اور پاکیزہ تر قوانین کے ماتحت وابستہ ہیں۔"

وہ یہ باتیں کہہ رہا تھا اور لڑکی میرے پیچھے کھسک کر استمداد کے لئے ہاتھ دبا رہی تھی۔ اس نے اپنی تقریر کو جاری رکھا۔ "جناب میری بیوی مجھے واپس دے دیجئے"

"دیکھو!" میں نے نہایت تلخ ہو کر کہا۔ "مجھے خود اس لڑکی کی موجودگی شاق گزرتی ہے۔ کاش! میں اس کا چہرہ تک نہ دیکھتا۔ خدا کی قسم اگر وہ آج فنا ہو جاتے تو مجھے ایک

لمحے کے لئے بھی رنج نہ ہو۔ مگر ایسے حالات میں جبکہ وُہ تم سے خوفزدہ اور متنفر ہے۔ مَیں اس کو تمہارے حوالے نہیں کر سکتا۔ بہتر کہ اب تم یہاں سے رفو چکر ہو جاؤ۔ اور مجھے دوبارہ مُنہ نہ دکھاؤ۔"

"تو پھر کیا تم اس کو واپس نہیں دوگے؟ اور اگر مَیں اس کو چھین کر لے جاؤں؟" جوشِ جذبات سے اس کا سیاہ رنگ اور بھی سیاہ ہو گیا۔

میرا خون کھولا یا اور مَیں نے پاس ہی سے ایک لکڑی اٹھا کر نہایت تُند ہو کر کہا "جاؤ یہاں سے دُور ہو جاؤ۔ ورنہ تمہاری خیر نہیں۔" ایک لمحے کے لئے مجھے مذبذب نگاہوں سے دیکھ دیکھ کر وُہ چلا گیا۔ مگر چشم زدن میں وہ پھر ہمارے دروازے میں کھڑا تھا۔ "اس کی کہانتک حفاظت کروگے عورت میری ہے اور مَیں اس کو لیجا کر ہی چھوڑوں گا۔ وحشی منتقم میں روسی سکاچ سے کم نہیں ہوتا۔"

مَیں نے اُچھل کر کہا۔ "ہاں دیکھا جائیگا" مگر وہ ایک دم میں رفو چکر ہو گیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے سامنے کی تاریکی میں غائب ہو گیا۔

اس کے بعد تقریباً ایک مہینے کے لئے ہم امن چین سے رہے۔ گو ہم کبھی ایکدوسرے سے ہمکلام نہیں ہوتے تھے۔ کبھی کبھی وہ میرے "دار التجربہ" میں خاموشی سے بیٹھ کر مجھے دیکھتی رہتی پہلے پہلے تو یہ دخل در معقولات نظر آتا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ مَیں اس کی موجودگی سے مانوس ہو گیا۔ آہستہ آہستہ وہ اپنے اسٹول کو کھسکا کھسکا کر میرے قریب لے آئی۔ مگر اب وہ کسی حد تک میری معاون بھی ہو گئی تھی۔ پنسلیں، نلکیاں، بوتلیں وغیرہ پکڑا دیا کرتی تھی۔

گھر سے باہر وُہ زیادہ دُور تک نہ جاتی تھی۔ اور دہلیز سے باہر قدم رکھنے سے پیشتر وہ کھڑکیوں میں سے اِدھر اُدھر جھانک لیا کرتی تھی۔ اس کو ڈر تھا کہ کہیں پھر اِس کا ہم وطن اس کو اُٹھا کر نہ لے جائے۔ اِس نے ایک اور کام بھی کیا۔ مَیں نے ایک پُرانا پستول ردّی میں پھینک رکھا تھا۔ اس نے اس کو نکال کر خوب صاف کیا۔ اور پھر دروازے کے قریب ایک تھیلے کے ساتھ جس میں کچھ گولیاں تھیں لٹکا دیا۔ جب کبھی مَیں باہر جانے لگتا تو وُہ پستول ساتھ لے جانے پر بہت مصر ہوتی۔ میری عدم موجودگی میں وہ دروازے کو ہمیشہ مقفّل رکھتی تھی۔ ان خدشات کے باوجود بھی وُہ خوش و خرّم تھی۔ اور میری ملازمہ کا دست و بازو بنی رہتی تھی۔

کچھ مُدّت کے بعد مجھے بھی معلوم ہو گیا کہ اس کے شبہات بیجا نہ تھے۔ اور وہ شخص فی الحقیقت ہمارے گردونواح میں پوشیدہ تھا۔ ایک رات مَیں سخت بے چین تھا۔ مَیں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ آسمان ابر آلود تھا

اور میں بمشکل سمندر کے کنارے پر اپنی کشتی دیکھ سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ جب میری آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہوگئیں تو مجھے اپنے دروازے کے سامنے کوئی سایہ۔ اور بھیانک چیز نظر آئی میں اس کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ کہ یکایک چاند بے نقاب ہوگیا۔ اور تمام خلیج اور اس کا لمبا کنارا سرد اور شفاف شعاعوں میں محبوس ہوگیا۔ اس روشنی میں میں نے پہچان لیا۔ کہ یہ وہی بُڑھا تھا۔ ایک موٹے تازے مینڈک کی طرح آسن جمائے اس کمرے کی طرف ٹکٹکی باندھے ہوئے تھا۔ جس میں دو لڑکی اور ملازمہ سو رہی تھیں۔ جی چاہا کہ فائر کردوں۔ مگر پھر میرا غصہ حقارت آمیز رحم میں تبدیل ہوگیا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "کس قدر بیوقوف ہے! تو وہی شخص ہے جو موت و ہلاکت کو پُرسکون نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ مگر تیرے تمام خیالات اور جذبات صرف ایک لڑکی پر مرکوز ہیں —— ایسی لڑکی پر جو تیری صورت سے بیزار ہے۔ ہزاروں عورتیں تجھ پر جان و دل سے فدا ہونگی۔ مگر تو صرف اس کے پیچھے دیوانہ وار بھٹکتا پھرے گا جس کو تجھ سے کوئی لگاؤ نہیں۔" جب میں اپنے بستر پر واپس آیا۔ تو مجھے اس کے حال پر بے اختیار ہنسی آئی۔ مجھے یقین تھا۔ کہ میری کھڑکی کی سلاخیں اور دروازوں کے قفل مضبوط ہیں۔ میری بلا سے وہ تمام رات وہیں دھونی رمائے بیٹھا رہتا۔ صبح کو جب میں باہر نکلا۔ تو حسب توقع وہ وہاں نہیں تھا۔

تھوڑے ہی عرصے کے بعد مجھے پھر اس کا سامنا ہوا۔ ایک صبح میں کشتی کھے رہا تھا۔ کنارے کنارے چند میل تک چلا گیا۔ مجھے سخت پیاس لگ رہی تھی۔ اسلئے میں ایک مقام پر لنگر انداز ہوگیا۔ یہ جگہ میری اراضی کی حدود سے باہر تھی۔ جب پانی پی کر وہاں سے اٹھا تو کیا دیکھتا ہوں۔ کہ وہی بُڑھا میرے بالمقابل کھڑا ہے۔

"میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

میں نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا "ہاں جلدی کرو۔ کیونکہ لغو باتوں کے لئے میرے پاس کوئی وقت نہیں ہے۔"

اُس نے نہایت غصے میں کہا۔ "لغو!" "اخاہ! مگر تم سکاچ لوگ بھی عجیب الخلقت ہو۔ تمہارا چہرہ درشت اور تمہارے الفاظ ترش ہیں۔ مگر مجھے یقین ہے کہ تمہارے دل کی گہرائیوں میں رحم اور نرمی ہے۔ اور تم اپنی سخت کلامی کے باوجود نہایت نیکدل اور خدا ترس ہو۔"

"خدارا اپنی داستان کو جلد ختم کرو۔ اور اپنا راستہ لو۔ کیونکہ میں تمہاری صورت سے سخت بیزار ہوں۔"

"کیا آپ کا دل کسی طرح بھی پسیج نہیں سکتا۔" آہ! دیکھو —— یہ دیکھو" اپنی جیب سے اس نے ایک

صلیب نکالی۔" اسے دیکھو، ہمارے مذاہب گو جزئیات میں مختلف ہوں۔ مگر ان کی حقیقت تو ایک ہی ہے۔"

"میں تو اس بات سے متفق نہیں ہوں۔"

اُس نے مجھے نہایت غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم بھی عجیب انسان ہو میں تو تمہاری فطرت کو سمجھنے سے قطعاً قاصر ہوں۔ تم ابھی تک میرے اور سوفیا کے درمیان حائل ہو، اے جناب! یہ روش بہت خطرناک ہے۔ ذرا ہوش سے کام لو۔ ورنہ بعد میں پشیمانی ہوگی کاش! تمہیں معلوم ہوتا کہ اُس کے لئے میں نے کن کن آفتوں اور کن کن خطروں کا سامنا کیا ہے۔ ان مہمات کے مقابلے میں جن کو میں سر کر چکا ہوں۔ تمہاری ہستی کیا ہے؟ - چاقو کا ایک وار یا پتھر کی ایک چوٹ تمہارا کام تمام کرنے کے لئے کافی ہے۔ مگر خدا نہ کرے!" اس نے دیوانہ وار چیخ ماری۔ "خدا نہ کرے! کیونکہ میں پہلے سے ہی بہت بھرا بیٹھا ہوں۔ میں یہ کام کرنا نہیں چاہتا۔"

"بہتر ہے کہ تم اپنے مُلک کو واپس چلے جاؤ۔ یہاں گھومنے سے کیا حاصل، جب مجھے یقین ہو جائیگا کہ تم یہاں سے چلے گئے ہو تو میں اسی روز اس کو روسی سفیر متعینہ اڈنبرا کے حوالے کر دونگا۔ اسی وقت تک میں خود اس کی حفاظت کرونگا۔ اور کوئی نہیں جو اس میں دخل انداز ہو۔"

"مگر تم سوفیا کو مجھ سے کیوں علیحدہ رکھتے ہو، کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اس کو ضرر پہنچاؤنگا' آہ! میں تو جہاں اُسکا پسینہ بہے اپنا خون بہانے کے لئے تیار ہوں۔"

"یہ میری خوشی ہے اور کوئی شخص اس سے تعرض نہیں کر سکتا۔"

وہ دفعتاً چراغ پا ہوگیا۔ اور ایک گھونسا تان کر میری جانب بڑھا "دیکھو!" اس نے چلا کر کہا۔ "اگر مجھے ایک لمحے کے لئے بھی یقین ہو جائے کہ اس لڑکی کے متعلق تمہارے دل میں کوئی ناجائز خیال ہے تو میں اسی وقت تمہاری جان لے لوں۔"

میں نے سمجھا کہ وہ مجھ پر حملہ آور ہونے لگا ہے میں نے پستول پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "پیچھے ہٹ جاؤ۔ ورنہ فنا کر دونگا۔"

اُس نے اپنا ہاتھ جیب میں ڈالا۔ میں نے سمجھا۔ کہ وہ بھی کوئی ہتھیار نکالنا چاہتا ہے۔ مگر اس نے سگریٹ نکالا۔ اور اُس کو سلگا کر ایک لمبا کش لگایا۔ وہ اپنی آتشِ غضب کو ٹھنڈا کرنا چاہتا تھا۔

اس نے نہایت تحمل کے ساتھ کہا: "میں تمہیں اپنا نام بتا چکا ہوں۔ میں فن لینڈ میں پیدا ہوا تھا، میری تمام زندگی سیر و سیاحت میں گزری ہے۔ میرے پاؤں میں کچھ ایسا چکر تھا۔ کہ مجھے ایک جگہ قرار نہیں تھا۔ جب

میں خود ایک جہاز کا مالک ہو گیا۔ تو ارچینچل سے آسٹریلیا تک تمام بندرگاہیں میری سیرگاہیں تھیں میں نہایت اکھڑ وحشی اور آزاد مزاج تھا۔ مگر وہاں ایک نوخیز خوبصورت اور شیریں کلام لڑکا تھا۔ وہ نازک اندام نازنینوں کے دل موہ لینے میں بہت مشاق تھا۔ اس شخص نے اس لڑکی پر بھی اپنی محبت اور سحر بیانی کے ڈورے ڈالے۔ اور اس کو میری جانب سے بالکل برگشتہ کر دیا۔ جب میں ایک لمبے سفر سے واپس آیا تو مجھے معلوم ہوا۔ کہ میرا خزانہ حیات اسی حسین لڑکے کے حوالے کیا جا رہا ہے۔ برات گرجے میں جا چکی تھی۔ میں چند رفقاء کے ہمراہ گرجے کی طرف چل دیا۔ وہ دونوں پادری کے روبرو کھڑے تھے۔ عقد ہونے سے پیشتر ہی میں ان پر جھپٹ پڑا۔ میرے ساتھیوں نے حیرت زدہ براتیوں کو مار پیٹ کر ادھر ادھر بھگا دیا۔ لڑکی کو ہم جہاز میں لے آئے اور پھر اپنا سفر شروع کر دیا۔ مجھے امید تھی کہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ وہ مجھے معاف کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتی تھی۔۔۔ میں نے اس کو اس کے محبوب سے جدا کر رکھا تھا۔ بالآخر یہ منحوس طوفان آیا اور میری تمام امیدیں میرے جہاز کے ساتھ ہی غرق ہو گئیں۔ اب میں اس عورت کو ایک نظر دیکھنے کے لئے بھی ترستا ہوں، جس کے لئے میں جان پر کھیل رہا تھا۔ شاید اب اس کا دل پسیج گیا ہو!"

میں نے واپس مڑتے ہوئے کہا۔ "تمہاری سمع خراش رام کہانی سنتے سنتے اکتا گیا ہوں۔ میرے خیال میں تم بھی عجیب بیوقوف ہو۔ اگر تمہاری محبت عارضی ہے تو اس کے مٹ جانے تک دل کو کسی اور چیز سے بہلانے کی کوشش کرو۔ اور اگر یہ غیر فانی ہے۔ تو سب سے بہتر یہی علاج ہے کہ سر پھوڑ کر مر جاؤ۔" میں زیادہ وقت ضائع نہیں کر سکتا۔" یہ کہہ کر میں اپنی کشتی کی طرف چلا گیا مگر اس کے پاؤں کی آہٹ مجھے سنائی دے رہی تھی۔

"داستان کا آغاز تو میں تمہیں سنا چکا ہوں۔ اب کسی روز تم اس کا انجام بھی دیکھ لوگے۔ بہتر ہے اس کو چھوڑ دو۔"

میں بالکل خاموش رہا۔ کچھ دور جا کر میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ کنارے پر میری طرف ٹکٹکی باندھے ہوئے کھڑا تھا۔ چند منٹوں کے بعد میں نے پھر دیکھا۔ مگر وہ غائب ہو چکا تھا۔

اس کے بعد پھر ایک طویل وقفہ آیا اور میری زندگی پھر اسی طرح گزرنے لگی۔ جس طرح جہاز کی غرقابی سے پیشتر گزر رہی تھی۔ کبھی کبھی مجھے خیال آتا۔ کہ شاید وہ چلا گیا ہے۔ مگر پھر اس کے پاؤں کے نشانات اور اس کے سگریٹوں کی راکھ مجھے متنبہ کر دیتی۔ لڑکی کے ساتھ میرے تعلقات جوں کے توں رہے۔ پہلے تو میری ملازمہ اس کو حسد کی نگاہوں سے دیکھتی تھی۔ کہ کہیں وہ گھر کی

مختارِ کل نہ بن جاتے۔ مگر میری بے مہری اور بے اعتنائی کو دیکھ کر اسے گونہ تسلی ہوئی۔ اور اب وہ بھی خوش و خرم تھی۔ کیونکہ لڑکی اب اس کا ہاتھ بھی بٹاتی تھی۔

یہ داستان جو میں کسی اور کے لئے بلکہ اپنی ہی دل لگی کے لئے لکھ رہا ہوں۔ اب قریب الاختتام ہے۔ اس عجیب داستان کا انجام بھی اس کے آغاز کی طرح خوفناک اور فوری تھا۔ صرف ایک رات کے واقعات نے میری تمام مشکلات کو رفع کر دیا۔ اور میں نئے سرے سے اپنی کتب بینی میں منہمک ہو گیا۔

دن بھر کی کاوش اور دماغ سوزی کے بعد میں نے نہایت لمبی سیر کا تہیہ کیا۔ گھر سے نکلتے ہی میری نظر سمندر پر جم گئی۔ چشمِ گرداب خوابیدہ اور سطح آئینے کی طرح شفاف تھی۔ مگر ہوا ایک درد بھری لے میں ڈوبی ہوئی تھی ـــــ گویا آبی قبرستان کی تمام روحیں آنیوالی آفتوں کا پیام دے رہی تھیں، مجھے یقین تھا کہ وہ رات بھی طوفانی رات ہو گی۔

پہاڑیوں کے دامن میں فضا ساکن اور سرد تھی، سورج غروب ہو رہا تھا، چوٹیاں گلپوش اور سمندر کی لہریں ارغوانی تھیں۔ مطلع صاف تھا۔ مگر سمندر کا شور آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ دور مشرق میں مجھے ایک کشتی نظر آئی۔ جو گاؤں کی طرف آ رہی تھی۔ کشتی کے پیچھے نہایت گہری کہر تھی۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ کہ طوفان سے پہلے پہلے ہی واپس ہو جانا چاہیئے۔

گھر سے غالباً ابھی نصف میل کے فاصلے پر تھا۔ کہ میں دفعتاً کھڑا ہو کر نہایت اضطراب اور تشویش کے عالم میں ایک آواز سننے لگا۔ قدرت کی آوازوں سے میرے کان بہت مانوس ہو چکے تھے۔ ہوا کی سرد آہوں اور لہروں کی سسکیوں میں بھی بہت دور سے میں غیر آواز کو پہچان سکتا تھا۔ میں نے پھر نہایت غور سے کان دھر کے سننے کی کوشش کی۔ ہاں! ایک مایوس چیخ پکار سنائی دے رہی تھی۔ استمداد کے لئے ایک پُر تاثیر اور درد انگیز التجا تھی میں ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اپنے گھر کی طرف بھاگا۔ کیونکہ تمام واقعہ کا دھندلا سا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔

گھر سے چوتھائی میل کے قریب ایک ٹیلا ہے۔ جہاں سے تمام گاؤں بخوبی نظر آتا ہے۔ یہاں چڑھ کر میں نے گھر کی طرف ایک نظر دوڑائی۔ زرد پتھر کی عمارت بدستور قائم تھی۔ کشتی بھی چٹانوں کی نوک پڑی ہوئی تھی۔ کوئی تغیر محسوس نہیں ہوتا تھا۔ مگر پھر وہی چیخ پکار سنائی دی۔ اور چشم زدن میں مجھے وہی دراز قامت روسی نظر آیا۔ اس کے کندھوں پر وہی خوبصورت لڑکی تھی جس کو وہ باوجود تیزی کے نہایت احتیاط کے ساتھ لے جا رہا تھا۔ اس کی نالہ وزاری کو میں

سُن رہا اور اُس کی اضطراب آمیز کشمکش کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے فوراً تاڑ لیا کہ وہ کشتی کی طرف بھاگ رہا ہے۔ اُمید کا ٹمٹماتا ہوا چراغ پھر جھلک اٹھا۔ میں کنارے کی طرف لپک پڑا۔ پستول میں ایک گولی بھی رکھ لی۔ کیونکہ میں نے آخری فیصلہ کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

مگر بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ کنارے پر پہنچنے تک وہ وہ تقریباً سو گز کا فاصلہ طے کر چکا تھا۔ میں نے دانت پیس کر دیوانہ وار چیخ ماری۔ اُس نے مڑ کر میری جانب دیکھا۔ اور اپنی جگہ سے اُٹھ کر مجھے مؤدبانہ سلام کیا۔ یہ سلام مضحکہ خیز معلوم نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ نہایت سنجیدہ اور متین نظر آتا تھا۔ اُس نے بیٹھ کر پھر کشتی کو چلانا شروع کر دیا۔ کشتی خلیج سے باہر نکل چکی تھی۔ آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ کشتی آہستہ آہستہ نظروں سے غائب ہو رہی تھی۔ حتےٰ کہ کہرا اور رات کی تاریکی میں وہ صرف ایک سیاہ نشان سا معلوم ہونے لگی۔ رفتہ رفتہ یہ دھندلے آثار بھی غائب ہو گئے۔ اور وہ ابدی تاریکی کے آغوش میں سو گئی۔

مگر میں اس تنہا اور ویران کنارے پر کیوں اسقدر آگ بگولا ہو رہا تھا؟ کیا مجھے اس روسی لڑکی کے ساتھ اُلفت تھی؟ قطعاً نہیں۔ میں اس قماش کا ہی نہیں کہ محض سفید چہرے اور نیلگوں آنکھ کے لئے اپنی زندگی کو تلخ کر لوں۔ میرا دل یکسر غیر متاثر تھا۔ مگر میرا فخر و غرور! آہ! وہ نہایت بُری طرح سے مجروح ہوا تھا۔ میں ایسی بیکس لڑکی کی حفاظت بھی نہیں کر سکا جس کو میری مدد کی ضرورت اور اس پر بھروسہ تھا۔ یہ خیال سوہان رُوح تھا۔ اور میرا دل بیٹھا جاتا تھا۔

سمندر سے پھر تند ہوائیں اُٹھیں لہریں کنارے پر اس زور سے جھپٹ رہی تھیں گویا اس کو بہا کر سمندر میں ملا دینگی۔ طوفان کا یہ شور و غل میری کیفیات قلبی کے لئے بہت موزوں تھا۔ تمام رات میں اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ اس روسی پر میں رہ رہ کر دانت پیستا تھا۔ گھونسا تان تان کر اور چلّا چلّا کر کہتا تھا "کاش وہ پھر ایک دفعہ آ جائے۔ اے کاش! وہ پھر ایک دفعہ آ جائے"

آخر وہ واپس آ گیا۔ سحر کی سپیدی آسمان کی مشرق میں پھیل رہی تھی۔ ریگستان پھر جگمگا اُٹھا پانی اُچھل رہا تھا اور بھورے بھورے بادل لہروں کی چوٹیوں کے اُوپر تیر رہے تھے۔ میں نے پھر اس کو ایک دفعہ دیکھا سو گز کے فاصلے پر ایک سیاہ چیز پڑی ہوئی تھی۔ یہ میری شکستہ کشتی تھی جو موجوں کے تھپیڑوں سے چور چور ہو چکی تھی تھوڑی دُور پرے کوئی غیر معلوم شے موجوں میں ڈبکیاں لے رہی تھی۔ آہ! یہ اُسی روسی کی لاش تھی۔ میں پانی میں کود پڑا۔ اور اس کی لاش کو کھینچ کر کنارے پر لے آیا۔

اس کے نیچے اس لڑکی کی لاش تھی۔ دونوں ہم آغوش تھے ظالم سمندر نے اگرچہ اس کو زندگی سے محروم کر دیا تھا۔ مگر اس کے کعبۂ عشق کو وہ بھی اس سے جُدا نہ کر سکا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس مدت لڑکی بھی اس کی بے لوث محبّت سے متاثر ہوئی۔ اور اُس نے اس کی جانبازی اور جاں سپاری کو محسوس کیا ورنہ اس کا سر اس کے عاشق کے سینے کے ساتھ کیوں لپٹا ہوا تھا۔ اور اس کے سُنہری بال اس کی ریش میں کیوں اُلجھے ہوتے تھے۔ اس کے عاشق کے لبوں پر کیوں ابدی مسرت اور کامرانی کا لازوال تبسم تھا جس کو مٹانے میں خود دست فنا بھی بیکار ثابت ہُوا۔ موت اسکو زندگی سے زیادہ خوشگوار معلوم ہوتی تھی

میری ملازمہ اور میں نے ان کو سمندر کے ویران کنارے پر دفن کر دیا۔ زرد ریت کی گہرائیوں میں دونوں ایک ہی قبر میں سو رہے ہیں۔ دُنیا میں عظیم الشان انقلابات ہونگے سلطنتیں بن بن کر مٹ جائینگی۔ خاندانوں کے خاندان تباہ و برباد ہو جائینگے۔ ہولناک اور خونریز معرکہ آرائیاں شروع ہو ہو کر ختم ہو جائینگی۔ مگر وہ دونوں حوادثاتِ روزگار سے بے خبر پُرشور سمندر کے کنارے پر اپنی تنہا قبر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہم آغوش ہیں شاید اُن کی رُوحیں خلیج کی سطح پر تیرتی پھرتی ہیں! ان کی آرامگاہ پر کوئی صلیب یا دوسرا نشان نہیں ہے۔ مگر میری ملازمہ کبھی کبھی وہاں جنگل کے پھُول چڑھا آتی تھی۔ حسبِ معمول میں سیر کے لئے جاتا ہوں تو شگفتہ پھولوں کو بکھرے ہُوئے دیکھ کر مجھے وہ دونوں یاد آتے ہیں۔ جنہوں نے دُور دراز سے آکر میری بے کیف زندگی کے طویل سلسلے کو چند لمحوں کے لئے توڑ دیا تھا۔

آثرِ صہبائی

غزل

کہیں نہ اس نے ٹھکانا دیا کہ پڑے رہتے
زمین ہم کو ستاتی ہے آسماں کی طرح

ہمارا خانۂ دِل تھا کبھی پری خانہ
الٰہی اُجڑے نہ گھر کوئی اس مکاں کی طرح

دماغ اُن کا ہے نازک تو میں نگاہوں سے
جتاؤں حالِ دِلِ زار بے زباں کی طرح

کہو جو تم تو میں کہہ دوں کہ آرزو میری
تڑپ رہی ہے دہن میں مرے زباں کی طرح

شگفتگی ہوئی نذرِ غمِ فراق افسوس
ہنسی بھی مُنہ سے نکلنے لگی فغاں کی طرح

"شامی"

تمدُّن

صنعِ حقیقی کی صنعت کا بہترین نمونہ خود انسان ہے۔ اُس کے چھوٹے سے دماغ کی وسعت و جامعیت محیر العقول ہے۔ اگر اس کی نشوونما مناسب ہوئی تو دُنیا اس کے کارناموں کو دیکھ کر مبہوت ہو جاتی ہے۔ انسان کی قوتیں اور طاقتیں خود فطرت کی نیرنگیوں کی طرح بوقلموں ہیں۔ جس طرح پہاڑوں کی بلندیاں یا دریاؤں کی گہرائیاں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اُسی طرح ہر انسان کی دماغی قوتیں بھی یکساں نہیں۔ لیکن جس طرح قدرت کی رنگا رنگی میں نظام کائنات کی ہم آہنگی کا راز مضمر ہے۔ اسی طرح انسان کے قوائے مختلفہ کسی نظامات عالم کو منتظم کئے ہوئے ہیں کسی قوم یا ملک کے چند ہی افراد میں ایسی قوتیں مضمر ہوتی ہیں۔ جن پر اس قوم کی ترقی کا دار و مدار ہوتا ہے۔ جس قوم کے اعلےٰ ترین دماغ دوسری اقوام کے دماغوں پر فوقیت رکھتے ہیں وہی قوم میدانِ ترقی میں سب پر سبقت لے جاتی ہے۔ اُسی کا تمدن دُنیا کے لئے نمونہ ہو جاتا ہے اور اُسی کو دُنیا کی حکومت عطا کی جاتی ہے۔

یہ مختصر مگر ممتاز جماعت اپنی قوتوں کو متحد کر کے ہر فرد سے اُس کی صلاحیت و استعداد کے مطابق کام لیتی ہے۔ قوم کا نظام درست کرتی ہے۔ پھر اُس کی مجموعی جد و جہد سے انفرادی اور اجتماعی ترقیاں رونما ہوتی ہیں۔ تمدن کی ابتدا ہوتی ہے۔ جو رفتہ رفتہ وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ اس کی پیچیدگیاں روز بروز بڑھتی جاتی ہیں مصنوعی یا قدرتی ذرائع سے راحت و آسائش کے نئے نئے سامان فراہم کئے جاتے ہیں ایجادات و اختراعات ہوتی ہیں۔ علوم و فنون میں نو بنو اضافے ہوتے ہیں۔ افراد اپنے اپنے فرائض انجام دیکر دُنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہیئت اجتماعی شاہراہِ ترقی پر برابر گامزن رہتی ہے۔ حتیٰ کہ معیار تہذیب و تمدن بلند ہوتا ہُوا اُس رفعت تک پہنچتا ہے۔ جہانتک موجدین کے قیاس و گمان کی بھی رسائی نہ ہوئی تھی۔

سمندر میں کبھی مد ہے کبھی جزر آفتاب کو کبھی عروج ہوتا ہے کبھی زوال چاند کبھی ایسا منہ چھپاتا ہے کہ عشاق کو ظلمت شب پر اپنے محبوب کے گیسوئے مشکین کا گمان ہوتا ہے۔ اور کبھی اس عظمت و جلال سے ضیاپاش ہوتا ہے کہ پرستاران حسن کو اپنے حبیب کے رخسار کی عریانی کا تصور بندھتا ہے۔ قدرت کی سرشت میں بھی جوتے یا

کی تلوّن مزاجی پائی جاتی ہے۔ کبھی یونان اپنے تمدن سے دُنیا کو مسحور کرتا ہے۔ تو کبھی چین کبھی مصر کا طوطی بولتا ہے تو کبھی ہندوستان کا۔ مختلف قوموں اور ملکوں نے دماغی و روحانی قوتوں کا ثبوت دیا۔ لیکن سب پھر پستی کی طرف مائل ہوئے۔ آج یورپ کا ستارہ اوج پر ہے اس کا تمدن اُس حد تک پہنچ چکا ہے۔ جہانتک چند امور کے اعتبار سے دُنیا کا کوئی تمدن ابتک نہیں پہنچا تھا۔ یونانیوں کی حُسن پرستی چینیوں کی استقامت یا ہندوستانیوں کی روحانیت یہاں مفقود ہے لیکن مادی قوت اس نقطہ تک کبھی نہ پہنچی تھی۔ قدرت کے غیر محدود ذرائع پر اس طرح کسی نے قبضہ نہ کیا تھا۔ قدرت کی متعدد قوتوں سے کسی نے اس طرح کام نہ لیا تھا۔ لیکن کیا اہل مغرب اپنی تمام حکمت و سائنس کے بھروسہ پر اس امر کا دعوےٰ کر سکتے ہیں۔ کہ ان کا تمدن ہمیشہ قائم رہیگا؟ کیا اُنہیں یقین ہے کہ جدید تمدن کے لئے بھی قدرت وہی قبر نہیں تیار کر رہی۔ جس میں دُنیا کے دوسرے تمدن بارہا مدفون کئے جا چکے ہیں؟

دُنیا میں تمدن کے متعدد دور گزر چکے ہیں جس طرح فطرت کی ہر ادا نرالی ہے۔ اسی طرح ہر دورِ تمدن کا بھی ایک خاص انداز ہے۔ ان کی مدتیں مختلف ہوتی ہیں۔ کوئی سو ہی برس کے اندر اپنے تمام مدارجِ عروج و زوال ختم کر لیتا ہے۔ کوئی ہزاروں سال تک جادۂ ترقی پر گامزن رہتا ہے۔ اور کمال تک پہنچکر بھی اُس کا دَور اتنا دیرپا ہوتا ہے۔ کہ اُس کے زوال و انحطاط کا سان گمان تک نہیں ہو سکتا۔ لیکن آخر میں پھر تنزّل شروع ہو ہی جاتا ہے۔ اور دُنیا کی تمام فانی چیزوں کی طرح تمدن بھی فنا ہو کر رہ جاتا ہے۔ زوالِ تمدن کے اسباب کی تشریح مختلف طور پر کی گئی ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ قانونِ قُدرت کے مطابق ہر کمال کے لئے زوال لازم ہے اس لئے جب کوئی تمدن کمال تک پہنچ جاتا ہے۔ تو پھر فطرتاً روبہ تنزّل ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ اس کمال کا نہ کوئی معیارِ رفعت و عظمت ہے۔ نہ کوئی میعادِ مدّت۔ مختلف تہذیبیں مختلف مُدّتوں تک قائم رہتی ہیں۔ اور مختلف درجوں تک پہنچکر انحطاط پذیر ہوتی ہیں۔ اس لئے یہ نظریہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ دوسرے لوگ عیش پسندی، تن آسانی، بدکاری، شہری بود و باش، بے مذہبی وغیرہ کو اسبابِ زوال بتاتے ہیں۔ خاص حالتوں میں ممکن ہے کہ انہی اسباب پر تنزّل کا انحصار ہو۔ عام طور پر بھی یہ باتیں انحطاط تمدن کی رفتار میں سرعت پیدا کر سکتی ہیں۔ لیکن ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ ان کو عالمگیر زوال تمدن کے قطعی و لازمی اسباب قرار دیا جاتے۔ علمائے اجتماعیات نے علم الحیات اور علم النفس کی جدید اختراعات کی مدد سے زوالِ تمدن کے تین اسباب

قرار دیتے ہیں۔ اور ان کی صداقت کو انسانی فہم و فراست بہ آسانی تسلیم کر سکتی ہے۔ وہ اسباب یہ ہیں (۱) بارِ تمدن (۲) حیاتِ انسانی کا ردِ عمل (۳) مظلوموں کی بیداری۔ مندرجہ ذیل سطور میں ان کی تشریح ملاحظہ فرمائیں:۔

بارِ تمدن

اوپر کی سطروں سے یہ بات ظاہر ہو چکی ہے کہ انسانوں کے گروہ میں چند ایسے افراد پیدا ہوتے ہیں۔ جن کو قدرت کی طرف سے زبردست قوتیں عطا کی جاتی ہیں۔ ان ہی قوتوں کی بدولت وہ لوگ قوموں اور ملکوں کی باگ اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ علوم و فنون کی نئی نئی راہوں کی داغ بیل ڈالتے ہیں۔ اور کمزور و بیکس انسان ہو کر قدرت کی عظیم الشان قوتوں پر حکومت کرتے ہیں لیکن یہ افراد اپنے دورِ حیات کو ختم کر کے آخر ملکِ عدم کو روانہ ہو جاتے ہیں۔ اور اپنے کارنامے اخلاف کے لئے چھوڑتے جاتے ہیں ان کے بعد آنے والی نسلیں اولاً ان علوم و فنون کو حاصل کرتی ہیں۔ جو ان کے سلف چھوڑ جاتے ہیں۔ پھر ان میں اضافہ کر کے نامور اسلاف کے نامور اخلاف کہلانے کی مستحق ہوتی ہیں۔ بالآخر یہ بھی عرصۂ حیات کو طے کر کے وہاں پہنچتی ہیں۔ جہاں کی کسی کو خبر نہیں۔ اور اپنی حاصل کی ہوئی چیزیں آنے والی نسلوں کے سپرد کر جاتی ہیں۔ الغرض یہی سلسلہ تحصیل و تفویض جاری رہتا ہے آخر میں وہ زمانہ آتا ہے کہ علوم و فنون کا ذخیرہ بہت بڑھ جاتا ہے۔ اب اخلاف میں یہ قوت باقی نہیں رہتی ہے۔ کہ ان تمام ذخائر کو حاصل کر سکیں۔ ان کو ترقی دینا تو در کنار جب کسی تمدن کی بنیاد استوار ہو جاتی ہے تو اس میں بے انتہا ترقی ہونی شروع ہوتی ہے۔ اور آناً فاناً وہ قوم ترقی کی کلہ افگن حد تک پہنچ جاتی ہے لیکن انسانی قوتیں محدود ہیں۔ ایک عرصہ تک دماغی قوتیں منکشف ہوتی جاتی ہیں۔ چند نسلیں اپنے آگے جانے والی نسلوں کی امانت کو محفوظ رکھ کر مزید منفعت کے ساتھ آئندہ قوموں کے سپرد کرتی رہتی ہیں لیکن آخر انسانی دماغوں کی وسعت نقطۂ کمال تک پہنچ جاتی ہے۔ اب ان میں توسیع کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اور علوم و فنون کے بار ناقابلِ برداشت ہو جاتے ہیں۔ کچھ زمانہ قبل ایک فرانسیسی سائنسدان مسٹر لیمارک نے اس نظریہ کی اشاعت کی تھی۔ کہ والدین کے حاصل کردہ علوم لڑکوں کو ورثتاً بطور علوم ہی حاصل ہو جاتے ہیں۔ اگر مسٹر لیمارک کا یہ نظریہ صحیح ثابت ہوتا تو نہ معلوم ایجادات و اختراعات کے سلسلے کہاں تک پہنچتے۔ اور تمدن نقطۂ عروج کی کس حد تک پہنچتا جس زمانہ میں مسٹر موصوف کا نظریہ مقبولیت حاصل کر رہا تھا۔ فرانس کی عورتیں ایامِ حمل میں ہمیشہ غور و فکر میں منہمک رہتی تھیں کنواری لڑکیاں

حب اوّل اوّل اپنے شوہر سے ملتیں تو فلسفہ کے کسی عمیق مسئلہ پر غور کرتی رہتیں۔ اور اُن کے شوہر بھی کسی عظیم الشان مسئلہ کے پیچ و تاب میں مبتلا رہتے۔ تاکہ اُن کی اولاد پیدائشی فلسفی یا ماہر سائنس ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ مسٹر لیمارک کا نظریہ بہت جلد غلط ثابت ہوا۔ ورنہ خدا جانے کتنی عروسان نازنین کے حجلۂ عروسی رصد خانوں میں تبدیل ہو جاتے۔ لذتِ جذبات کلفتِ ذہنی سے بدل جاتی۔ پھر مغرب نہ معلوم آج مصائب و آلام کے کس قعرِ عمیق میں مبتلا رہتا۔ بہرحال انسانی دماغ کی وسعت محدود ہی ثابت ہوئی۔ اور قدرت کے لامحدود اسرار کے چند ہی رازوں کے انکشاف سے بارِ تمدن ناقابلِ برداشت ہوگیا۔ اور اُس کے تمام اسرار پر قادر ہونے کی ہوس آخر کرکری ہو کر رہ گئی۔

حیاتِ انسانی کا ردِ عمل

جس زمانہ میں دنیا کا نظام انسانی دست برد سے محفوظ اور کلیتاً قدرت کے انتظام و اہتمام میں تھا اُس وقت قدرت "بقائے اصلح" کے اصول پر بہ شدت عمل پیرا تھی۔ ہر ناقص ہستی ابتدا ہی میں فنا کر دی جاتی تھی۔ قوت ذہن اور جوش کی فتح اور ضعف سستی اور بد دماغی کو ہمیشہ شکست ہوتی۔ لیکن جب رفتہ رفتہ تمدن کا دور دورہ ہوا۔ اور افراد جماعتوں میں منقسم ہو گئے۔ تو اکثر فطری قوانین پر انسانی نظام کا تغلب و تصرف ہوا۔ قدرت کے قوانین تمام نوع انسان کے مفاد کو ملحوظ خاطر رکھتے تھے لیکن انسان نے صرف اپنی مخصوص جماعتوں کے فواید کو مدِ نظر رکھ کر مختلف نظاماتِ عمل مرتب کئے۔ اب "بقائے اصلح" کا اصول پامال ہونے لگا۔ جماعت کی باگ ڈور تو اصلح ترین افراد کے ہاتھ میں رہی لیکن بجائے اس کے کہ ناقص افراد کا خاتمہ کر دیں۔ اُن پر ہیئتِ اجتماعی کی طرف سے یہ فرض عاید ہو گیا کہ کمزوروں کی حفاظت کریں۔ اُن کو تمام خطرات سے محفوظ رکھیں۔ اس کا نتیجہ لازمی طور پر یہ ہوا۔ کہ بیکار و ناقص افراد فنا ہونے کی بجائے سرسبز ہونے لگے۔ اُن کی تعداد روز بروز بڑھنے لگی۔ اصلح افراد کو اپنی قوتوں کے اظہار کے موقعے بیشک زیادہ ملنے لگے لیکن اُس کے ساتھ ساتھ ان کی ذمہ داریاں بڑھتی گئیں۔ ابتدا سے تمدن میں صرف "حسن" کو کمالِ انسانیت سمجھا جاتا تھا۔ یہی ایک نعمت تمام اعمال کی محرک تھی۔ لیکن اب تو دولت عیش پرستی۔ حکومت و اختیار اور علوم و فنون کی ہنگامہ آرائیوں نے زندگی کو نہایت پیچیدہ بنا دیا ہے۔ کامرانی کے انعامات و تحائف اور ذمہ داریوں کے بارِ گراں اصلح ترین قوی کو بھی برباد کر دیتے ہیں۔ اور نسلِ انسانی کمزور تر ہوتی جاتی ہے۔ اس اثنا میں کمزور و ناقص افراد ہیئت اجتماعی کے زیر سایہ پھلتے پھولتے رہے۔ قدرت کی طرف سے

اُن کا استیصال ہونا بند ہو ہی چکا تھا۔ لازماً کارآمد افراد کم ہوتے گئے۔ اور کاہل و ناکارہ بے طرح بڑھتے گئے اور جب آخر ہیئت اجتماعی کی فائق ہستیاں فنا ہو گئیں۔ تو تمدن یا تو انحطاط پذیر ہوا یا بالکل نیست و نابود ہو گیا۔ حیات انسانی میں رد عمل کا واقع ہونا تھا کہ تمدن اپنی تمام نمائش و نمود کے ساتھ ایک خود ساختہ قبر میں مدفون ہو گیا۔ افضل ترین دماغوں نے تمدن کو اوج کمال تک پہنچایا۔ اور پھر خود انہی کے اعمال نے اُس کی تخریب کی۔ بلکہ فنا کر دیا۔ ماہر رموز فطرت حضرت غالب مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

مظلوموں کی بیداری

فروغ تمدن کے زمانہ میں جماعت کی باگ افضل ترین افراد کے اختیار میں ہوتی ہے۔ متوسطین و نیز ادنیٰ ترین افراد طبقہ اولیٰ کے تابع فرمان ہوتے ہیں۔ طبقہ اولیٰ میں تخلیقی قوتیں ہوتی ہیں۔ متوسطین میں تخلیق شدہ اشیاء کو قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے لیکن ادنے ترین جماعت میں اس قبولیت کی بھی استعداد نہیں ہوتی۔ یہ لوگ تمدن کی رنگا رنگ تابناکیوں سے بیزار رہتے ہیں اگر طبقہ اعلےٰ میں انہیں کسی طرح رکھ دیا جاتے تو وہاں انہیں سخت تکلیف ہوتی ہے۔ انہیں فطرتاً تمدن سے نفرت ہوتی ہے۔ لیکن اس نفرت کے اظہار کا انہیں موقع نہیں ملتا۔ متوسطین تو تمدن کے فواید و ثمار سے حظ اٹھاتے ہیں لیکن انہیں تو بقائے حیات کے لئے کافی سامان خورد و نوش بھی میسر نہیں آتا۔ طبقہ اعلےٰ کے افراد ہمیشہ ان پر نئے نئے مظالم ڈھاتے ہیں۔ انکو آلہ کار بنا کر اُن کی دماغی و جسمانی قوتوں کی پیداوار پر غصب کر لیتے ہیں اسلئے یہ مظلوم جماعت ہمیشہ منتظر رہتی ہے کہ اگر قدرت نے موقع دیا تو تمام مظالم کی بنیاد یعنے خود تمدن ہی کا خاتمہ کر دے۔ جبتک ملک میں امن و امان رہتا ہے مظلوموں کے جذبات مادی ذرائع سے پامال کئے جاتے ہیں۔ آلات حرب و اسلحہ ہلاکت کی نمائشوں سے اُن پر قابو رکھا جاتا ہے۔ لیکن جب تمدن خود اپنے "شعلۂ مضمر" کا شکار ہوتا ہے۔ بار تمدن سے ہیئت اجتماعی کی قوتوں میں انحطاط شروع ہوتا ہے۔ خارجی جنگ۔ اندرونی اختلافات اور مختلف مصائب کے طوفان برپا ہوتے ہیں تو اس مظلوم طبقہ کو ایک زریں موقع ہاتھ آتا ہے۔ اب ہیئت اجتماعی میں اتنی قوت باقی نہیں رہتی کہ ان پر قابو رکھ سکے۔ آخر ایک شورش سر بلند ہوتا ہے اور ایک خوفناک انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔ ایسی تحریک میں بالتخصیص تین طرح کے افراد کی شرکت فتنہ و فساد کا باعث ہوتی ہے۔ (۱) وہ افراد

جا بعض فطری نقائص کی وجہ سے طبقۂ اولیٰ اور طبقۂ متوسط کے نقطۂ اتصال پر پہنچ جاتے ہیں۔ اور طبقۂ اولیٰ میں داخل ہو کر اُن کے تحائف و غنائم سے بہرہ ور نہیں ہو سکتے (۲) وہ افراد جو طبقۂ اولیٰ میں پیدا ہونے اور تربیت پانے پر بھی بعض ذاتی عیوب کی وجہ سے تنزل پذیر ہو کر جماعت متوسطین یا اُس سے بھی نیچے آجاتے ہیں۔ اور برکاتِ عالیہ سے محروم کر دیتے جاتے ہیں۔ (۳) وہ نادر الوجود افراد جن کی فطری قوتیں طبقۂ اولیٰ کے افضل ترین افراد سے بھی بہت ارفع و اعلیٰ ہوتی ہیں۔ اور تمدن کی تمام آب و تاب اُن کی نظر میں ہیچ اور اُس کی تمام رفعت و عظمت اُن کی نگاہ میں حد درجہ پست معلوم ہوتی ہے۔ ہیئت اجتماعی کے عیوب نقائص اُن کے دلوں میں ہیجان و اضطراب پیدا کرتے ہیں۔ جماعت کی سُست رفتار ترقی اُن کے دلوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے۔ وہ پریشان رہتے ہیں کہ کس طرح صدیوں کا کام گھنٹوں اور منٹوں میں انجام دیں۔

عوام کو آشوب انگیزی پر مائل دیکھ کر یہ لوگ رہبری کے لئے آگے بڑھتے ہیں۔ عامۃ الناس کے برانگیختہ جذبات کی پیروی کرتے ہیں۔ اُن کی ذہنی کمزوریوں کو اپنی تیز طبعی کی مدد سے شعلہ خیز بنا دیتے ہیں۔ اب انقلاب اپنے پورے جوش پر آجاتا ہے۔ تمام ملک میں قتل و غارت، شور و فساد کی گرم بازاری ہوتی ہے۔ خون کی ندیاں بہنے لگتی ہیں اور باہمی جنگ و جدال فسادِ آدمیت کا باعث ہو جاتا ہے۔

تاریخ عالم کے صفحات پر ہزاروں ایسے انقلاب جلی حروف میں مرقوم نظر آتے ہیں۔

محمد امیر الحسن

نغمۂ دلگداز

ڈوب گیا ہے سازِ دل نغمۂ دلگداز میں
موج مئے سرود تھی خندۂ دلنواز میں

عالمِ خواب میں تمام عمر مری گزر گئی
یعنی فسونِ خواب تھا نرگسِ نیم باز میں

پیکرِ خاک سے عیاں ہونے لگیں تجلّیاں
برقِ ضیائے طور تھی تیری نگاہِ ناز میں

چشمِ حقیقت آشنا کھول کے دیکھ بے خبر!
حسنِ ازل ہے جلوہ ریز آئینۂ مجاز میں

جوشِ نمود دیکھئے، شوقِ شہود دیکھئے
ذوقِ تماشا بن گیا، چشمِ نظارہ باز میں

رسمِ جہانِ عشق کا اور ہی رنگ ہے اثرؔ
سجدہ کناں ہے غزنوی بارگہِ ایاز میں

اثرؔ صہبائی

ماسٹر مشائی

(۱)

ادھر بابو اپنے باپ کے متروکہ سرمایہ کے منافع پر گزارہ کرتا تھا صرف دلال قرضوں کی دلالی کے لئے اس کے پاس آتے اور چاندی کا حقہ پیتے رہتے۔ یا مختار قانونی کے منشی کسی رہن کی شرائط یا سٹامپ فیس کا تصفیہ کرنے کے لئے آجاتے۔ اپنے روپے کو خرچ کرنے میں وہ اس قدر احتیاط سے کام لیتا کہ وہاں کے فٹ بال کلب کے طلبا چندہ لینے کی ہزار کوشش کرتے مگر وہ جیب سے ایک پائی نہ نکالتا۔

جس وقت یہ کہانی شروع ہوتی ہے۔ ایک مہمان اس کے گھر آیا ہوا تھا۔ حسرت ویاس کے زمانہ بعید کے بعد اس کی بیوی نانی بالا اب ایک لڑکے کی ماں بن چکی تھی۔ لڑکے کی شکل ماں سے ملتی تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں خوبصورت ناک اور سفید رنگت رتی کانتا کے شاگرد نے اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا " وہ اس شریف گھرانے کے قابل ہے۔" انہوں نے اس کا نام وینو گوپال رکھا۔

قبل ازیں ادھر لال کی بیوی نے خانگی معاملات میں کبھی اپنے خاوند کی رائے کے خلاف رائے نہیں دی۔ تھی بعض ضروری امور پر کافی بحث ہوتی۔ مگر بچے کی پیدائش سے پہلے اس کو ہمیشہ شکست ہوتی۔ اور وہ بڑبڑا کر خاموش رہ جاتی۔ اب ادھر لال اپنا امتیاز زیادہ دیر تک قائم نہ رکھ سکا۔ جب کبھی بچے کی خاطر ضروری چیزیں خریدنے کا معاملہ پیش آتا تو وہ اپنی بیوی کی رائے مان جاتا۔

(۲)

وینو گوپال ذرا بڑا ہوا اس کے لئے ایک پرانا تجربہ کار اتالیق مقرر کیا گیا۔ جو علم و فضل اور کمزور طلبا کو امتحان میں کامیاب کرانے میں مشہور تھا۔ مگر ایسی تعلیم تالیف قلوب کا باعث نہیں بن سکتی۔ اس آدمی نے لڑکے کے دل میں راہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس کے دل میں تھوڑی سی انسانی ہمدردی بھی باقی نہ تھی۔ اس کا خون ابتدا ہی سے سفید تھا۔ وہ اس کی کوششوں سے غیر متاثر رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی ماں نے سخت اعتراض کیا کہ اس کی شکل دیکھ کر بچہ بیمار ہو جاتا ہے۔ بیچارہ استاد رخصت ہو گیا۔

اسی وقت ہیرالال پھٹے پرانے کپڑے اور کرمچ کا ٹوٹا پھوٹا جوتا پہنے آیا۔ ہیرالال کی ماں بڑی مشکل سے لوگوں کی روٹیاں پکا پکا کر اور وہاں کوٹ کوٹ کر اس کو ضلع کے ایک اسکول میں تعلیم دلاتی تھی۔ اس نے انٹرنس کا امتحان پاس کر کے کالج میں جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ فاقہ کشی سے اس کے گالوں میں گڑھے پڑ گئے تھے۔ چہرہ سوکھ کر ذرا سا ہو گیا تھا۔ صرف ماتھا ہی ماتھا رہ گیا تھا۔

ملازم نے ہیرالال سے دریافت کیا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اس نے عاجزی سے کہا "مالک سے ملنا چاہتا ہوں۔ نوکر نے تیزی سے جواب دیا۔ تم ان سے نہیں مل سکتے

ہیرالال حیران تھا کہ کیا کرے کہ اتنے میں وینوگوپال باغ سے کھیل کر واپس دروازے پر آیا۔ نوکر نے ہیرالال سے کہا۔ بھاگ جاؤ۔ وینوگوپال کو خواہ مخواہ جوش آ گیا۔ اس نے کہا "نہیں۔ وہ نہیں جائیگا" اور وہ اجنبی کو کھینچ کر اپنے باپ کے پاس لے گیا۔

ادھر لال دوپہر کی نیند لے کر اٹھا تھا اور اوپر کے برآمدے میں بید کی کرسی پر خاموش بیٹھا ٹانگیں ہلا رہا تھا۔ رتی کانتا پاس ہی ایک کرسی پر بیٹھا حقے کا مزا لے رہا تھا۔ اس نے ہیرالال سے پوچھا کہ وہ کہاں تک پڑھا ہے۔ نوجوان نے جھک کر جواب دیا۔ کہ وہ انٹرنس پاس ہے۔ رتی کانتا نے گھور کر [illegible] کی طرف دیکھا اور کہا کہ "اتنی

بڑی عمر کا لڑکا اور تعلیم میں اسقدر پیچھے! ہیرالال خاموش رہا۔ رتی کانتا اپنے مربی کے وابستگان دامن کو تنگ کرنے میں خاص دلچسپی لیتا تھا۔ خواہ بات کی کوئی اصلیت ہو یا نہ ہو۔

یکلخت ادھر لال کو خیال آیا۔ کہ وہ اس نوجوان کو مفت میں اپنے بیٹے کا اتالیق کیوں نہ مقرر کر لے۔ اس نے پانچ روپیہ ماہوار اور رہائش کا وعدہ کر لیا۔

(۳)

اس دفعہ یہ عہدہ دیر تک قائم رہا۔ شروع سے ہیرالال اور اس کا شاگرد دوست بن گئے تھے۔ ہیرالال کو پہلے کبھی کسی بچے سے محبت کرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس کی ماں غریب اور محتاج تھی۔ اس لئے اس کو گھر میں بچوں سے کھیلنے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ اس کو ذرا بھی خیال نہ تھا۔ کہ اس کے دل میں محبت کے بیشمار خزانے پوشیدہ ہیں۔ وینو بھی اس کی صحبت میں بڑا خوش رہتا۔ وہ اپنے والدین کا اکلوتا لڑکا تھا۔ اس کی دو چھوٹی بہنیں اس کی صحبت کے قابل نہیں خیال کی جاتی تھیں۔ اس لئے اس کا نیا اتالیق ہی اس کا ہمراز تھا۔ وہ اپنے ننھے دوست کی شوخی و شرارت کا بوجھ صبر و تحمل سے برداشت کرتا تھا۔

(۴)

وینو اب گیارہ سال کا تھا۔ ہیرالال نے ایف اے کا امتحان پاس کیا۔ اور وظیفہ حاصل کیا۔ اب وہ بی اے کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ کالج کے لیکچروں سے فارغ ہو کر وہ وینو کو باہر سبزہ زار میں لے جاتا۔ اور تاریخ یونان میں سے عجیب و غریب کہانیاں اور وکٹر ہیوگو کے دلاویز فسانے سنایا کرتا۔ بچہ بھی باوجود اس بات کے کہ اس کی ماں اُسے اپنے پاس روکے رکھنے کی کوشش کرتی تھی سکول کے وقت کے بعد ہیرالال کے پاس بھاگ جاتا تھا۔

نانی بالا کو اس سے رنج ہوتا۔ اس نے خیال کیا۔ کہ ہو نہ ہو بچے کو اس طرح اپنے قابو میں رکھنے میں ہیرالال کوئی چال چل رہا ہے۔ تاکہ وہ ہمیشہ اس کا اتالیق بنا رہے۔ ایک دن اُس نے پردہ میں سے اس سے کہا۔ "تمہارا فرض لڑکے کو صرف صبح و شام دو ایک گھنٹے پڑھانا ہے۔ تم ہمیشہ اس کو اپنے ساتھ کیوں رکھتے ہو۔ لڑکے نے اپنے والدین کو بھی بھلا دیا ہے تمہیں خیال رہے کہ تمہاری حیثیت کا آدمی اس گھرانے کے کسی لڑکے کی صحبت کے قابل نہیں۔"

ہیرالال کی آواز بند ہو گئی۔ اُس نے کہا۔ آیندہ میں وینو کو صرف سبق پڑھا دیا کرونگا۔ اور ہر وقت اپنے پاس نہیں رکھوں گا۔

ہیرالال کا قاعدہ تھا کہ وہ پو پھٹنے سے پہلے ہی پڑھنا شروع کر دیتا۔ بچہ مُنہ ہاتھ دھو کر اس کے پاس آجاتا۔ باغ میں ایک جوہڑ تھا۔ جس میں وہ مچھلیوں کو اُبلے ہوئے چاول ڈالا کرتے تھے۔ وینو ایک چھوٹی سی پھلواڑی باغ کے ایک کونے میں تیار کیا کرتا تھا۔ جس میں چھوٹے چھوٹے دروازے اور جھاڑیاں اور پتھریلی روشیں ہوتی تھیں جب دُھوپ زیادہ ہو جاتی۔ تو وہ گھر واپس چلے جاتے اور وینو صبح کا سبق پڑھتا۔

جس روز کا ہم ذکر کرتے ہیں۔ اُس دن وینو معمول سے پہلے اُٹھا۔ کیونکہ وہ اُس کہانی کا نتیجہ سُننے کا خواہشمند تھا۔ جو ہیرالال سُنایا کرتا تھا۔ مگر اُستاد کہیں نہ ملا۔ نوکر سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ باہر چلا گیا ہے۔ سبق کے وقت وینو خلاف معمول خاموش تھا۔ اُس نے ہیرالال سے یہ بھی نہ پُوچھا کہ وہ باہر کیوں گیا تھا۔ اور چپ چاپ اپنا سبق یاد کرتا رہا۔ جب ناشتے کے وقت وہ اپنی ماں کے پاس گیا۔ تو اُس نے اس افسردگی کی وجہ پُوچھی۔ اور کھانا نہ کھانے کا سبب دریافت کیا۔ وینو نے کوئی جواب نہ دیا کھانے کے بعد اس کی ماں نے پُوچھا۔ "ماسٹر مشائی کو کیا ہوا؟" مگر وینو کے لئے یہ بیان کرنا مشکل تھا۔ کہ اس کے اُستاد نے اسے کیا رنج پہنچایا تھا۔

اس کی ماں نے پوچھا "کیا ماسٹر مشائی نے تم سے

میرے برخلاف کوئی بات کہی ہے۔" مگر وینو سوال کا مطلب نہ سمجھا۔ اور چلا گیا۔

(۵)

چند روز کے بعد ادھر بابو کے گھر چوری ہو گئی۔ پولیس تفتیش کے لئے بلائی گئی۔ ہیرالال کے ٹرنکوں کی بھی تلاشی ہوئی۔ رتی کانتا نے کہا "چور چوری کا مال کبھی اپنے صندوق میں نہیں رکھتا۔"

ادھر لال نے اپنے بیٹے کے اتالیق کو بلایا اور کہا۔ "اب میں آپ کو اس گھر میں آسانی سے نہیں رکھ سکتا۔ آج سے کوئی اور جگہ تلاش کرلیں۔ اور وقت مقررہ پر لڑکے کو پڑھانے کے لئے آجایا کریں۔"

رتی کانتا نے حقہ سرکاتے ہوئے کہا۔ "یہ معقول تجویز ہے۔ دونوں فریقوں کے لئے مفید۔"

ہیرالال ایک لفظ نہ بولا۔ مگر اس نے لکھ کر بھیج دیا کہ وہ وینو کا اتالیق نہیں رہیگا۔

جب وینو اسکول سے واپس آیا۔ تو اُستاد کا کمرہ خالی پایا۔ اس کا ٹوٹا ہوا ٹرنک بھی غائب تھا۔ کونے میں رسی بندھی تھی۔ مگر اس پر کپڑے اور تولیے نہیں تھے۔ وہ میز جس پر پہلے کتابوں اور کاغذوں کا انبار لگا رہتا تھا۔ اب وہاں ایک بڑا پیالہ جس میں سنہری مچھلیاں تھیں پڑا تھا۔ اس کے اوپر ہیرالال کے ہاتھوں کا کندہ کیا ہوا وینو نظر آتا تھا۔ لڑکا بھاگتا ہوا باپ کے پاس گیا۔ اور اس کا سبب دریافت کیا۔ اس کے باپ نے جواب دیا۔ کہ ہیرالال نے ملازمت سے استعفےٰ دیدیا ہے۔ وینو اپنے کمرے میں جاکر زمین پر گر پڑا۔ اور اس زور سے چلانا شروع کیا۔ کہ ادھر لال اس کو کسی طرح چپ نہ کرا سکا۔

اگلے دن ہیرالال بورڈنگ ہوس میں بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا۔ کہ وہ کالج جائے یا نہ جائے کہ اتنے میں اس نے ادھر بابو کے نوکر کو معہ وینو کے آتے ہوتے دیکھا۔ وینو نے دوڑ کر اپنی باہیں اس کی گردن میں ڈال دیں۔ اور گھر واپس چلنے کے لئے کہا۔

ہیرالال یہ بھی نہ بتا سکا۔ کہ اب اس کے لئے واپس جانا سخت ناممکن ہے۔ مگر جب کبھی وہ ان لٹکتے ہوئے بازوؤں اور ملتجی آواز کو یاد کرتا تو اس کے حلق میں کوئی چیز پھنس جاتی تھی۔

(۶)

ہیرالال کو اپنے ننھے دوست سے جدا ہو کر معلوم ہوا کہ اس کا دل متذبذب ہے۔ اور اس کو وظیفہ حاصل کرنے کی کوئی امید نہیں اگرچہ امتحان پاس کرلینا معمولی بات تھی مگر وہ یہ بھی جانتا تھا۔ کہ بغیر وظیفے کے وہ اپنی تعلیم جاری نہیں رکھ سکتا۔ اس نے کسی دفتر میں ملازمت کی تلاش شروع کی۔ حسن اتفاق سے ایک بڑی تجارتی کمپنی کے انگریز منیجر

نے اس کو پسند کر لیا۔ تبادلۂ الفاظ کے بعد مینجر نے دریافت کیا۔ کہ اس کو کچھ تجربہ بھی حاصل ہے یا نہیں اور اُس کے پاس کوئی سندات بھی ہیں؟

ہیرالال نے جواب دیا۔ "نہیں" تاہم بمشاہرہ بیس روپیہ ماہوار ایک جگہ اس کو مل گئی۔ اور مبلغ پندرہ روپے بطور پیشگی اس کو دیئے گئے۔ کہ وہ معقول لباس پہنکر دفتر میں آیا کرے۔

مینجر نے ہیرالال کو سخت مشکل کام دیا۔ اسکو اوقات دفتر کے بعد ٹھیرنا پڑتا اور کبھی کبھی بہت دیر سے آقا کے گھر جاتا تھا۔ مگر اس طرح وہ بہت جلدی کام سیکھ گیا۔ دوسرے کلرک اس سے جلنے لگے۔ اور اس کو نقصان پُہنچانے کی کوشش کی۔ مگر بے سود جب اس کی تنخواہ چالیس روپے ہوگئی۔ تو اُس نے ایک تنگ گلی میں مکان کرایہ پر لے لیا۔ اور اپنی والدہ کو لے آیا۔ اس کی ماں عرصہ دراز کے انتظار اور فکر کے بعد پھر خوشحال ہوئی۔

ہیرالال کی ماں اکثر اوقات وینو گوپال کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کرتی۔ اس کا ارادہ تھا کہ اس کو دعوت پر بلائے اور اپنے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانے کھلائے۔ ہیرالال یہ کہہ کر ٹال دیتا۔ کہ اس کا گھر اتنا بڑا نہیں۔ کہ لوگوں کو دعوتیں دی جائیں۔

ایک دن ہیرالال کو اطلاع ملی۔ کہ وینو کی ماں کا انتقال ہوگیا ہے۔ وہ فوراً ادھر لال کے مکان پر گیا۔ اُس دن سے وینو اور ہیرالال دونوں باہم پھر دوست بن گئے۔ اور ایکدوسرے کے پاس آنے جانے لگے۔ مگر زمانہ بدل گیا تھا۔ وینو اب مین ہیاں نوجوان تھا۔ ہر وقت مونچھوں پر تاؤ دیتا رہتا اس کے بہت سے دوست تھے۔ جو اس کی موجودہ حالت کے مناسب تھے۔ ٹوٹی ہوئی پرانی کرسی اور سیاہی سے خراب شدہ ڈسک اب غائب تھے۔ کمرہ نئی چیزوں سے آراستہ تھا آئینے۔ روغنی تصویریں اور دوسرا اسباب کثرت سے تھا۔ وینو کالج میں داخل ہو چکا تھا۔ مگر ابھی ایف۔ اے کی حد سے باہر نہیں گیا تھا۔

ہیرالال کو اپنی ماں کی خواہش کا خیال آیا۔ کچھ تامّل کے بعد اُس نے وینو کو مدعو کر لیا۔ وینو کے دلفریب چہرے پر ہیرالال کی ماں ریجھ گئی۔ مگر جونہی کھانا ختم ہوا۔ وہ واپس جانے کو تیار ہو گیا۔ اور سنہری گھڑی دیکھ کر کہنے لگا۔ کہ مجھے اور کئی جگہ جانا ہے۔ اور جلدی سے گاڑی میں سوار ہو کر روانہ ہوگیا۔ ہیرالال نے آہ بھر کر کہا۔ میں پھر کبھی اس کو مدعو نہیں کرونگا۔

(۷)

ایک دن دفتر سے واپس آکر ہیرالال نے دیکھا۔ کہ ایک شخص اس کے مکان کی اندھیر کوٹھڑی میں بیٹھا ہے اگر اُس کو عجیب وغریب خوشبو نہ آتی تو وہ پاس سے گزر

جاتا۔ ہیرالال نے پُوچھا کون ہے۔ جواب آیا
"میں ہوں"۔
ہیرالال نے کہا۔ "وینو۔ کیا بات ہے۔ تم کب آگئے"؟
وینو بولا۔ "مجھے آئے ہوئے گھنٹے گزر گئے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ اس قدر دیر سے آتے ہیں"۔
وہ اُوپر گئے۔ ہیرالال نے لمپ جلایا۔ اور وینو سے خیریت مزاج دریافت کی۔
وینو نے جواب دیا۔ "کالج کی جماعتیں عذاب جان ہو رہی ہیں۔ والد صاحب کو اس بات کا خیال نہیں کہ میرے لئے بالشتئے ہم جماعتوں کے ساتھ اسی جماعت میں تعلیم جاری رکھنا کس قدر دقت طلب ہے۔" ہیرالال نے پُوچھا۔ "تم کیا چاہتے ہو"؟ وینو نے جواب دیا۔ کہ وہ انگلینڈ جاکر بیرسٹر بننا چاہتا ہے۔ اس نے ایک لڑکے کی مثال دی۔ جو جماعت میں اس سے نالائق تھا۔ اور جانے کو تیار تھا۔ ہیرالال نے پُوچھا کہ والد سے اجازت بھی لی ہے یا نہیں۔ وینو نے کہا۔ کہ اس کا والد جب تک وہ ایف۔ اے پاس نہ کرلے۔ کوئی بات نہ سُنیگا۔ اور ایف۔ اے پاس کرنا اس کے لئے دشوار ہے۔" ہیرالال نے کہا۔ کہ وہ خود جاکر وینو کے باپ سے گفتگو کریگا۔
وینو نے کہا۔ "نہیں میں ہرگز یہ گوارا نہیں کرتا"۔
ہیرالال نے وینو سے کھانے کے لئے کہا۔ بیٹھے بیٹھے ہیرالال نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور کہا۔ "وینو اپنے باپ سے جھگڑا نہ کرو۔ نہ گھر سے نکلو۔"
وینو ناراض ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور کہنے لگا۔ "اگر آپ میرے یہاں آنے پر ناراض ہیں تو میں اور کہیں چلا جاتا ہوں۔"
ہیرالال نے اس کو ہاتھ سے پکڑ کر بٹھانا چاہا۔ مگر وینو ہاتھ چھڑا کر جانے ہی کو تھا۔ کہ ہیرالال کی ماں ایک طشتری میں کھانا لگا کر لے آئی۔ وینو کو جاتا دیکھ کر اُس نے بھی ٹھیرنے کے لئے کہا۔ اور وہ ناک بھوں چڑھا کر مان گیا۔
وہ کھانا کھا رہے تھے کہ دروازے پر ایک گاڑی کے ٹھیرنے کی آواز آئی۔ پہلے ایک نوکر اندر آیا۔ پھر ادھر بابو آپ۔ اپنے باپ کو دیکھ کر وینو کا چہرہ زرد ہو گیا۔ ماں اجنبی کو آتا دیکھ کر زنانے میں چلی گئی۔ ادھر بابو نے بھدی سی آواز میں ہیرالال کو گالیاں دینا شروع کر دیا۔ "ستی کانتا نے مجھے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا۔ مگر مجھے یقین نہ تھا کہ تم ایسے شیطان اور دغا باز ہو۔ کیا تم وینو کو ورغلا کر اپنا گرویدہ کرنا چاہتے ہو۔ یہ پُورا پُورا اغوا ہے۔ اور میں تمہیں گرفتار کروا دُونگا۔"
وینو چُپکے سے اپنے باپ کے پیچھے پیچھے گھر سے نکل گیا۔

(۸)

جس کمپنی کے کارخانے میں ہیرالال ملازم تھا۔ انہوں نے گردونواح کے علاقوں سے منوں کی مقدار میں چاول اور دال خریدنے شروع کر دیئے قیمت ادا کرنے کے لئے ہیرالال ہر ہفتہ روپیہ لیکر صبح کی گاڑی جاتا۔ اور اناج خرید لیتا۔ خاص خاص مرکز مقرر تھے جہاں دلال اور آڑھتی اپنی اپنی رسیدیں اور حساب لیکر آتے۔ اور تصفیہ کرتے۔ ہیرالال کو بغیر ضمانت یہ کام سپرد کرنے پر دفتر میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ مگر منیجر نے ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ اور کہا کہ ضمانت کی ضرورت نہیں۔ یہ کام وسط دسمبر سے وسط اپریل تک ہوتا۔ اور اکثر اوقات وینو رات کو بہت دیر سے گھر آتا۔

ایک دن جب وہ کام سے واپس آیا تو اس کی ماں نے کہا۔ "وینو آیا تھا۔ میں نے اُسے کھانے پر بلایا ہے" کئی دفعہ ایسا اتفاق ہوا تھا۔ ماں کی رائے تھی۔ کہ وینو اپنی ماں کو یاد کرتا ہے۔ یہ کہکر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔

ایک موقعہ پر وینو نے ہیرالال کا انتظار کیا اور وہ دیر تک باتیں کرتے رہے۔

اُس نے کہا۔ "ماسٹر مشاقی۔ والد صاحب اسقدر زود رنج ہو گئے ہیں۔ کہ میرا ان کے پاس رہنا محال ہے علاوہ ازیں وہ دوسری شادی کرانے والے ہیں۔ رتی کانتا کسی کنیا کی تلاش میں ہے۔ اور وہ دونوں باہم صلاح و مشورہ کرتے رہتے ہیں۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ اگر میں گھر سے دو گھنٹے غیر حاضر رہتا تھا تو میرا باپ بیقرار ہو جاتا تھا۔ اب اگر میں ایک ہفتہ غائب رہوں تو اُسے پروا نہیں۔ بلکہ اس کو اطمینان ہو جاتا ہے۔ اگر شادی ہو گئی۔ تو پھر میں گھر میں بالکل نہیں رہ سکتا۔ آپ کوئی تجویز بتائیں میں خود مختار بننا چاہتا ہوں۔"

ہیرالال کو سخت رنج ہوا۔ مگر اُس کو کوئی سبیل اپنے شاگرد کی مدد کرنے کی نظر نہ آئی۔ وینو نے کہا کہ اُس نے ولایت جاکر بیرسٹر بننے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے کسی نہ کسی طرح وہ اپنے باپ سے آمد و رفت کا خرچ نکال لیگا۔ وہ دستی رقعہ دیکر اُدھار لے لیگا۔ اور جب قرضخواہ عدالت میں چارہ جوئی کرینگے تو اس کے باپ کو دینا پڑیگا۔ یہ روپیہ لیکر وہ ولایت چلا جائیگا۔ اور وہاں تو اس کے باپ کو خواہ مخواہ ہی خرچ برداشت کرنا پڑیگا۔

ہیرالال نے کہا۔ "مگر کون تمہیں روپیہ قرض دیدیگا۔"

وینو نے کہا۔ "تم"

ہیرالال نے حیران ہوکر پوچھا۔ "میں؟"

وینو نے کہا۔ "ہاں! میں نے نوکروں کو روپوں کی تھیلیاں لاتے دیکھا ہے۔"

"ملازم اور روپیہ کسی اور کے ہیں۔"

ہیرالال نے مفصل بیان کیا کہ روپیہ اس کے ہاں

کس لئے آتا ہے۔

وینو نے پوچھا "کیا منیجر روپیہ نہیں دے سکتا"

ہیرالال نے کہا "کیوں نہیں، اگر تمہارا باپ ضمانت دے"

اس پر بحث ختم ہوگئی۔

(۹)

ایک رات جمعہ کے دن ہیرالال کے مکان کے سامنے ایک گاڑی ٹھیری۔ جب وینو کے آنے کی اطلاع ہوئی۔ ہیرالال اپنی آرامگاہ میں فرش پر بیٹھا روپیہ گن رہا تھا۔ وینو عجیب وغریب لباس پہنے اندر آیا۔ اُس نے ایک پارسی کوٹ اور پاجامہ پہن رکھا تھا۔ اور سر پر ایک ٹوپی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں جواہرات کی انگشتریاں تھیں۔ ایک موٹی طلائی زنجیر گلے میں لٹک رہی تھی۔ سونے کی گھڑی جیب میں تھی۔ ہیرے کے بٹن قمیص میں لگے تھے۔

ہیرالال نے پوچھا "کیا معاملہ ہے۔ ایسے کپڑے کیوں پہنے ہیں"

وینو نے جواب دیا "کل میرے باپ کی شادی ہے اس نے بہتیرا مجھ سے چھپانے کی کوشش کی مگر میں نے پتہ لگا ہی لیا۔ میں نے اس سے بیرک پور اپنے باغوں میں جانے کی اجازت مانگی۔ وہ مجھ کو بھیجکر بہت خوش ہوا۔ میں وہاں جا رہا ہوں۔ خدا کرے پھر واپس نہ آؤں۔

وینو نے یہ دیکھ کر کہ ہیرالال اس کی انگوٹھیوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے۔ کہا "یہ میری والدہ کی ہیں"

ہیرالال نے پوچھا "کھانا کھا چکے ہو"

اُس نے کہا "ہاں۔ کیا تم نے نہیں کھایا"

ہیرالال نے جواب دیا "نہیں۔ جبتک یہ روپیہ تجوری میں نہ رکھ لوں میں کمرے سے باہر نہیں جا سکتا"

وینو نے کہا "جاؤ کھانا کھا آؤ۔ میں حفاظت کرتا ہوں"

پہلے تو ہیرالال نے تامل کیا۔ پھر اُٹھا اور چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں بمعہ مال کے واپس آگیا۔ اور تینوں تھیلیوں کے پاس بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ جب آدھی رات گزر گئی تو وینو گھبرا کر اُٹھ بیٹھا اور گھڑی دیکھ کر کہنے لگا "میں گاڑی سے رہ جاؤنگا۔ یہ انگوٹھیاں، گھڑی اور زنجیر تم اپنے پاس رکھو۔ جب میں آؤنگا لے لونگا" ہیرالال نے ان کو ایک چمڑے کی تھیلی میں بند کر کے صندوق میں رکھ دیا۔ اور وینو چلا گیا۔ نوٹوں والی قرمز کی تھیلی پہلے ہی تجوری میں رکھی جا چکی تھی۔ صرف کھلے روپے گننے باقی تھے۔

(۱۰)

ہیرالال دروازے کے پاس لیٹ گیا۔ اور چابی تکیے کے نیچے رکھ کر سو گیا۔ اس نے خواب میں دیکھا۔ کہ پردے کے پیچھے سے وینو کی ماں زور زور سے اس کو لعنت ملامت کر رہی ہے۔ الفاظ اچھی طرح سنائی نہیں

دیتے تھے۔ مگر مختلف رنگ کے جواہرات جو وہ پہنے ہوئے تھی۔ پردے میں سے جھلک رہے تھے۔ ہیرالال نے وینو کو بلانے کی کوشش کی۔ مگر آواز اس کے حلق میں اٹک گئی۔ آخر پردہ زور سے گرا۔ ہیرالال چونک پڑا۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ ہوا کے ایک بگولے نے کھڑکی کا پردہ گرا کر لمپ کو بجھا دیا تھا۔ ہیرالال پسینے میں تر تھا۔ اس نے لمپ جلا کر دیکھا۔ چار بجے تھے۔ اب سونے کا وقت نہ تھا۔ کیونکہ اُسے جانیکی تیاری کرنا تھی۔

اس نے ابھی منہ ہاتھ دھویا ہی تھا۔ کہ اس کی ماں نے آواز دی۔ "بابا! آج اتنے سویرے کیوں اٹھ کھڑے ہوئے۔"

ہیرالال کا قاعدہ تھا۔ کہ صبح سب سے پہلے وہ اپنی ماں کا منہ دیکھتا تھا۔ تاکہ سارا دن بخیریت گزرے۔ اسکی ماں نے کہا۔ "میں نے خواب دیکھا۔ کہ تم دولہا بن کر جارہے ہو۔" ہیرالال پھر خوابگاہ میں گیا۔ اور روپوں اور نوٹوں کی تھیلیاں نکالنے لگا۔

اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ تین تھیلیاں خالی تھیں۔ اس نے تجوری کو ہلا کر دیکھا۔ اس کا گمان درست نکلا۔ اس نے اسکو کھولا۔ اور زور سے ہلایا۔ ان میں سوائے وینو کی دو چٹھیوں کے اور کچھ نہ ملا۔ ایک وینو کے باپ کے نام تھی۔ اور دوسری اس کے نام۔ ہیرالال نے اپنی

چٹھی کو کھولا۔ اور پڑھنے کی کوشش کی۔ کئی لفظوں پر سیاہی کے دھبے پڑ گئے تھے۔ اس نے لمپ کا گل کترا مگر کوئی لفظ نہ سمجھ سکا۔ تاہم مطلب صاف ظاہر تھا۔ وینو تین ہزار روپے کے نوٹ لیکر انگلینڈ کو روانہ ہوگیا تھا۔ جہاز اُسی دن علی الصباح جانے والا تھا۔ چٹھی کے آخری الفاظ یہ تھے۔ "میں نے باپ کے خط میں ہر ایک امر واضح کردیا ہے۔ وہ قرضہ ادا کردیگا۔ علاوہ ازیں میری والدہ کے زیورات جو آپ کی حراست میں ہیں۔ اس رقم سے زیادہ مالیت کے ہیں۔"

ہیرالال نے کمرے کو مُقفّل کردیا۔ اور ایک گھوڑا گاڑی کرایہ کی لیکر بندرگاہ پر گیا۔ مگر اس کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وینو کس جہاز پر سوار ہوا ہے۔ وہ گھاٹ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گیا۔ معلوم ہوا۔ کہ دو جہاز صبح سویرے انگلینڈ کو گئے ہیں۔ یہ اندازہ کرنا محال تھا کہ وینو ان دونوں میں سے کس جہاز میں تھا۔

جب ہیرالال واپس گھر آیا۔ تو سورج کافی بلند ہوچکا تھا۔ کلکتہ میں چہل پہل تھی لیکن اس کو ہر ایک چیز دھندلی نظر آتی تھی۔ اس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی بھاری بوجھ اٹھائے جاتا ہے۔ اسکی ماں برآمدے میں دوڑتی ہوئی آئی اور متفکر ہوکر پوچھنے لگی کہ وہ کہاں گیا تھا۔ اُسنے ایک عجیب انداز سے کہا۔ "دولہن لانے کیلئے"

یہ کہہ کر وہ بیہوش ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس کو ہوش آیا۔ اس نے آنکھیں کھولدیں اور اپنی ماں سے چلے جانے کو کہا اور کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔ اس کی ماں برآمدے میں سخت دھوپ میں بیٹھی رہی۔ وہ بے تحاشا اس کو پکارتی رہی۔ "بابا، بابا"

حسب معمول منیجر کے دفتر کا چپراسی آیا اور دروازے پر دستک دی کہ اگر جلدی روانہ نہ ہوئے تو گاڑی سے رہ جائینگے۔ ہیرالال نے اندر سے کہا "آج نہیں جا سکتے۔"

"تو پھر جناب کو کہاں جانا ہے۔"

"میں تمہیں پھر بتاؤنگا۔"

نوکر بیقرار ہو کر نیچے اُتر گیا۔

اچانک ہیرالال کو زیوروں کا خیال آیا۔ جو وینو چھوڑ گیا تھا۔ وہ ان کو بالکل بھول گیا تھا۔ خیال آتے ہی اس کو ذرا تسلی ہوئی۔ اُس نے تھیلی نکالی۔ اور وینو کے باپ کے نام چٹھی لے کر باہر چلا گیا۔

ادھرلال کے گھر پہنچنے سے پہلے اس نے شادی کا باجہ بجتے سُنا۔ اندر جا کر معلوم ہوا۔ کہ کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ ہیرالال کو بتایا گیا۔ کہ پچھلی رات چوری ہو گئی۔ اور چند نوکروں پر شبہ کیا جاتا ہے۔ ادھر بابو اوپر کے برآمدے میں غصّہ سے سرخ بیٹھا تھا۔ اور رتی کانتا پاس بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ ہیرالال نے کہا "میں آپ سے ایک پوشیدہ بات کہنا چاہتا ہوں" ادھرلال کا غصّہ بھڑک اُٹھا۔ اُس نے کہا "مجھے فرصت نہیں"

اس کا خیال تھا کہ ہیرالال اُدھار مانگنے یا مدد کی درخواست کرنے آیا ہے۔

رتی کانتا نے کہا "اگر آپ کو میری موجودگی میں بات کرتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے۔ تو آپ چلے جائیں" ادھرلال نے کہا "چپ رہو" تب ہیرالال نے وہ تھیلی ادھرلال کو دیدی۔ ادھرلال نے پوچھا "اس میں کیا ہے۔" ہیرالال نے کھول کر اس میں سے چیزیں نکال دیں۔ ادھر بابو نے ناک بھوں چڑھا کر کہا "تم نے اور تمہارے شاگرد نے جو کام شروع کیا ہے وہ ہے بڑا منفعت بخش۔ تمہیں معلوم تھا کہ مسروقہ مال کا سراغ مل جائیگا۔ اس لئے تم میرے پاس انعام کی خاطر آتے ہو۔"

ہیرالال نے وینو کی چٹھی دیدی۔ مگر اس سے ادھرلال اور بھی ناراض ہو گیا۔ اُس نے چلّا کر کہا "اس کے کیا معنی۔ میں پولیس کو بُلاتا ہوں۔ میرا لڑکا ابھی سِن بلوغت کو نہیں پہنچا۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ تم نے اس کو چند ایک سو روپیہ دیکر تین ہزار کا پرونوٹ لکھوا لیا

ہے۔ مگر میں ادائیگی کا ذمہ دار نہیں۔"

ہیرالال نے کہا۔ "میں نے تو اُسے ایک کوڑی بھی نہیں دی۔"

ادھر لال نے پُوچھا پھر اس کو یہ رقم کس طرح مل گئی کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ اس نے تمہارا صندوق کھول کر نوٹ چُرا لئے۔

ہیرالال خاموش رہا۔ رتی کانتا نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔ "میرا تو خیال نہیں کہ اس کے پاس تین ہزار روپیہ ساری عمر میں آیا ہو۔"

جب ہیرالال گھر سے نکلا۔ تو اس کو معلوم ہوا کہ وقت خوف اور فکر کی حدود سے باہر ہے۔ اس کے ضمیر نے کام کرنے سے انکار کر دیا۔ جونہی کہ وہ گلی میں داخل ہوا اُس نے ایک گاڑی دروازے پر کھڑی دیکھی۔ ایک لحظہ تو اُس کو یقین رہا کہ وہ جو ہوگا۔ یہ خیال کرنا ناممکن تھا۔ کہ یہ اس کی مصیبت کی انتہا تھی۔

ہیرالال جلدی سے گاڑی کے پاس پہنچا اس میں کمپنی کا ایک انگریز ملازم بیٹھا تھا۔ جب اُس نے ہیرالال کو دیکھا تو وہ نیچے اُتر آیا اور اس کو بازو سے پکڑ کر کہنے لگا۔

"تم آج صبح کی گاڑی سے کیوں نہیں گئے۔"

چپراسی نے منیجر صاحب پر شکوک ظاہر کر دیئے تھے۔ اسی لئے اُس نے اس آدمی کو دریافت کرنے کیلئے بھیجا تھا۔

ہیرالال نے جواب دیا۔ "کیونکہ تین ہزار کے نوٹ گم ہو گئے ہیں۔"

اُس نے سبب دریافت کیا۔ مگر ہیرالال نے کوئی جواب نہ دیا۔

اس کی گھبراہٹ دیکھ کر اُس نے ہیرالال سے کہا۔ "آؤ اُوپر چلیں اور دیکھیں تم روپیہ کہاں رکھتے ہو۔"

وہ اُوپر کمرے میں گئے۔ روپوں کو گنا۔ اور گھر کی تلاشی لی۔

جب ہیرالال کی ماں نے یہ دیکھا تو وہ ضبط نہ کر سکی اُس نے آکر اپنے بیٹے سے واقعہ دریافت کیا۔ اجنبی نے ٹوٹے پھوٹے ہندوستانی لفظوں میں جواب دیا کہ کچھ روپیہ چوری گیا ہے۔

ماں چلّائی۔ "چوری گیا" کس طرح چرایا گیا۔" ایسی کمینہ حرکت کس نے کی۔" مگر ہیرالال نے اسکو چپ کرا دیا۔

اجنبی نے بقایا روپے جمع کئے۔ اور ہیرالال کو ساتھ لیکر منیجر کے پاس چلا۔ ماں راستہ روک کر کھڑی ہو گئی حضور آپ میرے بچے کو کہاں لئے جاتے ہیں۔ میں نے حتے المقدور بھوکے رہ رہ کر یہ کوشش کی ہے۔ کہ میرا بچہ دیانتداری سے کام کرے۔ وہ کبھی غیر کے روپے کو ہاتھ تک نہیں لگاتا۔"

انگریز اس سے نہ سمجھ سکا۔ اُس نے جواب دیا۔ "اچھا۔ اچھا"

ہیرالال نے ماں سے کہا۔ "فکر نہ کرو۔ میں منیجر سے سب کچھ کہہ دونگا اور جلدی واپس آؤنگا۔" اُکی ماں نے متفکرانہ انداز سے سے کہ ہیرالال نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ اس کو ناشتہ کرنے کے لئے کہا۔ مگر ہیرالال نے اس کی التجا کی پروا نہ کی۔ اور گاڑی میں بیٹھکے چل دیا۔ اور ماں فرطِ رنج سے زمین پر گر پڑی۔

جب ہیرالال منیجر کے سامنے آیا۔ تو اُس نے پوچھا "سچ بتاؤ۔ کیا ہوا؟" مگر ہیرالال نے جواب دیا۔ "میں نے روپیہ نہیں لیا۔"

منیجر نے کہا۔ "مجھے بالکل یقین ہے۔ مگر تمہیں یہ تو معلوم ہے کہ کس نے لیا۔"

ہیرالال چُپ چاپ زمین پر نظریں جمائے کھڑا رہا۔ منیجر نے کہا۔ "کسی نہ کسی نے تو تمہاری غفلت کے باعث اُڑایا ہوگا۔"

ہیرالال نے جواب دیا۔ "میری موجودگی میں کوئی نہیں لے جا سکتا۔ میں جان دیدیتا۔"

منیجر نے کہا۔ "ہیرالال، دیکھو میں نے تم پر اعتبار کیا۔ کوئی ضمانت نہ لی۔ میں نے ذمہ داری کا کام تمہارے سپرد کیا۔ دفتر کے سب لوگ اس بات کے مخالف تھے۔ تین ہزار روپے معمولی بات ہیں۔ مگر شرم میرے لئے ایک اہم بات ہے۔ میں ایک بات کرونگا۔ میں تمہیں روپیہ واپس لانے کے لئے سارا دن دیتا ہوں۔ اگر تم لادو تو میں کچھ نہیں کہتا۔ اور تم اپنی جگہ پر بحال رہوگے۔"

سات بجے تھے ہیرالال سر جھکائے دفتر سے باہر آگیا۔ اور دوسرے کلرکوں کو اپنی ہتک پر خوش ہوتے چھوڑ گیا۔

ہیرالال نے بار بار دل میں کہا: "میں کیا کروں میں کیا کروں۔" سورج کی کرنیں سیدھی اس پر پڑ رہی تھیں۔ اور وہ چندھیائے ہوئے آدمی کی طرح جا رہا تھا۔ آخر کار تمام خیالات اس کے دل میں رُک گئے۔ اور وہ آپ سے آپ چلتا گیا۔

کلکتہ۔ جس میں ہزاروں ہی لوگ پناہ گزین ہوئے ہوئے تھے اس کو پنجرہ نظر آتا تھا۔ باہر جانے کو کوئی راستہ نہ تھا۔ سارے لوگ اس معمولی سی حیثیت کے انسان کو گرفتار کرنے کے لئے جس کا کوئی واقف بھی نہ تھا۔ باہم سازشیں کر رہے تھے۔ کسی کو اُس سے ذاتی عناد نہ تھا۔ مگر سب اس کے دشمن نظر آتے تھے۔ لوگ اُس سے کترا کر گزرتے۔ مختلف دفتروں کے کلرک سڑک پر بیٹھے درختوں کے پتّوں پر کھانا ڈال کر کھا رہے تھے۔ ایک تھکا ہوا مسافر میدان میں درخت کے سایہ تلے لیٹا ہوا تھا۔ ہاتھ سر کے نیچے تھا۔ اور ٹانگیں ایک دوسری کے اُوپر۔ دیہات کی عورتیں کرایہ کی گاڑیوں میں بیٹھی مندر کو جا رہی تھیں۔

ایک چپراسی چٹھی لے کر آیا۔ اور لفافہ پر کا پتہ دریافت کیا۔ دن ڈھل گیا۔ شام ہو چلی۔ دفتر بند ہونے شروع ہوئے۔ لوگوں کو واپس گھروں میں لے جانے کے لئے گاڑیاں چاروں طرف جانے لگیں۔ کلرک ٹریم کار میں بیٹھے تھے۔ اور راستے میں تھیئٹروں کے اشتہاروں کو پڑھتے تھے۔ اس کے دل میں خیال آیا۔ کہ اب وہ اس جمعیت کا فرد نہیں رہا۔ اس کو کوئی کام نہیں۔ اور شام کو دن کی تکان سے آرام بھی نہ ملیگا۔ اس کو گھر جانیوالی ٹریم میں بیٹھنے کی کیا جلدی پڑی ہے۔ شہر کی پر رونق عمارتیں گھوڑے گھیاں، لوگوں کی بھیڑ کبھی تو اصلیت بن کر اس کے سامنے آتیں۔ اور پھر انعکاس تصور میں غائب ہو جاتیں۔

ہیرالال نے تمام دن نہ تو کھانا کھایا۔ نہ آرام کیا، نہ سائے میں بیٹھا۔

بازاروں میں لیمپ روشن ہونے شروع ہوئے۔ اس کو ایسا معلوم ہوا۔ کہ تاریکی ایک دیو کی طرح آنکھیں پھاڑے ہر لحظہ اپنے مجرم پر نظر جمائے ہوئے ہے۔ ہیرالال کو یہ پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ کہ وقت کیا ہے۔ اس کے ماتھے کی رگیں ابھر آئی تھیں۔ گویا اس کا سر پھٹنے لگا ہے۔ درد کی شدت کی وجہ سے جس میں ناامیدی اور مایوسی بھی تھی۔ اس کے دل میں اتنے لوگوں کی موجودگی کا ایک خیال بار بار آتا۔ اس کے ذہن میں ایک شخص کا تصور آتا۔ اور اس کے خشک حلق سے صرف ایک ہی لفظ باہر نکلتا۔ "ماں"

اس نے سوچا۔ "رات کی تاریکی میں جب مجھے گرفتار کرنے والے سو رہے ہیں۔ میں چپکے سے دبے پاؤں اپنی ماں کی گود میں جا کر سو جاؤنگا۔ اور خدا کرے کہ پھر نہ جاگوں"

ہیرالال کو یہ بھی ڈر تھا۔ کہ کہیں کوئی پولیس افسر اس کی ماں کے سامنے اس کو ایذا نہ پہنچائے۔ اور گھر جانے سے نہ روک دے۔ جب آگے چلنا اس کو عذاب دکھائی دیا تو اس نے ایک گاڑی والے کو آواز دی۔ کوچوان نے پوچھا "کہاں جاؤ گے" اس نے کہا۔ "کہیں نہیں۔ میں صرف میدان میں چکر لگا کر تازہ ہوا کھانا چاہتا ہوں۔" کوچوان کو پہلے تو یقین نہ آیا۔ اور وہ چلدیا۔ جب ہیرالال نے اس کو ایک روپیہ پیشگی دیا۔ تو اس نے میدان کے ایک دو چکر لگائے۔

ہیرالال نے اپنا دھڑکتا ہوا دل کھڑکی کے ساتھ لگا دیا۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔ آہستہ آہستہ تمام درد جاتا رہا۔ دل کو کلی اطمینان حاصل ہوا۔ اور ہر طرف سے نجات بانہیں پھیلا پھیلا کر اس کو آغوش میں لیتی ہوئی نظر آئی۔ یہ غلط تھا۔" دن کی مایوسی جو اس کو حسرت کی طرف لیجا رہی تھی۔ یہ سچ نہ تھا۔ بلکہ غلط تھا۔ اب اسے معلوم ہوا۔ کہ یہ ایک بے بنیاد خیال تھا۔ جس کی کوئی اصلیت نہ تھی۔ نجات آسمانوں پر ہے۔ اور راحتِ قلب کی کوئی انتہا نہیں۔ دنیا کا کوئی بادشاہ کوئی شہنشاہ اس نیستی (ہیرالال) کو گرفتار کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ اس کے مطمئن قلب کے چاروں

طرف آسمان میں اس کو اپنی ماں نظر آتی۔ وہ بڑھتی گئی اور اُس نے ساری تاریکی کو گھیر لیا۔ کلکتے کی تمام سڑکیں عمارتیں اور دوکانیں اس میں چھپ گئیں۔ اس کی موجودگی میں اس کا درد جاتا رہا۔ خیال بلکہ ہوش بھی گم ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوا کہ درد کے بخارات سے بھرا ہوا آبلہ پھوٹ گیا۔ اور اب نہ تاریکی تھی نہ روشنی۔ بلکہ ہر طرف "سودگی ہی آسودگی تھی۔ گرجا گھر کے گھنٹے نے ایک بجایا۔ کوچوان پکارا۔

"بابو صاحب، اب میرا گھوڑا نہیں چل سکتا۔ آپ کہاں جائینگے؟" کوئی جواب نہ ملا۔ کوچوان نے نیچے اُتر کر ہیرالال کو ہلایا اور پوچھا کہ وہ کہاں جانا چاہتا ہے "کوئی جواب نہ ملا"

اور یہ ایک سوال تھا۔ جس کا ہیرالال نے کبھی جواب نہ دیا۔

(ترجمہ) (محمد شاہ ولی مینی)

حشر جذبات

نہ ہوں میں ظلم کے قابل نہ ہے تاب فغاں مجھکو
دُعا دیتا ہوں اب میں آسماں کو آسماں مجھ کو

وہ عالم ہے کہ ملتا ہی نہیں اپنا نشاں مجھ کو
لئے جاتی ہے میری بیخودی یارب کہاں مجھ کو

ترا بیمار سوئے شمع کس حسرت سے تکتا ہے
اشارہ تھا کہ سمجھو رات بھر کا میہماں مجھ کو

کسی کا حسنِ دلکش کہہ رہا ہے مرنیوالے سے
ابھی لینا ہے محشر میں بھی تیرا امتحاں مجھ کو

فنا کا ذکر ہی کیا زندہ باش اے مرگ مایوسی
ملی ہے تیرے صدقے میں حیات جاوداں مجھ کو

چلو اچھا ہوا دل مٹ گیا جھگڑا چکا ثاقب
کہ اب باقی نہیں اندیشۂ سود و زیاں مجھ کو

ابو محمد ثاقب

بیراگی

آدھی رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں وہ نیم خوابی کی حالت میں اُٹھا اور گیروے رنگ کے وہ کپڑے جو اُس نے بستر کی پوشیدہ تہوں میں چھپا رکھے تھے، زیب تن کئے۔ آہستہ سے دروازہ کھولا۔ اور سنسان بازاروں سے گزرتا ہُوا شہر کے باہر چلا گیا!

پرشانت بیراگی تھا اور وہ رات اُس کے عملی بیراگ کی صبح تھی!

وہ عجیب قسم کا فلسفی واقع ہُوا تھا۔ اُس کی فطرت عام انسانی فطرت سے جُدا تھی۔ اگرچہ تعلیم و فلسفہ پر اُسے کامل عبور تھا لیکن بسا اوقات اُس کی باتیں اُس کے حواس کی بدنظمی پر دلالت کرتی تھیں۔ اس کی منطق اس بات سے بے نیاز تھی۔ کہ اُس کے اصول قوانینِ قدرت کے مطابق ہیں یا نہیں۔ وہ اکثر ایسی باتیں کہہ جاتا جن کی عملی صورت بعید از ممکنات ہوتی اور ایسے نظریے پیش کر جاتا جن کا وجود قدرت کے نزدیک ناممکن ہوتا۔ وہ عورت کا دشمن تھا اور اُس محبت سے جو انسان کو اس جنسِ جمیل سے ہُوا کرتی ہے۔ اُس کی فطرت متنفر تھی۔ وہ بیراگی تھا۔ اور اس آرائش کی دیوی کو شریکِ حیات بنانے سے گریزاں۔ اُس کی منطق جنسِ لطیف کی نفرت ہی پر ختم نہ تھی۔ بلکہ وہ فضائے عالم کو اس کے وجود سے خالی کرنا چاہتا تھا۔

وہ اکثر کہتا "دُنیا میں صرف ایک عورت کی ضرورت ہے جس کا ہم سے ماں کا رشتہ ہو۔ بیوی بہن وغیرہ تمام تانیثی رشتے غیر ضروری ہیں۔ انسانی حیات کا مقصد محبّت نہیں۔ بلکہ ایسے وجود کی تلاش جو پسِ پردہ دُنیا کی تمام قوتوں کو اپنے اپنے نظام میں قائم رکھتا ہے۔ حسین عورت کی آنکھوں کی وہ روشنی جسے شاعر "فتنہ طرازی" اور محبت والے محبّت کی نظر کہا کرتے ہیں درحقیقت بربادی کا پیغام ہے۔ مکاری اور جفاکاری عورت کی فطری اور امتیازی خصوصیات ہیں اس لئے عورت اعتماد کے قابل نہیں۔ عورت کا وجود دُنیا میں بدی کا ایک ایسا مجسمہ ہے۔ جس سے نفس پرستی کا آغاز ہوتا ہے انسان کی وہ اکتسابی روحانی قوتیں جو وہ ایک مدّتِ مدید کے بعد حاصل کرتا ہے۔ اس اخلاق سوز "عورت" کے آتشیں رُخساروں کی گرمی سے جل کر خاک سیاہ ہوجاتی ہیں۔ اسی عورت کو دیکھ کر انسانی جذبات کا دریا بدی کی طرف بہنے لگتا ہے۔"

اُس کی تقریر طویل ہوتی تھی۔ اور جب کبھی وہ غصے میں آکر کچھ کہنے لگتا تھا۔ تو اُس کا موضوع تخیل "عورت سے نفرت"

ہوتا تھا۔

اس نفرت نے پرشانت کو بیراگی بنا دیا۔

وہ شباب جو اپنے ہمراہ محبت کی فوجیں لایا کرتا ہے پرشانت پر بھی حملہ آور ہوا۔ لیکن محبت نے ہتھیار ڈال دیئے۔ وہ اپنی بات کا دھنی تھا اس کی فطرت کچھ اس طرح کی واقع ہوئی تھی کہ قدرتی موسم بھی اس پر اپنا اثر نہ کر سکتے تھے۔ اسی قسم کے خیالات کے تسلسل نے پرشانت کو بیراگی بنا دیا تھا!

وہ یتیم تھا۔ حالات کی تنگ دامانی نے اُسے اسی قسم کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع دیا تھا۔ اور اسی زبردست خیال کو وہ دل کی پوشیدہ ترین گہرائیوں میں چھپا کر اپنے آقا کے گھر سے چوری چلا آیا تھا۔ کہ دُنیا کو اس مکروہ وجود سے پاک کر دے!

پرشانت کا شباب عروج پر تھا۔ تاہم محبت کے وہ عنصر جو کائنات کی نظم و بقا کے لئے ذرہ ذرہ میں ودیعت کئے گئے ہیں۔ پرشانت میں ناپید تھے۔

وہ کئی دن قدرت سے جنگ کرتا رہا۔ اور دنیا کی اُس نعمت کو جو خوبصورتی کا مجسمہ ہے صفحۂ عالم سے مٹا دینے پر تُلا رہا۔

پرشانت اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا۔ اُس کا دل ٹوٹ گیا اس کے حواس جاتے رہے اور اب لوگ اُسے "پاگل بیراگی" کہا کرتے تھے۔ بیشک وہ اس جنس لطیف کو دُنیا سے نہ مٹا سکا لیکن عورت کا نقش محبت بھی اُس کے دل میں نہ بیٹھ سکا۔ اُسے ایک قسم کا وہم ہو گیا۔ کہ عورت کا وجود دُنیا میں ابتدائے آفرینش ہی سے عنقا ہے۔ وہ اب عورت کو دیکھتا تھا اور اسے عورت نہ کہتا تھا۔ وہ اس پیدائشی صورت کو نوعِ انسان کی ایک عجیب صورت سمجھنے لگا۔ عورت اُس کے نزدیک عورت نہ تھی۔ اُس نے خیالات کی رو کو اس طرح بہایا کہ عورت کی نفرت۔ عورت کی محبت اور خود عورت کی ہستی اُس کے سیلاب میں بہ گئے!

ہاں اس طرح پرشانت عورت کو دُنیا سے مٹانے میں کامیاب ہو گیا!

پرشانت اسی طرح اپنے خیالات میں غرق گاؤں گاؤں فقیرانہ لباس میں پھرتا رہا۔ وہ جگہ جگہ کہا کرتا تھا۔ "مجھے مبارک دو۔ میں نے موجودات کو عورت کے ناپاک وجود سے پاک کر دیا ہے۔ اب دُنیا میں نیکی اور عافیت ہوگی۔ جو خاک کے ذرّوں سے بھی جھانکا کرے گی۔"

لوگ اُسے مجبور ہو کر پاگل کہہ دیتے تھے لیکن وہ پاگل نہیں تھا۔

ہمالہ کے دامن میں ایک خوبصورت گاؤں تھا۔ پرشانت وہاں آیا اور وہیں رہنے لگا۔ اُسے یہ مقام بہت پسند تھا وہ صبح کے نور میں آفتاب کی کرنوں کو ہمالہ کی اُونچی چوٹیوں پر رقص کرتے دیکھا کرتا تھا۔ وہ پہاڑی نالوں کے رُوحانی

راگ سنایا کرتا تھا۔ اور خود بھی بےخود ہو کر گانے لگتا لیکن اُس کا گانا محبت سے پھیکا ہوتا تھا۔

ہاں وہ بیراگی تھا۔

گاؤں میں نوخیز لڑکیوں کی ایک پاٹ شالا تھی۔ پرشانت اس پاٹ شالا کا اُستاد بن گیا۔ گاؤں کے لوگ اس کی طرف سے بالکل مطمئن تھے۔ پرشانت کی مرد و عورت میں امتیاز کرنے والی حس نیست ہو چکی تھی۔ وہ ایک پورا پورا بیراگی سادھو تھا۔

شانتا ایک دائم المریض بیوہ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ بھی پاٹ شالا میں پڑھا کرتی تھی۔ اور ضرورت کے موافق کافی بڑھ چکی تھی۔ شباب اُس کے ہر عضو میں جلوہ گر تھا اور خوبصورتی اُس کی ہر حرکت میں مضطرب۔ وہ قبول صورت تھی۔

ایک دن شانتا پڑھتے پڑھتے رک گئی۔ "پریم" کے لفظ نے اُس کو روک لیا۔ اُس کا دل "پریم" کی تشریح کے لئے بیتاب ہو گیا۔ وہ نہ رہ سکی اور پرشانت سے پریم کے معنے پوچھنے لگی۔

دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ اور پرشانت کے کان میں پریم کی آواز گونجی۔ وہ فلسفی تھا۔ اُس نے بتایا کہ "پریم پرماتما کی پوجا کا سادھن ہے۔ اور پریم ہی پرماتما کی سچی پوجا ہے۔"

شانتا کی تسلی نہ ہوئی۔ وہ بیٹھ گئی اور پاٹ شالا کا کام بدستور ہوتا رہا!

چھٹی کا گھنٹہ بجا اور تمام لڑکیاں اپنے اپنے گھر چلی گئیں۔

اُس رات پرشانت کو نیند نہ آئی تھی۔ وہ اس فوری تغیر کو نہ سمجھ سکا۔ اسے اپنے آپ میں ایک خلا سی محسوس ہونے لگی۔ اسے اپنی تکمیل پر شک سا ہونے لگا۔ "پریم" کا لفظ بار بار اُسے یاد آتا تھا۔ لیکن یہ پریم کا لفظ اُس پریم کے لفظ سے بالکل مختلف تھا۔ جو اُس نے فلسفہ کی خشک کتابوں میں کالی سیاہی سے لکھا ہوا دیکھا تھا۔ اس پریم میں کشش تھی اس پریم کے پیچھے شانتا کی سانچے میں ڈھلی ہوئی مجسم پریم صورت ایک کیفیت سحری سے اُس کو دیکھ رہی تھی۔

پرشانت پر محبت کے اسرار کھل گئے۔ اس کا فلسفہ ملمع سحر کی طرح پگھلنے لگا۔

دوسرے دن پرشانت پاٹ شالا میں کام کرتا رہا لیکن اُس کی نظریں بار بار شانتا کو بیتابی سے دیکھتی تھیں۔ محبت کی صبح ہو چکی تھی اور پریم کے سورج کو پردوں میں چھپانا اختیار سے باہر تھا۔ پرشانت بار بار اُس سے سبق سنتا اور "پریم" کے معنی پوچھتا تھا۔

پرشانت اور شانتا محبت کے رشتے میں بندھ گئے۔ پرشانت اب پاٹ شالا کا اُستاد نہ تھا۔ وہ بیراگی نہ تھا۔ وہ اب ایک دنیادار انسان تھا۔

عورت کی دنیا جو اس کے خیال میں نیست ہو چکی تھی پھر پیدا ہو گئی اس نئی دنیا میں مکاری اور جفاکاری عورت کی امتیازی خصوصیات نہ تھیں۔ بلکہ محبت حیا اور عصمت ان کے ایمان کا جزو تھا۔ اب دنیا اُس کے لئے زیادہ دلچسپ بن گئی۔

گیان چند

عرش پیمائی

خوبِ مطلب کی جنوں میں دلِ ناداں سمجھا
اُن کے دامن کو بھی اپنا ہی گریباں سمجھا

کھل گئی آنکھ پس مرگ الٰہی توبہ
حاصلِ عمر کو اک خوابِ پریشاں سمجھا

یہ بھی اک حسن کی تھی جلوہ فریبی ورنہ
کس لئے سیرتِ کافر کو مسلماں سمجھا

پھر گئی خلق جو ظالم کی نظر کے پھرتے
گردشِ چشم کو میں گردشِ دوراں سمجھا

سوز اس درجہ بڑھا مُردہ تمنّاؤں کا
دل کو میں شمع سرِ گورِ غریباں سمجھا

زندگی کیوں نہ ہو بیمارِ محبّت کی دراز
صبحِ محشر کو مآلِ شبِ ہجراں سمجھا

مجھ پہ یہ عقدۂ شوریدہ سری کیا کھلتا
بختِ برہم کو خمِ زلفِ پریشاں سمجھا

ٹھوکریں کھائیں بہت راہِ جنوں میں لیکن
پھر بھی کہنے کو نہ میرے دلِ ناداں سمجھا

عرشؔ

پائے حنا طراز

ربط ہے سوزِ عشق اور حسنِ کرشمہ ساز میں
خونِ جگر ہے جلوہ گر پائے حنا طراز میں

دیکھتے ہو کبھی جب قبول جذب تو ہم نے کر دیا
نالۂ دل خراش کو نغمۂ دل نواز میں

کیف نگاہِ چشمِ یار لغزشِ مست کے نثار
تو نے تو روح کھینچ لی بیخودیٔ نیاز میں

سوزِ دروں کی اک تپش ضبطِ جنوں کی اک خلش
مٹ بھی چکے کہیں یہ دل عشق کے سوز و ساز میں

ذوقِ نظر تو ہو کہیں دیدۂ تر تو ہو کہیں
دیکھ ہی لیں گے تجھ کو ہم آئینۂ مجاز میں

دیکھئے حسنِ جانگداز جان لبوں پہ آ نہ جائے
آئے نہ وہ خدا کرے میری شبِ دراز میں

جلیل قدوائی

ہار جیت

(۱)

اپنی بیوی کی زندگی میں میں نے اپنی بیٹی پر تھا کی چنداں پروا نہیں کی۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے پرتھا کی نسبت اس کی ماں سے زیادہ لگاؤ تھا۔ اس عرصہ میں اس کے متعلق میری محبت صرف اس کی میٹھی اور توتلی باتیں سننے، اس کی مسکراہٹ دیکھنے اور کھیل کود سے محظوظ ہونے تک محدود تھی۔ اس صورت میں جو ناتک سا مجھ سے ہو سکتا تھا۔ میں اُسے پیار کرتا تھا لیکن جونہی وہ رونا سا منہ بناتی میں اُسے فوراً اس کی ماں کے حوالے کر دیتا تھا۔

(۲)

بیوی کی بیوقت موت کے باعث بچہ کو اُس سے جدا ہو کر میری آغوشِ محبت میں آنا پڑا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا میں پرتھا سے زیادہ محبت کرتا تھا یا وہ مجھ سے زیادہ توجہ سے پیش آتی تھی۔ بہر حال یہ بالکل ٹھیک ہے کہ اُس نے اپنے گھر کو چھ ہی سال کی عمر میں سنبھال لیا اس صغیرسنی ہی میں اُس نے اپنے باپ کی تمام ذمہ داریاں اپنے سر پر لے لیا۔ میں دل ہی دل میں خوش ہوتا تھا مگر اس کا اظہار نہ کرتا تھا۔ میں نے جلدی ہی سمجھ لیا کہ میری لڑکی ہر ایک کام خوشی سے کرتی ہے۔ اس لئے میں نے ہر ایک کام سے ہاتھ کھینچ لیا۔ میں نے دیکھا کہ اگر میں اپنا کوٹ بھی کھونٹی سے اتارتا یا اپنی چھتری خود لے لیتا تو وہ اس قسم کی بیتابی کا اظہار کرتی۔ گویا میں نے اُس کا کوئی حق چھین لیا ہے۔ اُس کے پاس کوئی گڑیا نہ تھی جس سے وہ مجھے کھلانے پلانے اور کپڑے پہنانے میں ایک خاص قسم کی خوشی محسوس کرتی تھی۔ صرف اس وقت جب کبھی میں اُس سے سوال حل کرواتا یا انگریزی کی پہلی ریڈر پڑھاتا۔ اپنی شفقت کا اظہار کرتا تھا۔ کبھی کبھی اس خیال سے مجھے بیحد تکلیف ہوتی تھی۔ کہ میں اس کے لئے اتنا جہیز کہاں سے مہیا کرونگا جس سے کہ اُسے قابل شوہر میسر آسکے۔ وہ اعلےٰ تعلیم سے بہرہ اندوز ہو رہی تھی۔ میں دل میں سوچتا تھا کہ اگر وہ کسی جاہل مطلق اور بیوقوف سے بیاہی گئی تو پھر کیا ہوگا؟

(۳)

میں روپیہ کمانے کی جدوجہد میں تھا۔ لیکن زیادتی عمر کے باعث۔ تو کسی دفتر میں مجھے جگہ مل سکتی تھی نہ کوئی

پرائیویٹ فرم مجھے ملازم رکھنے کے لئے تیار تھی۔ بہت عرصہ سوچنے کے بعد میں نے کتابیں لکھنے کا ارادہ کیا۔

فرض کرو کہ ایک بانس کے درخت میں سوراخ کر دینے سے تیل یا پانی اس میں نہیں ٹھہر سکتا کیونکہ اس کے بند لوٹ چکے ہیں۔ لیکن اگر تم اس کے سرے پر سوراخ کر دو۔ تو اس میں بغیر کسی تکلیف کے سریلے نغمہ کی آواز سنائی دیگی۔ اس مثال سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ ہر غیر مفید شخص مفید بن سکتا ہے جو دنیا کے کاروبار میں ناقابل ہو۔ وہ علمی دنیا میں ترقی حاصل کر سکتا ہے اس خیال سے مجھے تقویت پہنچی۔ اور میں نے ایک ناٹک ڈراما لکھا جو پبلک میں مقبول ہوا۔ یہاں تک کہ وہ سٹیج پر کھیلا بھی گیا۔ اس سے میری شہرت کو چار پر لگ گئے۔ اب میں نے سلسلہ تالیف و تصنیف شروع کیا۔ اور بڑی محنت اور دلسوزی سے ڈرامے لکھنے شروع کر دئے۔ کبھی کبھی چپ چاپ اٹکاتی ہوئی میرے پاس آتی اور بہت معصومانہ الفاظ میں کہتی "ابا! یہ آپ کے سونے کا وقت ہے" مگر میں جھلا کر اسے کہہ دیتا چلی جاؤ۔ کیا تمہیں نظر نہیں آتا کہ میں مصروف ہوں۔ وہ بیچاری مایوس ہو کر ایک نظر مجھ پر ڈالتی ... سا منہ بنا کر چلی جاتی

(۴)

میں خود ماؤں کو پرستش کی نگاہ سے دیکھتا ... اور

جب کبھی کوئی فقیر میرے دروازے پر آکر صدا دیتا۔ تو میں چھڑی لیکر اس کے پیچھے بھاگتا

میرا کمرہ راہگذر پر واقع تھا۔ اس لئے اکثر راہرو مجھے ملتے اور مجھ سے راستہ پوچھتے۔ مگر میں جواب نہ دیتا اور اپنا ڈراما لکھنے میں سرتاپا منہمک رہتا۔

مگر باوجود اس شہرت اور عزت کے مجھے روپیہ میسر نہ ہوا۔ یہ خیال ہر وقت مجھے ستاتا رہتا تھا۔ اس اثنا میں تمام منسوب شدہ لڑکے دوسری دلہنوں کے لئے جوان ہو رہے تھے جن کے والدین ڈرا ... تھے

(۵)

عین اس موقعہ پر میرا ستارا چمکا کہ جبیرگرام کے جاگیردار نے ایک اخبار جاری کیا اور اس کی ایڈیٹری مجھے پیش کی جس نے بخوشی قبول کر لیا۔ چند ابتدائی ایام میں میں نے ایسے سنسنی خیز اور دلچسپ مضامین لکھے کہ جب میں بازار میں نکلتا تھا تو لوگ مجھ پر انگلیاں اٹھاتے تھے۔ اسے میں نے اپنی خوش قسمتی سمجھا۔ جبیرگرام سے اگلا گاؤں ابرگرام تھا۔ دونوں پرگنوں کے جاگیرداروں کے مابین مدت سے کشمکش چلی آتی تھی۔ ان کا کوئی تصفیہ مجسٹریٹ کے بغیر طے ہونا تھا۔ میں بھی ان دو فسادی پارٹیوں میں سے ایک کا صلاح کار بن گیا۔ دونوں کو ضد تھی کہ ان میں سے ہر ایک اپنی پوزیشن کو برقرار رکھیگا۔ میرے مضامین

نے ایرگرام کے جاگیردار کی رہی سہی عزت بھی مٹادی میرے قلم نے اُس کے خاندان اور مقدس فرقہ کی دھجیاں اُڑادیں۔ اس وقت میں نسبتاً زیادہ مرفع الحال تھا۔ اور کسی قدر موٹا بھی ہوگیا تھا۔ میرا چہرہ کامیابی کی کرنوں سے چمک رہا تھا۔

جب میں کوئی نظم ایرگرام کے حسب ونسب کے متعلق کنایۃً ہجو میں لکھتا تو جب ایرگرام کے آدمی اُس کو پڑھ پڑھ کر ہنستے اور پکے ہوئے تربوزے کی طرح پھل جاتے۔ یہ دیکھ کر میں بے حد خوش ہوتا تھا

(۹)

آخرکار ایرگرام کے جاگیردار نے بھی ایک اخبار جاری کیا۔ اس میں جو کچھ شائع ہوتا تھا وہ علمی لحاظ سے بالکل برا ہوتا تھا۔ زبان بالکل غلط اور طبقہ ادنےٰ کے روزمرہ کے مشابہ ہوتی تھی۔ اس کا ہر فقرہ سامعین کی سمع خراشی کرتا تھا آخرکار دونوں پہلگنوں کے باشندے حقیقت حال سے باخبر ہوگئے۔

میری طرزِ تحریر ایسی تھی کہ میرے ہجو آمیز مضامین دوست دشمن کے دل پر بُرا اثر نہ ڈالتے تھے۔ یہاں تک کہ جب میں اس جنگ میں فتحیاب ہوا تو میرے خریداروں کو مطلق اس کا علم نہ تھا۔ آخرکار مایوس ہوکر میں نے ایک بہترین مضمون لوگوں کے دل میں ذوق علم پیدا کرنے کے لئے لکھا لیکن مجھے معلوم ہوگیا کہ یہ میری بدترین حماقت تھی۔

سنجیدہ مضامین کو مذاقیہ بنانے کے لئے بے حد محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بہ نسبت اُن مضامین کے جو پہلے ہی سے مذاقیہ ہوں۔ اس لئے میری تمام کاوشوں کا اثر ناظرین پر اُلٹا پڑا۔

(۷)

مجھے اپنی ملازمت سے علیحدہ ہونا پڑا۔ جیسا کہ واقعات سے ظاہر ہوتا تھا۔ میری عزت دن بدن گھٹنے لگی۔ اور میری کوئی وقعت نہ رہی۔ جب میں اُنہی بازاروں میں سے گزرتا۔ جہاں سے کہ پہلے گزرتے وقت لوگ مجھے عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ تو کوئی شخص میری پروا نہ کرتا۔ شاید کوئی بے پروائی نفرت کا اظہار کرتی تھی۔ لوگ مجھے مذاق کرتے تھے۔ اس اثنا میں میرے مداحوں نے میری تصانیف کو بالائے طاق رکھ دیا جو کہ میری شہرت کا باعث تھیں۔ میری حالت اس دیاسلائی کی مانند تھی جو جلانے کے بعد ناکارہ سمجھ کر پھینک دی گئی ہو میرا دل اس قدر مایوس ہوگیا تھا کہ خواہ میں دماغ پر کتنا ہی زور ڈالتا مگر کسی معاملہ کے متعلق ایک لفظ بھی نہ لکھ سکتا تھا میں نے محسوس کیا کہ میں اپنی زندگی کے تمام مزے کھوچکا ہوں۔

(۸)

اب بڑھاپا مجھ سے بہت ڈرتی تھی۔ وہ بن بلائے کبھی میرے پاس آنے کی جرأت نہ کرتی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ ظرافت نگار

باپ سے ایک بے جان گڈا ہزار درجہ بہتر رفیق ہے۔

میری ملازمت کے کچھ عرصہ بعد ایک گمنام کے اخبار نے مجھ پر حملہ کیا اور نہایت ہی ناشائستہ الفاظ میرے متعلق استعمال کئے۔ پے در پے میرے تمام احباب و آشنا آئے اور وہ حصہ پڑھ کر مجھ پر خوب قہقہے لگانے رہے۔ ان میں سے اکثر کی رائے تھی۔ کہ سب کا اس پر متفق ہونا ناممکن ہے لیکن اس بات سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا تھا۔ کہ یہ بڑی قابلیت سے لکھا گیا ہے۔ کوئی بیس کے قریب آدمی اس روز میرے پاس آئے۔ اور اس پر بحث کرتے رہے۔

ایک دن شام کے وقت میں اپنے پائیں باغ میں ٹہل رہا تھا۔ پرندے اپنے گھونسلوں میں آرام سے سوتے ہوئے تھے۔ مجھے خیال گزرا۔ کہ پرندوں میں نہ کوئی اخبار نویس ہے اور نہ وہ کبھی بہترین مذاق کے متعلق تبادلہ خیالات کرتے ہیں۔ میں اسی خیال میں محو تھا۔ کہ اس مضمون کا جواب کیا ہو سکتا ہے۔ آخر کار میں نے ارادہ کر لیا۔ کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہئے۔ کیونکہ میں شکست کی شرمندگی اٹھانے کے لئے ہرگز تیار نہ تھا۔ جونہی میں اس نتیجہ پر پہنچا۔ شام کی تاریکی میں ایک مدھم مگر آشنا آواز سنائی دی۔

میں نے اپنے ہاتھ میں ایک ملائم اور گرم ہاتھ محسوس کیا میں اپنے خیال میں اس قدر محو تھا کہ باوجود اس گوش آشنا آواز اور مس کے بھی غافل رہا۔ کچھ دیر بعد ایک آواز میرے کان میں سنائی دی۔ وہ چیز جو مس ہوئی تھی ایک جاندار ہستی معلوم ہوتی لیکن اس وقت جبکہ یہ مجھ سے دور ہو گئی تھی میری لڑکی میرے پاس آئی۔ اور چپکے سے میرے کان میں کہا۔ "ابا" لیکن جواب نہ ملنے کی وجہ سے اس نے میرا دایاں ہاتھ پکڑ کر اپنی پیشانی سے لگایا اور بعد ازاں خاموش ہو کر اپنے گھر چلی گئی۔

(۹)

عرصہ سے پربھا نے مجھے اس طرح نہ پکارا تھا۔ اور نہ اس آزادی سے مجھ سے محبت کی تھی۔ اس لئے آج اس کے محبت آمیز مس کے باعث میرے دل میں اس کے لئے پیار کی بجلی دوڑ گئی۔ تھوڑی دیر بعد میں گھر گیا۔ دیکھا تو پربھا اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں اور وہ کسی تکلیف میں مبتلا معلوم ہوتی تھی۔ وہ ایک پژمردہ پھول کے مانند جو سر شام سرنگوں ہو کر خاک سے ہم آغوش ہو گیا ہو لیٹی ہوئی تھی۔ پیشانی پر ہاتھ رکھنے سے معلوم ہوا کہ اس کو بخار ہے۔ اس کا سانس گرم تھا۔ اور اس کی نبض تیز چل رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ بخار کے پہلے ہی حملہ نے اسے اس قدر کمزور کر دیا ہے۔ وہ میری شفقت کی پیاسی تھی۔ مگر میں نے عدم توجہی کی۔ جبکہ میں اخبار کو ایک سخت جواب لکھ بھیجنے میں مستغرق تھا۔ میں اس کے

سرہانے بیٹھ گیا۔ پرتجا نے میرے دونوں ہاتھ اپنی جلتی ہوئی پیشانی پر رکھ دیے۔

میں نے جہیر گرام کے تمام پرچے جو میرے پاس تھے جلا کر خاک سیاہ کر دیے۔ میں نے اس مضمون کا کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے ایسی خوشی کبھی نصیب نہ ہوئی تھی جو اس شکست کو قبول کرنے میں ہوتی۔

میں نے لڑکی کو یا تو اس کی ماں کے مرنے پر آغوشِ شفقت میں لیا تھا۔ یا اب بحیثیت اس کی ماں کے قائم مقام ہونے کے بچھڑے سینہ سے لگایا۔

(ترجمہ) **افتخار الرسول بدر**

کلامِ حسرت

سہل ہونے کو مرا عقدۂ دشوار آیا ||| روزِ غم ختم ہوا، شام ہوئی، یار آیا
ﷲ الحمد کہ تا بکیِ فرقت ہوئی دور ||| مژدۂ وصل بصد جلوۂ انوار آیا
چمنِ جاں میں نسیمِ ہوس انگیز چلی ||| کشتِ امید پہ ابرِ طرب آثار آیا
بادۂ عیش سے مینائے تمنا رنگیں ||| ساغرِ شوق۔ مئے ذوق سے گلنار آیا
بند کر دیگا اب یار کو بوسوں کا ہجوم ||| آج بھی ہم سے جو وہ برسرِ انکار آیا
دلِ مجبور بھی کیا شے ہے کہ در سے اپنے ||| اس نے سو بار اٹھایا تو میں سو بار آیا

کیوں نہ برہم ہوں وہ حسرت مری رسوائی سے
نام ان کا بھی ہر کوچہ و بازار آیا

مرسلہ

بیگم حسرت موہانی

باغبان

مصنفہ رابندر ناتھ ٹیگور

مترجمہ سُدرشن

(۱)

"آہ! شاعر!! شام زندگی نزدیک سرک رہی ہے۔ اور تمہارے سر کے بال سفید ہو رہے ہیں"۔

"کیا اس مسرت آمیز تنہائی میں تمہیں مابعد کا پیغام سنائی دے رہا ہے"

شاعر نے جواب دیا "واقعی شام ہو چکی ہے۔ مگر میں اس انتظار میں ہوں کہ شاید اس وقت گاؤں میں کسی کو میری امداد کی ضرورت درپیش ہو۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ شاید محبت کے بھوکے دلوں کا باہم ملاپ ہو جائے۔ اور اُن کی بیتاب و منتظر نگاہیں خاموشی کو توڑنے اور اپنے خیالات کی ترجمانی کرنے کے لئے ایک گیت کی التجا کریں۔

"اگر میں دریائے حیات کے کنارے بیٹھ کر موت اور اُس کے بعد کے واقعات پر غور کرنے لگ جاؤں تو کون ہے جو اُن کے لئے پُرکیف نغمے تیار کریگا۔

"شام کا ستارہ غائب ہو گیا ہے۔ دریائے خاموش کے کنارے ایک جلتی ہوئی چتا آہستہ آہستہ سرد ہو چکی ہے۔

"تھکے ہوئے چاند کی روشنی میں ایک خالی مکان کے صحن میں گیدڑ ایک آواز سے چیخیں مار رہے ہیں۔

"اگر کوئی سیلانی گھر سے نکلکر رات کو دیکھنے اور کچھ جھکے ہوئے سر کے ساتھ تاریکی کی مدھم بھائیں بھائیں سننے کے لئے یہاں آ جائے۔ تو کون ہے۔ جو اُس کے کانوں میں رموزِ حیات بیان کریگا ——— اگر میں اپنے دروازے بند کر لوں۔ اور انسانی رشتوں سے اپنے آپ کو آزاد کرنیکی کوشش میں منہمک ہو جاؤں"۔

"مضائقہ نہیں کہ میرے سر کے بال سفید ہو گئے ہیں۔

"عمر کے لحاظ سے میں گاؤں کے سب سے بُڈھے آدمی کے برابر ہوں لیکن جوش سرگرمی کے لحاظ سے میں گاؤں کے سب سے نوجوان سے بڑھ کر ہوں۔

"بعض آدمیوں کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی ہے شیریں

اور سادہ۔ بعض آدمیوں کی آنکھوں میں ادا ناچتی ہے شرارت سے بھرپور ہنسی اور شوخ۔

اپنے نہ جھکنے والے بازوؤں سے برابر اُڑتا جاتا ہے۔

بعض آدمیوں کی آنکھوں میں روزِ روشن کے وقت آنسو جھلکتے ہیں۔ مگر بعض آنسوؤں سے بھری ہوئی نگاہیں رات کی تاریکی میں چھپی رہتی ہیں۔

"ان سب کو میری ضرورت ہے۔ اس لئے مجھے موت کے بعد کے واقعات پر غور و خوض کرنے کی مطلقاً فرصت نہیں۔

"میں بڈھوں کے ساتھ بڈھا ہوں۔ مگر جب نوجوانوں کے پاس بیٹھتا ہوں تو عمر رفتہ کے پُر شباب ایام مجھے وہی دلربا اور رنگین بہاریں واپس لوٹا دیتے ہیں۔ جن کی واپسی دُنیا والوں کے لئے امر ناممکن ہے۔

"مضائقہ نہیں کہ شام ہو چکی ہے۔ اور میرے سر کے سیاہ بالوں پر موت کی سفیدی قبضہ کر رہی ہے۔"

---

(۲)

افسوس! میرا گھر منڈی کے راستہ پر کیوں واقع ہے؟

لوگ مال و اسباب سے لدی ہوئی کشتیاں لاتے ہیں اور میرے مکان کے قریب لنگر ڈال دیتے ہیں۔ وہ جب چاہتے ہیں آتے ہیں۔ اور جب چاہتے ہیں چلے جاتے ہیں

میں بیٹھی اُن کی طرف دیکھتی رہتی ہوں۔ اور پرندہ وقت

اُن کے قدموں کی آوازیں دن رات میرے دروازے پر گونجتی رہتی ہیں۔ میں چلاتی ہوں۔ کہ میں تم سے قطعاً ناواقف ہوں۔ لیکن بے فائدہ۔

اُن میں سے بعض ایسے ہیں۔ جنہیں میری انگلیاں شناخت کرتی ہیں۔ بعض کو میری قوت شامہ پہچانتی ہے بعض سے میری رگوں میں دوڑنے والا خون واقف ہے۔ اور بعض ایسے ہیں جن کو میں عالمِ خواب میں بارہا دیکھ چکی ہوں۔

مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ اُن کو بھگا دوں۔ میں انہیں بلاتی ہوں۔ اور کہتی ہوں۔ "جس کی مرضی ہو میرے گھر میں آجائے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

صبح کے وقت مندر میں گھڑیال بجتا ہے۔ اور وہ اپنے ہاتھوں میں ٹوکریاں اٹھاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

اُن کے پاؤں کے تلوے گلاب کے عرق سے رنگین ہوتے ہیں۔ اُن کے چہروں پر طلوعِ سحر کی روشنی کھیلتی ہے

مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ اُن کو دُھتکار دوں۔

میں انہیں بلاتی ہوں۔ اور کہتی ہوں۔ "پھول چننا

ہے۔ تو میرے باغ میں آجاؤ، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

دوپہر کے وقت گھنٹہ محل کے دروازے پر بجتا ہے
پتہ نہیں، وہ اپنا کام کیوں بند کر دیتے ہیں۔ اور میری
جھاڑی کے آس پاس کیوں منڈلانے لگتے ہیں۔

اُس وقت اُن کے بالوں میں پھول کُمھلا کر زرد
ہو جاتے ہیں۔ اور اُنکی بانسریوں میں نغمے ناتوان و مضمحل
ہو جاتے ہیں۔

مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ اُن کو نکال دُوں میں
اُنہیں بُلاتی ہوں، اور کہتی ہوں۔" میرے درختوں کے
نیچے فرحت بخش سایہ ہے۔ وہاں آرام کرو۔ مجھے
کوئی اعتراض نہیں۔"

رات کے وقت جنگل میں جھینگر بولتے ہیں۔ پتہ
نہیں، ایسے وقت میں کون سنبھل سنبھل کر قدم اُٹھاتا
ہوا میرے دروازے پر آتا ہے، اور آہستہ سے دستک
دیتا ہے۔

مَیں مبہم طور پر اس کے چہرے پر نظر ڈالتی ہوں۔
زبان سے کوئی لفظ نہیں نکلتا، چاروں طرف سنّاٹا
طاری ہو جاتا ہے۔

مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ مہمان خاموش کو جواب
دیدوں۔ مَیں تاریکی میں اُس پر نگاہیں گاڑ دیتی ہوں اور
خواب کے گھنٹے گزر جاتے ہیں۔

---

(۳)

دیا کیوں بُجھا؟

مَیں نے ہوا کے جھونکوں سے محفوظ رکھنے کی خاطر
اُسے اپنے چُغے سے ڈھک دیا۔ اس وجہ سے دیا بجھ گیا۔

پھول کیوں کمھلایا؟

مَیں نے مضطربانہ محبّت سے اُسے اپنے دل کے
ساتھ چپٹا لیا۔ اس وجہ سے پھول کمھلا گیا؟

ندی کیوں سُوکھی؟

مَیں نے اُسے اپنے استعمال کی خاطر محفوظ رکھنے
کے لئے اُس میں بند لگا دیا۔ اسوجہ سے ندی خشک
ہو گئی۔

بربط کا تار کیوں ٹوٹا؟

مَیں نے اس پر وہ گت بجانے کی سعیِ بے سود
کی۔ جس کے وہ قطعی ناقابل تھا۔ اس وجہ سے بربط
کا تار ٹوٹ گیا۔

۴

کہو میرے عاشق مجھ سے کہو۔ کیا یہ سچ ہے؟

کیا یہ سچ ہے کہ جب میری آنکھ کی بجلی چمکتی ہے۔ تو جواب میں تیرے سینہ کے تاریک بادلوں میں طوفان برپا ہو جاتا ہے؟

کیا یہ سچ ہے کہ میرے ہونٹ اولین علم محبت کی شگفتہ کلی کے مانند شیریں ہیں؟

کیا بچپن کے گزرے ہوئے مہینوں کی یاد کے نشانات ابھی تک میرے اعضا میں باقی ہیں؟

کیا میرے پاؤں کی مس سے زمین بربط کی طرح لرز کر نغمہ زن ہو جاتی ہے؟

تو کیا یہ سچ ہے کہ جب میں دکھائی دیتی ہوں تو زمین کی آنکھوں سے قطراتِ شبنم نیچے گر پڑتے ہیں۔ اور نورِ سحر جب میرے بدن کو چاروں طرف سے لپیٹتا ہے تو اُس کی خوشی کی حد نہیں رہتی

کیا یہ سچ ہے؟ کہ مجھے تلاش کرنے کی خاطر تیری محبت نے کتنے جہانوں اور زمانوں میں تنہا سفر کیا ہے؟

اور جب آخر کار میں تجھے مل گئی، تو تیری دیرینہ آرزو کو میری شیریں گفتار میں، اور میری آنکھوں میں، اور میرے ہونٹوں میں اور میرے پُر جنبش بالوں میں کامل اطمینان نصیب ہوا؟

پھر کیا یہ بھی سچ ہے کہ رازِ کائنات میری اِس چھوٹی سی پیشانی پر لکھا ہوا ہے؟

بول میرے عاشق بول، کیا یہ سب کچھ سچ ہے؟

---

(۵)

اے خوبصورت نازنین! تو اپنی ایک نگاہِ ناز سے شاعر کے بربط سے نکلے ہوئے نغموں کی دولت کو لوٹ سکتی ہے۔

لیکن تو اُن کی تعریف و ثنا کی طرف سے بالکل بے پروا ہے۔ اس لئے میں تیری تعریف میں رطب اللسان ہوں۔

اگر تو چاہے تو دُنیا کے مغرور ترین سر کو اپنے قدموں میں جھکا سکتی ہے۔

لیکن تو اپنی پرستش کے لئے ایسی ہستیوں کو انتخاب کرتی ہے جو شہرت کے کوچے میں سراسر گمنام ہیں۔ اِس لئے میں تیری پرستش کرتا ہوں۔

تیرے بازوؤں کا تناسب صرف اپنے چھونے سے بادشاہی شان میں اضافہ کر سکتا ہے۔

لیکن تو اُن سے گرد جھاڑتی ہے۔ اور انہیں ناچیز حقیر گھر کو صاف کرنے میں تھکا دیتی ہے۔ اس لئے میرا سینہ درد سے بھر جاتا ہے۔

---

(۶)

پُورب کا مزدور اور اُس کی بیوی ——— دونوں بھٹے

کے لئے اینٹیں تیار کرتے ہیں۔

اُن کی چھوٹی لڑکی دریا کے گھاٹ پر جاتی ہے اور مختلف شکلوں کے برتنوں کو صاف کرتی رہتی ہے۔

اُس کا چھوٹا بھائی جس کا سر منڈا ہوا ہے۔ اور جس کے خاکستری رنگ کے عُریاں اعضا کیچڑ میں لت پت ہیں۔ اپنی بہن کے حکم سے گھاٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر اُس کا انتظار کرتا ہے۔

وہ گھڑا سر پر اُٹھائے چمکدار پیتل کا برتن بائیں ہاتھ میں تھامے اور بچّے کی انگلی دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے گھر کو واپس جاتی ہے۔ گھر کی پریشانیوں کے بوجھ نے اُسے —— جو اپنی ماں کی ننھی خادمہ ہے سنجیدہ بنا دیا ہے۔

ایک دن کا ذکر ہے میں نے دیکھا کہ برہنہ بدن بچّہ ٹانگیں پھیلائے بیٹھا ہے۔

پانی میں اُس کی بہن مٹھی بھر مٹی سے برتن کو صاف کر رہی تھی۔ برتن نصف پانی میں ڈوبا ہُوا تھا اور لڑکی ایک ہاتھ سے اُسے گھما رہی تھی۔

پاس ہی ایک سفید بالوں والا بڑہ کھڑا تھا۔ جس کی نگاہیں گھاٹ کی مختلف اشیا میں محو تھیں۔

وہ آہستہ آہستہ بچّے کے قریب آیا۔ اور یکایک زور سے ممیا اُٹھا۔ بچّہ اس آواز سے سہم کر اُچھلا۔ اور

اُس نے ایک زور کی چیخ ماری۔

اُس کی بہن نے برتن کو چھوڑ دیا۔ اور گھاٹ کی سیڑھیوں پر دوڑتی ہوئی چڑھنے لگی۔

اُس نے اپنے بھائی کو ایک بازو میں اور بڑے کو دوسرے بازو میں لیا۔ اور دونوں کو یکساں جوشِ محبت سے اپنی طرف کھینچا۔ اس طور سے اس نے حیوان اور انسان کی اولاد کو شفقت کی زنجیر میں باندھ دیا۔

---

(۷)

میلہ مندر کے سامنے تھا۔ جہاں صبح سے بارش ہو رہی تھی۔ اور اب دن ختم ہونے کو تھا

تمام ہجوم کی مشترکہ مسرت سے زیادہ نمایاں ایک ننھی لڑکی کا روشن تبسّم تھا۔ جس نے ایک پیسے کو کیلے کے پتے کی سیٹی خریدی تھی۔

اُس سیٹی کی پُر کیف آواز ہجوم کے قہقہوں اور شور و غل کے اُوپر تیر رہی تھی۔

لوگوں کا گروہ آیا۔ اور آپس میں ٹکرایا۔ سڑک پر کیچڑ تھا۔ دریا میں طوفان بپا تھا۔ کھیت پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اور برکھا برابر جاری تھی۔

تمام ہجوم کی مشترکہ تکلیف سے زیادہ تکلیف ایک لڑکے کی تھی۔ جس کے پاس روغنی چھڑی خریدنے کو

پیسہ نہ تھا۔

اُس کی پُرحسرت نگاہوں نے جو دُکان پر لگی ہوئی تھیں۔ مجمع کو تڑپا دیا۔

---

(۸)

مجھے بچپن کا وہ دن یاد ہے۔ جب مَیں نے کاغذ کی کشتی خندق میں بہائی تھی۔

ساون کا ابر آلود دن تھا۔ مَیں تنہا اپنی پُر کیف کھیل میں مصروف تھا۔ اور کاغذ کی کشتی پانی میں بہا رہا تھا۔

یکایک طوفانی بادل گھرے ہوئے۔ ہوا کے جھکڑ چلنے لگے۔ اور چھاجوں پانی برسنے لگا۔ گدلا پانی موجیں مارتا ہوا آگے بڑھا۔ اس نے ندی کو چھلکا دیا۔ اور میری کاغذ کی کشتی غرق کر دی۔

مَیں نے رنجیدہ ہو کر خیال کیا کہ طوفان محض میری مسرت کو برباد کرنے کے لئے آیا تھا۔ اُس کا کینہ صرف میرے خلاف تھا۔

آج پھر ساون کا بادلوں سے گھرا ہوا دن ہے اور مَیں اپنی زندگی کے اُن تمام کھیلوں کو یاد کر رہا ہوں جن میں میری ہار ہوئی ہے۔

مَیں اپنی قسمت کو کوس رہا تھا کہ اُس نے مجھے بیشمار دھوکے دیئے۔ کہ اچانک مجھے اپنی وہ کاغذی کشتی یاد آگئی۔ جو خندق میں غرق ہو گئی تھی۔

---

(۹)

ایک دن صبح کے وقت ایک اندھی لڑکی میرے پاس باغ میں آئی۔ اُس کے پاس کنول کے پتّے میں لپٹی ہوئی پھولوں کی مالا تھی۔ جو اُس نے مجھے پیش کی۔

مَیں نے اُسے گلے میں پہن لیا اور آنسو میری آنکھوں سے بہہ نکلے۔

مَیں نے اُس کا مُنہ چوم کر کہا۔ تم بھی پھولوں کے مانند اندھی ہو۔ اور نہیں جانتی کہ تم نے جو تحفہ مجھے دیا ہے وہ کس قدر حسین ہے۔

---

(۱۰)

اے حسینہ! تو صرف خدا ہی کی دستکاری نہیں۔ بلکہ تیری خوبصورتی میں آدمیوں کا بھی حصّہ ہے۔ وہ اپنے دل کی خوبصورتی سے ہر وقت تجھے مالامال کرتے رہتے ہیں۔

شاعر زرّیں تخیّل کے تاروں سے تیرے لئے جالا تیار کرتے ہیں۔ صنّاع تیری شکل و صورت کو ہمیشہ نئی بقا دیتے ہیں۔

تیری آرائش کے لئے سمندر اپنے موتی تیرے اوڑھنے کے لئے موسم سرما کے باغ اپنے پھول اور تجھے زیادہ خوبصورت بنانے کے لئے کانیں اپنا سونا دے رہی ہیں۔

مردوں کی دلی آرزوؤں نے اپنا نور تیرے شباب پر انڈیل دیا ہے۔

تو نصف عورت ہے اور نصف خواب۔

---

(۱۱)

ماں! آج راجکمار ہمارے دروازے کے آگے سے گذریگا۔ میں کام کی جانب کس طرح توجہ دے سکتی ہوں۔

مجھے بتاؤ کہ بالوں کو آراستہ کرنے کا کیا طریقہ ہے کہو کہ آج کونسا لباس پہننا چاہیئے۔

ماں! تم مجھے نگاہِ حیرت سے کیوں دیکھ رہی ہو؟

میں جانتی ہوں کہ وہ میری کھڑکی کی طرف ایک بار بھی آنکھ نہ اٹھائیگا۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ چشم زدن میں میری نگاہوں سے اوجھل ہو جائیگا۔ اور صرت اس کی بنسی کی صدا دور فاصلے سے آہیں بھرتی ہوئی میرے کانوں تک پہنچے گی۔

مگر راجکمار ہمارے دروازے کے آگے سے گذرے گا۔ اور میں اُس وقت کے لئے اپنا بہترین لباس پہنوں گی۔

ماں! راجکمار ہمارے دروازے کے سامنے سے گزر گیا۔ اور آفتاب صبح اپنے رتھ سے طلوع ہوا۔

میں نے اپنے چہرے سے نقاب ہٹایا۔ اپنے گلے کے ہیروں کے ہار کو توڑا۔ اور اس کے راستے میں پھینک دیا۔

ماں تم مجھے نگاہ حیرت سے کیوں دیکھ رہی ہو۔

میں جانتی ہوں کہ اُس نے میرا ہار نہیں اٹھایا۔

مجھے معلوم ہے کہ وہ اس کے رتھ کے پہیوں کے نیچے آکر پیسا گیا۔ اور مٹی پر اپنا نشان صرف ایک سُرخ لکیر کی صورت میں چھوڑ گیا۔ اور کوئی نہیں جانتا کہ میرا نذرانہ کیا تھا۔ اور کس کے لئے تھا۔

لیکن راجکمار ہمارے دروازہ کے آگے سے گزرا۔ اور میں نے اُس کی راہ میں بچھانے کے لئے اپنی چھاتی سے ہیروں کا ہار اُتار کر پھینک دیا۔

قرضخواہ

پنڈت شادی رام نے آہ سرد بھری اور سوچنے لگے کہ کیا یہ قرض کبھی ادا نہ ہوگا۔

وہ غریب تھے مگر دل کے برے نہ تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جس طرح بھی ہو سکے۔ اپنے مہاجن لالہ سدانند کا روپیہ ادا کردیں۔ ان کے لئے ایک ایک پیسہ جوڑتے تھے۔ اپنا پیٹ کاٹ کر بچاتے تھے۔ مگر جب چار پیسے جمع ہوجاتے تو کوئی نہ کوئی ایسا خرچ نکل آتا کہ سارا روپیہ اڑجاتا۔ شادی رام کے دل پر برچھیاں چل جاتی تھیں۔ جس طرح کوئی ڈوبتا ہوا آدمی ہاتھ پاؤں مار کر کنارے پہنچے۔ اور کنارہ ٹوٹ جائے۔ اس وقت اس کی حالت کیسی قابلِ رحم کیسی پُردرد ہوتی ہے تقدیر کو گالیاں دے ڈالتا ہے۔ یہی حالت شادی رام کی تھی۔ وہ قرض کے دھارے سے باربار نکلنے کی کوشش کرتے تھے مگر اُن کی ہر ایک کوشش ناکامیاب ہوتی تھی۔ اس طرح کئی سال گزر گئے۔ شادی رام نے پیسہ پیسہ بچا کر اسّی روپے جمع کر لئے۔ اُنہیں لالہ سدانند کا پانسو روپیہ دینا تھا۔ اس اسّی روپے کی رقم سے ادائے قرض کا وقت نزدیک آتا معلوم ہُوا۔ امید دھوکہ دے رہی تھی۔ معاً اُن کا چھوٹا لڑکا بیمار ہُوا۔ اور متواتر چار مہینے بیمار رہا۔ پیسہ پیسہ کر کے بچائی ہوئی رقم دواؤں میں اُڑ گئی۔ پنڈت شادی رام نے سر پیٹ لیا۔ اب چاروں طرف پھر تاریکی تھی جس میں روشنی کی ہلکی سی کرن بھی دکھائی نہ دیتی تھی۔ انہوں نے آہ سرد بھری اور سوچنے لگے۔ کہ کیا یہ قرض کبھی ادا نہ ہوگا۔

لالہ سدانند اپنے پروہت کی مجبوریوں اور بے بسیوں کو جانتے تھے۔ اور نہ چاہتے تھے۔ کہ وہ روپیہ ادا کرنے کی کوشش کریں۔ اُنہیں اس رقم کی چنداں پروا نہ تھی اُنہوں نے اس کے لئے کبھی تقاضا نہیں کیا۔ نہ کبھی شادی رام سے ذکر چھیڑا۔ اس ذکر سے وہ اس طرح ڈرتے تھے۔ گویا شادی رام کی بجائے وہ خود مقروض ہوں۔ مگر شادی رام کے دل کو قرار نہ تھا۔ اکثر سوچتے۔ یہ کیسے شریف ہیں۔ جو اپنی رقم کے بارے میں مجھ سے دو لفظ بھی نہیں کہتے۔ یہ نہیں کہتے۔ یہ درست ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ تھوڑا ہی ہے کہ میں بھی اس خیال سے بے فکر ہو جاؤں۔ اُنہیں لالہ سدانند کے سامنے سر اُٹھانے کی جرأت نہ تھی۔ اُسے قرض کے بار نے نیچے جھکا رکھا تھا۔ اگر لالہ سدانند ایسی شرافت کا ثبوت نہ دیتے اور شادی رام کو تقاضوں سے پریشان کر دیتے۔ تو وہ ایسے ذہنی عذاب میں کبھی مبتلا

نہ ہوتے۔ ہم ظلم کا مقابلہ سر اُٹھا کر کر سکتے ہیں۔ مگر شرافت کے سامنے آنکھیں نہیں اُٹھتیں۔

ایک دن لالہ سدانند کسی کام سے لالہ شادی رام کے گھر گئے۔ اور اُن کی الماری میں کئی سو بنگالی۔ ہندی انگریزی رسالے دیکھ کر بولے" یہ کیا ہے۔

پنڈت شادی رام نے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدتے ہوئے جواب دیا۔" پُرانے رسالے ہیں۔ بڑے بھائی کو پڑھنے کا شوق تھا۔ منگواتے رہتے تھے۔ جب جیتے تھے تو کسی کو ہاتھ نہ لگانے دیتے تھے۔ اب انہیں کیڑے کھا رہے ہیں۔"

" ردّی میں کیوں نہیں بیچ دیتے۔"

" ان میں تصویریں ہیں۔ جب کبھی بچے رونے لگتے ہیں تو ایک آدھ نکال کر دے دیتا ہوں۔ اس سے اُن کے آنسو خشک ہو جاتے ہیں۔"

لالہ سدانند نے آگے بڑھکر کہا۔" دو چار پرچے دکھاؤ تو۔"

پنڈت شادی رام نے چند پرچے دکھائے۔ اِن میں سے ہر ایک میں کئی کئی خوبصورت اور رنگین تصویریں تھیں۔ لالہ سدانند کئی منٹ تک اُلٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ معاً اُن کے دل میں ایک عجیب خیال پیدا ہوا۔ چونک کر بولے۔" پنڈت جی!"

" جناب"

" یہ تصویریں حُسن کمال کے بہترین نمونے ہیں۔ اگر کسی شوقین کی نظر چڑھ جائیں۔ تو ہزار دو ہزار روپیہ کما لو۔"

پنڈت شادی رام نے آہ سرد بھری۔ اور کہا۔" ایسی قسمت ہوتی تو یوں دھکے نہ کھاتا پھرتا۔"

لالہ سدانند بولے۔" ایک کام کرو۔"

" کیا؟"

" آج بیٹھکر ان پرچوں میں جتنی عمدہ عمدہ تصویریں ہیں سب کو چھانٹ کر الگ کر لو۔"

" بہت اچھا۔"

" جب کر چکو تو مجھے اطلاع دینا۔"

" آپ کیا کرینگے؟"

" مَیں ان کا البم بناؤنگا۔ اور تمہاری طرف سے اشتہار دیدونگا۔ ممکن ہے وہ اشتہار کسی شوقین مزاج کی نظر پڑ جائے تو تم چار پیسے کما لو۔"

پنڈت شادی رام کو یہ امید نہ تھی۔ کہ کوئلوں میں ہیرا رل جائیگا۔ انتہائے یاس نے امید کے دروازے چاروں طرف سے بند کر رکھے تھے۔ وہ اُن بدقسمت آدمیوں میں سے تھے۔ جو دُنیا میں ناکام اور صرف ناکام رہنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ سونے کو ہاتھ لگاتے تھے۔ تو وہ مٹی ہو جاتا تھا۔ انہیں خیال نہیں کامل طور پر یقین

تھا کہ یہ کوشش بھی کچھ کامیاب نہ ہوگی۔ نہ اتنی ہمت تھی۔ نہ دل میں جوش۔ لیکن لالہ سدانند کی خاطر انکار نہ کر سکے۔ شام ہوئی تو اُن کے پاس دو سو تصویریں تھیں۔ اور ایک سے ایک بڑھیا۔ اُس وقت وہ اُنہیں دیکھ کر خود اُچھل پڑے۔ اُن کا چہرہ مسرت کی تصویر بن گیا۔ جیسے فیل ہو جانے کا یقین کر کے اپنی قسمت کا ماتم کر چکے ہوئے طالب علم کو پاس ہو جانے کا تار مل گیا ہو۔ اُس وقت وہ کیسا خوش ہوتا ہے۔ چاروں طرف کیسی متعجب اور مسرت پاش نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ یہی حالت پنڈت شادی رام کی تھی۔ وہ اُن تصویروں کی طرف اس طرح دیکھتے تھے گویا اُن میں سے ہر ایک دس دس روپے کا نوٹ ہو۔ بچوں کو اُدھر دیکھنے نہ دیتے تھے۔ وہ کامیابی کے خیال سے ایسے خوش ہو رہے تھے۔ جیسے کامیابی حاصل ہو چکی ہو، حالانکہ وہ ابھی کوسوں دُور تھی۔ لالہ سدانند کا خیال اُن کے دماغ میں یقین کی صورت اختیار کر چکا تھا۔

لالہ سدانند نے تصویروں کو البم میں لگوایا۔ اور چند ممتاز اخبارات میں اشتہار دیدیا۔ اب پنڈت شادی رام ہر وقت ڈاکیہ کا انتظار کرتے رہتے۔ ہر روز سوچتے۔ آج کوئی خط آئیگا۔ دن گذر جاتا۔ اور کوئی جواب نہ آتا۔ رات کو اُمید راہ کے گردے کی طرح بیٹھ جاتی۔ مگر دوسرے دن لالہ سدانند کی باتوں سے ٹوٹی ہوئی امید پھر استوار ہو جاتی۔ جس طرح گاڑیاں چلنے سے سڑک کی بیٹھی ہوئی مٹی ہوا میں اُڑنے لگتی ہے۔ امید پھر اپنا رُوئے روشن دکھا کر دروازے میں کھڑا کر دیتی۔ ڈاک کا وقت ہو جاتا۔ تو بازار میں لے جاتی۔ اور وہاں سے ڈاکخانے جا پہنچتے۔ اسی طرح ایک ماہ گذر گیا۔ کوئی خط نہ آیا۔ پنڈت شادی رام بالکل مایوس ہو گئے۔ مگر پھر بھی کامیابی کا خیال آجاتا تھا۔ جس طرح تاریکی میں جگنو چمک جاتا ہے۔ یہ جگنو کی چمک افسردہ دلوں کے لئے کیسی جاں بخش ہے۔ کیسی روح نواز۔ اسی کے سہارے گمراہ مسافر منزل مقصود پر پہنچنے کی خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اور چند لمحوں کے لئے اپنا رنج و الم دل سے محو کر دیتے ہیں۔ اس امید موہوم میں گیس کی روشنی نہیں۔ مگر دُور کے نغمہ کی دلکشی ضرور ہے۔ اس میں بارش کی نمی ہو یا نہ ہو۔ مگر اس سے کالی گھٹا کا جادو کس نے چھینا ہے۔

آخر ایک دن پنڈت شادی رام کے نصیب بیدار ہوئے۔ کلکتہ کے ایک مارواڑی سیٹھ نے خط لکھا۔ البم بھیج دو اگر پسند آگیا تو خرید لیا جائیگا۔ قیمت کا خیال نہیں۔ چیز عمدہ چاہئے۔ یہ خط اُس کروٹ سے مشابہ تھا جو سویا ہوا آدمی جاگنے سے پیشتر بدلتا ہے۔ اور اس کے بعد اُٹھ کر بسترے پر بیٹھ جاتا ہے۔ یہ کسی مرد کی کروٹ نہ تھی۔ کسی عورت کی کروٹ نہ تھی۔ یہ نصیبوں

کی کروٹ تھی۔ پنڈت شادی رام بھاگے بھاگے لالہ سدانند کے پاس پہنچے۔ اور انہیں خط دکھا کر بولے۔
"بھیج دوں ؟"
لالہ سدانند نے خط کو اچھی طرح سے دیکھا۔ اور جواب دیا۔" رجسٹری کرا کے بھیج دو۔ آدمی شوقین ہے۔ خرید لے گا۔"
"اور قیمت"
"لکھدو۔ ایک ہزار سے کم پر سودا طے نہ ہوگا۔"
چند دن کے بعد انہیں جواب میں ایک بیمہ شدہ لفافہ موصول ہوا۔ پنڈت شادی رام کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ مگر ہاتھ پاؤں سے زیادہ اُن کا دل کانپ رہا تھا۔ اُنھوں نے جلدی سے لفافہ کھولا اور اُچھل پڑے۔ اس میں سو سو روپے کے دس نوٹ تھے۔
پہلے اُن کی قسمت نے کروٹ بدلی تھی۔ اب پورے طور پر بیدار ہوئی۔ پنڈت شادی رام کھڑے تھے بیٹھ گئے۔ اور سوچنے لگے کہ اگر دو ہزار لکھ دیتا۔ تو شاید دو ہزار ہی مل جاتے۔ اس خیال نے ان کا مزہ کرکرا کر دیا۔
شام کے وقت وہ لالہ سدانند کے ہاں گئے۔ اور پانسو روپے کے نوٹ سامنے رکھ کر بولے۔" پرماتما کا شکر ہے کہ میں سبکدوش ہوا۔ اپنے روپے سنبھال لیجئے۔ آپ نے جس شرافت اور رحمدلی کا ثبوت دیا ہے تمے

میں مرتے دم تک نہ بھولونگا۔"
لالہ سدانند نے متعجبانہ انداز سے پوچھا۔" پنڈت جی! کیا سیٹھ نے البم خرید لیا؟"
"جی ہاں! روپے آ بھی گئے۔"
"ایک ہزار؟"
"جی ہاں! ورنہ مجھ غریب براہمن کے پاس کیا تھا جو آپ کا قرض ادا کرتا۔ پرماتما نے میری سُن لی۔"
"میں پہلے بھی کہنا چاہتا تھا۔ مگر کہتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔ کہ آپ کے دل کو کہیں ٹھیس نہ پہنچے۔ مگر اب مجھے یہ اندیشہ نہیں۔ کیونکہ روپیہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ میرے خیال میں آپ یہ روپیہ اپنے ہی پاس رہنے دیں۔ میں آپ کا ججمان ہوں۔ آپ میرے پروہت ہیں۔ میرا فرض ہے۔ کہ آپ کی خدمت کروں۔"
پنڈت جی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ صافہ سے پونچھتے ہوتے بولے۔" آپ جیسے نیک آدمی دُنیا میں کم ہونگے۔ پرماتما آپ کی عمر دراز کرے پر اب یہ روپیہ نہ لُونگا۔ آپ نے اتنے سال تقاضا نہیں کیا یہ نیکی بھی کوئی تھوڑی بات نہیں۔ مجھے سبکدوش ہونے دیجئے۔ یہ روپیہ دیکر میں دل کا چین خریدلونگا۔"
غریب براہمن کی یہ سیر چشمی اور دریادلی دیکھ کر لالہ سدانند کا پرندہ دل رقص کرنے لگا۔ انھوں نے

نوٹ لے لئے۔ آدمی روپیہ دے کر بھی ایسا خوش اسقدر بشاش ہو سکتا ہے۔ اس کا پہلی بار تجربہ ہوا۔ پنڈت جی کے چلے جانے پر اُنہوں نے اپنی آنکھیں بند کریں۔ اور کچھ سوچنے میں محو ہو گئے۔ اس وقت اُن کے چہرے پر ایک خاص روحانی جلال کی روشنی تھی۔

(۲)

چھ مہینے گزر گئے۔

لالہ سدانند بیمار تھے۔ ایسے بیمار وہ ساری عمر نہ ہوتے تھے۔ پنڈت شادی رام اُن کے لئے دن رات مالا پھیرا کرتے تھے۔ وہ حکیم نہ تھے۔ ڈاکٹر نہ تھے وہ براہمن تھے۔ اُن کی دوڑ مالا پھیرنے تک تھی۔ اور یہ فرض وہ اپنی رُوح کی گہرائیوں سے اپنے دل کی کامل عقیدت سے سرانجام دیتے تھے۔ انہیں دوا کی نسبت دُعا پر زیادہ بھروسہ تھا۔

ایک دن لالہ سدانند چارپائی پر لیٹے تھے۔ اُن کی بوڑھی ماں بیٹھی اُن کے کمزور اور زرد چہرے کی طرف دیکھ دیکھ کر اپنی آنکھوں کے آنسو اندر ہی اندر پی رہی تھی۔ ذرا فاصلے پر کونے میں اُن کی نوجوان بیوی گھونگٹ کاڑھے کھڑی دیکھ رہی تھی۔ کہ کوئی کام ایسا تو نہیں جو رہ گیا ہو۔ پاس پڑی ہوئی اِک چوکی پر پنڈت شادی رام بیٹھے تھے۔ اور مریض کو بھاگوت سنا رہے تھے۔

یکایک لالہ سدانند بیہوش ہو گئے۔

پنڈت جی نے بھاگوت چھوڑ دیا۔ اور اُٹھ کر اُن کے سرہانے ہو بیٹھے۔ بیوی گرم دودھ لینے کے لئے باہر دوڑی۔ اور ماں اپنے بیٹے کو گھبرا کر آوازیں دینے لگی۔ اُس وقت پنڈت جی کو مریض کے سرہانے کوئی سخت سی چیز چُبھتی ہوئی معلوم دی۔ اُنہوں نے ہاتھ نیچے ڈال کر دیکھا تو اُن کے تعجب کی انتہا نہ تھی۔ یہ سخت چیز وہی البم تھا۔ جسے کسی سیٹھ نے نہیں، بلکہ اُسکی معرفت خود لالہ سدانند نے خرید لیا تھا۔

پنڈت شادی رام اس خیال سے بہت خوش تھے کہ اُنہوں نے لالہ سدانند کا قرض ادا کر دیا ہے۔ مگر یہ معلوم کر کے اُن کے دل پر چرکا سا لگا۔ کہ وہ قرض ادا نہیں ہوا بلکہ پہلے کی نسبت دُگنا ہو گیا ہے۔

تب اُنہوں نے اپنے بیہوش محسن کے پاس بیٹھے بیٹھے اِک آہ سرد بھری اور سوچنے لگے۔ کہ کیا یہ قرض کبھی ادا نہ ہوگا۔

تھوڑی دیر کے بعد لالہ سدانند ہوش میں آ گئے۔ اُنہوں نے پنڈت جی کے ہاتھ سے البم چھین لیا۔ اور آہستہ سے بولے "یہ البم سیٹھ صاحب سے اب مَیں نے منگوا لیا ہے"۔

پنڈت جی جانتے تھے۔ کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ مگر وہ اُنہیں پہلے کی نسبت زیادہ شریف زیادہ بلند اور زیادہ محترم سمجھنے لگ گئے تھے۔

سُدرشن

جذباتِ ہادی

دِل کو ہلا رہا ہوں مَیں خاکِ رہِ نیاز میں
کیونکہ ہے بیدلی پسند اُن کی حریمِ ناز میں

راحتِ دلنواز سے ہے نازِ جگر گداز ہیں!
یعنے وفا کی شان ہے حُسنِ جفا طراز میں

اُٹھنے لگا حجابِ راز کھُلنے لگیں حقیقتیں
آئینہ بن رہا ہے دِل جلوہ گہِ مجاز میں

پھر کوئی یاد آگیا بڑھ گیا اضطرابِ شوق
درد نے رُوح پھُونک دِی نالۂ دلگداز میں

عشق کی بیخودی نہ پُوچھ شادی و غم سب ایک ہیں
پہلے یہ یکجہی نہ تھی قوّتِ امتیاز میں

ایک بُت خود نما تو ہے کعبہ نشیں صنم سہی
ہے کوئی نازنیں ضرور دل کی حریمِ ناز میں

شمع نہ ساتھ دے سکی ایسی جلی کہ بُجھ گئی
آگیا رنگ بیکسی میری شبِ دراز میں

سرخوشِ کیفِ غم ہوں مَیں نشۂ عشق ہے یہی
کھیل رہی ہیں مستیاں دامنِ سوز و ساز میں

ہادیِ اضطراب کوش پھر کوئی آہ دلگداز
آگئی کیوں فسردگی ہمتِ سرفراز میں

ھادی

حسرت

لکھتے ہیں پھر کہ لکھتے نہیں ہم ہزار خط
دیکھیں تو بھیجکر ہیں وہ ایک بار خط

آیا ہے عین کشمکشِ انتظار میں
کیونکر نہ ہو عزیز ترا غم شکار خط

لکھا تھا اپنے ہاتھ سے تم نے جو ایکبار
اب تک ہمارے پاس ہے وہ یادگار خط

اُس نے کہیں نہ حرفِ تسلّی بھی ہو لکھا
پڑھتے ہیں اس امید پہ ہم بار بار خط

مجھ کو عجب یہی ہے کہ اے نازنیں ترا
لیتا ہے دستِ شوق میں کیونکر قرار خط

سرتاسر اک لطیفۂ خوشبو ہے وہ نگار
زلف اُن کی عنبریں ہے تو ہے مشکبار خط

مجھ سے گدائے شوق کو لکھے تو کیا لکھے
حسرت دیارِ حسن کا وہ شہریار خط

مرسلہ بیگم حسرت موہانی

گورا

مصنفہ رابندر ناتھ ٹیگور — مترجمہ عبد الستار خاں

باب (۱۰) دسواں

سوچترا ابھی تک ایک طشت میں ناشتہ کے لئے کچھ چیزیں رکھ رہی تھی فارغ ہوتے ہی طشت تو ملازم کے حوالہ کیا کہ میز پر لے چلے۔ اور خود بھی وہاں آکر سب کے پاس بیٹھ گئی۔ اتنے میں گورا ملازم کے پیچھے پیچھے وہاں پہنچا۔ اس کا قد و قامت اور رنگ و روپ دیکھ کر سب کو تعجب ہوا۔

گورا اپنی پیشانی پر ٹیکا لگائے ہوئے تھا ایک انگرکھا کھادی کا زیب تن تھا۔ دھوتی بھی کھادی ہی کی تھی گلے میں کھادی کا پٹکہ پڑا ہوا تھا۔ اور جوتے بھی دیسی ہی تھے۔ اس کی وضع قطع اور پوشش سے گویا معلوم ہوتا تھا۔ کہ تہذیب انسانی قالب میں اُن کے سامنے کھڑی ہوئی ہے۔ بی نتے نے بھی اس کو اس جنگی وردی میں کبھی نہ دیکھا تھا۔

کچھ اسباب ایسے پیش آئے تھے کہ گورا آگ بگولا ہو رہا تھا۔ ایسی حالت میں اس کا برگشتہ خاطر ہونا حق بجانب بھی تھا۔ جس دن وہ تربینی اشنان کرنے گیا تھا اس دن ایک عجیب کیفیت دیکھی۔ جو جہاز ان اشنان کرنیوالوں کو تربینی لئے جا رہا تھا۔ وہ جس گھاٹ پر ٹھیرتا وہاں کثرت سے اشنان کرنے والی عورتیں دکھائی دیتی تھیں۔ ان میں شاید ہی دو ایک مرد ہوتے تھے۔ جہاز میں جگہ بہت کم تھی۔ اور مسافروں کا ہجوم تھا۔ بڑی کشاکش تھی۔ ان گھاٹوں پر ایک تختہ رکھ دیا جاتا تھا کہ اس پر سے مسافر جہاز میں چڑھ آئیں۔ بارش ہو رہی تھی۔ لوگ کیچڑ بھرے پیر لیکر تختہ پر سے چڑھتے تھے۔ اس لئے وہ بہت چکنا ہو گیا تھا۔ دوسرے ہر شخص یہ کوشش کرتا تھا کہ میں پہلے پہنچ جاؤں۔ اس کشاکش کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے آگے بڑھتے تھے۔ جس سے اکثر مسافر پھسل کر پانی میں گر پڑتے تھے۔ بعضوں کو جگہ نہ ہونے کی وجہ سے خلاصی دھکا دے کر جہاز سے دھکیل دیتے تھے۔ بہر اوقات اگر کسی کو جگہ کبھی مل جاتی تو وہ اپنے ساتھیوں سے بچھڑ جاتے۔ ان مصائب پر بارش کا ہونا طرہ تھا۔ بیچاری عورتیں تختہ پر بیٹھی ہوئی بھیگ رہی تھیں۔ ان کے چہرے سے خوف

اور سہم ٹپکا پڑتا تھا۔ اور آنکھوں سے تردد و پریشانی نمایاں تھی۔ ان کو اپنی اس مصیبت میں خلاصی سے لیکر کپتان تک کسی سے امداد کی امید نہ تھی۔ اُن کی ہر ادا اور حرکت سے خوف اور بزدلی ظاہر تھی۔ اس جہاز پر صرف گورا ہی کی ذات واحد ایسی تھی جو حتی الامکان ان زائرین کی مصیبت کے رفع کرنے میں کوشاں تھی۔

جہاز کے پہلے درجہ کے تختہ پر کھڑے سے جھکے ہوئے ایک انگریز اور ایک نئی روشنی کے دلدادہ تہذیب یورپ کے نقال بنگالی بابو کھڑے تھے۔ وہ دونوں سگرٹ پی رہے تھے۔ اور ان مصیبت زدہ زائرین کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ جب کبھی کوئی مصیبت کا مارا مسافر گرتا تو وہ انگریز اُسے دیکھ کر ہنس پڑتا۔ اور وہ بنگالی بھی اس کے ساتھ اِس تضحیک میں شریک ہو جاتا۔

دو تین اسٹیشن تک وہ ایسا ہی کرتے رہے۔ اب گورا کو تاب نہ رہی۔ اُن کی حرکتوں سے وہ بڑا جھلایا۔ اور اُوپر کے درجہ میں جاکر ڈانٹا۔ "بس کرو۔ کیا تم کو شرم نہیں آتی؟"

انگریز نے گورا کو صرف گھور کے دیکھا۔ بنگالی نے بڑی جرأت کی اور کہا۔ "شرم؟ اُن جانوروں کی حماقت پر البتہ شرم آتی ہے۔"

گورا نے کہا۔ "جاہلوں سے بڑھ کر حیوان وہ ہے، جو بالکل بے رحم ہے۔ اور جسے ہمدردی چھو بھی نہیں گئی ہے

بنگالی نے چڑھ کر کہا۔ "نکل جاؤ یہاں سے، تم کو پہلے درجہ میں آنے کی ضرورت نہ۔"

گورا۔ ہاں ہاں، میں جاتا ہوں۔ تم جیسے آدمیوں کے ساتھ میں نہیں رہ سکتا۔ میری جگہ تو اُن مصیبت زدوں کے پاس ہے۔ لیکن یہ کہے جاتا ہوں کہ مجھے اب یہاں آنے پر مجبور نہ کرنا۔ یہ کہہ کر گورا واپس زائرین کے پاس چلا آیا

اس کے بعد انگریز تو اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور کٹہرے پر پیر رکھ لئے۔ اور کوئی ناول پڑھنے لگا۔ اس کے بنگالی ہم سفر نے کئی مرتبہ اس سے گفتگو کا سلسلہ جاری کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اپنی اس ناکامی کے بعد اُس بنگالی نے یہ ظاہر کرنے کی غرض سے کہ اپنے ہموطنوں اور ہندوستانی عوام سے کوئی ہمدردی نہیں رکھتا ہے۔ جہاز کے خانساماں کو بلا کر دریافت کیا۔ کہ کچھ چوزے وغیرہ تیار ہیں یا نہیں۔ خانساماں نے جواب دیا۔ بجز مکھن روٹی اور چاء کے کچھ نہیں ہے۔ یہ جواب سُنکر بنگالی نے انگریزی میں زور سے کہا۔ کہ اس جہاز پر ہم لوگوں کے آرام کا انتظام ٹھیک نہیں۔ یہ اس لئے کہ اس کا ہم سفر انگریز سن لے۔

اس کا انگریز ہم سفر اس پر بھی اس کی طرف متوجہ نہ ہوا اتفاق سے اتنے میں اُس انگریز کا اخبار میز سے اڑ کر دُور جا پڑا۔ بنگالی نے اُس کو دوڑ کر اُٹھایا اور میز پر

نکال دیا۔ مگر پھر بھی اُس انگریز کے مُنہ سے شکریہ کے الفاظ نہ نکلے۔

جب جہاز چیندر نگر پہنچا۔ تو وہ انگریز گورا کے پاس آیا اور اپنی ٹوپی کو ذرا سا اُٹھا کر کہا "میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ اور اپنی حرکت پر نادم ہوں۔ اور اُتر کر چلا گیا۔

گورا کو رنج ہوا اور غصّہ بھی آیا۔ وہ دیکھتا تھا کہ لوگ محض اپنی مفروضہ فضیلت پر کتنے نازاں ہیں۔ اور حالت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ وہ اپنے ہموطنوں کو ذلیل سمجھتے ہیں۔ اُن کی تضحیک کرتے ہیں۔ اجنبیوں کے ساتھ مل کر ان کو ذلیل کرنے میں حصّہ لیتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ اہلِ وطن اسی قابل ہیں۔ کہ ان کے ساتھ جانوروں جیسا برتاؤ کیا جائے۔ اس قسم کے برتاؤ اور سلوک کو حق و انصاف پر مبنی جانتے ہیں۔ وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ یہ سب لاعلمی کے کرشمہ ہیں۔ یہی لاعلمی ان تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ افسوس تو زیادہ اس امر کا تھا۔ کہ تعلیم یافتہ حضرات اس ذلت کو قومی ذلت نہ سمجھتے تھے۔ اور اپنے آپکو مستثنےٰ سمجھ کر خاص حقوق کے مستحق سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ گورا ٹیکا لگائے اور ہندوستانی جوتے پہنے ہوئے اُن لوگوں کی مجلس میں گیا جو تعلیم یافتہ تو تھے لیکن تعلیم کے اصل مفہوم سے بالکل نابلد تھے۔

"خدا خیر کرے" بی نتے نے اپنے دل میں کہا۔ "آج تو گورا مع ساز و سامان کے جنگ کرنے آیا ہے"۔ اور مدافعت کے لئے تیار ہو گیا۔ جس وقت بارودا اور بی نتے باتیں کر رہے تھے۔ اُس وقت چھت کے ایک کونہ پر ستیش اپنا لٹو گھما رہا تھا۔ گورا کے آتے ہی ستیش اپنا لٹو چھوڑ کر چپکے سے بی نتے کی کرسی کے پیچھے آن کھڑا ہوا۔ اور نووارد مہمان کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ اور بی نتے سے آہستہ سے پوچھا "کیا آپ کے وہ دوست یہی ہیں؟"

بی نتے "جی ہاں یہی ہیں"

گورا نے آتے ہی سب کو ایک نظر دیکھ تو لیا لیکن پھر اُن کی طرف کچھ خیال ہی نہ کیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہاں کوئی موجود نہیں۔ آتے ہی گورا نے پریش بابو کو نہایت ادب سے سلام کیا اور بلا تکلف میز کے قریب سے ایک کرسی دُور کھینچ لی اور بیٹھ گیا۔ مذہبی روایات اور آدابِ معاشرت کا تقاضا ہے کہ مرد کو ہمیشہ اس قسم کا برتاؤ کرنا چاہیے کہ جس سے یہ معلوم ہو سکے۔ کہ عورتیں موجود ہیں۔ باوجود اُن کے موجود نہ ہونے کے بھی کسی اشارے یا کنایہ سے بھی یہ معلوم ہو کہ وہ موجود ہیں۔ اور مرد اُن کی موجودگی سے واقف ہے۔

بارودا گورا کے اس رویہ کو دیکھ کر اُسے وحشی سمجھنے لگی۔ اور اس نے یہ ارادہ کر لیا کہ اپنی لڑکیوں کو وہاں سے

ہٹا لے۔ اتنے میں پریش بابو نے اُس سے گورا کا یہ کہہ کر تعارف کرایا۔ کہ یہ میرے ایک بہت پُرانے دوست کے صاحبزادے ہیں۔ اب گورا بارودا کی طرف مخاطب ہُوا اور اُسے نہایت ادب سے سلام کیا۔

بی بی کی زبانی سوچترا گورا کی تعریف سن چکی تھی لیکن آج وہ اُسے دیکھ کے یہ نہ سمجھ سکی۔ کہ گورا یہی ہے۔ وہ گورا کی تراش خراش اور فیشن کو دیکھ کر کچھ جھجکی اور اُس کی طبیعت میں کچھ رکاوٹ اور نفرت سی پیدا ہو گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ آجتک اُس کو کسی ایسے تعلیم یافتہ آدمی سے ملنے کا اتفاق ہی نہ ہوا تھا جو اعلےٰ تعلیم کے زیور سے مزین بھی ہو اور پُرانے رسم و رواج کا پابند بھی۔ اس میں تحمّل و برداشت کا مادہ بھی اتنا نہ تھا کہ پابندانِ مذہب کو دیکھ کر صبر آ جائے۔"

پریش بابو اپنے دوست کی خیریت دریافت کرنے لگے۔ انہیں اپنے بچپن اور اوائلِ عمری کا زمانہ یاد آگیا۔ کہنے لگے "کیا کہوں! وہ بھی ایک زمانہ تھا۔ اس زمانہ کے کالج کے طالب علموں میں ہم دونوں سے بڑھ کر بُت شکن اور کوئی دوسرا نہ تھا۔ ہم لوگوں کو قومی روایات کا کوئی پاس نہ تھا۔ اور نہ ہم ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ہم ان قیدوں اور پابندیوں کو توڑنا اپنا عین فرض سمجھتے تھے شام کو کالج اسکوائر کے اسلامی ہوٹلوں میں کھانا کھاتے

اور ۱۲-۱۲ بجے رات تک یہی سوچا کرتے تھے کہ ہندوؤں کی حالت کس طرح درست کی جائے۔"

بارودا۔ غالباً آپ کے اُن دوست کے خیالات اب بھی ویسے ہی ہونگے۔"

گورا نے جواب دیا۔ "جی نہیں، آجکل تو وہ قدیم ہندو مذہب کے سخت پابند ہیں۔"

بارودا نے حقارت آمیز لہجہ میں کہا "کیا آپ کو اپنی حالت پر شرم نہیں آتی۔"

"شرم! شرم تو کمزور طبائع کا خاصہ ہے۔" گورا نے ہنسکر جواب دیا۔ "ہاں بہت سے تو ایسے بھی ہیں جو اپنے باپ کو باپ کہتے ہُوئے شرماتے ہیں۔"

بارودا۔ کیا پہلے وہ برھمو سماجی نہ تھے۔

گورا۔ پہلے تو مَیں بھی برھمو سماجی تھا۔

بارودا۔ اب تو غالباً آپ اپنے اعتقاد کے مطابق خُدا کی ہستی کو محدود اور متشکل تصور کرتے ہونگے۔"

گورا۔ "مَیں ایسا توہم پرست نہیں ہوں کہ خُدا کی ہستی کو متشکل تصوّر کرنے والوں کے خیال کو قابلِ نفرت سمجھوں کیا محض بھلا بُرا کہنے ہی سے کوئی امتیاز پیدا ہو جاتا ہے اب تک اس راز کو کوئی نہیں جان سکا۔"

پریش بابو نے متانت سے اپنے نرم لہجہ میں کہا۔ "لیکن جو چیز محدود ہوگی وہی متشکل یا صورت پذیر ہو سکتی

ہے۔"

گورا۔ جی ہاں۔ لیکن جب تک اس کی حد و تعین نہ ہو جائے وُہ عالم وجود میں آ بھی نہیں سکتی۔ عالم وجود میں آنے اور ظاہر ہونے کے لئے ہر شے کو اپنی ایک حد معین کرنے کی ضرورت پڑتی ہے جس کے بغیر اس کا ظاہر ہونا محال ہے۔ جو چیز ظاہر نہیں ہوتی وہ کمال کو بھی نہیں پہنچ سکتی۔ جو بات عالم بے صورتی میں نصیب نہیں ہوتی وہ متشکل ہوتے ہی عالم وجود میں میسر ہو جاتی ہے۔ جیسے خیالات کا کمال الفاظ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

بارودا کو ان دلائل سے اطمینان نہ ہوا۔ اور اُس نے سر ہلا کر کہا۔ "غالباً آپ کے نزدیک اُن اشیاء سے جن کی کوئی صورت نہیں۔ وہ چیزیں زیادہ کمال کی حد کو پہنچی ہوئی ہیں جو تشکیل کا جامہ پہنے ہوئے ہیں۔

گورا۔ جیسا آپ سمجھیں لیکن دنیا کا مشاہدہ یہی بتاتا ہے۔ اگر غیر متشکل چیزوں کو اصلی کمال ہوتا تو پھر دُنیا میں کوئی بھی چیز متشکل نہ ہوتی۔

سوچترا یہ دیکھ کے دل ہی دل میں کُڑھی جاتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس مغرور کو کوئی مباحثہ میں زیر کرے۔ بی نتے کو خاموش دیکھ کر اُسے اس پر بڑا غصّہ آیا۔ گورا کے ہر ہر لفظ کو سُنکر اُس کا یہی جی چاہتا تھا۔ کہ مُنہ توڑ جواب دے۔ اتنے میں ملازم گرم پانی کی کیتلی لئے ہوئے آیا اور وہ چاء تیار کرنے لگی۔ بی نتے بار بار متجسسانہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتا جاتا تھا۔

گورا اور بی نتے کے اعتقادات بالکل ایک سے تھے طریقہ عبادت بھی واحد تھا۔ مگر اب تو گورا بغیر مدعو کئے ہوئے ایک برہمو سماجی کے یہاں آیا تھا۔ دوسرے اُسنے حملہ آورانہ رویہ اختیار کیا تھا۔ جس سے بی نتے کو کوفت ہوتی تھی۔ جب وہ گورا کے اقدامانہ طریقہ کا پریش بابو کے متین اور سنجیدہ طریقہ سے تقابل کرتا تھا۔ تو اُن کے دل میں اُنکی قدر بڑھتی جاتی تھی۔

پریش بابو دورانِ مباحثہ میں بار بار اپنی آنکھ بند کر لیتے اور تصوّر جمانے تھے۔ اس وقت یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ گویا اُن کے چہرہ پر نور کی بارش ہو رہی ہے۔ یہ دیکھ کر کہ گورا کی طبیعت میں انکسار کیوں نہیں پیدا ہوتا اُسے ناامیدی سی ہو چلی تھی۔ اور وہ گورا کو خاموش بھی نہ کر سکتا تھا۔

سوچترا نے چاء کی پیالیاں تیار کیں اور پریش بابو کی طرف اس غرض سے دیکھا کہ ان دونوں صاحبوں میں پہلے چاء کس کو دی جائے۔

بارودا نے گورا کی طرف دیکھ کے کہا۔ "غالباً آپ چاء تو نہ پیتے ہونگے؟"

گورا نے فیصلہ کن جواب دیا۔ "جی نہیں۔ میں چاء بالکل نہیں پیتا۔"

بارودا۔ کیوں۔ کیا آپکو اپنی ذات جانے کا خیال ہے۔

گورا۔ جی ہاں۔

بارودا۔ کیا آپ ذات پات میں بھی یقین رکھتے ہیں۔

گورا۔ ذات پات کی بندشیں میری اختراع تو ہیں نہیں کہ جن کو ماننا نہ ماننا میرا اختیاری امر ہو۔ جبتک مجھ کو کسی خاص جماعت سے تعلق ہے اُس وقت تک مجھ کو اُسکا احترام بھی لازم ہے۔

بارودا۔ کیا آپکے لیئے ان معاملات میں جماعت کا تابع رہنا ضروری امر ہے۔

گورا۔ جماعت کے احکام سے انحراف کرنا گویا اس کو تباہ کرنا ہے۔

بارودا۔ کیا جماعت کے تباہ ہو جانے سے کوئی نقصان بھی ہوگا۔

گورا۔ ممکن ہے کہ آپ یہ بھی پوچھ بیٹھیں کہ درخت کی جس ٹہنی پر ہم بیٹھے ہوں کیا اُسے کاٹنے سے کچھ نقصان ہوگا۔

سوچترا بالآخر پریشان ہو کر بول اٹھی۔ "اماں جان جانے بھی دو۔ اس مباحثہ سے نتیجہ۔ بس معلوم ہو گیا کہ وہ ہمارے ساتھ نہ کھائینگے۔

گورا نے سوچترا کی طرف غور سے دیکھا۔ لیکن وہ بی نتے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس نے بی نتے سے آہستہ سے پوچھا۔ "کیا آپ؟"

بی نتے نے بھی عمر میں کبھی چاء نہ پی تھی۔ ایک زمانہ سے اُس نے مسلمانوں کے ہاتھ کا بنا ہوا بسکٹ اور نان پاؤ کھانا چھوڑ دیا تھا لیکن آج وہ ہر اُس چیز کا جو اُسے دی جاتے کھانا ضروری سمجھتا تھا چنانچہ اُس نے سوچترا کی طرف دیکھ کر کہا۔ "جی ہاں ضرور چاہیئے گی"

اس کے بعد اُس نے گورا کی طرف دیکھا۔ گورا کے چہرہ پر حقارت آمیز تبسم تھا۔

بی نتے نے بڑی ہمت کی۔ اور چاء پی لی۔ حالانکہ اُسے کچھ تلخ اور بدمزہ معلوم ہوتی تھی۔

"کیسا ستودہ صفات لڑکا ہے" یہ بارودا کی خاموش تحسین تھی۔ اُس نے گورا کی طرف سے اپنی پیٹھ پھیر لی اور بی نتے سے متوجہ ہو کر باتیں کرنے لگی۔ جب پریش بابو نے بارودا کا یہ رویہ دیکھا تو گورا کے قریب اپنی کرسی کھینچکر آ بیٹھے اور آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔

اتنے میں ایک اور ملاقاتی کے آنے کی خبر ہوئی جب وہ وہاں آیا تو سب نے اُس کو پنو بابو کہکر خوش آمدید کہا۔ اس کا اصل نام ہرن چندر ناگ تھا۔ اور وہ اپنے حلقۂ احباب میں بڑا ذکی الفہم اور عقلمند شخص مشہور تھا۔ باوجودیکہ ابتک طرفین میں سوچترا کی شادی بیاہ کے متعلق کوئی بات نہ ہوئی تھی۔ تاہم سب میں مشہور ہو گیا تھا۔ کہ سوچترا کی شادی اسی کے ساتھ ہوگی۔ پنو بابو تو دل سے اس کا متمنی تھا۔ سوچترا کی سہیلیاں اکثر اس کو چڑایا کرتی تھیں۔

پنو بابو کسی اسکول میں ماسٹر تھا اسی لئے بارودا اس کی طرف زیادہ مائل نہ تھی۔ اس نے پنو بابو کے یہ صاف صاف ذہن نشین کرا دیا تھا۔ کہ وہ کبھی اُس کی خاص لڑکیوں کے متعلق کچھ کہنے کی جرأت نہ کرے۔ اُس کے خیالی داماد تو وہ تھے جو ڈپٹی مجسٹریٹی کے حاصل کرنے میں مصروف ہوں۔

سوچترا نے جب پنو بابو کو چاء دی تو لیبونیا نے اُس کی طرف دیکھ کر دُور سے مُنہ بنایا۔ اور ہنسنے لگی۔ بی نتسے نے یہ دیکھ لیا۔ یہاں بیٹھے بیٹھے اس کی نگاہوں میں عجیب پھُرتی پیدا ہوگئی تھی۔ اور اُس کو پہلے یہ سان گمان بھی نہ تھا کہ اُس کی قوت مشاہدہ اتنی قوی و سریع السیر ہے۔ اس کی طبیعت میں رشک پیدا ہونے لگا۔ اور پنو بابو اور سدھیر کا اس خاندان میں اتنا گھُل مل جانا کہ وہ لڑکیوں کے لئے آپس میں اشارات کا باعث ہوں۔ بی نتسے کو خُدا کی غیر منصفی معلوم ہوتی تھی

آج پنو بابو کے آتے ہی سوچترا خوش ہوگئی۔ اور اُسے یہ اُمید ہونے لگی کہ پنو بابو گورا کو ضرور مباحثہ میں نیچا دکھائیگا۔ دوسرے موقعوں پر تو وہ پنو بابو کی بحث مباحثہ کی عادت سے بڑی بیزار ہوتی اور پریشان رہتی تھی۔ لیکن آج اُس نے پنو بابو کی خاطر مدارات چاء اور بسکٹ سے دل کھول کر کی۔ تاکہ وہ مباحثہ کے لئے چاق چوبند ہو جاتے۔

پریش بابو نے کہا "پنو بابو دیکھئے یہ ہمارے گورا ہیں۔"

پنو بابو نے بات کاٹ کر کہا "جی ہاں ان کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ کسی زمانہ میں یہ بڑے زبردست برہمو سماجی تھے۔ یہ کہکر وہ گورا کے پاس سے چلا گیا اور چاء پینے لگا۔

اس زمانہ میں صرف ایک یا دو بنگالیوں نے سول سروس کا امتحان پاس کیا تھا۔ سدھیر اُن کے ولایت سے واپس ہونے پر اُن کے استقبال کا حال بیان کر رہا تھا۔

ہرن نے کہا "کیا ہوا! اگرچہ بنگالی امتحانوں میں کتنی ہی قابلیت سے کامیابی کیوں نہ حاصل کر لیں لیکن ان میں انتظامی قابلیت کبھی نہیں پیدا ہو سکتی۔ اور نہ وہ اچھے حاکم ہو سکتے ہیں۔ یہ ثابت کرنے میں کہ بنگالی کسی صورت میں بھی ضلع کے انتظام کرنے کے اہل نہیں ہیں ہرن نے بڑی فصاحت و بلاغت سے کام لیا۔

اس بیجا اور مہمل شکوہ و شکایت کے سُنتے ہی گورا کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اس لئے حتی الوسع خاموش رہنے کی کوشش کی لیکن جب معاملہ حد سے گزرنے لگا۔ تو اس سے نہ رہا گیا۔ اور وہ بول اٹھا "جو کچھ آپ نے ابھی کہا ہے اگر فی الحقیقت آپکو اس پر یقین واثق ہے تو تعجب ہے کہ آپ آرام سے بیٹھ کر کھاتے ہوئے نہیں شرماتے۔"

ہرن نے تعجب سے گورا کو دیکھا اور کہا۔ "آپ مجھ سے کیا کرانا چاہتے ہیں؟"

گورا۔ آپ کو بنگالیوں پر سے اس دھبہ کو مٹانا چاہئے۔ اگر یہ نہیں ہو سکتا تو ایسی زندگی پر تف ہے۔ اس سے تو بہتر یہی ہے کہ کہیں پھانسی لگا کر مر جاؤ۔ مجھے تعجب تو اس پر ہے کہ آپ کی زبان سے ایسی باتیں نکلیں اور آپ کا لقمہ آپ کے حلق میں نہ پھنسے۔

ہرن۔ کیا میں حقیقت پر پردہ ڈال دوں اور سچ نہ بولوں؟

گورا۔ معاف کیجئے۔ جو کچھ آپ نے فرمایا ہے اگر اس پر آپ کو یقین ہوتا تو آپ کو اتنی چرب زبانی کی ضرورت نہ پڑتی۔ چونکہ وہ سراسر غلط ہے اس وجہ سے آپ اتنی آسانی سے کہہ گئے۔ ہرن بابو مبالغہ کرنا گناہ ہے۔ کسی پر جھوٹا الزام لگانا گناہِ عظیم ہے۔ اور اپنے ابنائے وطن کو کسی جھوٹے الزام سے متہم کرنا عظیم ترین گناہ ہے۔ جس کی مثال نہیں مل سکتی۔ اور نہ تلافی ممکن ہے۔

اس کے بعد ہی گورا نے یہ اور اضافہ کیا تو ہرن غصّہ سے تھرانے لگا۔ "شاید آپ اپنے زعم میں اپنے کو اپنے ابنائے وطن سے برتر اور اعلےٰ سمجھتے ہیں۔ اور اپنے کو اس کا مستحق سمجھتے ہیں۔ کہ آپ ان کی ملامت کریں۔ اور وہ آپ کی ملامت کو ٹھنڈے دل سے سنتے رہیں"۔ اب ہرن کو اپنی وضع قائم رکھنے میں بڑی دقت پڑی۔ اس نے بنگالیوں کو اور بھی بُرا بھلا کہنا شروع کیا۔ اُس نے بنگالیوں کی بہت سی بُری رسموں کا ذکر کر کے کہا۔ جبتک یہ رسمیں ان میں باقی رہیں گی۔ اس وقت تک ترقی غیر ممکن ہے۔

گورا نے متنفر ہو کر کہا۔ "بنگالی رسم و رواج کی جتنی مذمت تم نے اب تک کی ہے۔ اُس کا علم تم کو انگریزی ہی کی کتابوں سے ہوا ہے۔ جب تم انگریزی رسم و رواج کی بھی اسی صداقت سے مذمت کر سکو گے۔ اسی وقت تم کو ان مسائل پر گفتگو کرنے کا پورا حق ہو سکتا ہے۔"

پریش بابو نے ہر چند کوشش کی کہ گفتگو کا رُخ دوسری طرف پھر جائے لیکن غُصّہ سے بھرے ہوئے ہرن پر اِس کا بالکل اثر نہ ہوا۔

اتنے میں شام ہو گئی۔ شفق پھول گئی۔ بادلوں کے رنگ نہایت خوشگوار معلوم ہونے لگے۔ اس جنگ زرگری کی کوفت کے باوجود بی نتے کے دل پر اس منظر سے عجیب اثرات مترتب ہونے لگے۔

اس وقت پریش "تصور" باندھا کرتے تھے۔ وہ چھجے سے اُتر کر باغ میں ایک چمپا کے درخت کے نیچے جا بیٹھے۔ باروداً کو گورا سے کچھ نفرت سی ہو گئی۔ ہرن سے بھی وہ خوش نہ تھی۔ ان دونوں کے مباحثہ سے اکتا کر اس نے بی نتے سے کہا۔ "آئیے۔ بی نتے بابو اندر چلیں۔"

باروداً کی اس خاص عنایت کے شکریہ میں بی نتے باروداً

ـے ساتھ کمرے کے اندر چلا گیا۔ باتوداؔ نے اپنی لڑکیوں کو بھی ساتھ لے لیا۔ سٹیبنؔ اس مباحثہ کو شیطان کی آنت کی طرح بڑھتا ہوا دیکھ کر اپنے کُتّے سے کھیلنے لگا۔

باتوداؔ نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر بی نتّے سے اپنی لڑکیوں کی تعریف شروع کر دی۔ اس نے لیبوتیا سے مخاطب ہو کر کہا۔ "پیاری لیبوتیا اپنی بیاض لا کر بی نتّے بابو کو دکھلاؤ۔"

لیبوتیا کو اپنی بیاض نئے ملاقاتیوں اور دوستوں کو ـ ملانے کی عادت سی پڑ گئی تھی اور وہ ہمیشہ اسی انتظار میں رہا کرتی تھی۔ کہ کوئی اس سے اپنی بیاض دکھلانے کو کہے۔ آج مباحثہ کے طول پکڑنے کی وجہ سے اُسے کچھ ناامیدی سی ہو گئی تھی۔

بی نتّے نے جب بیاض کو کھولا تو اس میں مور اور لانگ فیلو کی چند نظمیں نسوانی ہاتھ سے لکھی ہوئی دیکھیں۔ ان نظموں کے عنوان اور ابتدائی حروف نہایت خوبصورتی سے جلی قلم سے لکھے گئے تھے۔ لکھنے میں صفائی اور احتیاط کا بڑا خیال رکھا گیا تھا۔ بی نتّے نے بڑی تعریف کی۔ اس زمانہ میں انگریزی نظموں کا اس خوبی سے نقل کرنا کوئی چھوٹی بات نہ سمجھی جاتی تھی۔

جب باتوداؔ نے دیکھا کہ بی نتّے بہت متاثر ہو گیا ہے۔ تو اس نے اپنی دوسری لڑکی سے کہا۔ "للیتا تم بی نتّے بابو کو اپنی نظم تو سناؤ۔"

للیتا نے جواب دیا۔ "نہیں امّاں جان، مجھ کو وہ نظم اچھی طرح یاد نہیں ہے میں نہ سناؤں گی۔ اور کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ باتوداؔ نے بی نتّے سے کہا۔ اسے نظم تو خوب یاد ہے لیکن وہ بڑی حیادار لڑکی ہے۔ وہ کسی قدر شرماتی ہے اور دکھاوا پسند نہیں کرتی۔ اس نے یہ بھی کہا۔ کہ بچپن سے کچھ اس کی ایسی ہی عادت ہے۔ اور اپنے بیان کی تائید میں اُس نے دو تین واقعات کا تذکرہ بھی کیا۔ اور ثابت کرنا چاہا۔ کہ وہ بہت لائق ہے۔ یہ بھی بیان کیا کہ وہ اپنے باپ پر گئی ہے۔ اس کی طبیعت میں بہت استقلال ہے۔ اور بڑی باہمت لڑکی ہے۔ اگر چوٹ بھی لگ جائے تو نہیں روتی۔

اب لیلا کی باری آئی۔ پہلے تو وہ کچھ اٹکتی رہی۔ اور جب اُس نے پڑھنا شروع کیا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا ایک چابی بھری ہوئی مشین ہے۔ ایک سانس میں وہ پوری نظم "ارے چھوٹے چھوٹے تارو کہ جگمگا رہے ہو" بغیر مطلب سمجھے ہوئے پڑھ گئی۔

للیتا یہ جانتی تھی کہ اب گانے کی باری ہے۔ اس لئے وہ باہر چلی گئی

خدا خدا کر کے باہر مباحثہ ختم ہو چکا تھا۔ ہرن نے لاجواب ہو کر سخت کلامی شروع کر دی تھی ہرن کے اپنے قابو سے باہر ہونے کی وجہ سے سوچترا کو سخت رنج ہوا اور وہ بہت شرمندہ بھی ہوئی اسی بنا پر اُسے گورا کی طرفداری کرنی شروع کر دی تو بھی ہرن خاموش نہ ہوا۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ چاروں طرف سے سخت ابر گھر آیا تھا۔ سڑکوں پر مالی جوہی کے ہار تنگے رہے تھے۔ درختوں پر جگنو چمکنے لگے قریب کے تالاب پر تاریکی پھیل چکی تھی اور اس تاریکی میں پانی چمک رہا تھا۔

بی نتے مجھے پر پریش بابو سے رخصت ہونے کو آیا۔ پریش بابو نے گورا سے کہا۔ "آپ اپنی فرصت کے وقت آیا کیجئے کرشن دیال میرے بھائی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ آجکل ہم لوگوں کے خیالات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ نہ تو ہم ایک دوسرے سے ملتے ہی ہیں اور نہ خط و کتابت ہے لیکن ہماری بچپن کی دوستی ہمارے پوست و خون کا ایک جزو بن چکی ہے۔ تمہارے والد سے دیرینہ تعلقات کی وجہ سے تم سے مجھ کو خاص محبت ہو گئی ہے۔

پریش بابو کے سنجیدہ لہجہ اور محبت آمیز گفتگو نے گورا کے دل کی مباحثہ کی گرمی کو ٹھنڈا کرنے میں آبحیات کا کام کیا۔ پہلے گورا نے جب اس پیر مرد کو سلام کیا تھا اس وقت اسکے دل میں اسکی اتنی توقیر نہ تھی۔ اب کی اُسنے نہایت ادب سے سلام کیا اور رخصت ہوا گورا نے سوچترا کی موجودگی کا ذرا سا بھی خیال نہ کیا۔ اور نہ کسی اشارے یا کنایہ سے یہ ظاہر ہونے دیا۔ کہ اُسکو اُس کی موجودگی کا علم ہے۔ اگر گورا سے ایسا فعل سرزد ہوتا تو گویا اُس کے اعتقاد و یقین کے مطابق وہ ایک بڑی بداخلاقی ہوتی۔ بی نتے نے پریش بابو کو سلام کیا۔ اور پھر سوچترا سے بھی رخصت ہوا۔ اپنے اس فعل پر بی نتے بہت نادم تھا۔ اور شرماتا ہوا گورا کے پیچھے ہولیا۔

ہرن ان دونوں کے رخصت ہوتے وقت عمداً اس خیال سے اندر چلا گیا تھا کہ اُن سے نہ ملے۔ وہاں میز پر برہمو سماج کی بھجن (حمدیہ اشعار) کی کتاب رکھی ہوئی تھی۔ اُسکے اوراق اُلٹ پلٹ رہا تھا۔ ان دونوں کے جاتے ہی فوراً وہ باہر چھجے پر آ گیا۔ اور پریش بابو سے کہنے لگا "جناب والا ہر کس و ناکس سے لڑکیوں کا ملانا مناسب نہیں۔"

سوچترا کو بہت ناگوار گذرا۔ اور اُسنے اپنی خفگی کا اظہار کرکے کہا۔ "اگر ابا جان آپکے مشورہ پر عمل کرتے تو آج ہم آپکو بھی نہ پہچانتے

ہرن۔ اگر آپ اپنے ہی ہم خیالوں میں دائرہ تعارف کو محدود رکھیں تو بہتر ہوگا۔

پریش بابو ہنس پڑے اور کہا۔ "کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہم اپنے دائرۂ تعارف کو اپنے ہم خیالوں میں محدود کرکے پھر پردہ کی رسم کو تازہ کریں میرا خیال تو یہ ہے کہ لڑکیاں ہر خیال کے آدمیوں سے ملیں۔ ورنہ وہ تنگدل غیر روادار اور متعصب ہو جائینگی۔ ہم کو اس معاملہ میں اتنا تنگ خیال نہ ہونا چاہئے۔

ہرن۔ میں نے یہ تو نہیں کہا۔ کہ لڑکیاں مختلف الخیال حضرات سے نہ ملیں لیکن یہ لوگ تو آداب معاشرت سے واقف ہی نہیں ہیں۔ اور نہ انہیں علم مجلس ہی ہے۔ وہ یہ بھی تو نہیں جانتے کہ خواتین سے کس طرح برتاؤ کرنا چاہئے۔

پریش بابو۔ نہیں یہ بات نہیں ہے جسے آپ بداخلاقی سے تعبیر کرتے ہیں وہ محض انکا حجاب ہے جبتک وہ عورتوں سے ملیں جلینگے نہیں اُس وقت تک انکا حجاب نہیں ٹوٹ سکتا۔ (باقی آئندہ)